شریف ہندوستانی بیبیوں کیلئے پاکیزہ خیالات علمی و ادبی مضامین اور مفید معلومات کا ماہوار ذخیرہ



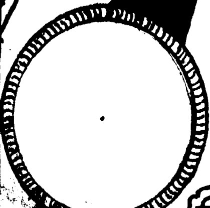
یادگار

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

انتیسویں ۲۹ سال کا پہلا پرچہ

راشد الخیری نمبر

تعداد اشاعت ۵۵۰۰





مرتبہ

رازق الخیری

یادگار مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

رسالہ عِصمت دہلی

راشد الخیری نمبر

انتیسواں سال	بابت جولائی و اگست سنہ ۱۹۳۶ء	جلد ۵۷ نمبر ۱ و ۲

فہرست مضامین

چندہ سالانہ پیشگی مع محصول ڈاک وغیرہ **چار روپیہ** ممالک غیر سے ۱۰ **شلنگ**

قسم خاص (جو آرٹ کاغذ پر چھپتا ہے) دس روپیہ۔ روسا سے پچیس روپے۔ والیان ریاست سے سو روپیہ۔ ممالک غیر سے ایک پونڈ۔ فی پرچہ ایک روپیہ۔

رسالہ عصمت ہندوستان کے بڑے بڑے اسٹیشنوں پر میسرز اے ایچ وھیلر کے بک سٹال پر بھی ملتا ہے۔

باہتمام ابراہیم مولوی محمد امان الرحمن پرنٹر و پبلشر محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپا

چند باتیں

حضرت والد مغفور کو شہرت اور نام و نمود سے جس قدر نفرت تھی اس کا علم ان خواتین و حضرات کو اچھی طرح سے ہے جو عصمت کا عرصہ دراز سے باقاعدہ مطالعہ کر رہے ہیں یا جن کی نظر سے ان کی متعدد تصانیف گذر چکی ہیں یا جنہیں ان سے ملاقات کا فخر حاصل ہوا تھا، وہ بھی محض مدرسے کی مجبوریاں تھیں جو حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے دُور دراز مقامات کے دورے کئے۔ اور مدرسے ہی کے مفاد اور قومی درد رکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے دورے کے حالات لکھے ورنہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ذاتی بڑی سے بڑی ضرورت کیلئے بھی کسی بڑے آدمی سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے، چار پانچ سال کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ سے جن کی شاندار خدمات کے صلے میں حکومت نے بڑے بڑے خطابات اور اعزازات سے انہیں سرفراز فرمایا ہے، دلی کے صاحب چیف کمشنر سرجان طامسن نے حضرت علامہ مغفور کے لٹریچر کے متعلق نہایت شاندار الفاظ فرمائے، ان محترم بزرگ نے حضرت علامہ مغفور تک یہ الفاظ پہنچا کر یہ بھی فرمایا کہ آپ ایک دفعہ صاحب سے مل لیں تو لیجیے شمس العلماء کا خطاب اسی سال آپ کو مل جائے گا! اس کا جواب انہوں نے جو دیا وہ یہ تھا: "بھائی صاحب آپ کی محبت کا شکریہ! مگر آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"!

مصور غم علیہ الرحمۃ کی تصانیف کی چند ایسی خصوصیات ہیں جن کی طرف بہت کم حضرات کا ذہن گیا ہوگا۔ اور جن سے مصنف کی طبیعت کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے، انہوں نے کسی کتاب میں اپنی تصویر کی اشاعت پسند نہ فرمائی کوئی کتاب کسی شخص کے نام ڈیڈیکیٹ نہیں کی۔ سوائے چار تصانیف کے جن کے دیباچوں کی اشد ضرورت تھی، کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا، کسی کتاب میں تعارف یا تقریظ کسی شخص سے نہیں لکھوائی۔ غرض پانچ درجن کتابوں میں کہیں اپنا نام نہ آنے دیا البتہ ٹائیٹل پر مصنف کی حیثیت سے پبلشر شائع کرنے پر مجبور تھے اسی طرح عصمت و بنات میں بھی انہوں نے کبھی خطوط شائع کئے تو وہ بھی صرف وہ تھے جو مسلمانوں سے متعلق ہوتے تھے ورنہ کبھی ایسے خطوط کی اشاعت جن میں ان کی خدمات اور ان کی ذات کی تعریف ہوتی تھی، اٹھائیس سال کی صحافت نگاری میں انہوں نے کبھی جائز نہ سمجھی۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر سخت تھے کہ اوراق عصمت پر عصمت کی تعریف میں خطوط یا اخبارات کے نوٹ تک نقل کرنا پسند نہ فرماتے تھے سنہ ۳۳ء میں جب عصمت کا جوبلی نمبر شائع ہوا تھا تو میں نے انکی تصویر شائع کرنیکی انتہائی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ سنہ ۳۴ء میں جب ہمارا فیملی گروپ اترا تھا میں نے فوٹو گرافر کو ان کا علیحدہ فوٹو اس طرح سے کھینچنے کی ہدایت کردی تھی۔ کہ ان کو خبر نہ ہو، اس فوٹو کا جب بلاک بننے کے بعد تصویر چھپ گئی اور اس کی جگہ کوئی اور تصویر دینے کا وقت نہیں رہا اور رسالہ بالکل تیار ہوگیا۔ اسوقت میں نے انہیں اطلاع کی تو انہوں نے اس کی اشاعت کو بھی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور ستمبر کے پرچہ میں اس کے متعلق ایک مضمون تحریر فرمایا۔ ان تمام واقعات سے باخبر ہونے اور ان کی طبیعت سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود میں نے سنہ ۳۶ء میں عرض کیا کہ میں "راشد الخیری نمبر" شائع کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ کی مختلف حیثیتوں اور آپ کی خدمات کے متعلق مضامین ہوں گے۔ یہ خاص نمبر نہ صرف اردو ادب کے لئے بلکہ قوم کے لئے بالخصوص لڑکیوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا"۔ اس پر انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ "تم کو اس کی ضرورت ہوگی مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری زندگی میں تم عصمت میں میرے متعلق کچھ نہیں چھاپ سکتے، میرے بعد تمہیں اختیار ہے"۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ دو برس بعد ہی میری خواہش پوری تو ہوگی۔ مگر اُسوقت جب اُن کا مبارک سایہ میرے اور قوم بدنصیب کے سر سے اُٹھ چکے گا۔

اس خاص نمبر کا اعلان ہونے کے بعد جس کثرت سے مضامین موصول ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ اس خاص نمبر میں ایک تہائی سے زیادہ صفحے باریک لکھوائے گئے ہیں اور کتابی سائز کے قریباً ساڑھے پانچ سو صفحوں کا میٹر دیا جا رہا ہے۔ لیکن قریب قریب اتنے ہی صفحوں کے قابل اندراج مضامین رد کرنے پڑے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض خواتین اور حضرات سے صادق میاں نے مضمون لکھنے کی خواہش کی تھی لیکن ان وجوہ سے کہ یا تو مضامین مقرر کردہ عنوانات پر نہیں لکھے گئے۔ یا بہت دیر میں موصول ہوئے۔ جبکہ کتابت بھی ختم کے قریب تھی یا وہ نامکمل تھے۔ یا مجوزہ صفحات سے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ اس پرچہ میں شریک نہ ہوسکے۔ اب یہ مضامین آئندہ شائع ہونگے

جو مضامین ناقابل اشاعت ہوں گے ان کی اطلاع مضمون نگاروں کو ۱۰ جولائی کے بعد دیدی جائیگی۔

مارچ کے پرچہ میں اس خاص نمبر کے لئے چند عنوانات تجویز کئے گئے تھے اُن میں سے بعض عنوانوں پر گو علیحدہ مستقل مضامین نہیں ہیں تاہم اُن موضوعوں پر مختلف مضمونوں میں مختصر طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً "تصانیف مصور غم کی بہترین کی خصوصیات" پر کپتان نصیر الدین احمد صاحب کے مضمون میں علامہ مغفور کے لکچروں اور وعظوں کے متعلق محترمہ مریم یوسف علی صاحب بی اے۔ اور گ۔ ن صاحبہ کے مضمونوں میں طرز تحریر کے متعلق متعدد مضامین ہیں جن مجوزہ عنوانوں پر علیحدہ مضامین اس پرچہ میں درج نہیں کئے گئے ان میں سے اکثر و بیشتر موصول ہوگئے تھے لیکن مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر درج رسالہ نہیں کئے جاسکے، اگر ان مضمونوں کو بھی اس پرچہ میں شریک کیا جاتا تو نہ صرف محصول ڈاک چار گنا ہو جاتا بلکہ پرچہ کا وقت پر شائع ہونا ناممکن تھا۔ "عصمت کے ۲۸ سال" کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے اس کے مطالعہ سے جہاں حضرت علامہ مغفور کی جرنلسٹ کی حیثیت کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہاں حقوق نسواں کے متعلق تمدن کی داستان سے عورتوں کے محسن اعظم کی کوششوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ حقوق نسواں کے لئے حضرت علامہ کی "کوششیں" جیسے موضوعات اس قدر وسیع ہیں کہ ان پر مفصل مضامین کے لئے رسالوں کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے، بلکہ ایسے عنوانات پر ضخیم کتابیں ہی لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جائیں گی،

اس خاص نمبر کے چند خاص خاص عنوانات پر ان خواتین اور حضرات کے مضامین شائع ہو رہے ہیں جو ان کے لئے نہایت موزوں ہیں حضرت علامہ مغفور کی الم نگاری، درد و اثر، سوز و گداز کے متعلق عام لوگوں کی یہ رائے کہ مصور غم کی تحریریں پڑھ کر دل کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں۔ ہر سطر کلیجے کے پار ہو جاتی ہے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں ہچکی بندھ جاتی ہے اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنی اس صورت میں کہ یہی الفاظ ان لوگوں کی زبان سے ادا ہوں جن کی ساری عمر مریضوں کی چیخ پکار اور زخموں کی چیر پھاڑ میں گذری ہو اور جو عام لوگوں کی طرح نرم دل نہ ہوں۔ جس مصنف کی تحریریں ایک ایسے ڈاکٹر کو جس کی ساری عمر انگلستان اور ہندوستان کے لاکھوں مریضوں کی آہ و بکا میں گذری ہو آٹھ آٹھ آنسو رلا دیں اسکو جو مصور غم کی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر تڑپ تڑپ اُٹھے اور ہچکی بندھ جائے اور جو خود بھی مشہور ادیب ہو اور جس کے زیر مطالعہ دنیا کی بڑی بڑی غم انگیز کتابیں رہتی ہوں واقعی وہ "مصنف" "آنسوؤں کا بادشاہ" ہے مصور غم کی ٹریجیڈی پر لکھنے کیلئے ان وجوہ سے کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب سے زیادہ موزوں اور کون ہو سکتا تھا۔ سیدہ کا لال حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی بہت مشہور کتاب ہے جس میں محض حسن عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ وہ واقعات تحریر فرمائے گئے ہیں جو فطرت انسانی، فلسفہ حیات اور سائنٹفک اصولوں پر پورے اتریں پھر یہ واقعات مصنف کی مشہور طرز تحریر میں ہیں۔ اس موضوع پر اس شخص کی رائے زیادہ وزن رکھ سکتی ہے جو خود بھی، ایک سچا مسلمان ہو اور خاندان رسالت سے محبت اور تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اس کے دقیانوسی خیالات نہ ہوں۔ غیر مدلل بحث نہ کرتا ہو اور اس نکتہ کو سمجھ سکتا ہو کہ ہمارے واعظوں اور عالموں کی غیر فطری اور خلاف عقل بے سر و پا حکایات کے بیان نے غیر مسلموں سے بہت عرصہ تک اسلام کا مضحکہ اڑوایا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ کی طرز تحریر کی قدر وہ کر سکتا ہے جو خود بھی موثر انداز بیان رکھتا ہو،

حضرت علامہ مغفور اہل سنن سے تعلق رکھتے تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فریق ثانی یعنی اہل تشیع اپنے عقاید اور عقیدت کی کسوٹی پر اس کتاب کو جس میں تاریخی واقعات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کس کسوٹی پر پرکھتے ہیں اس کے لئے ہندوستان کے مشہور سحر البیان، خطیب اعظم مولانا سید محمد زیدی کی رائے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے ہندوستانیوں میں مشرقیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بجائے پرانے زمانے کی کسی بزرگ بی بی کا مضمون شائع کرنیکے کرنل سر حسن سہروردی کی صاحبزادی محترمہ شائستہ اختر بانو سہروردی بی اے آنرز کا مضمون شائع

کیا جا رہا ہے، جو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ محترمہ موصوفہ ایک گریجویٹ خاتون ہیں اور ترقی یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اسی طرح حضرت علامہ مغفور کے مختصر افسانوں کے متعلق منشی پریم چند اور ڈاکٹر اعظم کریوی جیسے نامور حضرات کے مضامین ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا افسانہ نگار فن افسانہ نگاری پر کامیاب تنقید بھی لکھ سکتا ہو تاہم یہ حضرات جو افسانہ نگاری ہی کی وجہ سے مشہور ہیں جس نقطۂ نظر سے مصور غم رحمۃ اللہ علیہ کے افسانوں کو دیکھتے ہیں وہ کچھ وزن ضرور رکھتا ہے۔ المختصر متعدد عنوانوں پر جن خواتین و حضرات نے مضامین لکھے ہیں ان کے لئے وہی نہایت موزوں ہیں

جن خواتین اور حضرات سے خصوصیت کے ساتھ اس نمبر کے لئے مضمون لکھنے کی خواہش کی گئی تھی، ان کو یہ اختیار بھی دیدیا گیا تھا کہ وہ بے لاگ تنقید کریں چنانچہ چند حضرات نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں جن کا مختصر طور پر جواب دینا ضروری تھا لیکن علیحدہ کسی مضمون میں ان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک ایک اعتراض کا کئی کئی مضمونوں میں پہلے ہی سے جواب موجود ہے۔ مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ مصور غم علیہ الرحمۃ کے مکالمے غیر فطری اور نہایت طویل ہیں، اس کے جواب میں مشہور افسانہ نگار جناب ل احمد صاحب اکبر آبادی کا مضمون ہی کافی ہے جس میں انہوں نے حضرت مصور غم کی مکالمہ نویسی پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب ان کی مکالمہ نویسی کی قابلیت اور کمال سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈرامہ نویس کیوں نہیں ہوئے۔ میرا یقین یہ ہے کہ وہ اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو وہ قوم ان سے ڈرامہ ہی لکھواتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہندوستان کے اورکیل اور پہلے ڈرامہ نویس ہی نہ ہوتے بلکہ انہوں نے دنیا کے بڑے ڈرامہ نگاروں کی صف میں جگہ پائی ہوتی" ایک صاحب نے دبی زبان سے اُن کی زبان پر بھی اعتراض فرمایا ہے جس کا جواب دو چار، دس، بیس میں نہیں بلکہ اسی رسالہ کے کم از کم پچاس مضمونوں میں موجود ہے، ایک اعتراض یہ ہے کہ پلاٹ غیر فطری ہوتے ہیں، اس غلط فہمی کے دور کرنے کے لئے کپتان نصیر الدین احمد صاحب، منشی پریم چند صاحب، پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب، ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی، مسٹر محمود مورخ وغیرہ وغیرہ حضرات کے مضامین کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ دو اصحاب کے اعتراض کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا کی غم نگاری بعض دفعہ پڑھنے والے کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے، اس کا جواب بھی بہت سے مضمونوں میں موجود ہے مثلاً کپتان نصیر الدین صاحب کا مضمون، جن صاحب نے مغربی معیار پر پرکھ کر افسانوں پر اعتراض کیا ہے انہیں بھی کئی مضمونوں میں بہت معقول اور مدلل جواب مل جائیگا، اس سلسلہ میں پروفیسر طاہر رضوی ایم اے کے یہ الفاظ بھی ملحوظ رکھنے ہونگے کہ "مغرب کے خود ساختہ معیار سے مشرق کے ادبیات کو جانچنا حد درجہ کی بنیادی غلطی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ملک کی ضرورتیں اور ہر قوم کے خصائل جداگانہ ہوتے ہیں اور ہر ماحول اپنے ادب کے لئے ایک نیا معیار بناتا ہے۔"

بعض غیر مسلموں کی یہ شکایت ہے کہ مولانا مرحوم نے جو کچھ لکھا

صرف مسلمانوں کے لئے، اس کے جواب میں "مہا بیر سوامی" (مندرجہ نظام المشائخ) کرشن جی کی پیدایش کے متعلق مضمون (مندرجہ تیج کرشن نمبر ۱۹۳۳ء) بائی جی (مندرجہ نظام المشائخ) اور عصمت کے کئی مضامین اور افسانے مثلاً یاردلی آغیرت کی پتلی، وفا کی دیوی وغیرہ وغیرہ نبز کتاب شہید مغرب کے کئی مضامین مثلاً کلہ تیاں، سیاہ داغ۔ ازاماد تفریط، پیش کئے جا سکتے ہیں نوبت پنج روزہ میں ایک نوبت سلونو صرف ہندووں سے متعلق ہے علاوہ ان کے حضرت علامہ مغفور نے اپنی پہلی ہی تصنیف "حیات صالحہ" میں جو گویا ان کی ادبی وعلمی واصلاحی کوششوں کا سنگ بنیاد ہے تحریر فرما دیا تھا کہ گو یہ قصہ ایک مسلمان خاندان کا ہے مگر ہر قوم اور ہر فرقے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ مغفور کی تصانیف سے جس قدر فائدہ مسلمان خواتین کو پہنچا ہے اتنی ہی ان کی تصانیف غیر مسلم خواتین کے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں جنہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ خصوصیت کے ساتھ حضرت علامہ مغفور نے کوئی کتاب غیر مسلموں کے لئے نہیں لکھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بسنے والی ہر قوم انکی ہر کتاب سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتی ہے، اور جو واقعات انہوں نے تحریر فرمائے ہیں وہ مسلمانوں ہی تک محدود نہیں چنانچہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی اپنے مضمون کے دوران میں فرماتے ہیں کہ ایسے واقعات ہمارے معاشرت میں بلا تخصیص مذہب وملت آئے دن پیش آتے رہتے ہیں" عصمت کے اس خاص نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک درجن سے زیادہ غیر مسلم مردوں اور عورتوں کے مضامین شائع ہو رہے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ مغفور کی تصانیف اور رسالے غیر مسلموں میں بھی بہت مقبول ہوئے اور ان کو بھی کافی فائدہ پہنچا۔

عظیم المرتبت ہستیوں سے مکمل واقفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ان کے ملکی اور قومی یا ادبی وعلمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ذاتی حالات بھی معلوم ہوں۔ حضرت علامہ مغفور کے خانگی حالات۔ اور مختلف حیثیتوں پر کچھ مضامین اس نمبر میں بھی شائع کئے جا رہے ہیں جن سے ان کی پرائیوٹ زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت علامہ مغفور نے تمام عمر اپنی تصویر خود نہیں کھچوائی۔ اسی وجہ سے ان کی تصاویر کثیر تعداد میں نہیں۔ جوانی کی تصویر وہ ہے جو سر عبدالقادر نے رسالہ مخزن کے لئے کھچوائی تھی۔ سنہ ۱۹۲۸ء کی تصویر بمبئی میں مسٹر ضیاء الدین برنی بی اے کے اصرار سے کھچوائی تھی۔ باقی دونوں تصویریں مختلف گروپوں میں سے نکلوائی گئی ہیں، ان تصاویر کے علاوہ بعض اور گروپ حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی تصویریں آئندہ شائع کی جائیں گی،

راذق الخیری

اگست میں رسالہ کا انتظار نہ کیجیے

سالگرہ نمبر دو ماہ کا پرچہ ہوتا تھا جس کی ضخامت کچھ اوپر دو سو صفحے ہوتی تھی۔ مگر اس خاص نمبر پر چار ماہ کے پرچوں کے برابر لاگت آئی ہے۔ اور بہت سے صفحوں کی کتابت باریک ہونے کی وجہ سے مضامین قریباً ۵ ماہ کے پرچوں کے برابر دیئے جا رہے ہیں۔ عصمت کا نہ کوئی رزرو فنڈ ہے نہ مردانہ رسالوں کی طرح یہ پرچہ ایجنٹوں کے ذریعہ بازاروں میں فروخت ہوتا ہے اس لئے کم سے کم تین ماہ کے پرچوں کی جگہ شائع ہونا چاہئے تھا تیسرے ماہ کا پرچہ حسب معمول علیحدہ شائع ہونے سے جو مزید بار پڑے گا اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی اس کے متعلق ستمبر یا اکتوبر کے پرچہ میں عرض کیا سکے گا فی الحال آپ خاص نمبر کو دو ماہ یعنی اگست ستمبر کا رسالہ سمجھئے اور اگست میں رسالہ کا انتظار نہ کیجیے۔ اور نوٹ کر لیجیے۔ اب رسالہ ۳۰ جولائی کو شائع نہ ہوگا۔

مضامین کے مجموعے

حضرت علامہ مغفور کے جو مضامین عصمت کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئے تھے مختلف موضوعات پر ان کے مجموعے جلد سے جلد شائع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ آٹھ دس مجموعے ڈیڑھ دو ماہ بعد شائع ہو رہے ہیں۔ جن بہنوں نے اور بھائیوں نے انکے لئے ماہ جون میں ۵ روپیہ عنایت فرمائے ہیں انکی خدمت میں یہ مجموعے تیار ہوتے ہی ستمبر میں روانہ کر دیئے جائیں گے۔

عصمت کے اس خاص نمبر کی قیمت

کا اندازہ عہ تھا مگر چونکہ ضخامت بہت بڑھ گئی اس لیے ۱۰ جولائی سے عہ ہوگی اور بذریعہ وی پی عہ ۱۲ مگر مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ چار روپیہ ہی میں دیا جائے گا۔ جن خواتین وحضرات کو عورتوں کی بہتری کا ذرا بھی خیال ہے یا جو ادب اردو سے تھوڑی سی بھی دلچسپی رکھتے ہیں عصمت کے اس خاص نمبر کا انکی نظر سے گذرنا بہت ضروری ہے اس خیال سے اس خاص نمبر کے چند پرچے ضرورت سے زیادہ چھپوائے گئے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ چند ماہ گذر جانے کے بعد یہ خاص نمبر ختم ہو جائے اس لئے آپ کی جن ملنے والیوں کو خدا نے ذوق ادب عطا فرمایا ہے یا جنھیں تحریک نسواں سے کچھ دلچسپی ہے ان کو اپنے رسالہ کا خریدار بنا کر اسی مہینہ میں رسالہ ان کے نام جاری کرا دیجیے۔ اس نازک موقع پر توسیع اشاعت میں حصہ لینے والی قدردان بہنوں کا آئندہ پرچہ میں شکریہ ادا کیا جائے گا۔

عصمت کے اٹھائیس [۲۸] سال

عصمت کا اجرا اور پہلا دور (سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک)

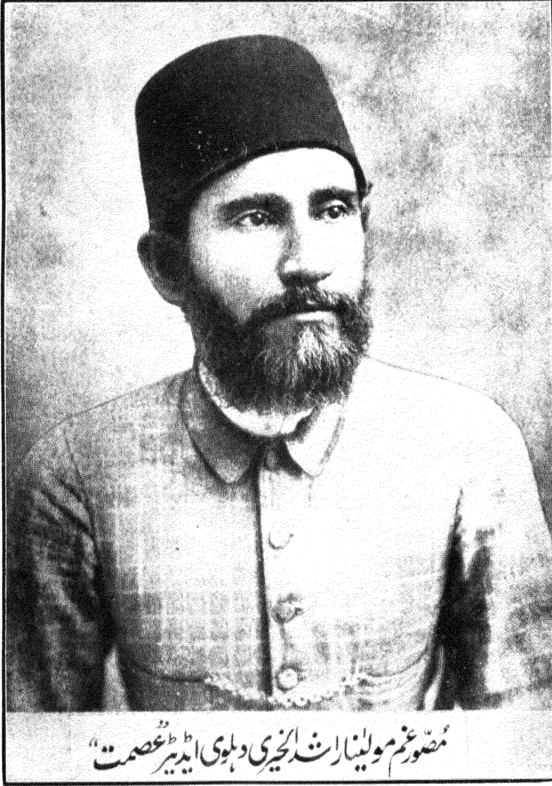
جہاں تک مجھے خیال ہے ہندوستان میں سب سے پہلا زنانہ پرچہ "اخبار النسا" تھا جو مولوی سید احمد علیہ الرحمۃ مؤلف فرہنگ آصفیہ و مصنف مہر افروز بیگم راحت زمانی وغیرہ نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد لاہور سے مولوی محبوب عالم مرحوم نے "شریف بی بی" اور مولوی سید ممتاز علی مغفور اور انکی اہلیہ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ نے "تہذیب النسواں" جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ عبد اللہ صاحب نے علی گڈہ سے "خاتون" کا اجرا فرمایا اور عزیزی پریس والوں نے آگرے سے "پردہ نشین" نکالا۔ انکے علاوہ ممکن ہے دو ایک اور پرچے بھی نکلے ہوں مگر انکے نام میرے ذہن میں نہیں۔ یہ سب کوئی نصف درجن زنانہ پرچے تھے جو عصمت سے پہلے جاری ہو چکے تھے اور ان پرچوں کے جاری کرنے والوں کو جو جو دقتیں پیش آئی ہونگی وہ اجرا عصمت کے وقت نسبتاً کم ہوئی ہونگی۔ تاہم اس زمانہ میں کسی زنانہ پرچہ کے جاری کرنے میں جو جو آسانیاں اور کامیابی کے جو جو ذرائع میسر ہیں آج سے چوتھائی صدی قبل نہ تھے۔ اِس زمانہ میں جو نئے زنانہ پرچے جاری ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کے اجرا کے تحت میں شہرت و ناموری حاصل کرنے، دل کا شوق پورا کرنے یا مالی منفعت کے حاصل کرنے کے جذبات کام کرتے ہیں، لیکن آج سے اٹھائیس برس پہلے کسی زنانہ پرچے کے جاری کرنے کے لئے باوجود اس کے کہ نہ اسقدر معقول سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی جتنی کہ اب ضروری ہے نہ اسقدر اہتمام و انتظام کرنا پڑتا تھا جتنا اب کیا جاتا ہے پھر بھی جن جن دشواریوں اور دقتوں کا آج سے چوتھائی صدی قبل کے زنانہ پرچوں کو سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ موجودہ زمانہ کی مشکلات سے بہت زیادہ تھیں۔ اگرچہ چار پانچ پرچے جاری ہو چکے تھے لیکن جدید تعلیم بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت تھوڑے تھے۔ جن خاندانوں میں تعلیم کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا ان میں بھی ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو اخبارات و رسائل کا لڑکیوں کی نظر سے گذرنا درست نہ سمجھتے تھے اور جو مستورات کا کاروباری خطوط لکھنا یا اپنے نام اخبارات میں چھپوانا بہت معیوب خیال فرماتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم۔ اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں پر دو چار صاحبوں کے مضامین شائع ہو رہے تھے مگر قوم کی طرف سے انپر پھبتیاں اُڑائی جاتیں اور فقرے کسے جاتے اور گالیوں کا خلعت فاخرہ عطا کیا جا رہا تھا ان حالات میں مالی منفعت یا شہرت و نام و نمود کے خیال سے زنانہ پرچہ جاری کرنے کی پچیس تیس سال پہلے کس کی شامت آئی تھی جو ہمت کرتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں پندرہ بیس سال قبل تک جس قدر بھی زنانہ پرچے جاری ہوئے وہ صرف اُن لوگوں نے جاری کئے جن کے دلوں میں تھوڑا یا بہت لیکن عورتوں کی ترقی یا اصلاح کا حقیقی درد موجود تھا۔ عصمت کا مطالعہ کرنے والی کئی ہزار بیبیوں میں، اب شاید کئی سو بھی باقی نہیں رہیں، جنہوں نے ابتدائی زمانہ اسکا دیکھا ہے اور جو باقی ہیں اُن میں گنتی کی چند بیبیاں ہونگی جنہیں یاد ہوگا کہ جس طرح "جوہر نسواں" خود دستکار بیبیوں کی خواہش اور اصرار پر جاری کیا گیا ہے، اسی طرح باوجود تعلیم نسواں کی ابتدائی حالت کے "عصمت بھی مستورات کے تقاضے سے جاری کیا گیا تھا" اس پرچے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور مخزن پریس دہلی سے مخزن ہی کے معیار کا ایک زنانہ رسالہ جاری کرنے کی خواہش خواتین کی طرف سے کیوں کی گئی اس کی یہ وجہ تو کچھ زیادہ وزنی نہیں کہ دہلی میں کوئی زنانہ پرچہ نہ تھا۔ اصل سبب خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت والد مغفور کی بے کس اور مظلوم عورتوں کے ساتھ وہ ہمدردی

تھی جسکا چرچا شروع ہو چکا تھا اور جس کا بعض کٹر سنگدل سفاک مرد مضحکہ اڑاتے تھے۔ "صالحات" اور "منازل السائرہ" جیسے اصلاحی معاشرتی ناول شائع ہو چکے تھے کہ رسالہ مخزن میں "عصمت رحمن" اور "بدنصیب کا لال" جیسے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے افسانے چھپنے شروع ہوئے اور کچھ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ انکی طرز تحریر کی دلآویزی۔ انداز بیان کی درد انگیزی۔ قلعہ معلیٰ کی بیگماتی زبان لکھنے کے کمال اور بے زبان عورتوں کے حقیقی جذبات کی ترجمانی اور اس جنس بے کس کی دلسوزی اور دردمندی کا تعلیم یافتہ طبقہ میں تذکرہ ہونے لگا۔ غالباً ۱۹۰۸ء میں شیخ عبد القادر صاحب (اب آنریبل سر عبد القادر ممبر انڈین کونسل لندن) رسالہ مخزن کو لاہور سے دہلی لائے تو انکی قدردانی والد مغفور کو مخزن پریس میں کھینچ لائی۔ وہ اس زمانہ تک سرکاری ملازم تھے لیکن ملازمت میں انکا کبھی جی نہ لگا اور یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے کہ انھوں نے ملازمت کے بارہ چودہ سال کس طرح گذارے تھے۔ لکھنے کی طرف طبعی رجحان تھا طویل طویل چھٹیاں لیتے اور دو ڈھائی سال تک مخزن مرتب فرماتے رہے اور ایسے ایسے کانٹے کے مضامین لکھے کہ پڑھنے والوں کو آج بھی جب انکے عنوانات یاد آجاتے ہیں تو حافظہ زبان کے چٹخارے لیتا اور دماغ تخیل کی داد دیتا ہے۔ مخزن کے اس دور میں عورتوں کے محسن اعظم کے جو مضامین شائع ہوئے تھے اُسے پہلے عورتوں کی مظلومیت کی تصویریں اسقدر مکمل کسی مصور قلم نے اخبار یا رسالہ میں نہیں کھینچی تھیں کوثر میں دُھلی ہوئی قلعہ معلیٰ کی ٹکسالی بیگماتی زبان میں لکھے ہوئے ان مضامین کے بار بار پڑھنے سے چند مستورات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ دفتر مخزن سے اگر علیحدہ ایک عورتوں کا رسالہ جاری کیا جائے تو وہ عورتوں کے جذبات کو زیادہ مؤثر پیرایہ میں ادا اور انکی ضروریات کو بہتر طریقے سے پورا کر سکے گا۔ شیخ عبد القادر صاحب کی بیرسٹری کی مصروفیت تھی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے خود پرچہ نہ نکال سکتے تھے۔ مخزن پریس کا تمام کام شیخ محمد اکرام صاحب کی مستعدی اور جفاکشی، محنت اور قابلیت کی وجہ سے بہ حسن و خوبی انجام پا رہا تھا۔ انکی ہمت اور حوصلہ نے اس ذمہ داری کو بھی اُٹھالیا اور جب جون ۱۹۰۸ء میں عصمت کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو اس شان اور اہتمام اور اس سج دھج سے کہ ہندوستانی پریس میں دھوم مچ گئی اور پہلا ہی پرچہ دیکھ کر تعلیم یافتہ خواتین اس کی گرویدہ بن گئیں۔

اس پرچے میں حضرت والد مغفور کا صرف ایک مضمون تھا "جہیز اور تجہیز" لیکن یہ ایک مضمون ہی چمن ادب کا وہ پھول ہے جس کی مہک مدتوں دماغ کو معطر رکھے گی۔ اس مضمون میں نسوانی زندگی کا فلسفہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانی بے کسی اور بے بسی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے دل کے پرخچے اُڑا دیتا ہے۔

پہلے ہی سال میں عصمت کو وہ مقبولیت حاصل ہو گئی جو اس سے پہلے غالباً کسی زنانہ پرچہ کو میسر نہ ہوئی تھی۔

عصمت کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد مستورات میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا تھا اور اس زمانے میں لکھنے والیاں گنتی کی ہی چند تھیں اس لئے جہاں حضرت والد ماجد مرحوم و مغفور نے اپنے مخصوص رنگ میں بڑے بڑے مؤثر مضامین تحریر فرمائے ہاں نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظان صحت وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی ناموں سے بھی لکھے۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کسی عورت کے نام سے کوئی عمدہ سا مضمون دیکھ کر عام طور پر لوگ کہا کرتے تھے کہ کسی مرد نے لکھا ہوگا اور نام ڈالدیا اپنی بیوی یا بیٹی یا بہن کا۔ اور یہ کہنا بعض حالات میں صحیح بھی ہوتا تھا۔ خود مجھے کئی صاحبوں نے دھوکہ دیا کہ مضمون خود لکھا اور اپنی بیٹی یا بیوی یا بہن کے نام سے بھیجدیا۔ لیکن اس قسم کی حرکتیں زیادہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتیں اور جھوٹ بالآخر معلوم ہو کر رہتا ہے اور جب قلعی کھل جاتی ہے تو جن لڑکیوں کے لئے اس غلط طریقہ سے شہرت کی کوشش کی جاتی ہے ان بچاریوں کو مستقبل میں حقیقتاً کافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ عصمت کے ابتدائی چند سال میں حضرت والد مغفور نے جو مضامین عورتوں کے ناموں سے لکھے تھے وہ فرضی عورتوں کے ناموں سے شائع ہوئے تھے نہ کہ اپنی کسی رشتہ دار کو مشہور کرنے کی نیت سے۔ یہ مضامین گو شائع ہوئے زنانہ ناموں سے لیکن اُن زنانہ ناموں سے



مصورِ غم مولانا راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر "عصمت"

۱۹۰۷ء میں رسالہ عصمت جاری ہونے سے ۶ ماہ قبل

جنکا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ مضامین بھی اگر وہ اپنے نام سے شائع کرتے تو ایک ہی شخص کے ایک ہی رسالہ میں چھ چھ سات سات مضامین کچھ اچھے نہ معلوم ہوتے۔ انھوں نے کسی مضمون کو "ج ۔ بیگم" کسی کو "ص ۔ ب" کسی کو "احمد النساء" وغیرہ وغیرہ ۔ ناموں سے اس لئے شائع کیا کہ عورتوں کو ایسے سیدھے سادھے مضامین پڑھ کر خود بھی کچھ لکھنے کی ہمت ہو۔ مثلاً برتن کی صفائی پر دو صفحے کا ایک مضمون ہے۔ جس میں برتنوں کو صاف ستھرے رکھنے کی خوبیاں اور انکی صفائی کے مختلف طریقے جو عام طور پر گھروں میں رائج ہیں، اس طرح تحریر فرما دیئے ہیں جیسے ایک لڑکی دوسری لڑکی کو بتا رہی ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد کئی لڑکیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ایسا مضمون تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں، یہ بات ہی کیا ہوئی۔ تو گویا گھرداری کے متعلق بے شمار عنوانوں پر بغیر کسی خاص علمی قابلیت کے اس مضمون کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی لڑکیوں کو ترغیب ملی اور خود لکھنے کا شوق ان کے دل میں پیدا ہونے لگا۔

اس قسم کے مضامین جو انہوں نے اپنے نام سے نہیں لکھے وہ اپنے عزیزوں کے ناموں سے بھی نہیں لکھے بلکہ فرضی زنانہ ناموں سے لکھ کر بے شمار بیبیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کر دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کیلئے یہی بہترین طریقہ ترغیب ہو سکتا تھا۔ انکے مخصوص رنگ میں بہت سے ادیبوں نے لکھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے پھر ان بیچاریوں کا کیا ذکر جنکی نہ معلومات وسیع تھیں نہ خاص ادبی قابلیت رکھتی تھیں، اگر اکثر و بیشتر مضامین حضرت والد ماجد مغفور اپنے مخصوص طرز میں لکھتے رہتے تو مضمون نگار خواتین کی یہ کثیر جماعت آج ہرگز نظر نہ آتی۔ لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لئے عصمت اور معاونین عصمت نے سنہ۱۰ء سے سنہ۲۲ء تک یعنی میرے کمزور کندھوں ادارت کی ذمہ داری رکھے جانے سے قبل مختلف موقعوں پر بہترین مضامین پر انعامات بھی دئے اور اس طریقہ سے بھی خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا۔ غرض عصمت کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی یہاں تک کہ گذشتہ بیس سال میں حضرت علامہ مغفور کی مستقل تصانیف کے مطالعہ نے لکھنے والیوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جن کی مضمون نگاری آج طبقہ نسواں کے لئے باعث فخر ہے۔ ان مضامین کے علاوہ جو لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے نام سے شائع نہیں کئے حضرت علامہ مغفور نے مختلف انگریزی رسالوں کے متعدد مضامین کے ترجمے بھی کئے مگر لفظی ترجمے نہیں بلکہ انگریزی مضمونوں کا مفہوم اپنی زبان میں اس طرح ادا فرمایا کہ طبع زاد کا دھوکہ ہوتا ہے ان مضامین کا وہ حصہ جو عام ہندوستانی گھرانوں کے لئے کچھ زیادہ مفید نہ سمجھا جاتا تھا نظر انداز کر کے ان مغربی خیالات کو اردو میں ادا کیا جاتا تھا جو مشرقی لڑکیوں کے لئے مفید ہو سکتے تھے۔ یہ مضامین خانہ داری اور پرورش اطفال پر بھی ہیں اور معاشرت و تاریخ پر بھی اور ادب لطیف اور مختصر نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔

عصمت کو مستورات کے لئے کیا کیا کام کرنے تھے اور شریف ہندوستانی بیبیوں کے لئے کس قسم کے مضامین کی اس کی رائے میں ضرورت تھی اس کے متعلق یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ کسی مضمون کا نہیں بلکہ حضرت علامہ مغفور کے لکھے ہوئے ایک اشتہار کا اقتباس دیدیا جائے جو سنہ۹ء سے کئی سال تک دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔

"خواتین کی واسطے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گذارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب۔ بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انھیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں ان کو پیش آئینگی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی۔ عصمت انھیں بتائے گا کہ جس آمدنی کو بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کر دیئے ہیں ان کی ذمہ داریاں

ان پر کیا کیا ہیں۔ عصمت بتائے گا کہ انھیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کا مصرف کیا ہے۔ خاندان کے ساتھ کس طرح بسر کرنی ہے۔"

یہ اقتباس ایک کسوٹی ہے جس پر عصمت کے دور اول ہی کو نہیں دور موجودہ کو بھی جس میں عصمت کا معیار بہت کچھ بلند ہو چکا ہے بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں قل آعوذیوں اور دنیا نوسیوں کی ہیں یا حقیقتاً ان ہی جوہروں کی ہندوستانی بیگموں کو ضرورت ہے اسپر بحث نہیں ہے، کہنا صرف یہ ہے کہ صحیح تھا یا غلط بہرحال یہ تھا وہ کام جو عصمت کو انجام دینا تھا اور اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا اسکا بہترین جواب ناظرین و ناظرات عصمت دے سکتے ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں مجھے بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ عصمت کے مضامین نے ہندوستانی گھرانوں میں ایک انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں کو اپنے فرائض کا احساس ہونے لگا اور عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کا دل پسیجنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں عصمت نے تعلیم نسواں کی حمایت، معاشرتی خرابیوں کی اصلاح، سلیقہ شعاری، ہنرمندی، انتظام خانہ داری، بچوں کی پرورش غرض فرائض اور حقوق، مذہب اور اخلاق تاریخ اور معلومات معاشرت اور تمدن پر بعض ایسے ایسے معرکتہ الآرا مضامین ایسے ایسے سبق آموز مؤثر افسانے اور ایسی ایسی معنی خیز، درد بھری نظمیں شائع کی ہیں جو اب تک پڑھنے والیوں کے ذہن سے فراموش نہ ہوئی ہونگی۔ مرحومہ خجستہ اختر بانو سہروردی (شائستہ اختر صاحبہ سہروردی کی پھوپی) مرحومہ امیر النسا بیگم اے ایچ فیضی (زہرہ بیگم صاحبہ فیضی کی والدہ) مرحومہ رضیہ مسعود الحسن۔ مرحومہ سید وپٹنہ۔ مرحومہ ر۔ ب امداد حسین۔ مرحومہ مسز نواب خدیو جنگ مرحومہ۔ زاہدہ خاتون شروانیہ (ز۔ خ۔ ش) اور مرحومات ہر ہائینس بیگم بھوپال، بیگم جنشان، بیگم سپین عباسی بیگم، کو دنیا سے اُٹھے برسوں گذر چکے مگر یہ وہ بیبیاں تھیں جنہوں نے چمن عصمت میں ایسے ایسے گل ہائے صدا بہار کھلائے ہیں جو آج بھی دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔ محترمات نذر سجاد حیدر۔ زہرہ فیضی۔ عطیہ فیضی۔ صغرا ہمایوں مرزا۔ سلطانہ بیگم۔ بیگم شیخ عبداللہ۔ برج کماری نرندر ناتھ۔ اور حامدہ بیگم عصمت کے اس زریں دور کے مضمون نگاروں کی یادگار بس یہ گنتی کی چند بیبیاں رہ گئی ہیں جن میں سے اکثر اب تک عصمت کی قلمی اعانت اسی مستعدی اور استقلال کے ساتھ کر رہی ہیں۔ اس زمانہ میں باوجودیکہ خواتین کے مطلب کے مضامین لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم۔ مولانا حالی مرحوم منشی ذکاء اللہ مرحوم۔ حکیم اجمل خاں مرحوم۔ خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم۔ مولوی سید احمد مرحوم، عزیز لکھنوی مرحوم، آنجہانی سرور جہان آبادی آنجہانی نانک رام شاد بجاڑیہ، مرحوم شوق قدوائی۔ شیخ عبدالقادر صاحب خواجہ حسن نظامی صاحب۔ سید راحت حسین صاحب۔ پروفیسر زاہدی۔ منشی تلوک چند محروم، خواجہ دل محمد، خواجہ عشرت لکھنوی۔ اور مولانا عرشی دہلوی کے مضامین اور نظمیں عصمت کے شاندار ماضی کی یاد دلا رہی ہیں۔

عصمت کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کنواری لڑکیوں اور بیاہی عورتوں کے مطلب کی کتابیں شائع کرے، اس مقصد میں بھی عصمت کو کامیابی ہوئی اور دوسرے ہی سال سے مفید کتابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عصمت کی اشاعت کا دوسرا سال ختم نہ ہوا تھا کہ شیخ عبدالقادر صاحب نے مخزن کو لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اور شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹری کے لئے لندن روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تو عصمت کے جاری رہنے کی صرف ایک صورت تھی کہ حضرت والد مغفور ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کریں چنانچہ انھوں نے یہی کیا اور چودہ پندرہ برس کی سرکاری ملازمت عصمت پر قربان کر دی۔

خریداروں کو سالانہ چندہ کے معاوضہ میں جو پرچہ مل رہا تھا اس میں مضامین بھی بہت عمدہ ہوتے تھے، خوبصورت بھی تھا۔ باتصویر بھی اور اشاعت بھی قریب قریب وقت پر ہو رہی تھی، لیکن عصمت کی مالی حالت ناقابل اطمینان تھی، ستمبر ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں

اُس وقت کے عصمت کے متعلق حضرت والد مغفور نے تحریر فرمایا تھا۔

"اس کے دَورِ اولیں میں بھی جب میں اور شیخ محمد اکرام صاحب متفقہ کوشش کر رہے تھے اس کی اشاعت آٹھ سو سے زیادہ نہ تھی اور جب شیخ صاحب اس کے سپید و سیاہ کی تمام ذمہ داری میرے سر پر رکھ کر ولایت چلے گئے تو آمدنی کے مقابلہ میں اخراجات اسقدر زیادہ تھے کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میرا آبائی مکان اسکی نذر ہوا مگر تا بکے۔ یہ کوشش بھی کارگر نہ ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دو دو تین تین ماہ بعد پرچہ شائع ہونے لگا۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ خریدار گھٹ گھٹا کر چار ساڑھے چار سو رہ گئے۔ میں اپنی طرف سے پرچہ کو ختم کر چکا تھا کہ رازق میاں کا نکاح ہو گیا۔"

عصمت کی جو حالت آخری دو سطروں میں بیان فرمائی تھی وہ ۱۹۱۵ء کے بعد دورِ دوم کے آخری دو سال ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کی تھی مگر ابھی ۱۹۱۵ء سے پہلے کی کئی باتیں بیان کرنی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ۔ تمدن کی داستان

تمدن ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۵ء تک کے عصمت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورتوں کے فرائض پر ہر پرچہ میں متعدد مضامین شائع کئے گئے تھے، ماؤں اور بیٹیوں ساسوں اور بہوؤں نندوں اور بھاوجوں کے حقوق اور فرائض پر اس دور کے عصمت میں طبقہ نسواں کے محسن اعظم کے ایسے ایسے درد انگیز مضامین شایع ہوئے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر دل کٹ کٹ جاتا ہے۔ البتہ حقوق نسواں پر اس زمانہ کے پرچوں میں بہت کم مضامین شایع ہوئے تھے اس وجہ سے کہ حضرت مصور غم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے مضامین کے لئے مردانہ رسالے موزوں تھے۔ اور زنانہ رسالوں میں لڑکیوں کے سامنے لڑکیوں کی حمایت لینا مناسب نہ تھا چنانچہ نومبر ۱۹۱۵ء کے عصمت میں تحریر فرمایا تھا:۔

"عصمت نے شروع سے تقریباً چار سال تک ملک اور قوم کی جو خدمت کی اس کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی دلچسپی سے ہزاروں دل فتح کر لئے۔ ایک دُنیا اس کی مداح تھی اور ہندوستان کے زنانہ پرچوں میں سب سے بہتر تھا۔ وہ لڑکیوں ہی میں ہر دلعزیز نہ تھا بلکہ مرد بھی اس کے گرویدہ تھے۔ میری طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں بیویوں کو آزادی اور حریت کی ترغیب دوں۔ خود لکھنا تو درکنار میں نے دوسروں کے مضامین بھی عصمت میں شایع کرنے سے پرہیز کیا جو بغاوت پیدا کریں اور لڑکیوں کو اپنے حقوق کی طلبی پر آمادہ کریں۔ گو زمانہ کی رفتار مجھکو اجازت نہ دیتی تھی مگر میرا دل مجھکو ملامت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کمبخت یہی بیچاریاں اطاعت اور فرماں برداری کے لئے پیدا کیگئی ہیں یا ان مظلوموں کے بھی کچھ حقوق مردوں کی ذات پر ہیں، میں اپنی کمزوری پر نادم تو ضرور تھا مگر یہ نہ چاہتا تھا کہ لڑکیوں کی حمایت ان کے منہ در منہ لیکر ان کو شیر کردوں مگر دل کی آگ کسی طرح نہ بجھتی تھی اور ضمیر کہتا تھا کہ بے ایمانی نہ کرو۔"

اس خیال کو جنوری ۱۹۲۶ء کے عصمت میں بھی ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا:۔

"زنانہ پرچے میں لڑکیوں کے سامنے ان کے حقوق کی حمایت کمزور کو شہ دے کر پٹوانا ہے لڑکیوں کے سامنے انھیں حقوق کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جو مردوں کے انکی ذات پر عاید ہو رہے ہیں۔ ان کے حقوق کا مطالبہ مردانہ پرچوں میں مناسب ہوگا۔"

المختصر حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ رسالہ کی ضرورت وہ پوری طرح محسوس فرما رہے تھے، مگر سب سے بڑا مسئلہ روپیہ کا تھا مخزن پریس لاہور جا چکا تھا اور دو دو پرچوں کے لئے اپنا پریس ہو جانے میں زیادہ سہولت تھی لیکن پریس کے لیے سرکاری خزانہ میں نقد روپیہ بطور ضمانت داخل کرنا ضروری تھا، دادی اماں مرحومہ اور والدہ معظمہ کا کئی ہزار کا زیور اور ایک مکان عصمت کی نذر ہو چکا تھا اور تمدن کے

لے گیا تمدن پریس کے لئے بھی اب اتنا روپیہ پاس نہ تھا جو کافی ہوتا۔ دو متضاد کیفیتوں کی کشمکش تھی، حقوق نسواں کی حمایت کا جذبہ اور بزرگوں کی اُس نشانی کی حفاظت کی ضرورت جہاں باپ دادا کے نال گڑے تھے۔ دل عورتوں کی زدہ حالت پر رو رہا تھا مگر دماغ مالی حالت خراب ہونے سے روک رہا تھا۔ ایمان کہتا تھا کہ ان مصیبت ماریوں کی حمایت میں جو کچھ بھی قربان ہو جائے وہ کم ہے مگر مشاہدات کو سامنے لا کر عقل بتا رہی تھی کہ خدمت نسواں کا یہ جذبہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کے افلاس کا سبب نہ بن جائے، دل و دماغ کی اس جنگ میں بالآخر دل نے فتح پائی اور جو عظیم الشان آبائی مکان باقی رہ گیا تھا وہ تمدن پر قربان کر دیا گیا۔

اپریل ۱۹۱۱ء میں تمدن کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نقادانِ ادب کہہ اٹھے کہ مخزن کے لاہور جانے سے دلی کو جو نقصان پہنچا تھا، تمدن بہت خوبی کے ساتھ اس کی تلافی کرے گا۔ تمدن نے پہلے ہی سال میں ملک کے مایۂ ناز اہل قلم کی اعانت حاصل کر لی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم، منشی ذکاء اللہ مرحوم، مولانا حالی مرحوم، مولانا شبلی مرحوم، مولوی سید احمد مرحوم مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی احمد علی شوق قدوائی مرحوم لکھنوی، مولانا شاد مرحوم عظیم آبادی، مولانا عزیز مرحوم لکھنوی، قاری سرفراز حسین مرحوم، مولوی اشرف حسین مرحوم، حکیم ناصر نذیر فراق مرحوم، سید رؤف علی بیرسٹر مرحوم، ڈاکٹر مشرف الحق مرحوم، مولانا طباطبائی مرحوم، شہزادہ مرزا محمد اشرف جہاں گورگانی آہ! آسمان ادب کے کیسے کیسے درخشندہ ستارے تھے جو بساطِ تمدن پر اپنی بہار دکھا کر ڈوب گئے۔ جس پرچے کو ایسے ایسے باکمال مستقل مضمون نگار میسر تھے اس کی کامیابی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن صرف سوچئے کہ تمدن نے اپنے سب سے بڑے مقصد حقوق نسواں پر مسلمان مردوں کو متوجہ کرنے کی کوشش پیش نظر رکھی، جہاں تمدن کے بلند معیارِ علمی و ادبی مضامین پر واہ واہ ہوئی۔ وہاں حقوق نسواں کا مطالبہ ایک پھانس تھی جو "تمدن، کے قدر دانوں" کے دلوں میں کھٹکتی رہی اور اس لئے اور صرف اس لئے تمدن بجائے وہ مقبولیت حاصل کرنے کے جسکا باعتبارِ ادب وہ مستحق تھا، اُن لوگوں کی نگاہ میں بھی، جو بانیٔ تمدن کی تحریر کے مداح تھے، مردود بنا، مالی مشکلات کا ہر ہر قدم پر دو سال تک سامنا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں پرچے کی اشاعت میں بے قاعدگی شروع ہو گئی اور خریداروں کی تعداد میں اور بھی کمی ہونے لگی لیکن جس سر میں مسلمانوں سے مظلوم عورتوں کے شرعی حقوق دلوانے کی دُھن سمائی ہوئی تھی وہ باوجود مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اپنی کوششوں میں منہمک رہا، تمدن کی تھوڑی سی کہانی، بانیٔ تمدن ہی کی زبان سنئے:-

"حقوق نسواں کا جگر خراش افسانہ، جس نے راتوں کچوکے دئے اور دنوں تیر برسائے اور جو اس وقت تک کلیجہ مسوس رہا ہے پیش نظر تھا اور اب موت ہی ہے ایک چیز جو مظلوم بیویوں کے مصائب کا درد دل سے دور کرے گی۔ مبارک ہو گا وہ وقت جب جسد خاکی روح کو الوداع کہہ کر پیوند زمین ہو گا، مصیبت راحت ہو گی اور دُکھ سُکھ سے بدلے گا۔ ظالم شوہروں کی حکومت سے قبر کی میٹھی نیند میں دل نا آشنا ہو گا اور مسلمانوں کے غصب حقوق کے اخبار، عالم ممات میں کان تک نہ پہونچیں گے مگر موجودہ طرز معاشرت کی پھانس جسکا ہر لمحہ اسلام کا مضحکہ اُڑا رہا ہے تادم واپسیں سینہ میں کھٹکے گی۔

یہی تھی وہ خلش جو تمدن کو عدم سے وجود میں لائی اور مالی و جانی، جسمانی و روحانی دنیا بھر کی تکالیف کا انبار سر پر رکھ گئی گو مدتوں کا تجربہ کمر ہمت توڑ رہا تھا ناکامی کی تصویریں قدم قدم پر تھیں۔ حقوق نسواں کا مطالبہ زہر دے کر شہد لینے کی توقع تھی لیکن دل کبھی کبھی یہ صدا بھی دیتا تھا کہ بہنوں کے بھائی اور بیٹیوں کے باپ ہم آہنگ ہو کر ہاتھ بٹائیں گے اور خدا کی ہزارہا مخلوق میں چند صورتیں ایسی بھی نکلیں گی جو نرم نرم تکیوں اور گرم گرم بچھونوں پر لیٹ کر شاید ان مصیبت ماریوں پر بھی دو آنسو بہالیں جو جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں پھٹے ہوئے گودڑوں میں گذار رہی ہیں۔ بھرے پُرے گھروں کی بیٹیاں اور اللہ آمین کی بچیاں جن کے قدموں کے نیچے بیسیوں آنکھیں بچھاتے تھے اپنوں سے کوسوں دور

مصیبت کی زندگی بسر کر رہی ہیں، مسلمانوں نے ان بیگموں کو لونڈیاں بنا دیا اور ان بدنصیبوں کو اتنا حق بھی نہ دیا کہ زبان سے اُف کر سکیں ..... جن کی گھٹیوں میں حکومت کا چسکا اور جن کی آنکھوں پر خود غرضی کا پردہ پڑا ہوا تھا ان کے پتھر دلوں تک فریاد پہونچانے کی یہی صورت تھی کہ انکی دلچسپی کے سامان فراہم ہوتے، بزمِ عیش منعقد ہوتی ..... اسی محفل میں کوئی بھولا بھٹکا فریادی اپنی بپتا بھی کان میں ڈالنی شروع کر دیتا اور یہ سمجھتا کہ یہ بیج ایک نہ ایک دن پھل لائیں گے اور یہ گریہ وزاری خالی نہ جائے گی۔ اور یہ سلسلہ آہ و بکا جاری رہا تو اسی خاک سے ایسے لوگ بھی اُٹھینگے جو مظلوم کی آہ سے لرز اُٹھیں گے۔

تمدن اسی اُصول پر جاری ہوا اور گل و بلبل کی چاشنی دے کر اپنا کام انجام دیتا رہا۔" تمدن مارچ ۱۳ء

حامیانِ حقوقِ نسواں اب تو ہر شہر میں کچھ نہ کچھ نکل آئیں گے۔ مگر جب تک یہی تڑپ نہ ہوگی دو سطریں بھی اس رنگ کی نہیں لکھی جا سکتیں، وہ جو ازل ہی سے مسلمان عورت کے غصب کردہ حقوق کا حقیقی درد لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے انھوں نے آج سے قریباً چوتھائی صدی قبل مطالبہ حقوقِ نسواں پر دل کے یہ آنسو اور تمدن پر گرائے تھے آج آزادیٔ نسواں کا غلغلہ ہے اسوقت حقوقِ نسواں کا مطالبہ کرنے والا کافر اور مردود تھا، بدتر سے بدتر الفاظ کا خلعت انکی اس قوم نے جس پر وہ قربان تھے انھیں عطا کیا، لیکن ان کی ذات تک یہ عنایتیں محدود ہوتیں تو بھی غنیمت تھیں تمدن کو اپنی دُھن سے باز رکھنے میں کوئی امکانی کوشش چھوڑی نہ گئی۔

"ان پریشانیوں کا خاتمہ ہوا، اب آنکھ کھلی تو عجب سماں دیکھا، تمدن، حیرت سے ایک ایک خریدار کا منہ تک رہا تھا جن سے بہت کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں وہ بھی منہ پھیر رہے تھے ..... آنکھ یہ نیرنگیاں بہت سی دیکھ چکی اور اب خواب بدی کی منتظر ہے دل خوشی اور رنج کے بہت سودے کر چکا اور اب سکون مستقل کا جویا ہے مگر دماغ جب تک کام کے قابل ہے اپنے خبط میں منہمک رہیگا اور اس سے پہلے کہ تمدن ان ارمانوں کو پورا کرے اگر کان یہ سُن لیں کہ تمدن کی فریاد نے ایک عورت کی بھی زندگی سنوار دی تو عمر بھر کی محنت ٹھکانے لگی ..... مگر دل اس خیال سے باغ باغ ہے کہ ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب یہ خون اپنا رنگ لائے گا یہ بیج بار آور ہونگے اور ہماری مظلوم بیبیاں اپنے گھروں میں سچ مچ کی ملکہ ہونگی۔" تمدن مارچ ۱۳ء

تمدن کی اشاعت پہلے ہی سال میں بارہ سو تک پہنچ گئی تھی اور عصمت اسوقت نو سو چھپ رہا تھا تمدن کا ادبی معیار کافی بلند تھا اگر حقوقِ نسواں کی حفاظت و حمایت تمدن کا مقصد اولیں نہ ہوتا تو شروع سے آخر تک اس کے مضامین اسقدر دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہوتے تھے کہ اگر اس کی اشاعت دو ڈھائی ہزار بھی ہو جاتی تو تعجب انگیز نہ ہو سکتی تھی، پہلا سال پھر غنیمت تھا مگر خریداروں پر اچھی طرح روشن ہو گیا تھا کہ تمدن ہماری حکومت کمزور کرنے کے لیۓ جاری کیا گیا اور ہمارے عیش و آرام میں خلل ڈالنے کے لئے وجود میں آیا ہے خریداروں کی تعداد دوسرے ہی سال سے گھٹنی شروع ہوئی حالانکہ تمدن کا دوسرا سال بھی اور تیسرا سال بھی باعتبار مضامین پہلے سال سے زیادہ کامیاب تھا۔ خریداروں کی تعداد کا ماہ بماہ گرنا بے قاعدگی کا سبب بنی اب عصمت کا بے قاعدگی کی لپیٹ میں آنا لازمی اور ضروری تھا یہاں تک کہ ۱۳ء کے آخر میں دونوں پرچوں کی اشاعت ساڑھے سات سات سو رہ گئی۔ ۱۴ء میں اشاعت اور گری اور حقوقِ نسواں کی حمایت پر چاروں طرف سے لعن طعن بدستور ہوتی رہی مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ان کے استقلال اور استقامت میں فرق نہ آیا۔ اس موقعہ پر ایک اقتباس اس "معذرت" کا بھی دیتا ہوں جو فروری ۱۴ء میں لکھی گئی اور تاخیر

اشاعت کے سبب دسمبر ۱۳ء کے پرچہ میں شائع ہوئی تھی:۔

"۔۔۔ مگر کیا کیا جائے تمدن کی توقعات پوری نہ ہوئیں اور صرف اس وجہ سے کہ وہ حقوق نسواں کا مطالبہ کرتا ہے عزیز نہ ہوسکا، رفتار زمانہ متقاضی ہے کہ اب تمدن اس خیال کو دُور کرے وقت کا ساتھ دے اور اپنے کام سے کام رکھے مگر ان معصوم بچیوں کی تصویر آنکھ کے سامنے ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جنکی مصیبت ناک زندگی پر در و دیوار رو رہے ہیں۔ جو میکے میں ناز و نعم سے پلیں اور سسرال پہونچتے ہی بے دام کی غلام بن گئیں، سوکن کا جلاپا، ساس نندوں کے طعنے، شوہر کی حکومت، کس کس کا رونا رویا جائے، ایک نہیں سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ایسی موجود ہیں جن کے نازک دل شادی نے چھلنی کر دیے، طرّہ یہ کہ اگر ایک مردانہ پرچہ حقوق نسواں کی آواز منہ سے نکالے تو لوگ اسکا گلا گھونٹنے کو تیار ہو جائیں"۔ "شہید مغرب" کے نام سے جو مضمون لکھا گیا اس میں حقوق نسواں کے متعلق جو الفاظ اس قلم سے نکلے اور ان پر جو کچھ شورش ہو رہی ہے اسکو دیکھ کر خدا کی شان یاد آتی ہے۔ جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا تھا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرینگی جیسا مرد اُن کے ساتھ۔ آج اس کے پیرو ایسے شخص کو جو صرف ان حقوق کا مطالبہ کرتا ہے جو شرع اسلام نے عطا کئے **مار ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں**۔"

گالیاں تو مل ہی رہی تھیں اب مار ڈالنے کی بھی دھمکیاں دی جانے لگیں روحانی اذیت بھی ہو رہی تھی اور مالی نقصانات بھی حد کو پہنچ چکے تھے مگر جو لگن دل میں لگ رہی تھی وہ بدستور لگی رہی یہاں تک کہ ۱۵ء شروع ہوا تو تمدن کے خریدار ڈہائی سو سے زیادہ نہ رہے تھے، ترقی کے مواقع اب بھی موجود تھے، عارضی طور پر ہی اگر رنگ بدل دیتے تو تمدن پھر عصمت سے آگے نکل جاتا لیکن پرچہ کا بند ہو جانا اور اس کے ساتھ بہت سی امنگیں بہت سی آرزوئیں جو اجرا تمدن کے وقت دل میں پیدا ہوئی تھیں ان کا جنازہ نکل جانا اس سے بہتر تھا کہ وہ تمدن کی روش بدل دیتے۔ ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر رہے تھے مگر پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی، اسی حالت میں تمدن نکل رہا تھا کہ انکے بچپن کے نہایت عزیز دوست قاری سرفراز حسین صاحب مرحوم کے خلف اکبر بھائی عباس حسین قاری نے ضد کی کہ تمدن انھیں دیدیا جائے۔ مروت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، دوسروں کی پاسداری اور لحاظ قدرت نے اس درجہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا کہ کسی کی بات رد نہ فرماتے تھے اور کسی کی دل آزاری ان سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ دوسروں کے فائدے کے سامنے اپنا نقصان تک بھول جاتے تھے ایک دو نہیں درجنوں کتابیں جن کے اوپر تلے کئی کئی ایڈیشن شائع کر کے لوگوں نے ہزاروں روپیہ کمائے محض مروت میں دیدیں۔ تمدن کی اشاعت لاکھ گر گئی تھی لیکن اس پر ہزاروں روپیہ لٹایا تھا۔ خون جگر سے اسے سینچ رہے تھے اور بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں۔ اس کی علیحدگی معمولی بات نہ تھی۔ مگر جب قاری صاحب نے یقین دلایا کہ تمدن اپنے اصلی مقصد یعنی حقوق نسواں سے غافل نہ رہیگا تو رضامند ہو گئے۔

"میں نے تمدن پر جس قدر محنت کی ہے میرا ہی دل جانتا ہے مشکل تھا کہ میں اسکو جدا کر دں مگر بالک ہٹ میرے ارادوں پر غالب آگئی اور میاں عباس آج تمدن لئے لکھنو براج رہے ہیں"۔ ناظرین تمدن سے مجھے اُمید ہے وہ عزیز عباس سلمہٗ کو مجھ سے زیادہ مدد دینگے تاکہ وہ زبان اُردو اور حقوق نسواں کی معقول خدمت کے قابل ہو"

تمدن جولائی ۱۵ء

تمدن کی علیحدگی کا ایک اور بھی سبب تھا:۔

"گذشتہ دو سال میں عصمت و تمدن دونوں پرچوں کی مصروفیت نے مجھکو اس قابل نہ رکھا کہ میں دوسرے کام کی

طرف توجہ کرسکتا۔ کئی کتابیں جن میں سیدۃ النساء (الزہرا) خصوصیت سے قابل ذکر ہے ادھوری رہ گئیں"

تمدن کی رخصت اور عصمت کے مستقبل کے متعلق نومبر ۱۵ء کے عصمت میں جو مضمون تحریر فرمایا تھا اسکا ایک حصہ بھی تمدن کی کہانی ختم کرنے سے قبل نقل کردینا ضروری ہے:۔

"تمدن پہلا مردانہ پرچہ تھا جس نے حقوق نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اسوقت کوئی مردانہ پرچہ حقوق نسواں کا حامی قوم میں موجود نہ تھا اور مجھے یقین کامل ہے کہ آیندہ بھی دس بیس برس تک موجود نہ ہوگا۔ تمدن کا شائع ہونا تھا کہ مجھ پر چاروں طرف سے لعن طعن شروع ہوئی ہیں نے اپنی طرف سے منت سماجت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ رو رو کر کہا۔ گڑگڑا کر عرض کیا کہ بیٹوں کے باپ بہنوں کے بھائی۔ ماؤں کے بیٹے۔ قوم کی بچیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھیں مگر حقوق نسواں کی حمایت ایسا گناہ کبیرہ تھا کہ میرا قصور معاف نہ ہوسکا۔ یہ میری غلطی ہی سہی کہ میں نے تمدن کے آخری سانس تک اپنی بدنصیب بہنوں کی ہمدردی نہ چھوڑی مگر مجھکو چار برس میں چار شخصوں کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو تمدن کے وجود کو ضروری سمجھتا نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت کی آمدنی تمدن پر صرف ہوئی وہ کافی نہ ہوئی تو جو کچھ میرے پاس رہ گیا تھا وہ بھی تمدن کی نذر ہوا ...... مجھ پر اس چار برس میں کیا گذری اس کے بیان کی ضرورت نہیں مگر اپنی بہنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عصمت کی تاخیر اشاعت میں بے گناہ ہوں ...... میں اپنی محترم بہنوں اور بچیوں سے اِلتجا کرتا ہوں خواہ ان کو ایک خریدار بھی میسر نہ ہو مگر وہ حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں۔"

خدا کی بے شمار رحمتوں کے پھول حضرت علامہ مغفور کے مزار مقدس پر برستے رہیں انکی پیشین گوئی صحیح نکلی جس طرح تمدن سے پہلے حقوق نسواں کے لئے کوئی مردانہ پرچہ جاری نہ ہوا تھا اسی طرح دس کیا بیس سال گذر گئے تمدن کی علیحدگی کے بعد بھی کوئی مردانہ پرچہ صرف اس مقصد کو لے کر نہ نکلا۔ تمدن کو رخصت فرمانے کے بعد انھوں نے خواتین کو مشورہ دیا تھا کہ

"خواہ کچھ ہو حقوق نسواں کی حمایت میں ایک مردانہ پرچہ ضرور جاری رکھیں"

مجھے اسوقت ٹھیک یاد نہیں کہ کب اور کس موقع پر مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ غالباً دس بارہ سال بعد یہی الفاظ پھر دہرائے تھے، کوئی اللہ کا بندہ آگے نہ بڑھا اور یوں تو ہر ہر قسم کے رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتے رہے مگر حقوق نسواں کے لئے کوئی مردانہ رسالہ نہ نکلا۔ گو میرے زمانہ ادارت سے حقوق نسواں پر ہر پرچہ میں کافی مضامین شائع ہورہے تھے۔ تاہم فرائض نسواں کے مقابلہ میں عصمت میں حقوق نسواں پر زیادہ زور نہ دیا جاتا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ دو مسئلے جلد سے جلد طے ہوجائیں جن کی ضرورت پر پہلے بھی دو ایک دفعہ خصوصیت کے ساتھ خواتین کو متوجہ کیا تھا۔

"میں ناظرین عصمت کو دو نہایت ضروری باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز خلع ہے۔ اور دوسری چیز ان بدبخت لڑکیوں کے حقوق کا مطالبہ جو ترکۂ پدری سے محروم کردی گئی ہیں۔ مجھے اُمید ہے ۲۰ء میں عصمت ان دونوں مسئلوں پر پوری توجہ کرے گا اور مبارک ہوگا وہ وقت جب مسلمان عورت یہ دونوں حقوق حاصل کرلے گی۔ میں مسلمانوں کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ارتداد کا اصلی علاج کرنا چاہتے ہیں تو مسئلہ خلع پر توجہ کریں۔"

عصمت جنوری ۲۰ء

غرض علیحدگی تمدن کے بعد بیس سال گذر گئے اور حقوق نسواں کا مقصد لے کر کوئی مردانہ رسالہ نہ نکلا تو دنیا سے تشریف لے جانے کے لئے بیمار پڑنے سے دس بارہ روز قبل نومبر ۳۵ء کی ابتدائی تاریخوں میں اس موضوع پر مجھ سے گفتگو فرمائی اور میں تمدن

ہی کو جاری کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ قاری عباس حسین صاحب اسوقت حیدر آباد دکن کے اخبار پیام میں کام کر رہے تھے انہیں خط لکھا۔ وہ دسمبر میں دہلی آئے اُنسے تمدن کے حقوق رجسٹر وغیرہ لئے مگر اس سے پہلے کہ تمدن کا اعلان کیا جاتا بانیٔ تمدن کا سایہ ان بدنصیب خواتین ہند کے سر سے اُٹھ گیا جن کے حقوق کی حفاظت اور حمایت میں تمدن پھر جاری کیا جا رہا تھا۔

عصمت کی تاریخ میں تمدن کا مفصل ذکر ایک نہایت اہم باب تھا جس کی رخصت کے ساتھ عصمت کا دور اول بھی ختم ہوگیا۔

دوسرا دور (۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک)

تمدن کی رخصت کے بعد حضرت والد مغفور نے پھر عصمت پر توجہ فرمانی شروع کی۔ مگر ابھی پرچہ اپنی اصلی شان پر نہ پہنچا تھا کہ لڑکیوں کے لئے ہفتہ وار رسالہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے "سہیلی" جاری فرمایا عصمت کے خریداروں کی تعداد ترقی کر رہی تھی بے قاعدگی اشاعت بھی جاتی رہی تھی اور سہیلی بھی مقبول ہو رہا تھا کہ عصمت پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔

۱۶ء کی آتشزدگی

مارچ ۱۹۱۶ء میں دفتر میں اس غضب کی آگ لگی کہ آٹھ سال کا سارا سرمایہ جل کر راکھ ہوگیا۔

"خدا کی مرضی ہماری کوششوں پر غالب تھی مارچ کا پرچہ مکمل ہو چکا تھا کہ رات کے ابتدائی حصہ میں آگ لگی اور تمام کوشش اور سرمایہ جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ آنکھیں تمام محنت برباد ہوتے دیکھ رہی تھیں مگر دل مشیت ایزدی پر صبر کر رہا تھا اس نقصان نے کمر ہمت توڑ دی تھی اور بظاہر اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی نہ اُمید ہے کہ ہوگی مگر بندے کا کام کوشش ہے اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھ" (عصمت مارچ ۱۹۱۶ء)

جنگ عظیم کا اثر

سہیلی بند ہوا۔ کتب خانہ ختم ہوا۔ اور بڑے بڑے قیمتی مسودے راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہ رہے۔ ادھر آتشزدگی نے ہوش اُڑا دئے تھے اودھر جنگ عظیم کی وجہ سے کاغذ کی قیمت پر آگ پڑ رہی تھی۔ بڑے اچھے اچھے کامیاب سے کامیاب پرچے کاغذ اور دوسرے سامان طباعت کی گرانی نے بٹھا دئے تھے۔ ہندوستان ہی نہیں ولایت کے اخبارات تک چیخ اُٹھے تھے۔

"کاغذ کی قیمت جو آندھی اور مینہ کی طرح بڑھ رہی ہے بیسوں اخباروں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر چکی جو باقی ہیں ان میں سے بھی بعض دم توڑ رہے ہیں عصمت کے واسطے اسوقت دوہری مصیبت کا سامنا ہے ادھر آگ نے مدتوں کا سرمایہ جلا کر خاک کر دیا ادھر کاغذ کی گرانی دیکھ کر ہوش اُڑے جاتے ہیں" (عصمت مئی ۱۹۱۶ء)

۱۶ء کی حالت

عصمت کا پنپنا بظاہر مشکل تھا مگر خدا کی مدد شامل حال تھی۔ دو دو ماہ کا اکٹھا پرچہ شائع ہو رہا تھا اور وہ بھی بہت معمولی کاغذ پر۔ خریداروں کو سالانہ چندے کے وی پی گئے تو آدھے سے زیادہ واپس آئے۔ کاغذ کی گرانی سے ہندوستانی پرچوں میں کسی نے چندے بڑھائے کسی نے کاغذ فنڈ کھولا مگر عصمت نے آتشزدگی اور گرانی کاغذ کے سبب خریداروں کو کوئی مالی تکلیف نہ دی البتہ ان سے یہ توقع تھی کہ اس کی ۸ سالہ خدمات خریدار فراموش نہ کرینگے لیکن وی کی واپسیوں نے اس توقع کو بھی جھوجھر کر دیا۔ المختصر ۱۹۱۶ء میں خریدار ۳۰۰ بھی نہ رہے اور جو رہے تھے وہ بھی عصمت کی بے قاعدگی اشاعت اور خراب کاغذ کی وجہ سے خوش نہ تھے۔ عصمت کے لئے ۱۹۱۶ء نہایت منحوس سال تھا۔ پرچہ شائع کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی تو آمدنی ضرورتوں کے لئے کسی طرح بھی کافی نہ تھی۔ کاتب کو لکھنے کے لئے پرچہ دیا جاتا تو مضامین ہونے چاہئے تھے وہ نہ تھے

لیکن خدا کو اس پرچہ سے بہت کچھ کام لینا تھا، روپیہ کا بھی انتظام ہوا اور مضامین کا بھی۔ اب وہ زمانہ تھا کہ میں کچھ ہوشیار ہو گیا تھا تعلیم اور کھیل سے جو وقت بچتا عصمت پر صرف کرتا تھا۔ آہ ۱۹۱۶ء کے وہ دن آنکھوں میں پھر رہے ہیں کہ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابا جان پلنگ پر لیٹے حقہ پی رہے اور مضمون پر مضمون لکھوا رہے ہیں، انکے مخصوص رنگ کے مضامین تو بہت کم ہوتے تھے مگر معمولی سے معمولی مضمونوں میں جو انھوں نے اپنے نام سے شائع نہیں کئے فقرے کے فقرے بہت موثر تھے۔
انکی وہ خفگی بھی یاد ہے کہ کوئی لفظ میں نے اچھی طرح نہیں سُنا یا سمجھ میں نہیں آیا تو فرماتے "بس تو رکھ دو قلم۔ میں خود لکھ لونگا۔ تمہیں کس جاہل نے جماعت چڑھا دیا کہ معمولی سا لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے سنو اس کے بعد لکھو" اور اگر کوئی لفظ مجھے معلوم نہ ہوتا اور انکی زبان سے نکلتے ہی میں پوچھنے لگتا کہ "اس کے کیا معنی ہوئے" تو فرماتے پہلے مضمون ختم کر لو پھر جو پوچھو گے بتاؤنگا جب بڑے ہو گے اور لکھو گے اسوقت معلوم ہوگا کہ اس طرح بار بار سوال کرنے سے خیالات بٹ جاتے ہیں۔ اب آگے کیا خاک لکھواؤں بس رکھ دو پھر لکھنا" اور پھر میں معافی مانگتا اور کہتا اچھا یہ مضمون تو ختم کروا دیجئے اور وہ مضمون ختم کرا دیتے" اس طرح کئی ماہ تک اور قریب قریب روز ہی کوئی نہ کوئی مضمون لکھواتے رہے۔

۱۹۱۷ء فروری ۱۹۱۷ء میں پرچہ کی اشاعت وقت پر آگئی اور اشاعت میں بھی ترقی ہونے لگی کہ انھوں نے تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا، کتابوں کا بہت معقول معاوضہ لیتے تھے، ۱۹۱۷ء میں کتابیں لکھنی شروع کیں تو نصف درجن سے زیادہ لکھ دیں انکی جو آمدنی ہوئی اسکا ایک بڑا حصہ عصمت پر صرف کیا گیا پرچہ بھی پابندی وقت سے شائع ہوتا رہا اشاعت میں غیر معمولی ترقی ہونی شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء جب رخصت ہوا تو عصمت بارہ سو چھپ رہا تھا۔

۱۹۱۸ء میں فروری ۱۹۱۸ء میں مسلم لیڈیز کانفرنس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تو اسکا ایک رزولیوشن یہ تھا کہ کوئی مسلمان عورت اپنی لڑکی کسی ایسے شخص کو نہ دے جس کی پہلی بیوی موجود ہو۔ سوکن کے جلاپے پر اور تعدد ازدواج کے خلاف حضرت والد مغفور سے زیادہ کسی شخص نے نہیں لکھا۔ فرمایا کرتے تھے اور کئی مضمون میں بھی لکھا تھا کہ مسلمان ایک کو تو دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی کھلا اور ڈھنگ کا کپڑا پہنا نہیں سکتے وہ دوسری شادی کس برتے پر کرنے کا خیال کر سکتے ہیں۔ کسی مضمون میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ دو دو اور تین تین نکاحوں کے لئے شرط ہے انصاف کی اور برابر کا سلوک فطرت انسان کے خلاف ہے کہ کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے، اور جو سنت نبوی فرما کر دوسرا نکاح کرتے ہیں اس کے متعلق بھی انکے یہ خیالات انکی تصانیف میں موجود ہیں کہ سرکار دو عالمؐ کے نکاح نفس کے غلبہ کی وجہ سے نہیں اسلام اور صرف اسلام کے لیئے کیئے گئے تھے۔

المختصر پہلی بیوی کی موجودگی میں مرد کا دوسرا نکاح وہ نہایت ہی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور پہلی بیوی کی خدمات کے بدترین معاوضہ سے تعبیر فرماتے تھے اب جو انھوں نے اس رزولیوشن کی سخت مخالفت کی تو تعلیم یافتہ خواتین کو بے انتہا تعجب ہوا کہ ہمارے وہ محسن جو قریباً چوتھائی صدی سے ہمارے حقوق کی حمایت میں مردوں سے لڑ رہے ہیں انھوں نے کس طرح ہماری بہتری کے ایک معاملہ کی مخالفت کر دی۔ غضب یہ ہوا تھا کہ اس جلسہ میں کچھ ہندو اور عیسائی عورتیں بھی موجود تھیں انھوں نے بھی خوش ہو ہو کر اور تالیاں بجا بجا کر اس تجویز کی تائید کی اخبارات میں یہ مفصل رُوداد پڑھ کر انھیں بہت رنج ہوا کہ مسلمان بیبیوں نے غیر مسلموں سے اسلام کا مضحکہ اُڑوایا۔ اسی کیفیت میں انھوں نے ایک نظم لکھی جو "صدائے راشد" کے عنوان سے مارچ ۱۹۱۸ء کے عصمت میں شائع ہوئی۔ اسی نظم کا شائع ہونا تھا کہ عصمت کی مخالفت کی دبی ہوئی چنگاریاں جن دلوں میں موجود تھیں وہ بھڑک اٹھیں،

تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کے پھولوں سے جو بیبیاں آراستہ تھیں انھیں شہ دے کر ابھارا گیا اور عورتوں کے محسن اعظم کی ترقی یافتہ عورتوں کی طرف سے مخالفت کی گئی، حضرت مغفور کا نو سال بعد جنوری ۱۹۲۷ء کے عصمت میں عصمت کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں اس کی چند سطریں یہاں نقل کرتا ہوں جس سے مذکورہ بالا رزولیوشن کی مخالفت کی وجہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی۔

"...... ایک دوسرا اعتراض عصمت پر یہ بھی ہے یہ خواہ عصمت پر سمجھنا چاہئے یا میری ذات پر کہ عصمت بھی اور میری تصانیف بھی لڑکیوں کو غلامی کی ترغیب دیتی ہیں، ایک زنانہ پرچہ میں میرے یا عصمت کے خلاف اس قسم کے مضامین شائع ہوئے تھے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ عصمت سخت سے سخت نقصان اٹھانے پر بھی دائرہ صداقت سے باہر نہ نکلا ناظرین عصمت کو وہ وقت یاد ہوگا جب لیڈیز کانفرنس نے کثرت ازدواج کے خلاف ۱۹۱۸ء میں رزولیوشن پاس کیا تو گو تمام زنانہ پرچے کانفرنس کے ہمنوا ہو گئے مگر عصمت نے باوجود اس کے کہ میں خود کثرت ازدواج کو مسلمانوں کے واسطے زہر سمجھتا ہوں اس رزولیوشن کی مخالفت اس واسطے کی کہ یہ نص قرآنی کے خلاف تھا۔"

حضرت علامہ مرحوم نے کیوں مخالفت کی تھی اسکا جواب انھیں کے الفاظ میں آپ ملاحظہ فرما چکیں ان سطروں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ

"عصمت سخت سے سخت نقصان اُٹھانے پر بھی دائرہ صداقت سے باہر نہ نکلا۔"

ان الفاظ کی صراحت اس موقعہ پر ضروری سمجھتا ہوں عصمت کو دس سال سے پیہم نقصانات ہی ہو رہے تھے ۱۹۱۸ء میں جو نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ ایک اسلامی ریاست سے عصمت کو سات آٹھ سال سے بہت معقول مالی مدد مل رہی تھی لیکن عصمت نے اس کے معاوضہ میں تعریفی مضامین کبھی شائع نہ کئے کچھ نوبوں بھی امداد کا مستحق نہ سمجھا جا رہا تھا، اُفتاد یہ آ کر پڑی کہ اس رزولیوشن سے چونکہ بالواسطہ یا بلا واسطہ انکا بھی کچھ نہ کچھ تعلق تھا اس رزولیوشن کی مخالفت انکی مخالفت سے تعبیر کی گئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت کو جو مالی مدد مل رہی تھی وہ بند کر دی گئی۔ دو تین روز بعد جب میں نے یہ حکم امتنائی پڑھا تو افسوس کرنے لگا حضرت العلامہ مغفور نے اس کی وجہ بیان فرمائی تو میں نے عرض کیا "آپ نے خواہ مخواہ مخالفت کی۔ بیٹھے بٹھائے یہ نقصان ہو گیا بہت ہنسے فرمایا "کیا انکے بھروسہ پر عصمت چل رہا ہے۔ روپیہ دینے والا تو خدا ہے عصمت غلط راستہ پر نہیں ہے۔ ایک دروازہ بند ہوا تو دس دروازے اور کھل جائیں گے۔"......

میں نے اپنے ابا جان کی روحانی قوت کے عجیب عجیب تماشے دیکھے ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس سے انکے کیسے معاملے ہوتے تھے۔ اسی سال کا ذکر ہے کہ خیال تھا نہ کوئی کوشش پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے اردو نصاب کی زبان کی تصحیح کا کام بھیج دیا۔ یہ شاید پانچ یا آٹھ کتابیں تھیں ابا جان کی یہ کچھ عادت ہی تھی کہ فرمائشی کاموں میں خواہ کتنے ہی ضروری ہوتے اور کتنا ہی معاوضہ ملتا۔ وقت بہت لگا دیتے تھے دو دن کا کام ہوتا تو مہینوں ٹالتے رہتے اور جب مجبور ہی ہو جاتے کہ پیچھا چھوٹنا ممکن نہیں اسوقت کرتے تھے اور جب شروع کر دیتے تو پھر بہت جلد ختم کر دیتے تھے ٹھیک یاد نہیں کہ دو مہینے لگے یا چار مہینے مگر جو کام کیا وہ آٹھ دن سے زیادہ کا نہ تھا اسکا جو معاوضہ انھوں نے لیا وہ اس مجموعی رقم سے بھی دوگنا تھا جو مذکورہ بالا ریاست سے سات سال میں عصمت کو ملی تھی!

۱۹۱۹ء کی آتش زدگی

۱۹۱۷ء میں عصمت خاصہ پنپ گیا تھا ۱۹۱۸ء میں حالت اور بہتر ہو گئی تھی، متواتر مصائب پریشانیوں اور کثیر مالی نقصانات کے سبب پرچہ کی ظاہری شان قایم نہ رہنے سے

جو نفاست پسند طبیعت رکھنے والی بہنیں عصمت سے ناخوش ہو گئی تھیں وہ پھر عصمت کی قدر افزائی فرما رہی تھیں کہ سنہ ۱۹ء میں پھر ایک آفت آئی۔ اب یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ پریسمین کی شرارت تھی یا کلیبہ کی غفلت کا نتیجہ کہ سر شام آگ لگی اور پریس سے چلکر نو بجے شب تک دفتر اور گودام تک پہنچی، اوسط درجہ کا کتب خانہ پھر قایم ہو چکا تھا وہ نذر آتش ہوا۔ کتابوں کے کئی مسودے تھے وہ راکھ کا ڈھیر ہوئے، پریس کا حقیقی معنوں میں خاتمہ ہو گیا۔ پرانے پرچوں کا قیمتی ذخیرہ جو پچھلی آتشزدگی سے اس لئے محفوظ رہ گیا تھا کہ علیحدہ جگہ محفوظ تھا وہ اور دفتر کا فرنیچر سب کچھ تباہ ہوا مگر اس حالت میں بھی ابا جان نے ہمت نہ ہاری، اور جس طرح ممکن ہوا پرچہ شائع کرتے رہے۔ جائداد، نقد روپیہ، زیور غرض انکے اور اماجان کے پاس جو کچھ بھی تھا سب اصلاح نسواں اور حقوق نسواں کے لئے عصمت و تمدن کی نذر کر چکے تھے، اب عصمت کو جاری رکھنے کے لیئے پھر کافی سرمایہ کی ضرورت تھی، طبیعت کی کیفیت یہ تھی کہ جم کر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتے تھے، تھوڑی دیر لکھا اور پھر ٹہلنے لگے یا کسی سے باتیں کرنے لگے، مگر اس زمانہ میں انھوں نے عصمت کی بہتری کے لیئے اپنی طبیعت پر جبر کر کے کتابوں پر کتابیں لکھ ڈالیں اور ان کے معاوضہ سے نیم مردہ عصمت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔

سنہ ۱۹ء کے بعد

یہ وہ زمانہ تھا کہ میں کالج میں پہنچ چکا تھا اور دفتر کا کچھ نہ کچھ کام کر رہا تھا، مضمون نگاروں کے خطوط کے جوابات بالعموم میں ہی لکھتا تھا مضمونوں کے انتخاب میں بھی میرا ہی دخل تھا، کتابت کی ہوئی کاپیاں بھی میں پڑھتا اور دفتر کے انتظام میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اور ابا جان (خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) عصمت کی مالی حالت درست کرنے کے لیئے نئی نئی کتابیں لکھ رہے تھے جو وقت وہ عصمت پر صرف فرماتے اس میں کتابیں لکھ کر خواتین کی بھی بہت زبردست خدمات انجام دیں، ادب اردو میں بھی بیش بہا اضافہ فرمایا اور عصمت کی مالی حالت بھی درست کر دی۔

اگست سنہ ۱۹ء سے عصمت کا کاغذ لکھائی چھپائی سب چیزیں پھر عمدہ ہونے لگیں، مضامین بھی زیادہ دلچسپ چھپنے لگے اور پرچہ بھی پابندی وقت سے شائع ہونے لگا۔ خریداروں کی تعداد میں پھر اضافہ شروع ہوا یہاں تک سنہ ۲۰ء کی پہلی سہ ماہی میں اشاعت پھر ایک ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔

سنہ ۲۱ء میں حضرت والد مغفور نے تربیت گاہ بنات قایم فرمائی اور ہمہ تن اس میں منہمک ہو گئے، مجھے کالج کی تعلیم کے علاوہ کالج کے جلسوں اور کھیلوں میں بھی حصہ لینا پڑتا تھا، انکی مدرسہ کی مصروفیات بڑھیں اور میری کالج کی دلچسپیاں، ایک اور صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں مگر سودمند ثابت نہ ہوئیں اور سنہ ۲۲ء میں اشاعت گرنی شروع ہوئی تو تربیت گاہ کی ترقی کے سلسلہ میں ایک ہفتہ وار پرچہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عصمت کا ہفتہ وار اڈیشن سہیلی جاری کیا گیا۔ اس نے بہت جلد ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ دسمبر سنہ ۲۲ء میں میرا نکاح ہوا اور فروری سنہ ۲۳ء میں مرحومہ خاتون اکرم دلی تشریف لائیں۔ اب ترقی عصمت کی طرف سے عصمتی بہنوں کو بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔ مارچ میں ہم لوگ ایک ہفتہ کے لیئے بڑی ہمشیرہ محترمہ راشدہ بیگم صاحبہ کے پاس گنگا پور چلے گئے۔ مجھے بی اے کے امتحان کی تیاری کرنی تھی اور کتابیں سب دلی ہی میں تھیں۔ پرچے کی اشاعت میں دیر ہو رہی تھی مگر ہونی شدنی، دلی بالخصوص کوچہ چیلاں میں طاعون کا زور ہوا، دو ہفتے بعد وبا کم ہو گئی، میں نے کتنا ہی سر پٹکا مگر ابا جان کی محبت نے ایک روز کے لیئے بھی دلی آنے کی اجازت نہ دی، مہینہ سوا مہینہ بعد جس رات کو ہم دلی پہنچے ہیں اس کی صبح امتحان کا پہلا پرچہ کرنے اس حالت میں گیا کہ کتابیں دیکھے پانچ ہفتے ہو گئے تھے۔ شروع مئی میں میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی کہ پھر سب گنگا پور گئے خیال تھا ایک ہفتہ بعد آ جائیں گے مگر کئی مہینے لگ گئے ابا جان نے اسی زمانہ میں اپنی طبیعت کے قطعی خلاف مدرسہ کے لیئے پہلی مرتبہ دورہ کیا، واپس آئے تو بیمار پڑ گئے، طبیعت درست ہوئی، دہلی واپس ہوئے تو چار ماہ سے دونوں پرچے نہ نکلے تھے۔

اسوقت عصمت ہی کے لالے پڑ رہے تھے، تہذیب بند کرنا پڑا، بعض ہمدرد حضرات نے مشورہ دیا کہ عصمت بے قاعدگی کی وجہ سے بدنام ہوگیا ہے مناسب ہے کوئی اور ماہوار رسالہ جاری کیا جائے یا ہفتہ وار تہذیب ہی کا اجرا ثانی ہو گر خاتون مرحومہ کی رائے سے متفق ہو کر ابا جان نے اسے پسند نہ کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ میں اور خاتون مرحومہ مل کر عصمت ہی کی ترقی کی کوشش کریں۔

دوسرے دور کا خلاصہ

۱۹۲۶ء سے اپریل ۱۹۳۲ء تک میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور گو میں خود مختار اڈیٹر یا مینجر نہ تھا تاہم عصمت کا بہت سا کام ابا جان مجھ سے ہی لے رہے تھے۔ عصمت کا یہ دور اتنا شاندار نہ تھا جتنا دور اول تھا عصمت کی ظاہری حالت کسی سال بہتر ہو جاتی اور کسی سال معیار سے گر جاتی۔ کبھی مسلسل کئی کئی ماہ تک پرچہ پابندی وقت سے شائع ہوا کبھی دو دو ماہ کے اکھٹے پرچے چھپے۔ بعض جلدیں باتصویر ہیں بعض بے تصویر۔ کسی سال مضامین کے اعتبار سے پرچہ اچھا نکلا تو کسی سال مضامین کی طرف زیادہ توجہ نہ کی گئی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عصمت کی جو روش شروع میں تھی اس میں فرق نہ آیا۔ اُس زمانہ کا بھی کسی سال کا پرچہ اٹھا کر دیکھ لیا جائے عصمت کے مقاصد ہر پرچہ میں نظر آئیں گے، عورتوں کے فرائض کیا ہیں وہ کس طرح اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہیں۔ بہ حیثیت بیٹی۔ بہن۔ بیوی۔ ماں۔ بہو نند اور بھاوج کیا کیا ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی ہیں، وہ اپنا گھر کس طرح جنت کا نمونہ بنا سکتی۔ اور کس طرح اپنے شوہر کا دل مسخر کر سکتی ہیں۔ بچوں کی پرورش میں مشورے، روپیہ کے خرچ میں ہدایتیں غرض مختلف حیثیتوں میں عورت کے فرائض پر ہر پرچہ میں بہت معقول تعداد میں مضامین نکلیں گے اور خشک اور ادق مضامین نہیں کہ طبیعت اُکتائے یا دل گھبرائے بلکہ پیرایہ بیان کی دلاویزی کے سبب مضمون ختم کرنے کو جی چاہے گا اور پھر خواتین ہی کو انکے فرائض پر متوجہ نہیں کیا گیا ہے اس زمانہ میں بھی حقوق نسواں پر ہر پرچہ میں موثر مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن وہ آزادی نسواں جس میں مرد و عورت کا امتیاز مشکل ہو جائے اسے عصمت نے ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اُس زمانہ میں بھی اس موضوع کے کافی مضامین شائع کئے۔ مغرب کی کورانہ تقلید کی عصمت نے ہمیشہ مخالفت کی لیکن دوسروں کی خوبیوں کا بھی معترف رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی روایات زندہ رکھنے پر بھی زور دیا اور انھیں اُصولوں پر عصمت نے ترقی نسواں اور بیداری نسواں کی کوششیں کیں۔ اِس دور کے اُن پرچوں میں بھی جو خراب کاغذ پر معمولی لکھائی چھپائی کے ساتھ بے وقت شائع ہوئے عصمت اپنے اصولوں سے نہ ہٹا اور اصل روح ہمیشہ موجود رہی۔ اس دوسرے دور میں بھی عصمت نے مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی اور بہت سی ہونہار لکھنے والیاں پیدا کیں جن میں سے اکثر نے مستقبل میں بہ حیثیت کامیاب مضمون نگار کے نام پیدا کیا۔ عصمت کی بعض پرانی لکھنے والیوں کے علاوہ اس دور میں جن کے مضامین خصوصیت کے ساتھ شائع ہوتے رہے ان میں خاتون اکرم مرحومہ۔ منجھو بیگم مرحومہ (م۔ ب لکھنوی) مرحومہ نجمہ آپا۔ امتیاز جہاں۔ محترمات لطیف بیگم۔ حمیدہ بیگم۔ صغرا بیگم۔ سیدہ اصغری بیگم۔ مسز کاظم۔ زہرہ اختر بیگم۔ رضیہ بیگم۔ زہرہ سلطانہ۔ نصیرہ شمس۔ زاہدہ خاتون رز۔ مراد آبادی البقین بیگم قرۃ العین۔ اُم الحلیمہ مریم۔ آسیہ بائی۔ مسز مجیب الرحمن خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں نئے نئے نسوانی پرچے بھی جاری ہو رہے تھے اور پرانے پرچہ بھی اپنا کام کر رہے تھے دو ایک نے عصمت سے اُلجھنا چاہا۔ ایک معاصر نے ابا جان کی تصانیف کے خلاف مسلسل کئی مضامین شائع کئے اور ان الفاظ تک کی اشاعت جائز سمجھی جو کم سے کم ایک زنانہ پرچے کی شان سے گرے ہوئے تھے، یہ مضامین کس جذبہ کے تحت میں اور کس نیت سے شائع کیے گئے تھے اسکا جواب ابا جان نے بھی نہیں دیا اور میں بھی اس کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ محسن کشی کی بدترین مثال تھے۔

تیسرا دور (سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک)

سنہ ۲۳ء میں جب یہ طے ہوا کہ مجھے اور خاتون اکرم مرحومہ کو عصمت کی حالت ٹھیک کرنی ہے اور تمام ذمہ داریاں ہم دونوں کے سپرد کر دی گئیں تو میری اس تجویز سے ابا جان نے بھی اتفاق کیا کہ جب تک پرچہ اپنی اصلی شان پر نہ آ جائے اور پابندی وقت سے نہ نکلنے لگے خاتون اکرم مرحومہ کا نام عصمت کی اڈیٹری میں نہ ڈالا جائے۔ دو ماہ کے پرچے مارا مارا تیار کیے گئے اور خدا خدا کر کے مارچ سنہ ۲۴ء میں اشاعت وقت پر آئی۔ اگر خاتون مرحومہ میری مدد نہ کرتیں تو میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے بہتر سے بہتر مضامین خود لکھے۔ اپنی سہیلیوں سے لکھوائے، روپیہ صرف کیا۔ دفتر کا انتظام درست کیا غرض جو جو کچھ کر سکتی تھیں سب ہی کچھ کیا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت نے غیر معمولی ترقی کرنی شروع کی۔ مجھے اکتوبر سنہ ۲۴ء کے وہ دو دن اور دو راتیں ہمیشہ یاد رہینگی جب انھوں نے اور میں نے مل کر جنوری سنہ ۲۵ء سے عصمت کو بہت بلند پیمانے پر شائع کرنے کی ایک مکمل سکیم بنائی اور اس کے مطابق تیاریاں شروع کیں۔ ابا جان نے بھی پسندیدہ نظروں سے اس اسکیم کو ملاحظہ فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی چونکہ بہت فضول خرچ سمجھا جاتا تھا اس لئے انھوں نے یہ ترمیم فرمائی کہ یکم نومبر سے تمام آمدنی اور خرچ خاتون کے سپرد ہو۔ نومبر کا پہلا ہفتہ خاتون مرحومہ کا بہت مصروفیت کا گذرا تھا، نومبر کو انھیں بخار چڑھا اور ۱۴ اور ۱۵ نومبر کی درمیانی شب وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں اور عصمت کو اور طبقہ نسواں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا، ترقی عصمت کے تمام ارادے خاک میں مل گئے، زندگی کی بہت سی امنگوں کا خاتمہ ہو گیا، کہاں کی تعلیم کس کا پرچہ اپنا ہی ہوش نہ رہا۔ ابا جان بڑے بڑے ارمانوں سے خاتون کو لائے تھے، انکی آرزوئیں مٹی میں مل گئیں۔ خدمت گزار اور فرماں بردار بہو نے چند دنوں ہی میں قدر دان خسر کا دل موہ لیا تھا، خاتون کا یہ صدمہ ابا جان کو ایسا پہنچا کہ دم واپسیں تک نہ گیا، اِدھر خاتون کی مفارقت ابدی انہیں تڑپا رہی تھی اُدھر میری حالت کچھ سے کچھ ہو رہی تھی۔ دل پر چھریاں چل رہی تھیں مگر زبان پر حرف شکایت نہ تھا انھوں نے میرا غم غلط کرنے کی جو جو کوششیں کیں جب یاد کرتا ہوں تڑپ اٹھتا ہوں، ایک دولت مند سے دولت مند اور زیادہ سے زیادہ محبت کرنے والا باپ جو جو کچھ کر سکتا ہے ابا جان نے میرا دل بہلانے کے لئے اس سے بھی بہت زیادہ کیا مگر میری حالت کسی پہلو درست نہ ہوتی تھی اسی طرح سات ماہ گذر گئے اور پرچہ شائع نہ ہوا۔ ابا جان کوشش یہ فرما رہے تھے کہ کسی طرح میں عصمت کا کام شروع کروں تاکہ میرے خیالات بٹنے لگیں، اس کوشش میں بالآخر انھیں کامیابی ہوئی دو تین مہینے میں پچھلے تمام پرچے شائع کیے گئے اور جب ستمبر سنہ ۲۵ء کا پرچہ شائع ہوا تو خریداروں کو وی پی گئے ہوئے دو سال کے قریب ہو گئے تھے! اس موقع پر شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ میں شاید اور کسی پرچہ کا نام نہ بتا جا سکے جس نے سالانہ چندہ وصول ہوئے بغیر دو سال تک اپنے خریداروں کو مفت رسالہ دیا ہو۔ اس عرصہ میں کس قدر روپیہ اٹھا ہوگا اسکا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود اس قدر ایثار کے جب اکتوبر میں وی پی بھیجے گئے تو دھڑا دھڑ واپس آئے۔ یہ واپسیاں ہمیشہ کے لئے عصمت کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ دو سال میں جس قدر روپیہ اٹھایا گیا تھا سب بے کار ثابت ہوا جو محبت کی گئی تھی سب اکارت گئی۔ خاتون کی زندگی میں پرچہ ڈیڑھ ہزار چھپنے لگا تھا۔ اب پورے چار سو خریدار بھی نہ رہے تھے لیکن ابا جان (خدا انکی پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے) خوب اچھی طرح میرے دل میں بٹھا چکے تھے کہ خاتون کی روح کی خوشی ترقی عصمت ہی سے ہو سکتی ہے، وی پی کی

واپسیوں نے ہمت پست نہ ہونے دی، وہ حوصلہ افزائی فرماتے رہے اور جنوری ۲۶ء سے عصمت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۲۵ء میں عصمت کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں ستمبر کے پرچہ میں حضرت والد مغفور کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جسکا ایک حصہ یہ تھا:۔

"۔۔۔۔ میں ایک اکیلا آدمی کیا کیا کرسکتا ہوں۔ مدرسہ کا انتظام کروں۔ روپیہ فراہم کروں۔ کتابیں لکھوں۔ رسالہ کو دیکھوں ایک انار وصد بیمار۔۔۔۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ جو میری دوسری مصروفیتوں کے باعث پرچہ میں وقتاً فوقتاً تاخیر ہوتی ہے اس کی تلافی رازق دولہن مرحومہ کے آجانے سے ہوجائے گی اور میں رسالہ سے بالکل سبکدوش ہوجاؤنگا مگر خدا کو یہ منظور نہ ہوا، ان کے بعد رازق بیاں نہ پرچے کی طرف توجہ کرسکے نہ بی اے کے امتحان میں شریک ہو سکے۔ تاہم میں عصمت سے غافل نہ تھا مگر مجبور تھا خدا خدا کرکے اس صدمہ کا اثر قانونِ قدرت کے بموجب نسبتاً کم ہوا تو ۲۶ جون کو میرا منجھلا بچہ ۱۸ سال کی عمر میں رخصت ہوا۔ اس صدمہ نے میری کمر توڑ دی مگر عصمت اور مدرسہ دونوں چیزیں میرے دم کے ساتھ رہیں اور اب جو کچھ پرچہ پر محنت کی گئی اور صرف ہوا ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ اس موقعہ پر مجھے یہ کہدینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ستمبر ۲۵ء کا پرچہ روانہ ہونے کے بعد ناظرینِ عصمت کے پاس دو سال کے پرچے اس طرح پہنچیں گے کہ ان سے ایک پیسہ بھی چندہ نہیں لیا گیا۔"

سالگرہ نمبر ۳۳ء میں حضرت والد مغفور کی تصویر شائع ہوئی اور عصمتی بہنوں نے اس پر اظہارِ مسرت فرمایا اور عصمت کی ترقی پر ان کو بھی مبارکباد کے خطوط روانہ فرمائے تو ستمبر ۳۳ء کے پرچہ میں انکا ایک مضمون شائع ہوا جس میں خاتون مرحومہ کی یاد میں اور عصمت کی ترقی کے سلسلہ میں تحریر فرمایا تھا۔

"دولھن نہیں فرشتہ تھی جس نے دلی آتے ہی پہلا کام مردہ عصمت کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس موقع پر یہ اختلاف کیا کہ عصمت کی بیقاعدہ اشاعت کی بدنامی اسقدر کافی ہوچکی ہے کہ اسکا زندہ رہنا محال ہے بہتر ہے کہ دوسرا نام رکھو مگر اس نے میری اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔

میری رائے میں اپنی صنف کی محبت اور بہبودی کا مادہ زیادہ سے زیادہ کسی عورت میں اتنا ہی ہوگا جتنا مرحوم خاتون اکرم میں تھا۔ اس نے رات رات بھر عصمت کے واسطے مضامین لکھے جن لکھنے والیوں سے اس کے تعلقات تھے انھیں مجبور کیا، سہیلیوں کو ترغیب دی اور یہ اُسی کا دم تھا کہ مردہ عصمت کو قبر میں سے نکال لائی، اسکو جہیز میں جو زیور اور روپیہ ملا تھا اس سے مَدَدلی اپنا آرام قربان کیا اور جو ارادہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ایک موقع پر جب کئی روز سے متواتر بارش ہو رہی تھی اور پرچہ کی تکمیل کی ہر توقع ناکام ہوچکی تھی۔ اس نے دفتریوں کو رات بھر اپنے سامنے بٹھا کر کام لیا۔ اور صبح پرچہ روانہ کیا۔ غرض ۳۰ تاریخ جو مقرر تھی ناغہ نہ ہونے دی۔ میں آج بھی یہی رائے رکھتا ہوں کہ اگر خاتون مرحومہ کی شخصیت کا اثر نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ڈیڑھ سال میں اس کی اشاعت دوگنی ہوجاتی۔

سعد سلمہٗ شاید چھ مہینہ کا تھا کہ اس روپیہ کی مقدار میرے علم میں آئی جو مرحومہ کا عصمت پر صرف ہوا۔ میں نے کہا بیٹی تم نے اپنے بچہ کو اس روپیہ سے محروم کیا۔ وہ ہنسی اور کہنے لگی ابا جان میرا واسطہ عورتوں سے پڑا ہے وہ میری خدمات فراموش نہ کرینگی۔ آپ کی اور رازق صاحب کی عمر خدا دراز کرے روپیہ کا بہترین مصرف صرف یہی ہے اگر میں مر بھی گئی تو میری

بہنیں میرے بچے کو میری جگہ سمجھیں گی۔

خاتون اکرم مرحومہ کی اُمید صحیح تھی اور اسکا اندازہ درست، میں دیکھ رہا ہوں کہ جب دورہ پر جاتا ہوں تو مرحومہ کی عصمتی بہنیں انتہائی محبت سے اپنی جنتی بہن کے بچہ کا استقبال کرتی ہیں۔"

چوتھا دَور (۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک)

۱۹۲۶ء جنوری ۱۹۲۵ء سے عصمت کو جس معیار پر شائع کرنے کی اسکیم اکتوبر ۱۹۲۴ء میں جنت مکانی خاتون اکرم نے اور مینے تیار کی تھی اس کے مطابق جنوری ۱۹۲۵ء سے نہیں جنوری ۱۹۲۶ء سے پرچہ نکلنا شروع ہوا۔ عصمت کی مشہور مضمون نگار خواتین کئی سال بعد ۱۹۲۶ء سے پھر بزم عصمت میں تشریف لائیں اور نئی نئی مضمون نگار خواتین پیدا کرنے کی کوشش عصمت نے بدستور جاری رکھی۔ مضامین کا معیار پہلے سے بلند کر دیا گیا، اور ہر پرچہ میں خواتین کے مطلب کے بہتر سے بہتر مضامین زیادہ سے زیادہ موضوعوں پر درج کرنے کی کوشش کی گئی۔ جہاں مضامین کی دلچسپی پیش نظر رہی وہاں اسکا بھی لحاظ رکھا گیا کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو مختلف عمر اور مختلف مذاق کی خواتین کی دلچسپی کا سامان قریب قریب ہر پرچہ میں دیا گیا۔ اور ترتیب رسالہ میں چند خاص امور کا خیال رکھا گیا اور باوجود ان تمام باتوں کے سب سے بڑی بات پیش نظر یہ رہی کہ عصمت کی روش میں فرق نہ آئے، جنوری سے دسمبر تک سال کے بارہ کے بارہ پرچے نہایت پابندی وقت سے شائع ہوئے، تصاویر خاص طور پر ہر پرچہ کے لئے بنوائی گئیں۔ کاغذ چھپائی لکھائی کے اعتبار سے بھی ۱۹۲۶ء کے پرچے دور اول کے پرچوں سے کم نہ رہے۔

المختصر ۱۹۲۶ء میں عصمت اس شان سے نکلا کہ پرانے خریداروں کو دور اول کے ابتدائی تین سال یاد آ گئے۔ خدا کی مدد پرچہ کے ساتھ تھی سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ عصمت کی اشاعت دو ہزار ہو گئی۔

جنوری ۱۹۲۷ء کے پرچے میں حضرت والد مغفور نے عصمت کے ۱۹۲۶ء پر تبصرہ فرمایا تھا، اسکا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں ۱۹۲۶ء کی کہانی انکی زبانی کچھ اور ہی لطف دے گی:۔

> "میں نے جس وقت تربیت گاہِ بنات کی بنیاد ڈالی ہے تو احتمال نہیں یقین تھا کہ میری مصروفیت عصمت پر اچھا اثر نہ ڈالے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مدرسے کی نت نئی ضرورتیں اور ہر لحہ کی مصروفیتیں مجھے اتنی مہلت نہ دے سکیں کہ میں عصمت پر متوجہ ہوتا...... رازق میاں کے واسطے میں نے ایسی دُلہن منتخب کی جو عصمت کو پوری طرح سنبھال لے اور عصمت کے متعلق میری پریشانیوں کا خاتمہ ہو۔ یہ ۱۹۲۳ء کی باتیں ہیں اور اس مرحومہ نے جس محنت سے کام کیا اسکا ثبوت اس مرنے والی کے بعد اس کے زندہ پرچے آج تک موجود ہیں۔ رازق دُلہن مرحومہ کے بعد رازق میاں مطلق کام نہ کر سکے۔ میں مدرسے کو نہ چھوڑ سکا اور عصمت کی حالت پھر ردی ہونی شروع ہوئی...... ۱۹۲۵ء کے آخر میں میں نے رازق میاں کو اطلاع دے دی کہ عصمت اور کتابوں کا کام صرف ان کو انجام دینا ہے۔ انھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی اور کرنی چاہیئے تھی لیکن غمزدہ اور دل شکستہ ہونے کے علاوہ انکو بہت سی دِقتوں کا سامنا رہا۔ خریداروں کی تعداد بے قاعدگیٔ اشاعت کی وجہ سے اسقدر گھٹ چکی تھی کہ کامیابی محال معلوم ہوتی تھی مگر میں انکی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے نہایت استقلال سے کام کیا اور کامیاب ہوئے۔ ایک دوسری مشکل یہ تھی کہ نئے نئے پرچے نکل رہے تھے اور کم چندے پر زیادہ سامان دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی اور اسی سرگرمی

محنت کرتے رہے۔ پہلی ہی مرتبہ سینکڑوں وی پی واپس ہوئے ہیں تو یہ داپسیاں کام کرنے والے کو مایوس کرنے کے لئے بہت کافی تھیں لیکن رازق میاں نے نہایت محنت اور استقلال سے وقت کا مقابلہ کیا اور آج خدا کا شکر ہے وہی لوگ جو عصمت سے مایوس ہو چکے تھے انکی بہت سی اُمیدیں عصمت سے وابستہ ہیں۔

عصمت اس سال جس آب تاب اور پابندیٔ وقت سے شائع ہوا اور جیسے قابل قدر اور پاکیزہ مضامین شائع کئے ان کو دیکھ کر میں رازق میاں کو انکی کامیابی پر نہایت خوشی سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس میں شک نہیں انہوں نے بے غل و غش روپیہ خرچ کیا ہے اور رسالہ کو کامیاب بنانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر اب عصمت کی پوری کامیابی ناظرین عصمت کی توجہ سے وابستہ ہے جو الحمد للہ حاصل ہو چکی، حاصل ہو رہی ہے اور یقین کامل ہے حاصل ہوگی۔

جنوری ۱۹۲۶ء سے دسمبر ۱۹۲۶ء تک بارہ پرچے نہایت پابندی سے ہر مہینے شائع ہوئے۔ تصاویر عصمت کی اپنی ہیں بازاری یا مستعار نہیں ......

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض پرچے اپنے فرائض کو پوری طرح سے محسوس نہیں کرتے۔ تھوڑے دن ہوئے ایک زنانہ پرچے میں میں نے یہ فقرے دیکھے " ......" ایڈیٹر کی ادنیٰ کوشش اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی بیان کر سکتی تھی۔ لباس ظاہری کتنا ہی بھڑک دار ہو مگر سننے والے کی باتیں بھی دیکھنی ہیں ...... نامہ نگار نے اپنے جوش میں لکھا ہو ......" مگر یہ کام ایڈیٹر کا تھا کہ نامہ نگار کا مفہوم ادا ہو جائے اور کسی کو ناگوار نہ ہو۔

مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ عصمت کے جس قدر مضامین شائع ہوئے وہ اس اعتبار سے بھی نہایت درست اور صحیح تھے۔ ایک موقع پر ایک نامہ نگار کو ایک مشہور خاتون سے مذہبی عقائد میں شکایت ہوئی۔ عصمت نے وہ مضمون شائع کیا مگر اس طرح کہ دونوں فریق رضامند ہو گئے۔ رازق میاں کا بیان ہے اگر وہ مضمون حرف بہ حرف شائع ہوتا تو ایک آگ لگ جاتی۔

سب سے بڑی بات جس کو دیکھ کر میں مطمئن ہوا یہ ہے کہ جس مقصد کو لیکر عصمت کا پہلا پرچہ ۱۹۰۸ء میں نکلا تھا ۱۹۲۶ء میں بھی ان مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے اور باوجودیکہ زمانہ کئی رنگ پلٹ چکا ہے اور وقت کہیں کا کہیں پہنچ گیا عصمت آج بھی اس روش پر قایم ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ عصمت لڑکیوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کر رہا ہے اور لکھنے والی لڑکیوں کی تعداد روز بروز پیدا ہو رہی ہے ...... ۱۹۲۶ء عصمت کا ایک نہایت کامیاب سال ہے جس پر ایڈیٹر عصمت اور مضمون نگاران عصمت مبارکباد کے مستحق ہیں"

میرے متعلق ابا جان نے (خدا انکی آرام گاہ کو اپنے نور سے معمور کرے) جو کچھ تحریر فرمایا تھا وہ انکی شفقت پدری تھی ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی قابلیت اور محنت کا خود ہی اچھی طرح اندازہ ہے۔ ۱۹۲۶ء میں عصمت کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ابا جان اور صرف ابا جان کی وجہ سے، انکی زبردست شخصیت، انکی بے مثل بے لوث خدمات اور انکی سحر نگاری کی وجہ سے۔

مصور غم کی سحر نگاری

۱۹۲۶ء کا ذکر ہو رہا ہے۔ اسی سال کا ایک واقعہ بھی لکھے دیتا ہوں اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں نے انکی تحریروں کو سحر نگاری کہا تو مبالغہ سے کام نہیں لیا۔

ٹھیک یاد نہیں کہ فروری کا مہینہ تھا یا مارچ کا کہ ہندوستان کے ایک صوبہ کے ایک معقول سرکاری عہدہ دار کی جن سے ہماری ملاقات

ہو چکی تھی انکی بیوی کی طلاق کے متعلق مجھے اشاعت کی غرض سے ایک مضمون موصول ہوا۔ میں نے یہ مضمون ابا جان کو سنایا تو انھوں نے میرا خیال معلوم کرنے کے لئے فرمایا "مناسب سمجھو تو چھاپ دو" میں نے عرض کیا "میں تو قیامت تک شائع نہ کرونگا۔ پہلا ظلم طلاق دوسرا ستم اس مصیبت ماری کی بدنامی" فرمایا "تو پھر مطلقہ کی حمایت میں عصمت کو لکھنا چاہیئے" میں نے عرض کیا "عصمت ضرور لکھے گا"۔ شاید ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ یہی مضمون ایک زنانہ پرچہ میں شائع ہوا اور دوسرے ہفتہ میں ایک اور زنانہ پرچہ میں۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے ابا جان سے عرض کیا "اب تو اسکا بہت سخت جواب ہونا چاہیئے"۔ انھوں نے فرمایا "تم اس ہفتہ کے پرچہ کے واسطے افسانہ کے لئے کہہ رہے ہو میں اسی میں اسکا جواب بھی لکھدونگا"۔ ابا جان نے افسانہ شروع کر دیا تو ایک بہن کا مضمون پہنچا جس میں انھوں نے سخت شکایت کی کہ زنانہ پرچے جو ہمارے اپنے کہلاتے ہیں ہمیں بدنام کرتے ہیں اور پھر ہماری ہمدردی کے دعویدار ہیں۔ عصمت نے یہ مضمون بھی شائع نہ کیا۔ البتہ مصیبت ماری بہن کی حمایت میں حضرت "مصورِ غم" کا دردانگیز بالتصویر افسانہ "طلاقن کا سفید بال" شائع کیا گیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ جن صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی انھوں نے ارشادِ رسول کی تعمیل کی اور رجوع کر لیا۔

مصورِ غم کی سحر نگاری کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ تھا انکی مستقل تصانیف اور عصمت کے مضامین نے ایک دو نہیں دس بیس نہیں ہزاروں گھرانوں کو تباہی و بربادی سے بچا کر جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

عصمت بک ڈپو عصمت جن مقاصد کو لے کر میدان میں جاری ہوا تھا وہ ہر دور میں پیش نظر رہے۔ کنواری لڑکیوں اور بیاہی ہوئی مستورات کے لئے مفید کتابوں کی اشاعت بھی عصمت کے مقاصد میں سے ہے۔ ۱۹۰۹ء ہی سے عصمت نے اس طرف توجہ کرنی شروع کر دی تھی اور آٹھ دس کتابیں ۱۹۱۳ء تک شائع ہو چکی تھیں مگر ۱۹۱۶ء میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کتابوں کا سرمایہ آگ کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد جو کوشش کی گئی وہ ۱۹۱۹ء کی آتشزدگی کی لپیٹ میں آئی۔ اس زمانہ میں حضرت والد مرحوم کی تصانیف جو دوسرے حضرات نے شائع کیں اور ہم خود اسقدر مقبول کتابیں شائع نہ کر سکے اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے ہاں چھپائی وغیرہ کا معقول انتظام نہ رہا تھا اور آتشزدگی نے ہزاروں روپیہ کا چھاپہ خانہ ختم کے قریب کر دیا تھا تاہم ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں بھی حضرت علامہ مغفور کی چار پانچ کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں سے ہمیں مالی فائدہ کافی ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ عصمت کی حالت درست ہونے میں بہت بڑی مالی امداد ان کتابوں کی فروخت سے ہی ملی۔ ۱۹۲۶ء میں عصمت سنبھل چکا تھا، دوسرے پریس میں چھپائی کا معقول انتظام ہو گیا تھا اور اب کتابوں کی اشاعت کا انتظام اطمینان کے ساتھ کیا جا سکتا تھا چنانچہ ۱۹۲۶ء میں خلد آشیاں مصورِ غم کی کئی بیش بہا تصانیف شائع کی گئیں۔ اور ہر سال کتابوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک ۱۹۳۵ء میں دفتر عصمت کی کتابوں کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔

میں نے عصمت بک ڈپو کے متعلق عصمت میں کچھ لکھنا پسند نہیں کیا، مگر اس موقع پر چند باتیں عرض کر دینی نامناسب نہ ہونگی۔

ابا جان (فردوس مکانی) جب اس دُنیا سے تشریف لے گئے تو اسوقت تک انکی قریباً ساٹھ کتابیں شائع ہو چکی تھیں ان میں نصف سے زیادہ تصانیف ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۱ء تک لکھی گئی تھیں۔ اور سوائے دو تین کتابوں کے تمام کتابیں دوسرے حضرات نے شائع کی تھیں، ابا جان کی مدرسہ کی مصروفیات اسقدر بڑھتی چلی گئیں کہ آخری دس سال میں وہ دس کتابیں بھی نہ لکھ سکے۔ جو تصنیف ایک ایک دو دو ماہ میں ختم کر ڈالتے وہ دو دو تین تین سال میں پوری ہوئی۔ دوسروں کے لئے انھوں نے ایک ایک سال میں دس دس کتابیں لکھ دیں لیکن مدرسے

کی مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے پندرہ سال میں دس کتابیں بھی نہیں لکھیں۔ میں کبھی شکایت بھی کرتا تو فرماتے "بہت کچھ لکھ چکا اب کچھ وہاں کے لئے بھی کرنے دو" اور یتیم بچیوں کو سینہ سے چمٹا کر ان پر اپنی کتابوں کا روپیہ صرف کرکے انھیں جس قدر خوشی ہوتی تھی وہ کسی تصنیف کے ختم کرنے اور اس کی مقبولیت کا حال دیکھ کر بھی نہ ہوتی تھی۔ مدرسہ میں ان کا یہ انہماک دیکھ کر میں نے ان کے مطبوعہ مضامین کتابی صورت میں چھاپنے شروع کر دئے، انکی تلاش و جستجو میں بڑی بڑی کاوش اور محنت کرنی پڑتی تھی مگر جب کوئی مجموعہ تیار کرکے انھیں دکھاتا اور وہ مسکراتے تو انکی مسکراہٹ بہت معنی خیز ہوتی تھی اور میں اپنی تمام محنت بھول جاتا تھا ادھر تو میں مطبوعہ مضامین کتابی صورت میں شائع کر رہا تھا ادھر جو کتابیں دوسروں کو دے چکے تھے انکا کاپی رائٹ واپس لینے کی کوشش کر رہا تھا اور دونوں کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا، ابا جان خلد آشیاں کی تصانیف کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ انکے زمانہ کے کسی اردو مصنف نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھی، ایک ایک کتاب کے پانچ پانچ دس دس بلکہ پندرہ پندرہ بیس بیس اڈیشن شائع ہوئے، اور دو چار کتابوں کی بجز قریب قریب سب ہی کتابوں کی یہ کیفیت رہی کہ ادھر چھپیں ادھر ختم ہوئیں، ابا جان جنت مکانی کی تصانیف سے ہر ماہ عصمت بک ڈپو کو نہایت معقول آمدنی ہوتی رہی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کی تصانیف کی آمدنی سے مدد نہ ملتی تو نہ مدرسہ کی بڑی بڑی ضرورتیں رفع ہوتیں اور نہ عصمت اسقدر ترقی کر سکتا تھا۔ عصمت کی اشاعت جب پانچ ہزار تک پہنچ گئی اسوقت بھی آمدنی کے مقابلہ میں اخراجات اسقدر زیادہ رہے کہ بغیر ان کتابوں کی مدد کے عصمت کا اپنی شان قایم رکھنا ناممکن تھا۔ یہ حالات معلوم ہونے کے بعد یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے مصور غم علیہ الرحمۃ کی مستقل اور نئی نئی تصانیف کے متعدد اڈیشن شائع کئے انھوں نے کس قدر دولت پیدا کی ہوگی۔

۴۸ سال گذر گئے لیکن عصمت تجارتی اُصولوں پر کبھی نہیں نکلا ورنہ مندرجہ بالا داستان پڑھنے کے بعد بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر عصمت تجارتی پرچہ ہوتا تو ہزاروں روپیہ کا اسقدر زبردست مالی نقصان پہ درپہ ہرگز نہ اُٹھاتا۔ البتہ حضرت علامہ مغفور کی کتابیں چھاپنے میں بے شک مالی منفعت بھی پیش نظر تھی اور خدا نے کچھ ایسی برکت دی کہ جب سے میں نے باقاعدہ کتابوں کا کام شروع کیا عصمت بک ڈپو میں کبھی روپیہ کی کمی نہ ہوئی ۔ عصمت کی ترقی کا یہ بھی ایک بڑا راز ہے۔

ابا جان خلد مکانی کی تصانیف کے علاوہ عصمت کے مضمون نگاروں کی بھی چار پانچ درجن کتابیں میں نے شائع کی ہیں مگر سوائے چند کتابوں کے انسے مجھے کوئی خاص مالی فایدہ نہ ہوا۔

ممکن ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ کتابوں کی نکاسی کے لئے جو طریقے عام طور پر اختیار کئے جاتے اور انکی فروخت و اشاعت کے لئے جو جو کوششیں کی جاتی ہیں مجھ سے وہ نہ ہو سکیں۔ مدرسوں اور کالجوں کے نصاب اور کتب خانوں کے لئے کتابیں منظور کرانے کے واسطے متعلقہ اشخاص کو رشوتیں دینا، دعوتیں کرنا خوشامد اور چاپلوسی سے کام لینا، یہ سب باتیں میری طبیعت کے خلاف تھیں، ممکن ہے میرا اصول غلط ہو، اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ غلط ہی تھا مگر میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ یہ کام میرا نہیں ان لوگوں کا تھا جنھیں موزوں اور مفید کتابوں کا انتخاب کرنے کے لئے گورنمنٹ بڑی بڑی تنخواہیں دے رہی ہے۔ ہر دوکاندار اپنی چیز کو بہترین ظاہر کرتا ہے یہ خریدنے والے کا کام ہے کہ وہ پیتل اور سونے میں امتیاز کر سکے۔

کتابوں کی نکاسی کے لئے ایک اور کامیاب طریقہ اشتہار بازی ہے۔ عصمت بک ڈپو کی کتابیں اشتہاری کے ذریعہ فروخت ہوتی ہیں اور اشتہارات بھی میں خود ہی لکھتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے میں نے تن پروری کے لئے کسی اشتہار میں دھوکہ یا فریب سے کام نہیں لیا۔ اشتہار میں جاذبیت اور کشش پیدا کرنے کے فن سے میں قطعی ناواقف نہیں لیکن زمین آسمان کے قلابے میں

نہیں ملا سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کسی اشتہار میں کسی قدر مبالغہ ہو گیا ہو لیکن غلط اشتہار میں نے کبھی نہیں لکھا میں نے وہی کتابیں شائع کیں جو میری رائے میں تعلیم یافتہ سنجیدہ مستورات کے لئے مفید ہو سکتی تھیں یا جنکا مطالعہ ان کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس اصول کے تحت میری رائے اگر کسی مسودہ کے متعلق اچھی نہ ہوئی تو میں نے مالی فائدہ کو بھی نظر انداز کر دیا اور اسے شائع نہ کیا۔ اور صرف وہی کتابیں چھاپیں اور انکے اشتہارات لکھے جو میری رائے میں خواتین کے لئے مفید تھیں۔ اور اسی لئے میں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر کوئی کتاب اشتہار کے مطابق نہ ہو تو واپس کر کے قیمت منگالی جائے، اور ایسا کوئی خط کبھی موصول ہوا تو اسے شائع بھی کر دیا چنانچہ میں نے ایک دفعہ یہ بھی لکھا تھا کہ یوپی کے ایک صاحب نے عصمتی دستر خوان کو پسند نہیں کیا۔ انھوں نے اشتہار دیکھ کر کتاب منگائی اور اپنی رائے میں خلاف اشتہار پائی۔ اسکا جواب بھی شاید میں نے لکھا تھا۔ یہ کتاب جیسی بری بھلی ہے ہزاروں بہنیں منگا کر دیکھ چکی ہیں۔

ایک اور طریقہ یہ ہے۔ بعض تاجران کتب اپنے دوستوں یا ملنے والوں سے تعریفی مضامین یا خطوط لکھوا کر شائع کرتے ہیں یا فرضی خطوط ہی کسی کتاب کی تعریف میں شائع کرتے رہتے ہیں جس طرح رسالہ عصمت کی ترقی کے خیال سے فرضی خطوط شائع نہیں کیے گئے اسی طرح عصمت بک ڈپو کی کتابوں کی فروخت کے لئے بھی کبھی فرضی خطوط لکھنے یا شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

بعض کتابوں کو کسی دولت مند شخص کے نام منسوب کر کے کچھ نہیں تو خرچ کی بڑی رقم وصول کر لی جاتی ہے لیکن عصمت بک ڈپو کی سو کتابوں میں سے دو چار کتابیں ہی ایسی ہیں اور وہ بھی وہ جو مصنفوں نے منسوب کی ہیں جن سے کتاب کی چھپائی وغیرہ میں نام کو بھی کوئی مدد نہیں لی۔ حلقہ عصمت میں خدا کے فضل سے متمول خواتین کی کمی نہیں بہت آسانی سے بہت سی کتابوں کی اشاعت میں مالی مدد مل سکتی تھی مگر عصمت نے یہ طریقہ بھی پسند نہیں کیا۔

کتابوں کے فروخت ہونے میں اخبارات و رسائل کے ریویو سے بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے مگر خود مصنف نے بھیجدی ہو تو دوسری بات ہے عصمت بک ڈپو نے اپنی کوئی کتاب ریویو کی غرض سے اپنے معاصرین کو اس لیے نہیں بھیجی کہ ان میں سے اکثر کی نگاہ میں اول تو زنانہ لٹریچر کی کوئی قدر نہیں دوسرے صحیح تبصرے بالعموم کیئے ہی نہیں جاتے، توجہ کے قابل بعض معاصرین کی نگاہ میں وہی کتابیں ہوتی ہیں جنکا انکی کتابوں پر کوئی اثر نہ پڑے یا کسی دوست کی لکھی یا شائع کی ہوئی ہوں یا کسی ایسے شخص کی ذات سے تعلق رکھتی ہوں جسے کسی مصلحت سے ممنون کرنا مقصود ہوتا ہے۔ عصمت ہر ماہ تو نہیں کیونکہ خواتین کی مطلب کی کتابیں کئی کئی ماہ بعد شائع ہوتی ہیں لیکن وقتاً فوقتاً دوسروں کی کتابوں پر ریویو کرتا رہتا ہے مگر اپنی کتابوں کا ریویو کرنے کی بالعموم اپنے معاصرین کو تکلیف نہیں دیتا۔

اپنے کام کو ترقی دینے کے لئے بعض تاجران کتب دوسروں کی مقبول کتابوں کا توڑ کرتے ہیں انکو اس سے بحث نہیں کہ دوسرے نے کس دماغ سوزی کے بعد اس موضوع پر کس محنت سے کتاب لکھی ہے، کوئی نیا موضوع انکے ذہن میں نہیں آتا اور دوسروں کی نقالی میں اپنی کامیابی معلوم ہوتی ہے، وہ اس طرز پر اس رنگ کی کتاب شائع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کتاب کا نام بھی ملتا جلتا رکھتے اور اسی قسم کے اشتہارات شائع کرتے ہیں اور اشتہار پڑھنے والے کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب بھی اسی مصنف یا اسی کتب خانہ کی ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اس قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش بھی عصمت بک ڈپو نے کبھی نہیں کی۔

اس تمام تفصیل کے بیان کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ حلقہ عصمت کو یہ معلوم ہو سکے کہ کتابوں کی تجارت میں کامیابی کا

جو عام صورتیں ہوتی ہیں عصمت بک ڈپو اُن سے فایدہ نہ اُٹھا سکا اور اسی لئے حضرت علامہ مغفور کی تصانیف اور چند اور کتابوں کو چھوڑ کر نامہ نگاران عصمت کی کتابوں کی اتنی فروخت نہ ہو سکی جس کی وہ حقیقتاً مستحق تھیں، اگر انکی اتنی قدردانی بھی ہوتی رہتی کہ ہزار ہزار نسخوں کا ایک ایک ایڈیشن سال ڈیڑھ ڈیڑھ سال میں ختم ہوتا رہتا تو اب تک دو ڈھائی سو کتابیں شائع کر چکا ہوتا لیکن جہاں مجھے بعض کتابوں کی اس سست رفتار فروخت پر اکثر افسوس ہوا وہاں ان خیالات سے میں خوش تھا کہ میں نے بہت سے بکھرے ہوئے ادبی پھولوں کے گلدستے تیار کئے جن کی اب نہ ہوئی تو کیا آیندہ قدر ہوگی، میں نے مستورات کے مطلب کی نئے نئے موضوعوں پر مفید کتابیں شائع کیں جو خریدنے والوں نے پسندیدہ نظروں سے دیکھیں اور تعداد میں بھی دس سال میں خواتین کے لئے اتنی کتابیں شائع کر دیں کہ ہندوستان میں کسی ایک جگہ سے شائع نہیں ہوئیں۔

بنات

میں نے جس طرح عصمت میں کتابوں کے متعلق کچھ اس لئے لکھنا پسند نہ کیا کہ یہ کتابیں میں خود شائع کر رہا تھا اسی طرح بنات کے متعلق میں نے آٹھ سال گذر گئے اور کچھ نہیں لکھا اس وجہ سے کہ بنات میری ہی ادارت میں نکل رہا تھا۔ مگر عصمت کی اس تاریخ میں بنات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

سنہ ۲۶ء میں عصمت کی حالت ٹھیک ہوگئی تھی مگر تربیت گاہ کے لئے علیحدہ ایک آرگن کی ضرورت ابا جان جنت مکانی کو محسوس ہو رہی تھی، لیکن صرف مدرسہ کا آرگن ہونے کی صورت میں پرچہ کی کامیابی ممکن نہ تھی، عصمت کا معیار بلند ہو چکا تھا اور اب وہ چھوٹی بچیوں کے مطلب کا پرچہ نہیں رہا تھا۔ ادھر عصمت میں یہ کمی تھی کہ یوں تو ہر موضوع کے مضامین کافی شائع ہوتے تھے مگر مذہبی مضامین کی تعداد نسبتاً کم تھی، بالآخر ابا جان نے یہ طے فرمایا کہ مسلمان بچیوں کے لئے ایک مذہبی رسالہ جاری کیا جائے جو تربیت گاہ کا پرچہ ہو۔ چنانچہ سنہ ۲۷ء میں بنات جاری ہوا۔ اس کی ادارت اور انتظامات وغیرہ بھی میرے سپرد فرمائے گئے۔

عصمت کی طرح بنات آج تک نہایت پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے اسکا چندہ بھی بہت کم رکھا گیا اور مدرسہ کی ترقی کے لیئے تین تین چار چار ہزار پرچے ماہوار مفت تقسیم کیے گئے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی، جیسی توقع تھی، زیادہ سے زیادہ خریدار جو بنات کو کسی سال میسر آسکے انکی تعداد اٹھارہ سو زیادہ نہ ہو سکی۔ اجرائے بنات کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس سے مدرسہ کو فایدہ پہنچے اور گو اس پر ہر سال بہت کافی روپیہ خرچ ہوتا رہا تاہم مدرسہ کو اس سے کچھ نہ کچھ فایدہ پہنچتا رہا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بچیوں میں مذہبیت پیدا ہو۔ اس مقصد میں بھی بنات کو کافی کامیابی ہوئی بنات کے اور مضامین تو کچھ ایسے بہت زیادہ دلچسپ ہر ماہ نہیں ہوتے تھے لیکن بنات کے صفحات پر، احکام نسواں، مذہبی تاریخ، قرآن مجید کے قصے، غلبہ رواج وغیرہ مستقل عنوانوں کے تحت میں ابا جان نے (خدا انھیں جنت نعیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے) جو مضامین لکھے وہ یقیناً ادب اُردو اور زنانہ لٹریچر کے گراں بہا شہ پارے ہیں، اُن سے مسلمان لڑکیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ بنات کی خریدار زیادہ ترعصتی بہنیں یا انکی بچیاں تھیں۔ جو خوبصورتی اور دلچسپی عصمت میں تھی ایک روپیہ چندہ کے بنات میں پیدا نہ ہو سکتی تھی اور پھر خریداروں کی تعداد بھی کافی نہ تھی۔ دو تین مرتبہ بنات کو نسبتاً دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر خریداروں نے پرچہ کی ترقی میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ میں جب میں نے نئی کتابوں کی اشاعت اور عصمت کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ کی تو بنات کو زیادہ وقت نہ دے سکا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۳۳ء میں اس کی اشاعت بارہ سو رہ گئی اس کے بعد کبھی ڈیڑھ ہزار یا پونے دو ہزار ہو گئی۔ یا سوا ہزار رہ گئی۔ اکتوبر سنہ ۳۵ء میں حضرت والد مغفور نے اس کی ادارت میاں صادق سلمہ کے سپرد کی۔ اور ابتک وہی پرچہ مرتب کر رہے ہیں۔ بنات کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں مگر چونکہ ابا جان کی (خدا کی بے شمار رحمتیں اس قبر پر ہمیشہ نازل

ہوتی رہیں جس میں وہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند اور ابدی نیند سو رہے ہیں) یادگار ہے اس لئے بدستور جاری رہیگا۔

سنہ ۲۸ء

عصمت اب ہر سال ہر اعتبار سے ترقی کر رہا تھا خریدار اکتوبر سنہ ۲۵ء میں چار سو بھی نہ رہے تھے سنہ ۲۶ء میں اشاعت دو ہزار اور سنہ ۲۷ء میں ڈھائی ہزار ہوگئی، سنہ ۲۸ء میں اور معقول اضافہ ہوا اور سنہ ۲۹ء میں اشاعت تین ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔ سنہ ۲۸ء میں جوبلی نمبر شائع ہوا تو رسالہ کی تقطیع بدل کر موجودہ بڑا سائز کر دیا گیا۔ جوبلی نمبر ضرورت سے بہت زیادہ چھپوایا گیا مگر اسکو اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ سب پرچے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے، جوبلی نمبر کے بعض مضامین بہت قیمتی تھے۔ بعض تصویروں کے بلاک یورپ میں بنائے گئے تھے۔ عصمت کے جوبلی نمبر سے قبل اسقدر شاندار اور ضخیم خاص نمبر کسی ادبی رسالہ کا بھی شائع نہ ہوا تھا تعلیم یافتہ طبقہ میں توقع سے بہت زیادہ مقبول ہوا اور ہندوستانی پریس نے نہایت اچھے الفاظ میں اسکا تذکرہ کیا۔ جوبلی نمبر کا عصمت کی شہرت اور اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا لیکن اس کے بعد میں ہر سال جون کی قیامت خیز گرمی میں سالگرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع کرنے کا پابند ہوگیا۔ سنہ ۲۹ء کا سالگرہ نمبر جوبلی نمبر کی طرح کامیاب تو نہ تھا لیکن قدرداں بہنوں نے اسے بھی بے حد پسندیدہ نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

رسالہ کا سائز بدلا گیا تو مضامین پرانے سائز کے ڈیڑھ گنے سے بھی کچھ زیادہ دئے جانے لگے خدا کا کچھ ایسا کرم شامل حال رہا کہ باوجودیکہ مضامین کے انتخاب میں سختی سے میں کام لے رہا تھا مضمونوں کی کسی ماہ کمی نہ ہوئی بلکہ دو دو ماہ کے پرچوں کے قابل اشاعت مضامین ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور مضامین کی کثرت عصمت کا معیار بلند ہونے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

سنہ ۲۹ء

سنہ ۲۹ء میں میرا دوسرا نکاح ہوا تو آمنہ نازلی صاحبہ نے عصمت کی ادارت میں تو بہت کم لیکن نئی کتابوں کی تیاری میں معقول مدد دینی شروع کی اور عصمتی دسترخوان جیسی مفید کتابیں تیار کر کے خواتین ہند کی ایک اشد ضرورت کو پورا کر دیا۔ سنہ ۲۹ء عصمت کا بہت کامیاب سال تھا۔ اشاعت کے اعتبار سے عصمت ہندوستان کے تمام زنانہ پرچوں سے آگے نکل چکا تھا۔ مضمون نگار خواتین کی تعداد سو سے اوپر پہنچ چکی تھی اور مضامین کا معیار کافی بلند تھا۔ اخراجات گو سنہ ۲۹ء میں بہت زیادہ تھے تاہم اب پرچہ اپنا خرچ نکالنے لگا تھا۔ عصمت کے سنہ ۲۹ء کے متعلق جنوری سنہ ۳۰ء کے پرچے میں حضرت والد مغفور کا جو مضمون شائع ہوا تھا اسکا ایک حصہ بھی اس موقعہ پر نقل کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ عصمت کے سنہ ۲۹ء پر تبصرہ تھا:۔

"میں نے جس وقت عصمت میاں رازق کے سپرد کیا تھا اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اپنی آنکھوں سے عصمت کو اسقدر کامیاب دیکھ سکوں گا کہ اس کی اشاعت ہندوستان کے کسی زنانہ پرچے سے کم نہ ہوگی اور ملک کی بہترین اہل قلم اس کی نامہ نگاری میں مصروف ہونگی، اور پیچیدہ سے پیچیدہ زنانہ مسئلہ عصمت کے ذریعہ سے طے ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں عصمت کا سنہ ۲۹ء نہایت کامیاب سال ہے اس لئے نہیں کہ ہر مہینہ کا پرچہ پابندی وقت کے ساتھ ۳۰ تاریخ کو شائع ہوا بلکہ اس لحاظ سے کہ باوجود مالی ترقی کے یہ مواقع موجود ہونے کے کہ بعض اشتہارات کی توقع سے بہت زیادہ اجرت پیش کی گئی اور یہ نہ ہونے سے کہ سرکاری اشتہارات اس میں شائع ہو سکیں عصمت نے نہایت استقلال سے کام لیا۔ اور ان اشتہارات سے بھی پرہیز کیا جو بہنوں کے واسطے کچھ مفید نہیں میں اس موقعہ پر جہاں میاں رازق کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں وہاں عصمتی بہنوں کو بھی جن کی توجہ نے عصمت کو ایک

حد تک بے نیاز کر دیا اور اشاعت میں جو ترقی ۲۹ء میں ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔

میرے دوران ادارت میں ہر پرچہ جو صرف ہوتا تھا اسوقت اس سے بلا مبالغہ چھ گنا زیادہ صرف ہو رہا ہے مگر اشاعت چھ گنی نہیں ہے۔ اخراجات میں تصاویر ہی کی ایک ایسی مد ہے کہ میں دیکھ کر متحیر اور ششدر ساکت ہو جاتا ہوں ۲۶ء میں ایک تصویر دی جاتی تھی مگر لڑکیوں کے مذاق کی وجہ سے تصویروں کی تعداد اتنی بڑھانی پڑی کہ شاید اردو کا کوئی رسالہ بھی اتنی تصویریں نہیں دیتا اس پر یہ احتیاط اور بھی زیادہ رقم لیتی ہے کہ ہر تصویر عورتوں کے دائرہ پسندیدگی اور مذاق کے موافق ہو۔ . . . اگر میری کتابوں کی آمدنی عصمت کو مدد نہ دیتی تو باوجود ترقی اشاعت کے عصمت بآسانی ان اخراجات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

عصمت کی یہ کوشش کہ لڑکیوں میں نامہ نگاری کا شوق پیدا ہو یقیناً قابل شکریہ ہے اس سلسلہ میں جس قدر روپیہ وہ ہر سال معاوضہ اور انعام کی صورت میں تقسیم کر رہا ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور میں اس پر میاں رازق کی جس قدر حوصلہ افزائی کروں کم ہے۔

اس سال میرے پاس بعض بہنوں کے خطوط آئے کہ عصمت مضامین کے انتخاب میں غیر معمولی سختی سے کام لے رہا ہے اور انکے مضامین شائع نہیں ہوتے . . . ان عزیز بہنوں کو میں ہدایت کرونگا کہ وہ تحریر کا معیار بلند کریں اور لکھتے وقت یہ خیال فرمائیں کہ پڑھنے والی بہن نے جو وقت مطالعہ میں صرف کیا وہ بے کار نہ جائے بلکہ اسکا کچھ معاوضہ اسے ملے . . . . . مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عصمت ۲۹ء کے مضامین کی تعداد ہر پرچہ پر فوقیت لے گئی اور اکثر مضامین نہایت ضروری اور مفید شائع ہوئے اور پامال مضامین سے جن پر بارہا بحث ہو چکی ہے اوراق سیاہ نہیں ہوئے . . . . مجھے سب سے زیادہ خوشی اس کی ہے کہ بھرتی کے مضامین سے اس کے اوراق پاک رہے۔

زنانہ پرچوں میں اس سال باہمی کشمکش بھی رہی اور ایک ایسا مسئلہ پیش آگیا جس پر دونوں طرف سے ورق کے ورق زنانہ اور مردانہ پرچوں کے سیاہ ہوئے اس سلسلہ میں بہت سے مضامین عصمت میں بھی اشاعت کے واسطے آئے مگر میں نے میاں رازق کو سختی سے ہدایت کر دی کہ انکی اشاعت تو درکنار اگر عصمت کے خلاف بھی کچھ لکھا جائے تو حتی الوسع اس کے جواب دینے کی کوشش نہ ہو۔"

عصمت کے ۲۹ء کے متعلق حضرت والد مغفور علیہ الرحمۃ کے تبصرہ کا جو حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے اس میں بعض امور کی کسی قدر تشریح ضروری ہے۔

اشتہارات کے چند اصول

اشتہارات سے اخبارات و رسائل کو بہت معقول مدد ملتی ہے۔ اور بعض پرچوں کی آمدنی تو مستقل خریداروں کے چندہ سے اتنی نہیں ہوتی جتنی اشتہارات کی اُجرت سے، عصمت اگر تجارتی پرچہ ہوتا تو ہمیشہ مالی پریشانیوں میں نہ گھرا رہتا۔ اشتہارات کے معاملہ میں عصمت کا ہمیشہ یہ اُصول رہا کہ خواہ کتنی ہی زیادہ اُجرت پیش کی جائے لیکن اگر وہ عصمت کے معیار پر پورا اترے تو قبول کر لیا جائے ورنہ کسی صورت میں شائع نہ کیا جائے بعض پرچے ڈنکے کی چوٹ دعوے کرتے ہیں کہ ہم تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے اشتہارات شائع نہیں کرتے لیکن میں نے تو ان میں سے اکثر پرچوں میں جن کا مطالعہ کرنے والیاں زیادہ تر کنواری لڑکیاں ہیں ایسے ایسے اشتہارات

دیکھے ہیں جو شریف مرد بھی اپنی مستورات کے سامنے نہیں پڑھ سکتے۔ بہر حال اشتہارات کے معاملہ میں عصمت کا سب سے پہلا اُصول یہ رہا کہ صرف وہ اشتہارات شایع کیے گئے جو ایک شریف بیٹی اپنے باپ کے سامنے اور ایک شریف بہن اپنے بھائی کے سامنے پڑھ سکے۔ پھر عصمت کو جس وقت یہ معلوم ہوا کہ اس اشتہار میں سوائے فریب اور دھوکے کے اور کچھ نہیں تو بڑی سے بڑی اُجرت کی عصمت نے پرواہ نہیں کی اور اشتہار شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ ان اصولوں کی پابندی سے اشتہارات سے جو آمدنی ہو سکتی تھی اس کے ستر اسّی فی صدی حصہ سے عصمت فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور ہر ماہ کئی کئی صفحوں کے اشتہارات کی اُجرت ابتک واپس کر رہا ہے۔

معاصرین سے تعلقات

نئے نئے زنانہ پرچے عصمت کے ہر دور میں جاری ہوتے رہے اور بعض پرچوں نے اکثر اعتبار سے عصمت کا چربہ اُتارنے کی ناکام کوشش کی اور اپنی کامیابی کی جدوجہد میں اپنی طرف سے عصمت کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ایک صاحب نے دو مضمون روانہ فرمائے دونوں ناقابل اشاعت تھے انھیں غصہ آگیا اور ایک زنانہ پرچہ جاری کر دیا عصمت چونکہ تبادلہ میں اشتہارات شائع نہیں کرتا انکا اشتہار بھی شائع نہ ہو سکا۔ خدا جانے کب تک اور کیسے کیسے غیر مہذب الفاظ میں انکا عصمت پر غصہ اترتا رہا۔ ایک صاحب سے اُسوقت تک تعارف نہ ہوا تھا چند بے تکلف دوستوں میں پہلے دس گالیاں دیتے اس کے بعد کوئی بات زبان سے نکالتے۔ اپنے پرچہ کے جاری کرنے کی جو وجوہ بیان فرما رہے تھے وہ بھی کچھ ایسی ہی سی تھیں، جب ان سے تعارف ہوا تو بہت اچھی طرح ملے اور اپنے پرچہ کا اشتہار بھیجا اور ریویو کے سلسلہ میں دو ایک دوستوں سے بھی خطوط لکھوائے انکے ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکی اس لئے عصمت سے سخت ناراض ہو گئے۔ اور تربیت گاہ کے خلاف صرف اس وجہ سے لکھا کہ اڈیٹر صاحب کے اس ارشاد کی کہ مضمون نگار خواتین کے پتے ان کو لکھ دئے جائیں تعمیل نہ ہو سکی عصمت نے اپنے کسی معاصر کی اس مخالفت اور خفگی کی پرواہ نہیں کی اور بجائے ان فضولیات میں وقت ضائع اور اوراق سیاہ کرنے کے اپنی ناچیز خدمات میں مصروف رہا۔ چند ایسے بھی پرچے تھے جو دوسرے معاصرین کو نیچا دکھانے کی کوشش میں عصمت کی مدد یا حمایت حاصل کرنی چاہتے تھے۔ ایک صاحب تو صرف مجھ سے ملنے کے لئے تین دفعہ دہلی تشریف لائے۔ ایک موقع پر وہ اپنے ایک معاصر کو کچھ اس قسم کا نقصان پہنچانا چاہتے تھے جس سے عصمت کو معقول فائدہ ہو سکتا تھا مگر نہ صرف انکو کورا جواب دیدیا گیا بلکہ اس ارادہ سے باز رہنے کا دوستانہ مشورہ بھی دیا گیا ایک دفعہ وہ صرف اس غرض سے تشریف لائے کہ ان کی ذات پر انکا وہی معاصر ظلم کر رہا تھا اور عصمت کو از روئے انصاف مدد کرنی چاہئے تھی۔

عصمت نے دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دینا پسند نہ کیا اور اس سے یہ توقع اس لئے بھی نہیں کرنی چاہئے تھی کہ وہ اپنے ذاتی معاملات تک میں خاموش تھا۔ یہ صاحب بہت ناراض ہوئے۔ ابا جان سے انھوں نے میری شکایتیں کیں، ناراضگی کے خطوط لکھے اور اپنی تائید میں عصمت کی بعض ان مضمون نگار خواتین کے مضامین اور خطوط بھجوائے جن سے میرے حقیقی بہنوں کے سے تعلقات تھے۔ میں اسوقت بھی ٹس سے مس نہ ہوا اور ابا جان کی ہدایت کے بموجب عصمت نے اس جھگڑے میں بڑے سے بڑا زور پڑنے پر بھی کوئی حصہ نہ لیا۔ تیسری دفعہ پھر یہ صاحب تشریف لائے، اور میری جان کھا گئے، مجھے افسوس ہے جس نیت سے انھوں نے زنانہ پرچہ جاری کیا تھا وہ درست نہ تھی اور اپنے معاصر کو نقصان پہنچانے کی جو کوششیں وہ فرما رہے تھے وہ بھی صحیح نہ تھیں المختصر وہ اپنی کوشش میں قطعی ناکام رہے اور عصمت میں اس ذاتی بحث مباحثہ کے سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ چھپا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں جو شورش انکے خلاف برپا کی گئی تھی گو اس میں انکے معزز معاصر کا نفس بھی غالب تھا لیکن وہ محترم دوست

بھی اس کے مستحق نہ تھے کہ انکے ساتھ ہمدردی کی جاتی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ بعض معاصرین نے عصمت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں مگر عصمت نے انکے خلاف بھی کچھ نہ لکھا۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۲۹ء کا ایک واقعہ لکھ دینا نامناسب نہ ہوگا۔

محترمہ و۔ا (بلقیس بیگم) صاحبہ ہندوستان کی مشہور مضمون نگار خواتین میں سے ہیں ۱۹۲۹ء کے آخر میں وہ تربیت گاہ کی ہیڈ معلمہ کی حیثیت سے دہلی تشریف لائیں عصمت اور عصمت بکڈپو کو بھی انسے بیش بہا قلمی مدد ملتی رہی۔ ایک معزز معاصر جس نے پہلے بھی کئی مرتبہ عصمت کو نقصان پہنچانے کی کوشش فرمائی تھیں اس موقع پر بھی نہ چوکا اور اپنے ایک معتبر ایجنٹ کو انکے قیام گاہ پر بھیجا اور اس نے اڈیٹر رسالہ کی ہدایات کے بموجب محترمہ موصوفہ کو ہم لوگوں کی طرف سے بددل کرنے کی انتہائی کوششیں کیں۔ ٹیپ کا بند یہ تھا کہ وہ پرچہ آپ کی صحیح قدردانی کرے گا آپ وہاں تشریف لے جائیں تو فایدہ ہی فایدہ ہے۔ اگر گفتگو کا یہی مقصد ہوتا تو بھی غنیمت تھا مگر افسوس یہ ہے کہ مطلب براری کے لئے ہم میں دنیا بھر کے کیڑے ڈالے گئے، محترمہ و۔ا صاحبہ کو اس گفتگو کا بے انتہا رنج ہوا۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ابا جان سے اسکا ذکر کیا، مگر انتقام تو بڑی بات تھی وہ ذات اقدس تو دشمن کے جذبات کو بھی ٹھیس لگانا نہ جانتی تھی۔ خرابی صحت کی بنا پر سال بھر بعد محترمہ و۔ا آگرہ تشریف لے گئیں اور انھوں نے کچھ عرصہ بعد پورا واقعہ خود ہی قلمبند کر کے اشاعت کی غرض سے بھیجدیا تو مینے اس طرح اس مضمون کو شائع کرنا چاہا کہ معاصر مذکور کی بدنامی نہ ہو لیکن عصمتی بہنوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ لوگ اپنے فائدہ کے لیئے غیروں کو نہیں اُن تک کو جن پر اُنکے احسانات ہیں کیسا کیسا زبردست نقصان پہنچانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ حضرت والد مغفور فطرتاً صلح کل اور امن پسند تھے اور ہر قسم کے جھگڑوں سے قطعی الگ تھلگ رہتے اور دشمنوں اور حاسدوں تک سے برتاؤ انتہائی شرافت کا کرتے تھے انکے اعلیٰ ظرف نے اس مضمون تک کی اشاعت کی مجھے اجازت نہ دی اور فرمایا۔

''تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت سے ممکن ہے اس پرچہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اگر تم کسی کو کوئی فایدہ نہیں پہنچا سکتے تو کوئی نقصان بھی نہ پہنچاؤ''

اندراج مضامین کے چند اصول

جس طرح برسات کے موسم میں جب اودی اودی گھٹائیں اُٹھ رہی ہوں دریا کے کنارے کڑاہی چڑھ رہی اور گرم گرم چیزیں اُتر رہی ہوں تو پیٹ بھرے بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کچھ اسی طرح سے اخبارات و رسائل کی سنسنی خیز ہیجان انگیز خبریں اور چٹ پٹی مزیدار گرما گرم بحثوں میں اچھی خاصی سنجیدہ اور متین طبیعتوں کو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طریقہ سے عارضی ہی سہی خریداروں کی تعداد میں کئی کئی گنا اضافہ ہو جاتا اور بعض حالات میں کافی مالی فایدہ ہوتا ہے۔ اس مشاہدے کے بعد عصمت میں بھی بحث مباحثہ اور کسی نہ کسی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کے لئے کافی میدان تھا۔ بڑی بڑی شخصیتوں تک عصمت بھی بہت کامیابی کے ساتھ پہنچ سکتا تھا اور اکثر اس قسم کے مواقع پیدا ہوتے رہتے کہ تعلیم یافتہ خواتین کی ہر محفل میں اور ہر مجلس میں عصمت کے گرما گرم مضمونوں کا چرچا ہوتا رہتا۔ لیکن ہنگامی مضمونوں اور فضول بحثوں سے جن سے خریداروں کو کوئی فایدہ نہ پہنچ سکے خدا کا شکر ہے اوراق عصمت ہمیشہ پاک رہے۔ زنانہ مسائل پر عصمت نے نہایت مفصل اور مدلل بحثیں کیں جو خواتین میں بہت مقبول ہوئیں لیکن متانت وقار تہذیب شائستگی سنجیدگی کو عصمت نے سب سے پہلے ملحوظ رکھا۔ لڑکیوں کی تعلیم انکے شرعی حقوق۔ بچوں کی تربیت۔ فرائض کی ذمہ داری۔ معاشرتی اصلاح۔ مغربی تقلید۔ مشرقی خوبیاں غرض مختلف موضوعوں پر مختلف الخیال خواتین و حضرات نے رائے

زنی کی۔ عصمت کی جہاں یہ خصوصیت رہی کہ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ایسی بحث نہ چھڑے جو فریقین کو ناگوار گزرے اور جسکا کسی جماعت کے عقائد پر اثر پڑے وہاں اسکا کوئی مضمون ذاتیات سے بھی آلودہ نہ تھا۔ عصمت نے کوئی بحث چھیڑی تو پہلے اس پر غور کر لیا کہ ہندوستانی خواتین کے لئے یہ کہاں تک مفید ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر میں صرف ایک بحث کا حوالہ دیتا ہوں۔ غالباً سنہ ۳۵ء کا ذکر ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی خواتین کی صحت کے لئے مناسب ہے کہ وہ بھی اب مغربی خواتین کی طرح سر کے بال کتروا کر بوبڈھیر یا پٹھے رکھیں۔ حقوق نسواں اور اصلاح نسواں کے سلسلہ میں حضرت والد مغفور نے اور عصمت نے ساری عمر مسلمانوں کی گالیاں کھائیں۔ تنگ خیال اور کوتاہ بیں طبقہ کی طرف سے اس موقع پر بھی عصمت کے خلاف ایک خاصہ فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ تھا مگر میری رائے میں اس مضمون کی اشاعت بے انتہا ضروری تھی کیونکہ جو قوم حاکم ہوتی ہے اسکا ہر فعل اور ہر طریقہ محکوم قوم کی نگاہ میں مستحسن اور اس لئے قابل تقلید ہوتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اپنی یورپین استانیوں کی بود و باش کے طریقوں، میل جول کے اصولوں اور لباس کی وضع قطع طرز گفتگو آزادی بے باکی کے مشاہدوں اور انکے خیالات کا ممکن ہی نہیں کہ کچھ نہ کچھ اثر قبول نہ کریں، انکا تھوڑا بہت پرچھاواں پڑنا لازمی اور ضروری۔ جب روزمرہ انکی بال کٹی استانیاں انکے سامنے آئیں گی اور کبھی کبھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں بال کٹوانے کے فایدے بھی بیان فرماتی رہینگی تو پانی بھی بار بار پڑنے سے پتھر میں جگہ پیدا کر لیتا ہے یہ تو ناتجربہ کار لڑکیوں کے نرم دل ہوئے، اسی طرح شادی شدہ قدامت پرست لڑکیوں کو کم مگر مہذب ترقی یافتہ، جدت پسند بیبیوں کو زیادہ، سینما میں دیکھنے یا اپنے شوہروں اور بھائیوں کے ملنے والوں کی بیویوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بہر حال کوئی فائدہ تو ہوگا ہی جو انھوں نے بال کتروا ڈالے۔ دُنیا کا بڑے سے بڑا جرم بھی سب سے پہلے ایک ہلکے سے خیال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور جس طرح پہلے ایک ننھا سا بیج پھوٹتا اور پھر آہستہ آہستہ جڑ پکڑنی شروع کر دیتا ہے اسی طرح خیالات مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر بال کٹوانے میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں تو اس سے پہلے کہ عقل رہنمائی کر کے نقصانات کو نمایاں کرے، دل ظاہری فائدوں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ فلاں شخص نے جو یہ طریقہ اختیار کیا تو کیوں، بال کتروانے کا خیال گذشتہ دس سال میں سو پچاس نہیں ہزاروں ہی عورتوں کے دل میں پیدا ہوا، اور میرے علم میں ہیں کئی مسلمان بیبیاں جنہوں نے بال کتروا بھی ڈالے، انکا شوق تھا یا ضرورت اور اچھی تھی یا بُری مجھے اس سے بحث نہیں لیکن بجائے اس کے کہ حاکم قوم کی اندھی تقلید محکوم قوم کرے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو بات کشمکش پیدا کر رہی ہو اس کے دونوں پہلوؤں کو خوب اچھی طرح سے واضح کر دیا جائے۔ اور پھر اگر اس میں فائدے زیادہ نظر آئیں اور وہ ہمارے حسب حال ہو سکے اور ہم اسے نبھا بھی سکیں تو شوق سے اختیار کریں۔ اس خیال کے بموجب میں نے اپنے نوٹ کے ساتھ اس مضمون کو بہت خوشی کے ساتھ درج رسالہ کر کے ہر خیال کے طبقہ کی خواتین اور حضرات کو رائے زنی کرنے کی دعوت دی۔ چار پانچ ماہ یہ بحث چلی اور چند خاص خاص اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ڈھائی تین درجن مضامین اور خطوط اسی سلسلہ میں شائع کیے گئے۔ عصمتی بہنوں کے سامنے تصویر کے دونوں رخ آ گئے، جو خیال انکے دل میں پہلے پیدا ہوا ہوگا یا آگے جاکر پیدا ہوتا اور وہ اس پر غور کر سکیں عصمت نے اسے نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا اور پڑھنے والیاں اندھی تقلید کرنے کی بجائے اپنے حالات کے اعتبار سے ایک نتیجہ پر پہنچ گئیں اور مناسب فیصلہ کر سکیں۔

اسی طرح گذشتہ سال ایک مسلمان گریجویٹ بہن کا ایک نہایت سخت مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے قدامت پرستی

کے خلاف بہت کچھ لکھا اور مغربی تہذیب کی تعریف فرمائی، بقول ایک محترم دوست کے عصمت اس قسم کے مضامین ہرگز برداشت نہ کرسکتا تھا لیکن جو خیالات ان بہن کے تھے اور بھی بہت سی بہنوں کے تھے اور اس لئے عصمت کو اس مسئلہ پر بھی بحث کرنی ضروری تھی۔ اس موضوع کی مخالفت میں بھی اور موافقت میں بھی کافی مضامین شائع ہوئے اور عصمتی بہنوں کو فریقین کے خیالات معلوم ہونے کے بعد خود ایک فیصلہ کرنے کا موقع دیا گیا۔

مضامین کی سختی کے سلسلہ میں جن بہنوں نے ابا جان فردوس آشیاں سے شکایت کی، انھوں نے بعد میں تسلیم کر لیا ہوگا کہ میری سختی میرے ذاتی فایدے کے لئے نہیں عصمتی بہنوں ہی کے فایدے کے لیئے تھی میں نے اپنے لئے جو اصول مقرر کر لئے تھے یا جن پابندیوں میں اپنے تئیں جکڑ دیا تھا ان پر میں سختی سے اس لئے بھی عمل کر رہا تھا کہ حضرت والد مغفور میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور میری کمر اسقدر مضبوط تھی کہ مجھے کسی چیز کی مطلق پرواہ نہ تھی، میں نہ کسی شخصیت سے کبھی مرعوب ہوا نہ کسی ہنگامی جذبہ کے تحت میں لکھے ہوئے کسی ایسے مضمون کو شائع کیا جس سے عصمت کو تو کچھ فایدہ پہنچ سکتا تھا لیکن عصمتی بہنوں کو قطعی کوئی فایدہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ میں دو ایک واقعات بھی بیان کر دیتا ہوں۔ جن سے معلوم ہو سکے گا کہ جب ابا جان خلد آشیاں کا مقدس اور بابرکت سایہ میرے سر پر سلامت اور قایم تھا تو میں کس شان سے پرچہ مرتب کر رہا تھا۔

۱۹۳۱ء میں عصمت کی مشہور مضمون نگار محترمہ زہرہ بیگم صاحبہ فیضی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے والیان ریاست کے ان مظالم پر آنسو بہائے جو وہ اپنی بیگمات اور رانیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں راجاؤں اور نوابوں کا اپنی بیویوں کے ساتھ جو سفاکانہ ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک ہے چونکہ مجھے ذاتی طور پر انکا کچھ علم تھا اور چونکہ جو واقعات اس مضمون میں لکھے گئے تھے وہ تھوڑے بہت معلوم بھی تھے اس لئے میں نے فوراً اس مضمون کو درج رسالہ کر دیا۔ اس کے جواب میں میرے پاس تین ریاستوں سے مضامین آئے مگر چونکہ ضمیر کو مجروح کرکے اور ایمان نگل کر، حقوق نسواں کی پامالی کی حمایت میں لکھے گئے تھے میں نے انکی اشاعت سے صاف انکار کر دیا اور ناقابل اشاعت مضامین کی فہرست میں بھی غالباً ان مضامین کے عنوانات درج کر دیئے، اس سلسلہ میں دو صاحب دہلی آئے، اور مجھے مرعوب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ انکی عنایات کا شکریہ ادا کرکے میں نے عرض کر دیا کہ عصمت انکی تائید نہیں کر سکتا۔ اور بہت سے زنانہ پرچے ہیں۔ اس جواب کا نقصان عصمت کو جو پہنچ سکتا تھا وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ قسم خاص کے جو رسالے یہ ریاستیں خرید رہی تھیں وہ بند کر دیتیں چنانچہ دو پرچے بند بھی کر دیئے گئے مگر عصمت اپنے اُصول سے نہ ہٹا۔

عصمت کی ایک مشہور مضمون نگار بہن کا ایک دفعہ ایک مضمون کثرت ازدواج کی موافقت میں موصول ہوا تو مجھے بے انتہا تعجب ہوا تھا کہ کس طرح انکے قلم سے یہ مضمون نکلا۔ کیونکہ حقوق نسواں کی حمایت میں اکثر انکے مضامین دوسرے پرچوں میں بھی شائع ہوئے تھے۔ مضمون کچھ ایسا مدلل بھی نہ تھا لیکن مؤثر کسی حد تک ضرور تھا، یہ مضمون میں نے شائع نہیں کیا اور اس کے متعلق انھوں نے کئی مرتبہ دریافت فرمایا تو میں نے اسکا جواب بھی نہ دیا یہ بہن مجھ سے سخت ناخوش ہو چکی تھیں اور انھیں مجھ سے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میں انکے ایسے "ضروری" مضمون کی اشاعت میں اسقدر تاخیر کر دونگا۔ مگر کچھ مدت بعد جب میں نے اپنے خط میں انکے اس مضمون پر اپنی حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا تو انکا جو خط حضرت والد مغفور کے نام موصول ہوا۔ وہ عورت کی مجبوری بے کسی اور بے بسی کا آئینہ تھا۔ مضمون ان کے شوہر نے اُن سے لکھوایا تھا اور اطاعت شوہر کی مجسم تصویر نے صرف شوہر کی خوشنودی کے لیئے اپنے خیالات کے قطعی خلاف مرد کے نکاح ثانی کی پُرزور حمایت صرف

اس لئے کی تھی کہ ان کے شوہر دوسری شادی کر رہے تھے۔



۱۹۳۲ء اس دور میں ۱۹۳۲ء سب سے زیادہ کامیاب سال تھا نہ صرف اس اعتبار سے کہ سب سے زیادہ کتابیں اس سال شائع ہوئیں اور عصمت بک ڈپو کی آمدنی پہلے سے کافی زیادہ ہو گئی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ عصمت کی مالی حالت اب قابل اطمینان ہو گئی تھی۔ پہلے کتابوں کی آمدنی سے عصمت کو مدد مل رہی تھی مگر اب باوجودیکہ مضمون نگاروں کو انعامات اور معاوضہ ہزار بارہ سو روپیہ سالانہ دیا جا رہا تھا عصمت سے کچھ نہ کچھ روپیہ بچ رہا تھا۔ اور مستقل اشاعت چار ہزار سے اوپر پہنچ گئی تھی۔ مضامین کی کثرت کی وجہ سے رسالہ کا ایک چوتھائی حصہ اور بعض بعض ماہ اس سے بھی زیادہ صفحات باریک لکھوا کر زیادہ سے زیادہ مضامین اسی سال سے چھپنے شروع ہوئے جو ۱۹۲۸ء سے قبل یعنی پرانے سائز کے ڈیڑھ سو صفحوں کے برابر ہوتے تھے۔

مضمون نگاران عصمت اب عصمت ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اس کے مضمون نگاروں کی تعداد نسوانی پرچوں کا تو ذکر ہی کیا مردانہ ادبی رسالوں کے مضمون نگاروں سے بھی بہت زیادہ تھی عصمت کے اس دور میں قدیم مایہ ناز لکھنے والیوں مثلاً محترمات صغرا ہمایوں مرزا۔ زہرہ فیضی۔ نذر سجاد حیدر۔ حامدہ بیگم الخیری۔ سلطان بیگم کے علاوہ ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کی نہایت معقول جماعت عصمت کی مضمون نگاری کر رہی تھی محترمات نوشابہ خاتون قریشی بی اے فاطمہ بیگم منشی فاضل مصنفہ غیرت کی پتلی وغیرہ امۃ الوحی مصنفہ "شہید وفا" رفیعہ کرانیہ (اس۔ ار کے) مصنفہ "منیرنگ" و۔ آ۔ (بلقیس بیگم) مصنفہ "خانہ داری کے تجربات" مسز بر لاس (اشرف جہاں بیگم دہلوی) مصنفہ "فغان اشرف"۔ خدیجہ بائی مؤلفہ "سلمہ ستارہ کا کام" خورشید آرا بیگم منشی فاضل۔ ادیب فاضل۔ سردار محمدی بیگم۔ نواب قمر جہاں بیگم۔ ظفر جہاں بیگم مصنفہ "اختری بیگم" تہذیب فاطمہ عباسی۔ جمیلہ بیگم مصنفہ "فیروزہ"۔ ح۔ ا۔ ابو۔ فاطمہ انور علی مؤلفہ "عصمتی کروشیا" حجاب اسمٰعیل مصنفہ "ادب زریں" فاطمہ بیگم منشی فاضل لکھیم پور۔ محمدی بیگم بی اے۔ نور جہاں بیگم ناز۔ بغدادی بیگم۔ جہاں بانو۔ بیگم نقوی بی اے مصنفہ "پرواز خیال" علیا ظفر وغیرہ کے مضامین اور نظمیں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی اور قبولیت عام کا خلعت حاصل کرتی رہیں عصمت خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا اس کے سلسلہ میں ۱۹۲۶ء سے جنت مکانی خاتون اکرم کی یادگار میں ہر سال مضمون نگار بیبیوں کو بہترین مضامین پر معقول انعامات بھی نقد روپیہ کی صورت میں دے رہا تھا۔ اس سے بھی عصمت کو اپنے اس مقصد کی کامیابی میں مدد ملی۔ ان انعامات نے بھی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی اور لکھنے والیوں کی ایک کثیر جماعت پیدا ہو گئی۔ عصمت کا یہ وہ دور تھا جس میں ہر حصہ ملک میں عصمت کی مضمون نگار خواتین کے بہت کافی نام گنوائے جا سکتے ہیں عصمت کی جن مخصوص مضمون نگار خواتین نے اپنی مفید مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے گراں بہا خیالات اور تجربوں سے اپنی ہزاروں بہنوں کو مستفید فرمایا اور زیادہ سے زیادہ مضامین لکھ کر عصمت کی گراں بہا امداد فرمائی ان میں محترمات کنیز محمد بیگم منشی فاضل۔ شہر بانو۔ مہر النسا۔ فاطمہ خیری برنی۔ عائشہ بیگم مسز غلام رسول۔ مسز فضلی۔ مسز یوسف الزماں عطیہ نصرت خانم انیس فاطمہ بنت بسوق۔ بیگم کپتان نصیر الدین احمد خورشید اقبال حیا۔ سلطانہ آصف۔ ہر ہائینس نواب فاطمہ صدیقہ۔ ممتاز رفیع۔ امۃ الحفیظ۔ ایس بی طاہرہ۔ ایس کے صغرا سبزواریہ۔ بلقیس جمال۔ رابعہ پنہاں۔ مرحومہ حمیدہ خانم ایم اے۔ غدیر فاطمہ۔ شائستہ اختر بانو سہروردی بی اے (آنرس) تہذیب النسا بی اے۔ مریم یوسف علی بی اے۔ سکینہ چراغ الدین بی اے۔ رحمت النسا بیگم بی اے کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان خواتین کے اکثر و بیشتر مضامین حلقہ عصمت میں غیر معمولی پسندیدگی سے دیکھے گئے اور قابل قابل مردوں نے انکی تعریف کی۔ ان محترم خواتین کے متعدد مضامین

اپنے اپنے موضوع پر بہترین اور اس لئے خاتون اکرم عصمتی انعامات کے مستحق قرار دئے گئے علاوہ ازیں ان میں سے کئی بہنوں کے بعض بعض سال سب سے زیادہ مضامین شائع ہوئے۔ مقتدر خواتین کی اس جماعت کے علاوہ بھی عصمت نے کئی درجن لکھنے والیاں پیدا کیں جن کے مختلف موضوعوں پر، مفید معلومات سے پُر، نتیجہ خیز دلچسپ مضامین معقول تعداد میں شائع ہوئے، ان بیبیوں میں محترمات صالحہ خاتون پانی پتی۔ جابیانہ خاتون بدایونی۔ بیگم اصغر حسین لکھنوی۔ ب۔ ن۔ ابراہیم مدراس۔ اُم عاصمہ گلبرگہ۔ حمیدہ نذیر۔ لطف النسا بیگم۔ مسز حمید۔ شزانت بیگم ادیب فاضل۔ گ۔ ن کپور تھلہ۔ نزہت افضل۔ سرور جہاں رعنا۔ حفیظہ جمال۔ بشیر النسا بیگم۔ بشیر۔ افضل النسا بیگم جوہری۔ بیگم یار محمد۔ بیگم حفاظت علی۔ رضیہ دل شاد۔ اختر خانم بندر عباس۔ سلیمہ مرتضیٰ بی اے۔ آر۔ بی۔ آمنہ نازلی اے آر بیگم ظہیر الدین دہلوی۔ ر۔ س۔ شہر آرا بیگم۔ قیصرہ بیگم کلکتہ۔ معتصمۃ الرحمن۔ منظور مبارک علی۔ نشاط افزا۔ عالم آرا بیگم۔ رقیہ بیگم۔ ر۔ س۔ راجکماری جھینگن۔ کرشن کماری۔ مسز مجیب دہلی۔ مسز گر راج بہاری ماتھر۔ کستوری دیوی۔ عابدہ بیگم رعنا۔ ادریس بیگم شمسہ شمع۔ نعیمہ بیگم۔ ص۔ بیگم قریشی۔ ص تقی الحسن۔ تسنیم فردوس۔ رضیہ ناصرہ۔ سلطان بیگم۔ ک۔ خاتون۔ مرحومہ حلیمہ خاتون۔ عطیہ سعید۔ اسما سعید۔ ار۔ کے۔ کنیز فاطمہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ان میں بعض بہنوں نے شادی ہو جانے کے بعد بعض نے خرابی صحت کی بنا پر اور بعض نے خانہ داری کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے مضامین لکھنے چھوڑ دئے لیکن کثرت ان خواتین کی ہے جنہوں نے اپنی بہنوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے مضامین لکھنے شروع کئے تو باوجود دُنیاوی افکار اور ذمہ داریوں کی ادائگی کے انہاک کے جب موقع ملا عصمت کے لئے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔

مضمون نگار مردوں کی جو کثرت پانچ سات سال سے ہے پندرہ بیس سال قبل نہ تھی لیکن جس طرح اُس زمانہ میں منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین شائع ہو رہے تھے اسی طرح اس دور میں بھی اُن حضرات سے خاص طور پر لکھوایا گیا۔ جو خواتین کے مذاق اور مطلب کے مضامین لکھنے کی قدرت اور انکی اصلاح و ترقی کا دل میں درد رکھتے ہیں، مضمون نگاران عصمت میں پروفیسر ستار خیری صاحب ام اے۔ کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب۔ مولوی محمد ظفر صاحب ام اے۔ لالہ تلوک چند محروم اے ایم۔ مولوی سید راحت حسین صاحب بی اے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ مولوی عبد الغفار صاحب الخیری۔ منشی پریم چند صاحب بی اے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے۔ پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ام اے۔ افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ مولانا محوی صدیقی۔ ڈاکٹر اعظم کریوی۔ حضرت امداد عظیم آبادی۔ حضرت عشرت لکھنوی وغیرہ وہ حضرات ہیں جن کے مضامین حاصل کرنے کی اردو رسائل انتہائی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ منتخب حضرات ہیں جنھیں مسائل نسواں سے دلچسپی ہے اور اپنے اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں ان حضرات کے مضامین بالعموم اور کسی زنانہ پرچے میں نہیں چھپتے لیکن عصمت کے مخصوص لکھنے والے ہیں اور عصمت کے ذریعہ ہندوستانی بیبیوں کی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں عصمت کا یہ دور جن بزرگوں کی نظموں اور مضامین سے مزین ہے ان میں افسوس حضرت عزیز لکھنوی۔ حضرت خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی۔ مولانا عبد الحلیم شرر منشی عبد الخالق خلیق دہلوی۔ اور میر باقر علی داستان گو۔ اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ خدا ان سب کی مغفرت فرمائے۔ انکے پاکیزہ خیالات اوراق عصمت پر اب انکی یادگار باقی ہیں۔

اُس زمانہ کے مضمون نگاروں میں مولوی نصیر الدین ہاشمی۔ مسٹر ضیاء الدین احمد برنی بی اے۔ مولانا اسعد الاشرفی عرشی دہلوی۔ خانصاحب مولوی عبد الغفور خاں صاحب۔ حضرت امام اکبر آبادی۔ جے آر رائے صاحب۔ پروفیسر طاہر رضوی۔ حضرت محمود اسرائیلی

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ پروفیسر طاہر جمیل۔ مرزا عثمان اشرف گورگانی۔ قاری محمد عباس حسین صاحب دہلوی۔ اور سید ابو تیمیم صاحب فرید آبادی جیسے مشہور اہل قلم حضرات کے مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیے گئے۔
ان کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے نسوانی پرچوں میں سب سے پہلے عصمت میں لکھا یا عصمت سے مضمون نگاری شروع کی اور آج خدا کے فضل سے اردو رسائل کے مقتدر اور کامیاب لکھنے والوں میں انکا شمار ہوتا ہے۔ مثلاً۔ صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب بی۔ اے۔ مولوی سید محمود الحسن صاحب صدیقی بی اے۔ مسٹر عبدالحئی عباسی بی اے۔ مولوی عبدالرحمن کاکوروی بی اے۔ سید رضا احمد صاحب جعفری۔ مولوی عشرت رحمانی۔ ام اول۔ تقی علی صاحب ہاشمی۔ مولوی سید مغنی الدین شمسی بی اے۔ مسٹر مفتاح الدین ظفر بی ایس سی۔ سید ابو طاہر صاحب داؤدی ایس سی۔ ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب۔ مولوی اقبال احمد وغیرہ۔

مضمون نگاران عصمت (عورتوں اور مردوں) کے جو نام مندرجہ بالا فہرستوں میں دیے گئے ہیں انسے دوگنی تعداد میں اور مضمون نگاروں کے نام بھی ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کی جلدوں میں نظر آئیں گے۔ لیکن یا تو انھوں نے مستقل مضمون نگاری نہیں کی یا ان کی تحریروں میں کوئی قابل ذکر خصوصیت نہیں۔

سال میں ایک ماہ کی چھٹی

۱۹۲۸ء سے عصمت کے سال میں گیارہ پرچے شائع ہوتے رہے۔ دس عام نمبر اور گیارھواں سالگرہ نمبر جس پر لاگت گو تین ماہ کے پرچوں سے بھی زیادہ کی آتی تھی مگر دو ماہ جولائی اگست کا اکٹھا پرچہ ہوتا تھا اس طرح خریداروں کو تو ۸۰ صفحے ماہوار کے حساب سے ۱۲ ماہ کے ۹۶۰ سے بھی زیادہ قریباً ۱۰۰۰ صفحے مضامین کے مل رہے تھے لیکن خاکسار اڈیٹر کم و بیش ایک ماہ کی چھٹی ہر سال لے رہا اور دلی سے باہر گذار رہا تھا۔ کاروباری حضرات اور بالخصوص اخبارات اور رسالے والے اکثر اپنے پرچوں کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہیں۔ میں بھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے دورہ پر جاتا تھا مگر یہ دورہ میرے کاروبار کے لئے نہ ہوتا تھا۔ تجارتی اصولوں کی پابندی کے ساتھ میں کبھی کام نہ کرسکا۔ میرے ایک ماہ یا سوا ماہ باہر رہنے سے جو نقصان ہوتا تھا وہ پرچوں کے جدید خریدار پیدا کرکے یا کتابوں کی فرمائشیں حاصل کرکے یا سرکاری طور پر کتابوں کی خریداری کے لئے کوشش کرنے سے یعنی مدارس وغیرہ کے لئے اپنی کتابیں منظور کراکے بآسانی اس کی کسر نکال سکتا تھا بلکہ نقصان سے زیادہ منافع کی صورت نکلتی رہتی۔ لیکن سوائے ایک آدھ دفعہ کے میں نے کبھی یہ پسند نہ کیا اور وہ ایک دفعہ کا قصہ یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں بہار منسٹری نے ترقی اردو کے سلسلہ میں بہ حیثیت ماہر اردو کے شمالی ہند سے حضرت والد مغفور کو بلایا۔ جنت مکانی محترمہ خاتون اکرم کے انتقال کے بعد یعنی ۱۹۲۵ء سے حضرت والد مغفور دو روز کے لئے بھی کبھی باہر تشریف لے گئے تو میں انکی خدمت میں حاضر رہا چنانچہ اس موقعہ پر بھی میں ساتھ تھا۔ وہ کمیٹی کے اجلاس میں مصروف تھے اور میں انکی اجازت لے کر سید عبدالحمید صاحب کے ہاں پہنچا جو پٹنہ جدید میں کسی انگریزی دفتر میں ملازم تھے۔ بعض بڑے بڑے حضرات کے متعلق سُنا تھا کہ انھوں نے اپنے پرچوں کے خریدار پیدا کرنے کے لئے دورہ کیا اور بہت اچھی کامیابی ہوئی۔ دو تین حضرات سے اس سلسلہ میں مجھے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ جب مشہور اور نامور اڈیٹروں نے خریداروں کے لئے دورہ کیے تو کیا ہرج ہے میں بھی ایک دفعہ کوشش کرکے دیکھوں، چنانچہ سید صاحب سے ملا اور ان سے خواہش کی کہ آپ اپنی بیگم صاحبہ کو میرے آنے کی اطلاع دیدیجے اگر انکی رائے عصمت کے متعلق اچھی ہو تو انسے فرمایئے کہ عصمت کا اڈیٹر اس غرض سے آپ کے پاس آیا ہے کہ پرچہ کو کچھ خریدار عنایت فرمایئے لیکن یہ بھی کہدیجے کہ کل میں جارہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب

مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا حضرت آپ نے مجھے باندھ دیا۔ بیگم صاحبہ آپ کے پرچہ کی بہت مداح ہیں اور اس کی اشاعت بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہیں لیکن وقت تو آپ بالکل ہی نہیں دے رہے ہے تاہم اس خدمت کے لئے مجھے مامور کیا گیا ہے۔ سید صاحب خلیق ہنس مکھ باذاق اور معاملہ فہم انسان ہیں اور خدا جانے آج کل کہاں ہیں وہ وقت مجھے آج تک یاد ہے کہ انھوں نے اسی روز دفتر کی چھٹی لی اور اپنے ملنے والوں کے پاس مجھے لے کر گئے، میں نے ان سے یہ کہدیا تھا کہ رسالہ کا چندہ میں کسی صاحب سے نہ لونگا۔ صرف آرڈر دلوا دیجئے، شام تک سید صاحب نے چالیس کے قریب آرڈر لکھے جو دہلی بھیجدئے گئے اور ان میں سے بینتیس یا اڑتیس نے وی پی وصول کرلئے، اس تجربہ کے بعد چاہیئے یہ تھا کہ میں ہر سال جب دہلی سے باہر جاتا تو خریدار پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور ایک ایک مہینے اور سوا سوا مہینے کے دورہ میں دو دو سو تین تین سو نئے خریدار ہر سال پیدا کرلیتا۔ مگر پٹنہ میں جو کوشش کی گئی تھی یہی سب سے پہلی اور یہی سب سے آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد دہلی سے جب باہر جانا پڑا مدرسہ کے سلسلہ میں۔ حضرت والد مغفور اگست ستمبر میں جب تربیت گاہ میں چھٹیاں ہوتی تھیں کسی صوبہ کا دورہ فرماکر عصمتی بہنوں اور نباتی بچیوں کو تربیت گاہ بنات پر متوجہ فرماتے تھے۔ انھوں نے عام چندہ کبھی پسند فرمایا نہ کسی ایسے شخص سے مدرسہ کی مالی مدد کی خواہش فرمائی جو انکی خدمات یا تربیت گاہ سے قطعی ناواقف تھا۔ ان دوروں میں والدہ صاحبہ ہمیشہ انکے ساتھ ہوتی تھیں۔ اسکی ایک وجہ تو انکے ہی الفاظ میں یہ تھی کہ

> "میں صرف مردوں تک پہنچ سکتا ہوں۔ مدرسہ کی کیفیت اور بچیوں کی حالت مستورات کو بیگم راشد الخیری ہی بتاسکتی ہیں۔ مائیں خواہ مفلوک الحال ہوں یا خوش حال جب تک اپنا اطمینان نہ کرلیں اور یہ نہ دیکھ لیں کہ ہم اپنا کلیجہ کا ٹکڑا جس عورت کے سپرد کررہے ہیں وہ کس طبیعت اور کس عادت کی ہے اسوقت تک بچیوں کو کس طرح بھیج سکتی ہیں"

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ ابا جان والدہ معظمہ سے زیادہ دن تک علیحدہ نہ رہ سکتے تھے۔ تربیت گاہ کی ضرورتوں سے انتہائی مجبور ہوکر دلی سے باہر گئے تو دو چار روز سے زیادہ جی نہ لگا ان کا اور چند روزہ قیام کتنا ہی ضروری ہوتا مگر فوراً واپس آجاتے۔ والدہ معظمہ کے ہمراہ ہونے سے دو چار دن کیا ایک ایک مہینہ بلکہ ڈیڑھ ڈیڑھ مہینہ کے طویل دورے اطمینان کے ساتھ کئے۔ گویا والدہ معظمہ کا ساتھ ہونا اسی اعتبار سے بھی مدرسہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہورہا تھا۔ روپیہ ابا جان کی شخصیت کو مل رہا تھا اور خوشحال وکم استطاعت اور یتیم ونادار بچیاں اماں جان کی وجہ سے مدرسہ میں بحیثیت بورڈر کے آرہی تھیں دو چار نہیں بیسیوں بچیاں مختلف صوبوں کی محض والدہ معظمہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تربیت گاہ میں آئیں۔

بڑھاپے میں معمولی سفر بھی کافی تکلیف دہ ہوتا ہے یہ دورے تو دور دراز صوبوں اور شہروں کے ہوتے تھے اور مسلسل بیس بیس چوبیس چوبیس گھنٹوں کے، اور بڑے بڑے شہروں ہی کے نہ ہوتے تھے جہاں موٹر اور ربڑ ٹائر گھوڑے گاڑیاں مل جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات قصبوں اور قریوں کے بھی ہوتے جہاں یکے بیل گاڑیاں سگھڑ وغیرہ میسر آتیں پھر ادھر تو ابا جان کو کبھی کبھی اختلاج قلب کی شکایت ہوتی اور زیادہ چلنے پھرنے کے سبب جوڑ جوڑ دکھ جاتا تھا، ادھر اماں جان کو گال اسٹون کی شکایت تھی اور ڈاکٹر کی یہ تاکید تھی کہ کسی اونچے زینے پر نہ چڑھیں۔ کوئی بوجھ نہ اٹھائیں اور گاڑیوں کے جھٹکوں اور ہچکولوں سے محفوظ رہیں۔ پھر ریل کی تکالیف اور زندگی کے اس آخری دور میں جب غذا میں انتہائی احتیاط کی جاتی ہے

مختلف مقامات کے مختلف کھانوں کا بھی صحت پر اثر پڑنے اور بیمار ہوجانے کا اندیشہ رہتا تھا غرض ان حالات میں میرے لیئے قطعی ناممکن تھا کہ میں اپنے ضعیف والدین سے علیحدہ رہ سکتا۔ میں انکی اور صرف انکی خدمت کے لئے مہینہ ڈیڑہ مہینہ کے واسطے دفتر سے غیر حاضر ہوتا تھا میری عدم موجودگی میں دفتر کے انتظامات میں کچھ فرق آجاتا یا کچھ مالی نقصان ہوتا تو میری تیوری پر بل بھی نہ آتا تھا کیونکہ پیدا کرنے والے نے ماں باپ کی خدمت و اطاعت کا جو فرض مجھ پر عاید کردیا تھا اس کی ادائگی اور بخیر واپسی کی خوشی اس نقصان سے کروڑوں گنی زیادہ قیمتی ہوتی تھی۔

میں نے اپنے والدین کے ساتھ آدھے سے زیادہ ہندوستان دیکھ لیا۔ اگر تجارتی مقصد میرے سامنے ہوتا تو ہر دورہ میں عصمت و بنات کے لئے دو دو سو چار چار سو خریدار بنا لینے، اور ڈیڑہ دو ہزار روپیہ کی کتابوں کی فرمائشیں حاصل کرلینی کچھ بھی مشکل نہ تھیں۔ ہر دورہ میں بآسانی دس بارہ صفحوں کے اشتہارات بھی مل سکتے تھے اور ہر شہر کے بڑے بڑے تاجران کتب سے مل کر عصمت بک ڈپو کی آمدنی بھی بہت کچھ بڑھائی جاسکتی تھی۔ اس مضمون کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہوکر تعجب ہوگا کہ باوجود کامیابی کے تمام مواقع موجود ہونے کے میں نے نہ کبھی کوئی اشتہار حاصل کیا نہ کسی تاجر کی کوئی فرمائش۔ نہ محکمہ تعلیم کے کسی افسر سے اپنی مطبوعات مدارس اور کتب خانوں کے لئے منظور کرانے کی کوشش کی نہ کسی صاحب سے کسی کتاب کے خریدنے کی خواہش اور نہ بنات کے خریدار فراہم کرنے کی کسی صاحب سے درخواست کی ہاں بعض سچی قدردان عصمتی بہنوں نے خود ہی عصمت کی توسیع اشاعت کی ضرورت محسوس فرماکر اپنے مردوں سے مجھے پانچ سات جگہ لے جانے کی خودخواہش کی تو بے شک میں ساتھ ہولیا یا دوران گفتگو میں کبھی عصمت کا ذکر آگیا اور پرچہ جاری کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا تو بھی میں نے چندہ کی رقم اسی وقت وصول کرنے کی بجائے وی پی کے لئے پتہ لکھ کر دہلی بھیجدیا۔ البتہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا ہے کسی صاحب نے اپنی کفایت اور آسانی کے لئے خود ہی بہت اصرار فرمایا تو میں نے سالانہ چندہ وصول کرلیا۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا۔

اللہ اللہ کیا دن تھے جن کی یاد کلیجہ توڑ رہی ہے اور کیا راتیں تھیں جنکا خیال دل کے ٹکڑے اُڑا رہا ہے۔ دولت ثروت نہ تھی جائداد املاک نہ تھی۔ روپیہ پیسہ کا پھیر نہ تھا چاندی سونے کا ڈھیر نہ تھا لیکن ابا جان کی زندگی ایک ایسی نعمت تھی جس کے سامنے قارون کا خزانہ بھی ہیچ تھا دل خاتون جیسی شریک حیات کا داغ اٹھا چکنے کے باوجود ہر وقت خوش رہتا تھا اور دماغ مستقبل کے افکار سے محفوظ، اطمینان اور بے فکری کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اس شان اور وضعداری کے ساتھ دَورہ کے یہ سات آٹھ سال گذرے! بعض احباب تو تعجب بھی کرتے کہ کاروباری ترقی کے ایسے اچھے مواقع اور اتنی بے پرواہی! مگر کاروبار کی ترقی کے لئے گھر سے کون نکلتا تھا اور تجارتی مقاصد ہوتے کس کے سامنے تھے۔ اصل مقصد اُن بوڑھے ماں باپ کی خدمت تھی جنہوں نے بالشت بھر گوشت کے لوتھڑے کو بڑے بڑے ارمانوں سے جوان کیا تھا۔ یہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی چھٹی اپنی ذاتی غرض کے لیئے ہوتی تھی عصمت کو یا کتب خانہ کو اس سے کوئی فایدہ نہ پہنچتا تھا۔ بلکہ پانچ چھ ہفتہ کی عدم موجودگی کے سبب آمدنی میں کچھ کمی ہوجاتی لیکن خداوند کریم کا فضل و کرم شامل حال تھا چند ہفتوں کی محنت کے بعد یہ نقصان معلوم نہ ہوتا تھا۔

ایک زبردست سازش

جون سنہ ۳۴ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ایک محترم دوست نے مجھے اطلاع دی کہ میرے دفتر میں ایک زبردست سازش ہوئی ہے اور فلاں شخص کے ذریعہ خریداروں کے پتے چرائے گئے ہیں اور چار پانچ شخص مل کر عصمت کے مقابلہ میں ایک زنانہ رسالہ نکال رہے ہیں مجھے جس وقت یہ معلوم ہوا تو

عصمت کے مقابلہ میں زنانہ رسالہ جاری ہونے کی تو میں نے مطلق پروا نہیں کی کیونکہ کسی شے کی اصل قیمت اُسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کے مقابلہ میں اور چیزیں بھی ہوں جس قدر زیادہ زنانہ پرچے ہونگے عصمت کے جوہر اُتنے ہی کھُلیں گے اور اتنی ہی اس کی خوبیاں نمایاں ہونگی عصمت کو کسی معاصر کی ترقی کبھی ناگوار نہ گذری۔ تہذیب نسواں۔ سہیلی۔ زیب النسا۔ خاتون بمبئی۔ مستورات۔ مسلمہ۔ مصباح۔ ہمجولی۔ حریم۔ متعدد زنانہ پرچے اسوقت شائع ہو رہے تھے اور اسوقت بھی جاری ہیں لیکن کسی پرچے کی عصمت نے مخالفت نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر پرچوں کی خدمات کا عصمت نے اعتراف کیا ہے۔ بہت سے زنانہ پرچے اور بھی جاری ہوئے مثلاً عفت برہانپور۔ عفت گڑگانوہ۔ خاتون۔ بانو۔ بیگم۔ زیب النسا چھپرہ۔ پیام امید۔ ظل السلطان۔ پردہ نشین النسا۔ خادمہ۔ استانی بٹالہ۔ نور جہاں ۔۔ رفیق النسا۔ خاتون مشرق اور حور۔ ان میں سے کئی پرچے کئی کئی سال تک جاری رہے۔ خود دہلی سے استانی۔ تبلیغ نسواں۔ عورتوں کا اخبار۔ نسوانی دنیا۔ نسائی ۔ عفت وغیرہ نکلے اور اپنی اپنی بہار دکھا کر بند ہو گئے ان میں سے بھی کسی پرچے کے خلاف ڈھونڈے سے کوئی لفظ اوراق عصمت میں نہ نکلیگا۔ بعض معاصرین نے خواہ مخواہ عصمت سے حسد کیا اور اپنی کامیابی کے لئے اس کے خلاف لکھا اگر عصمت نے ان تحریروں کو کوئی وقعت نہ دی اور انکی مخالفت عصمت کی شہرت یا اشاعت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ ان حالات میں کتنے ہی بڑے پیمانہ پر بھی کسی نئے زنانہ پرچے کے جاری ہونے کی خبر کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی خریدار جو سالانہ چندہ دے رہے تھے اس کے معاوضہ میں جو پرچہ انھیں مل رہا تھا وہ مہنگا ہوتا یا خریدار اپنے پرچہ کی خدمات اور روش اور اصولوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوتے یا اڈیٹر ظاہر کی جاتیں عورتیں اور کام کرنیوالے ہوتے مرد یا رسالہ کی تعریف میں عورتوں کے نام فرضی خط خود ہی لکھ لکھ کر شائع کئے جاتے یا مشہور لکھنے والوں کے مضامین ادھر اُدھر سے اُڑا کر اس طرح شائع کئے جاتے گویا خاص طور پر عصمت کے لئے لکھوائے جا رہے تھے یا زنانہ ناموں سے مرد خط و کتابت کرتے المختصر کسی اعتبار سے بھی کوئی دھوکہ یا فریب ہوتا تو بے شک پریشانی ہو سکتی تھی لیکن جب ان میں سے کوئی بات نہ تھی تو ایک نہیں دس زنانہ پرچوں کے جاری ہونے کی خبر بھی کوئی فکر پیدا نہ کر سکتی تھی، البتہ خریداروں کے پتے چرائے جانے کی اطلاع جس قدر تشویشناک تھی اتنی ہی رنجدہ۔ ر[illegible] اسوجہ سے کہ جن صاحب نے یہ عنایت فرمائی تھی ان کو میری ذات سے یا میرے دفتر سے کوئی معقول شکایت نہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے آٹھ برس میرے پاس کام کیا تھا میرا سلوک انکے ساتھ، اور ان کے ساتھ کیا دفتر کے تمام کارکنوں کے ساتھ بھائیوں کا سا رہا۔ سخت کلامی میری عادت نہیں۔ اُجرت یا تنخواہ کی ادائگی میں میں نے کبھی ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کی۔ ہمیشہ وقت مقررہ پر روپیہ دیا۔ اب رہا ترقی کرنے کا جذبہ تو بشرطیکہ غیر مستحسن نہ ہو یقیناً حوصلہ افزائی کا حق رکھتا ہے ان صاحب کی اور ان صاحب ہی کی نہیں دفتر کے اور کئی صاحبوں کی ترقی کی کوششوں میں میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن مدد کی تھی۔ یہ صاحب اگر خود مجھ سے مشورہ لیتے تو میں انکو کوئی بہتر رائے اور مدد دے سکتا تھا مگر انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے بے انتہا رنج ہوا۔ مجھے انکے اس فعل پر رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ ادھر انکا رسالہ میری نظر سے گزرا ادھر عصمتی بہنوں کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ جس پتہ پر یہ بھیجا گیا ہے وہ پتہ سوائے دفتر عصمت کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ ہم چونکہ کسی بہن کا پتہ خواہ وہ کتنی ہی مشہور کیوں نہ ہوں بغیر انکی اجازت کے کسی کو نہیں بتاتے اس لئے بعض بہنوں کو خیال ہوا کہ وہ پرچہ بھی دفتر عصمت کا ہوگا۔ مجھے جہاں اس غلط فہمی کو دور کرنا تھا وہاں یہ اندیشہ تھا کہ ان پتوں سے ناجائز فایدہ نہ اٹھایا جائے میں نے اُس ماہ کے دونوں پرچوں عصمت و بنات میں یہ نوٹ دیدیا کہ دفتر عصمت کا اور کسی پرچہ سے کوئی تعلق نہیں۔ دفتر عصمت میں جو پتہ خریداروں کا درج ہے اس پتہ پر اگر کوئی رسالہ انھیں ملے تو وہ ناجائز ذرایع سے حاصل کیا گیا ہے۔

اس لئے کہ یہ لوگ بدنام نہ ہوں اور اس لئے کہ باوجود انکے اس سلوک کے میں اس پرچہ کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتا تھا میں نے کسی صاحب کا نام لکھا نہ اس پرچہ کا۔ لیکن اس مضمون پر یہ جماعت میری دشمن ہوگئی، مقدمہ بازی کی دھمکیاں دی جانے لگیں دفتر کے کارکنوں کو بہکایا گیا اور کام میں ہرج کیا جانے لگا۔ اگر اس جماعت کی عنایات میری ذات پر ختم ہوجاتیں تو بھی غنیمت تھا مگر ان لوگوں نے حضرت والد مرحوم کی بزرگی شریف النفسی اور انکے احسانات کا بھی پاس نہ کیا۔ اب میرا ضبط وتحمل کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ میں نے ایک نہایت مفصل مضمون لکھا اور تمام واقعات بیان کردئے مگر ابا جان نے یہ فرماکر اس کی اشاعت کو منع فرمادیا۔

"رازق میاں! تم اس رسول کی اُمت ہو جس کے جسم مُبارک پر دشمنوں نے غلاظت پھینکی اور پتھر برسائے لیکن اس کی زبان مُبارک نے انھیں بددُعا بھی نہ دی اور یہ فرمایا الٰہی ان پر رحم کر! انھوں نے ابھی مجھے پہچانا نہیں ہے۔"

میں نے شروع میں جو نوٹ لکھا تھا اس سے عصمتی بہنیں اور بناتی بچیاں بڑی حد تک معاملہ کو سمجھ چکی تھیں۔ ان لوگوں نے ہمیں تباہ وبرباد کرنے کی کوشش میں اپنی کامیابی کا جو خواب دیکھا تھا گو وہ حقیقت کا لباس نہ پہن سکا لیکن ہمیں بدنام کرنے کی کوششیں جاری تھیں یہاں تک کہ ابا جان (نوراللہ مرقدہٗ) کی ذات پر شرافت اخلاق اور ایمان سے گرے ہوئے رکیک حملے کیے گئے اور تربیت گاہ کے وجود تک سے انکار کردیا گیا۔ ابا جان (خلد آشیاں) کی تصانیف کی مقبولیت اور آمدنی اتنی تھی کہ ہندوستان میں اُن سے پہلے کسی مسلمان مصنف کو نصیب نہ ہوئی تھی انھوں نے مدرسہ پر اپنی کتابوں کا روپیہ۔ اپنی بیوی اور بہو اور بیٹیوں کا زیور۔ اپنے بیٹے کی گاڑھے پسینہ کی کمائی کا کئی کئی ہزار روپیہ سالانہ قربان کردیا تھا، زندگی کا وہ بیش بہا وقت صرف فرمایا تھا جس میں بآسانی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کی مستقل نئی تصانیف لکھ سکتے تھے۔ جس تربیت گاہ کے لئے اس بڑھاپے میں جو آرام کا وقت تھا دور دراز شہروں کے سفر کی تکلیفیں برداشت کیں جسکو دیکھ کر اور مطمئن ہوکر بیسیوں خواتین نے بورڈر کی حیثیت سے اپنی بچیاں داخل کیں جس کی یتیم ونادار بچیوں کو مولانا محمد علی مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم اور مولوی عبدالماجد دریابادی اور میر جالب جیسے رہنمایان قوم گلے لگاکر روئے تھے اور جس کی شاندار اسلامی خدمات کا مشاہیر نے اخبارات میں اعتراف کیا تھا اور جو ان لوگوں کو بھی جنکا نفس حقیقت پر غالب آچکا تھا روز روشن کی طرح نظر آرہی تھی اس کے وجود تک سے انکار نے حضرت والد مغفور کو کس قدر روحانی صدمہ پہنچایا تھا اس کے تخیل سے میری روح کانپ کانپ جاتی ہے! یہ داستان جس قدر طویل ہے اتنی ہی تکلیف دہ، جس قدر افسوسناک ہے اتنی ہی جگر خراش عصمت کی ۲۸ سال کی تاریخ میں یہ سازش نہایت اہم واقعہ تھا اس لئے سرسری طور پر اسکا ذکر دینا ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں میرا کتنا روپیہ ضائع ہوا کیسی کیسی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں اور کس قدر روحانی تکلیفیں پہنچیں۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہئے۔ جس شریف النفس انسان نے انسان تو انسان کبھی کسی جانور تک کو ایذا نہ پہنچائی اس کی عزت وناموس پر یہ حملہ معمولی بات نہ تھی۔ ایسا دھکا بیٹھا کہ گھلتے چلے گئے اور اسی زمانہ کے کسی مضمون میں جو یہ شعر لکھا تھا صحیح ثابت ہوا۔

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے | عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

جوہرِ نسواں محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی کے دل میں ترقی عصمت کی جو آرزوئیں تھیں وہ انکی زندگی میں پوری نہ ہوئیں لیکن ۲۶ء میں یہ خزاں دیدہ چمن پھر سرسبز وشاداب ہوگیا۔ اور اُن کی یادگار کے طور پر مختلف موضوعات

کے بہترین مضامین پر تین چار سو روپیہ کے نقد انعامات بھی ہر سال دیئے جانے لگے اور انکے مضمونوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہو گئے عصمت کی ترقی، اور یہ انعامات اور کتابیں انکا نام زندہ رکھنے کو کافی تھیں لیکن میں کسی اخبار یا رسالہ کی صورت میں ان کی ایک علیحدہ اور مستقل یادگار قایم کرنے کی فکر میں تھا۔ ۳۳ء میں جب میں نے ایک معقول رقم انکی مستقل یادگار کے لیے محفوظ کر لی تو حضرت والد مغفور پر اپنا خیال ظاہر کیا میرے اس جذبہ کی قدر سوائے انکے اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ بے انتہا خوش ہوئے مگر اب یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ پرچہ کے مقاصد کیا ہوں اور کونسی ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری لے۔ غالباً ۳۰ء میں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسے زنانہ پرچہ کی ضرورت ہے جو مغربیت کا مقابلہ کر سکے اور مشرقی خوبیوں کو نمایاں کرے، اسوقت میرے پاس دفتر کی ضروریات کے علاوہ نقد روپیہ اسقدر موجود نہ تھا کہ میں فوراً تعمیل ارشاد کر سکتا۔ اور میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ جب تک تین چار ہزار روپیہ نقد محفوظ نہ ہو کوئی ایسا ہفتہ وار یا ماہوار رسالہ جاری کرنا جو مالک یا اڈیٹر کی خود داری کو مجروح کئے بغیر صرف خریداروں کے چندے پر چل سکے عاقبت اندیشی نہیں۔ محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی گو مشرقی جواہرات سے مالا مال تھیں لیکن دور جدید کی بیوی تھیں ایک ایسا رسالہ جسکا مقصد صرف قدامت پرستی ہو انکی یادگار کچھ زیادہ موزوں نہ تہا۔ ایک خیال یہ تھا کہ جس طرح تمدن حقوق نسواں کی حمایت میں جاری ہوا تہا اسیطرح مرحومہ خاتون کی یاد میں جو پرچے نکلے اسکا سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں ہو خاتون مرحومہ کی یہ یادگار نہایت موزوں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حقوق نسواں کی حامی و ساعی تھیں اپنی بہنوں کے حقوق کی حفاظت و حمایت میں انکے بے شمار مضامین زنانہ و مردانہ رسائل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئے تھے، ایک دوسرا خیال یہ تہا کہ ایسا زنانہ رسالہ جاری کیا جائے جس کی صرف ایک کوشش ہو اور وہ یہ کہ لڑکیوں کو سلیقہ شعار اور ہنرمند بنائے، حضرت والد مغفور اپنی مستقل تصانیف اور اپنے رسالوں کے مضامین کے ذریعہ اس کوشش میں بھی کامیاب ہوئے اور انھوں نے خواتین میں زنانہ دستکاری کا شوق اس درجہ پیدا کر دیا کہ جب میں نے ۲۹ء سے اس موضوع پر کتابیں شائع کرنی شروع کیں تو چاروں طرف انکی مانگ ہونے لگی اور چار پانچ سال میں مجھے کئی کتابیں صرف زنانہ دستکاری کی شائع کرنی پڑیں جنکی تیاری میں ستر اسی خواتین نے حصہ لیا۔ اب بجائے ایک پرچہ کے دو پرچوں کی ضرورت سامنے تھی اور میں صرف ایک پرچہ جاری کرنے کے لئے تیار تھا آخر حضرت والد مغفور نے یہ فیصلہ فرمایا کہ پہلے لڑکیوں کو سگھڑ اور ہنرمند بناؤ پھر انکے حقوق کے لیے مردانہ رسالہ جاری کرو۔ اس فیصلہ کے مطابق میں دستکاری کے پرچہ کی کامیابی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ بڑی دقت یہ تھی کہ میں خود زنانہ دستکاریوں سے نابلد تھا اور آمنہ نازلی زیادہ وقت نہ دے سکتی تھیں۔ مگر تائید غیبی شامل حال ہوئی مشہور دستکار بہن غدیر فاطمہ صاحبہ نے پرچہ کا بار ادارت اُٹھا لینے کا وعدہ فرمایا اور میں نے اپریل ۳۴ء کے عصمت و بنات میں دستکاری کا پرچہ جاری کرنے کا خیال ظاہر کر کے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر خواتین کو واقعی اس پرچہ کی ضرورت ہوئی تو پرچہ جلد جاری کر دیا جائے گا۔

اس خیال کی ہر طرف سے تائید ہوئی اور دستکار خواتین کے حوصلہ افزا خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے جو نہ صرف خریداری رسالہ کی درخواستیں تھی بلکہ جن میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ جلد سے جلد یہ رسالہ جاری کیا جائے۔

ستمبر ۳۴ء میں جوہر نسواں کا پہلا پرچہ شائع ہوا اور دستکار خواتین میں اس کی دھوم مچ گئی اور انھوں نے محسوس فرمایا کہ ایسے رسالہ کی ہندوستانی بیبیوں کو واقعی اشد ضرورت تھی۔ پرچہ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی اور کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ اسکی تعریف میں خطوط نہ آتے جہاں یہ ہو رہا تھا وہاں دفتر عصمت سے پتے اُڑانے والے اس کی مخالفت کر رہے تھے انکے علاوہ بعض زنانہ پرچوں نے بھی جوہر نسواں کے متعلق کچھ لکھنا پسند نہ کیا باایںہمہ جوہر نسواں کو پہلے ہی سال میں وہ کامیابی حاصل ہو گئی جو اس سے پہلے عصمت

سمیت کسی زمانہ پرچہ کو پہلے سال میں میسر نہ ہوئی تھی ستمبر ۱۹۰۵ء میں جب دوسرا سال شروع ہوا ہے تو اس کے مستقل خریدار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھے۔ جوہر نسواں پر جو روپیہ صرف ہوا تھا اور جو محنت کی گئی تھی اس کے مقابلہ میں تو یہ اشاعت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اُردو کے اچھے رسائل کی عام حالت پیش نظر رکھ کر خریداروں کی یہ تعداد کافی حوصلہ افزا تھی۔ خاتون جنت مکانی کی یادگار قایم کرنے کے ساتھ ساتھ اس رسالہ سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی لڑکیاں دستکار ہنرمند اور سلیقہ شعار بن جائیں وہ اگر دولت مند ہیں تو اوقات فرصت میں بجائے فضولیات میں پڑنے کے دستکاری سے اپنا دل بہلائیں اور اگر غریب اور کم استطاعت ہیں تو خودداری اور عزت کے ساتھ اپنی مالی دقتوں کو دور کر سکیں۔ جوہر نسواں کو اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی اسکا اندازہ اُن خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۳۵ء عصمت کے اس چوتھے دور میں ۱۹۳۵ء اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ یہ سال اکثر اعتبار سے عصمت کا سب سے زیادہ کامیاب سال ہونے کے باوجود بدترین سال تھا۔ عصمت نے اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا خریداروں پر اظہار کرنا کبھی پسند نہیں کیا اور جو جو بپتا پڑی خاموشی کے ساتھ انگیز کرتا رہا۔ لیکن گذشتہ سال جب ایک محدود تعداد میں ان خواتین و حضرات کے لیئے جن کے مطالعہ سے گزرنے کا عصمت کو سالہا سال سے فخر حاصل ہے کتابوں کی قیمتوں میں ایک خاص رعایت کی گئی تو اس موقعہ پر عصمت کی آمدنی و خرچ کی مختصر کیفیت بیان کی گئی تھی اسکا ایک حصہ یہ ہے۔

”رسالہ عصمت ہندوستان کے اُن گنتی کے چند رسائل میں سے ہے جن کی آمدنی باوجود کثیر اخراجات کے صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ جھوٹی تعریفیں۔ قصیدہ گوئی۔ مدح سرائی۔ چونکہ عصمت کا مسلک نہیں اس لئے رئیسوں اور دولت مند حضرات کی مالی اعانت سے عصمت محروم ہے۔ بلیک میلنگ یعنی شریف اور مالدار لوگوں کو ڈرا دھمکا کر روپیہ وصول کرنے کا ہلکے سے ہلکا دھبہ دامنِ عصمت پر نہیں۔ سرکاری یا نیم سرکاری مالی امداد حاصل کرنے کی طرف عصمت نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اشتہارات کی نہایت معقول آمدنی سے بھی عصمت اس لئے محروم ہے کہ صرف وہی اشتہارات درج کئے جاتے ہیں جن میں نام کو بھی کوئی لفظ مشرقی حیا و تہذیب کے خلاف اور کنواری بچیوں کے لئے غیر موزوں نہ ہو اور جن اشتہارات میں دھوکہ اور فریب نہ معلوم ہو۔ عصمت کا کوئی فنڈ بھی نہیں۔ عام بازاری کتابیں جن کی فروخت سے معقول کمیشن ہرا مل سکتا ہے۔ عصمت وہ بھی فروخت نہیں کرتا نہ رسالہ ایجنٹوں کے ذریعہ عام طور پر فروخت کیا جاتا ہے۔ المختصر عصمت کی آمدنی صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ قسم دوم کا چندہ ۴ہے ہے مگر دو سال سے صرف تین روپیہ لیے جا رہے ہیں ۴ر خرچ وی پی ۶ر محصول ڈاک اور ۱۰ر سالگرہ نمبر کی لاگت نکال کر ۲؎۱ میں دس پرچے یعنی ماہوار رسالہ پونے تین آنے میں دیا جا رہا ہے، وہ رسالہ جس میں مضامین کے کم سے کم ۸۰ صفحے ہوتے ہیں جن میں بعض صفحے باریک لکھوا کر قریباً ۱۰۰ صفحوں کے بہتر سے بہتر اور اعلےٰ سے اعلےٰ مضامین دیئے جاتے ہیں اور ہر مضمون کم سے کم جگہ میں درج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مضامین بھی وہ ہوتے ہیں جن پر قریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ یا انعامات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ پھر پرچہ کی وضعداری قایم رکھنے کے لئے چھوٹے موٹے اور بھی بہت سے اخراجات ہیں جن سے عام پرچے قطعی محفوظ ہیں یہ بھی ایک ہزار روپیہ سالانہ کا خرچ ہے عصمت کو سنہ ۱۹۲۸ء تک بیس سال میں ۲۵ ہزار روپیہ کا نقصان پہلے ہو چکا ہے گذشتہ دو سال میں محصول ڈاک بڑھ جانے اور قسم دوم کے چندہ میں ۸ر کم کر دینے کی وجہ سے عصمت کو پھر کئی ہزار روپیہ کا زیر بار ہونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نہایت اہم

اور بے حد ضروری اور مفید کتابیں اس وقت تک شائع نہ ہو سکیں"!

سطور مندرجہ بالا کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ عصمت کی آمدنی صرف خریداروں کا سالانہ چندہ ہے۔ آمدنی کے دوسرے ذرائع جو عام طور پر اردو پرچوں کو میسر ہیں عصمت ان سب سے محروم ہے۔ ۳۲ء میں خریداروں کے چندہ سے رسالہ کی تمام ضروریات بخوبی پوری ہو رہی بلکہ کچھ پس انداز بھی ہو رہا تھا اگر ۳۳ء سے باوجود ترقی اشاعت کے پرچہ پھر زیر بار ہونے لگا۔ تربیت گاہ کے لئے عصمت بک ڈپو سے حضرت والد مغفور ہر سال ایک معقول رقم دے رہے تھے لیکن آخری تین سال میں خرابئ صحت کی بنا پر وہ دورہ پر تشریف نہ لے جا سکے اور انکے مدرسہ کے اخراجات ایک بڑی حد تک انکی تصانیف اور انکے رسالوں کی آمدنی سے پورے کیے گئے۔ ایک دوسرا سبب مالی دقتوں میں اضافہ ہو جانے کا یہ ہوا کہ ادھر تو محصول ڈاک بڑھ جانے کی وجہ سے ٹکٹوں کا خرچ بہت زیادہ ہو گیا تھا ادھر قسم دوم کا چندہ جس کے خریدار دو تہائی سے بھی زیادہ تھے ساڑھے تین روپیہ سے تین روپیہ کر دیا گیا تھا۔ تیسری پریشانی تھی دفتر میں چوری اور منظم سازش۔ المختصر ان تین سال میں عصمت کم و بیش دس ہزار روپیہ کا پھر زیر بار ہو گیا۔ مئی ۳۵ء میں کتب خانہ کی ایک غیر معمولی رعایت اور مطبوعات عصمت کی قدردان خواتین و حضرات کی توجہ سے گو اس نقصان کی تھوڑی سی تلافی ہو گئی تھی تاہم آیندہ تین روپیہ سالانہ چندہ مع محصول ڈاک وغیرہ میں معمولی کاغذ کا رسالہ شائع کرنے سے عصمت اپنی شان قایم نہ رکھ سکتا تھا لیکن قسم اول کا چندہ گھٹانے سے بھی نقصان ہوتا تھا مگر یہ نقصان اتنا نہ تھا جتنا پہلی صورت میں اس لئے دسمبر ۳۵ء سے قسم دوم بند کر کے قسم اول کا چندہ بجائے پانچ روپیہ کے صرف چار روپیہ کر دیا گیا۔ اسوقت یہ اندیشہ بھی تھا کہ جو خریدار پہلے تین روپیہ دے رہے تھے ان میں کچھ ایسے بھی ہونگے جو شاید ایک روپیہ زیادہ نہ دے سکیں اور اس لئے اشاعت کچھ کم ہو جائے لیکن اس صورت میں مالی نقصان اسقدر نہ ہوتا تھا جتنا پہلے ہو رہا تھا مالی نقصانات کے علاوہ عصمت کی خصوصیات قایم رکھنے کے لئے اور بہت سی پریشانیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا ان نقصانات اور روحانی تکالیف کے لحاظ سے ۳۵ء عصمت کا بدترین سال تھا لیکن بایںہمہ بعض اعتبار سے عصمت کا یہ سال نہایت کامیاب تھا مضامین کا معیار پہلے سے بھی بلند ہو گیا تھا اور بعض اہم نسوانی مسائل پر مضامین نہایت گراں قدر شائع ہو رہے تھے اور ہر ماہ بعض صفحے باریک لکھوا کر کم و بیش سو صفحوں (اور کتابی سائز کے ڈیڑھ سو صفحوں) کے مضامین دیئے جا رہے تھے اس قدر میٹر ہندوستان کے کسی زنانہ پرچے نے کسی سال نہ دیا تھا۔ حسب معمول سال کے کسی ماہ کے پرچہ کی اشاعت میں ایک دن کی بھی دیر نہ ہوئی کسی ماہ کا پرچہ پانچ ہزار سے کم نہ چھپا۔ گویا رسالہ کی اشاعت ہندوستان کے تین زنانہ ماہوار رسالوں کے خریداروں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔ روپیہ روپیہ آٹھ آٹھ آنہ سالانہ چندے کے رسالوں کا ذکر نہیں کسی خوبصورت۔ بلند معیار ضخیم رسالہ کی جو نہ گورنمنٹ معقول تعداد میں خریدتی ہو نہ کوئی ریاست جس کے چند پرچے بھی کسی کانفرنس یا انجمن نے نہ متمول اور دولتمند خواتین نے اپنی طرف سے نادار اور کم استطاعت غریب عورتوں کے نام جاری کیے ہوں اور جو مردانہ رسالوں کی طرح بازاروں میں ایجنٹوں کے ذریعہ بھی فروخت نہ ہوتا ہو غرض جو خواتین و حضرات مستقل خریدار ہیں انکے سالانہ چندے کے علاوہ جسکی اشاعت کی اور کوئی صورت نام کو بھی نہ ہو ایسے رسالہ کی ہندوستان جیسے ملک میں پانچ ہزار مستقل اشاعت انتہائی ترقی ہے لیکن حضرت علامہ راشد الخیری نور اللہ مرقدہٗ، کا یہی پرچہ اگر کسی ترقی یافتہ ملک سے شائع ہوتا جہاں خواتین کو اپنی ضرورتوں کا پوری طرح احساس ہے تو اس کی اشاعت بجائے پانچ ہزار کے پانچ لاکھ سے کم نہ ہوتی اور ۲۷ سال گذر جانے کے بعد کئی لاکھ روپیہ اس کی ملکیت ہوتا۔ مگر یہ غریب پرچہ ایک جاہل ملک اور مردہ قوم اور بے کس طبقہ کا پرچہ ہے کہ ۲۷ سال میں ۲۷ ہزار کی ڈیڑھ گنی رقم سے زیادہ اس کی نذر ہو چکے

کے بعد بھی اس کی مالی حالت اچھی نہ ہوسکی۔

جو خواتین گذشتہ چودہ سال سے رسالہ کی خریدار ہیں انھوں نے اوراق عصمت پر میری کوئی ایسی تحریر نہ دیکھی ہوگی جس میں عصمت کی مالی مشکلات کا رونا رویا گیا ہو یا میری اُن پریشانیوں پر جو عصمت ہی سے تعلق رکھتی تھیں متوجہ کرنے کے لیے ان کو کسی قسم کی تکلیف دی گئی ہو۔ لیکن اس داستان میں میرے قلم سے ایسے فقرے نکل گئے ہیں جن سے عصمت کی ساکھ میں کچھ فرق آرہا ہے اور جن سے عصمت کی سچی قدردان بہنوں کو روحانی تکلیف پہنچی ہوگی۔ مجھے جہاں اسکا احساس ہورہا ہے وہیں میں یہ بھی محسوس کررہا ہوں کہ میں نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جنکا کاروباری نقطہ نظر سے یا تجارتی اصول سے ظاہر کرنا مناسب نہ تھا۔ ہر کام کرنے والے کے چند راز ہوتے ہیں جنکا راز ہی میں رہنا زیادہ سودمند اور جنکا ظاہر کردینا خلاف مصلحت ہے۔ حضرت والد مغفور کی سرپرستی اور میرے زمانہ ادارت کے چودہ برس میں عصمت نے طبقہ نسواں اور ادب اُردو کی جو بڑی بھلی خدمات انجام دیں اور مجھے اس طویل مدت میں جن جن موقعوں پر جو جو پریشانیاں اور دقتیں اٹھانی پڑیں میں نے کبھی عصمت میں انکی تفصیل بیان نہیں کی اور اس موقعہ پر بھی مختصر طور پر وہی واقعات قلمبند کیے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، ان کی یادداشت میں مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ باوجود انتہائی احتیاط کے ایسے فقرے بھی لکھدیئے ہیں جن سے خود نمائی کا پہلو نکل رہا ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری بے فکری شان اور اطمینان کا زمانہ ابا جان (خلد آشیاں) کی آنکھ بند ہوتے ہی ختم ہوگیا اور جن اصولوں پر میں انکے زیر سایہ کام کررہا تھا عصمت ہی کی بہتری کے لئے مستقبل میں شاید مجھے ان میں سے بعض اُصول بدلنے پڑیں، یہ سب کچھ سمجھنے اور ان تمام باتوں کا اچھی طرح احساس ہونے کے باوجود جو کچھ میں نے لکھا ہے میری رائے میں مجھے لکھدینا چاہئے تھا۔ ماضی کی یہ یادداشت عصمت کی اٹھائیس سال کی تاریخ ہے جسے قلمبند کرتے وقت رسالہ کے اطمینان اور پریشانی کے کامیابی اور ناکامی کے اور عروج و زوال کے ہر دور کے اور ہر زمانہ کے بُرے بھی اور بھلے بھی ہر قسم کے واقعات بیان کردینے ضروری تھے تاکہ عصمتی بہنوں کو صحیح اندازہ ہوسکے کہ حضرت علامہ راشد الخیری نور اللہ مرقدہٗ نے کس طرح خون جگر سے سینچ کر ننھے سے بیج کو شجر بار آور کیا اور شریف ہندوستانی بیبیوں کے لئے کس استقلال اور استقامت سے کس خاموشی کے ساتھ کیسے کیسے مالی نقصانات اور کیسی کیسی روحانی تکالیف اُٹھاتے رہے۔

یہ اُنھیں کی برکت تھی، اُنھیں کی نیت کا پھل، اُنھیں کے ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ اور انھیں کی سحر نگاری اور دردمندی کا صلہ کہ اس شاندار چوتھے دور میں عصمت نے قابل رشک کامیابی حاصل کرلی تھی۔ آہ مجھے کیا انھیں بھی خبر نہ تھی کہ عصمت کو معراج کمال پر پہنچاکر انکا بابرکت سایہ اُٹھ رہا تھا عصمت کا یہ زریں دور جو ۱۹۲۶ء کی جنوری سے شروع ہوا تھا ۱۹۳۵ء کے دسمبر کے ساتھ ختم ہوگیا۔ بخار پندرہ روز سے آرہا تھا مگر دسمبر کے دوسرے ہفتہ سے علالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی شروع کی تو کس کا دفتر اور کہاں کا رسالہ سب کچھ بھول بسر میں ہمہ تن ان کی تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔

پانچواں دَور

جنوری اور فروری کے پرچے جن سے عصمت میں نئی نئی دلچسپیاں شروع کرنے کی تیاریاں کی جارہی تھیں جس پریشانی کے عالم میں شائع کیے گئے تھے کیا خبر تھی کہ اس سے پانچویں دَور کا آغاز ہورہا تھا۔ ۳ فروری کی منحوس صبح نے

خواتین ہند کے محسن اعظم، رہبر اعظم، مصلح اعظم کو ہمیشہ کے لئے جدا کر کے چمن عصمت کی ساری بہار لوٹ لی! اس اٹھائیس سال میں کیسی کیسی مشکلات کیسی کیسی پریشانیوں، کیسے کیسے نقصانات کا عصمت کو مقابلہ کرنا پڑا مگر یہ عصمت کا وہ نقصان ہے جس سے زیادہ کوئی نقصان پہلے ہوا تھا اور نہ آیندہ ہوگا! کہنے کو پچھلے چودہ سال سے عصمت کا تمام کام میں ہی کر رہا تھا اور اب بھی میں ہی کر رہا ہوں مگر جب ہمت بلند تھی حوصلے بڑھے ہوئے، کمر مضبوط اور دل توی مگر اس انقلاب عظیم نے اُمیدوں پر پانی پھیر دیا، آرزوئیں خاک میں ملادیں، دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کلیجہ پاش پاش! پہلے اگر کبھی کام کی کثرت سے طبیعت اکتا جاتی یا مالی پریشانیوں سے دل گھبرا جاتا تھا یا کبھی پرچہ کی خصوصیات اور شان قایم رکھنے کے لئے مشکلات کا سامنا ہوتا تھا تو وہ شفقت پدری میں ڈوبی ہوئی نظریں، وہ معنی خیز مگر خاموش مسکراہٹ ساری کلفت اور پریشانی ایک لمحہ میں دور کر دیتی تھی۔ اب ہر صبح پیام آلام اپنے ساتھ لائے اور ہر شام ہجوم افکار میں مبتلا چھوڑ کر رخصت ہو، اُن کی میٹھی نیند، دائمی نیند، ابدی نیند میں کوئی چیز خلل انداز نہ ہوگی، اب حوادث کی آندھیاں چلیں طوفان اُٹھیں، بجلیاں گریں، عصمت کے گلزار خزاں زدہ میں آبیاری کا انہیں کچھ فکر نہیں۔ آہ علالت سے چندماہ قبل کسی مضمون کے دوران میں جب یہ تحریر فرمایا تھا کہ "موت سر پر منڈلا رہی ہے" تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ قضا قلم سے یہ الفاظ ادا کرا رہی تھی اور سرائے دنیا کے بظاہر مشاش بشاش اور شاداں و خنداں مگر حقیقتاً تھکے ماندے مسافر چند روز کے اور مہمان تھے اور وہ نورانی صورت، وہ مقدس وجود، وہ بابرکت ہستی دُنیا سے مٹ رہی اور وہ مبارک سایہ عصمت کے سر سے اُٹھ رہا تھا!

ابا جان کی دائمی جدائی، میرے لئے گرویدگی اور فریفتگی کے اُس مجسمہ اور محبت اور عشق کے اس دیوتا کا فراق ابدی ہے، جس کی شفقت خدائی جلوے دکھا اور جس کی انسانیت ہادی برحق کے احکام کی تفسیر کر رہی تھی! آہ موت نے کیسی شاندار کیسی کامیاب اور کتنی محبوب اور کتنی پیاری زندگی کا خاتمہ کر دیا! اب اُن کو روؤں یا اپنی دل کی بستی اُجڑنے پر آنسو بہاؤں، اپنی بہنوں کی خدمت سے غافل نہ ہوں یا خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالوں۔ دل، جو دیکھنے کو کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا آنکھوں نے وہ دکھا دیا۔ اب اس کے بعد بھی اگر کچھ اور پڑنی ہے تو وہ بھی پڑ جائے گی، مگر "عصمت" پیارے ابا جان کی پیاری نشانی، ہر حالت میں سینہ سے چمٹی رہے گی اور اگر یہ صحیح ہے کہ بعد الموت بھی دنیا سے روح کو کچھ تعلق رہتا ہے تو ابا جان کی پاک روح دیکھ رہی ہوگی کہ اس کشمکش ہی میں بھی جس میں ہر طلوع ہونے والا آفتاب میرا کلیجہ توڑ دیتا اور ہر نمودار ہونے والا چاند میرے دل کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے میں نے کس طرح انکے رسالہ کو اس کی تمام ممتاز خصوصیات کے ساتھ شایع کیا ہے۔

جب وہ تشریف رکھتے تھے تو کیا بتاؤں عصمت کا مستقبل مجھے کسقدر شاندار نظر آتا تھا مگر ماضی کی پوری تاریخ سنانے کے بعد اپنی قابلیت، اپنی استطاعت، اپنی کمزوریوں اپنے حالات اور اپنی کیفیت پر نظر ڈال کر سمجھ میں نہیں آتا عصمت کے مستقبل کے متعلق کیا رائے قایم کروں عصمت نے اٹھائیس سال کس طرح گزارے ہیں یہ داستان میں نے سُنا دی اب آیندہ کیا ہوگا اسکا علم صرف خدائے بہتر و برتر کو ہے البتہ میری دلی آرزو بس اب یہ ہے کہ زندگی کے بہترین چودہ سال ذمہ دارانہ حیثیت سے جس پرچہ پر ابا جان کے سامنے صرف ہوگئے عمر کی باقی گھڑیاں بھی اسی خدمت میں بسر ہو جائیں اور یہ پرچہ جو چند ماہ پہلے انکی سرپرستی کی دولت بے بہا سے مالا مال تھا اور اب انکا مبارک سایہ اُٹھنے کے بعد انکی یادگار ہے اپنے فرائض کی ادائگی میں سرگرم عمل رہ کر اس پاک روح کی خوشنودی اُسوقت تک حاصل کرتا رہے جب تک اسکا ایک قدر دان بھی باقی رہے۔

رازق الخیری

بے مثل باپ بے نظیر بیٹے

علامہ مغفور کے "بڑے لال" راشدہ بیگم صاحبہ خیری کے آنسو

۳ فروری کی نمودار ہونے والی منحوس صبح نے طلوع آفتاب سے قبل ایسے جھنڈے گاڑے کہ ہندوستان کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا! آہ میری آنکھیں اُس وقت کیا دیکھ رہی تھیں، وہ خاموشی کیسی تھی جس مبارک چہرہ پر ہر وقت مسرت کی لہریں دوڑتی تھیں اُداسی سے بدل گئی تھی۔ بچوں کو دیکھ کر روشن ہونے والی آنکھیں مسکراتے ہوئے ہونٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند تھے۔ کیا خبر تھی پچپن سال قبل "چراغ سحری" کے آخری شعر میں اپنے اس وقت کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ابا جان کے غسل کے بعد جس وقت آخری دیدار کے لئے صحن میں آئی ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ فرماتے ہیں "بیوی دیکھ لو جس قدر دیکھنا ہے۔ ہنسنا ہنسانا بگڑنا اور منانا سب ختم ہوا ہم چلے اور ایسے چلے قیامت میں ملیں گے" میرے بیقرار دل نے اپنے خاموش باپ سے کہا "ابا کیا یہ وہی صبح ہے جس کے لئے آپ نے فرمایا تھا۔

گاڑے صبح نے جھنڈے! اور یہ چراغ ٹھنڈے

ابا جان کی خاموشی سے معلوم ہوتا تھا فرماتے ہیں "ہاں میں سمجھتا تھا کہ میرے بچوں کے واسطے ایک روز ابدی جدائی کی صبح اٹل ہے"۔ جس بدنصیب اولاد کے سر سے جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والے باپ کا سایہ اُٹھ جائے اُسکے۔ لئے یہ صبح قیامت سے کم نہ تھی میں تو رو بھی نہیں سکتی محترمہ اماں جان مجسمۂ غم ہیں چھوٹے بھائی اور بہن جن کے کھلے ہوئے پھول سے دل مرجھا گئے اُن کے سامنے کیا روؤں۔ ابا ان کے کلیجہ کے ٹکڑے فراق پدری میں تڑپ رہے ہیں محض فطرتی تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس شفیق باپ کے لئے جس نے بچوں والے بچوں کے سُکھ کے سامنے اپنے دُکھ کی کبھی پروا نہ کی۔ آہ ہمارے سر سے ابا جان کا سایہ اُٹھ گیا۔ دل جس بیش بہا دولت سے مالا مال تھا وہ لٹ گئی۔ شفقت پدری جس پر ہم ناز کرتے تھے وہ ختم ہو گئی ہمارا ہر دن ہنسنے ہنسانے میں گذرتا تھا۔ روز و شب محفل جمتی تھی۔ گانا بجانا۔ گیت۔ لطیفے۔ تاش۔ شطرنج۔ کیرم۔ بیڈمنٹن۔ جھولا الٹی کڑاہی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ یہ چہل پہل یہ رونق جن کے دم سے تھی ہائے وہ رخصت ہو گئے۔ ابر آلود دن ہوتا یا گرمیوں کی چاندنی گھر پر ٹھیرنا گناہ سمجھتے تھے۔ سیر و تفریح میں عزیزوں اور رشتہ داروں کی شرکت مقدم تھی۔ اُن کا ڈھنگ نرالا تھا اُن کا طریقہ عجیب خواہ گھر میں محفل ہو یا گھر سے باہر سیر تفریح، سب کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مگر بیٹھتے تھے سب سے الگ۔ صرف اماں جان اُن کے پاس بیٹھتی تھیں دُور سے بیٹھے بیٹھے لطف اُٹھاتے تھے جو دل خوشیوں سے لبریز اب ماتم کدہ ہیں گھر کے بچے عزیز اور دوست جو اُن کی صحبت اُٹھا چکے ہیں یاد کرینگے اور روئیں گے۔ ابا جان نے ہر حیثیت سے اپنا رنگ دکھایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں اب نہ دیکھیں گی۔ اُنہوں نے دنیا کو دکھایا کہ میاں بیوی اسے کہتے ہیں ابا جان نے اماں جان کا کبھی آنکھ سے اوجھل ہونا گوارا نہ کیا جہاں کہیں ابا جان کو جانیکی ضرورت ہوتی شادی ہوتی یا غمی اور ذاتی معاملہ ہوتا یا مسلمان بچیوں کا اماں جان ضرور ہمراہ ہوتیں ابا جان جیسے عاشق زار شوہر اور اماں جان جیسی خدمت گذار بیوی، دونوں نے میاں بیوی کی محبت کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں سمجھنے والے دل اور عقل رکھنے والے دماغ اگر اُن کے نقش قدم پر چلیں تو گھر جنت کا نمونہ بنا سکتے ہیں ابا جان اور اماں جان کے تعلقات کی تفصیل بہت لمبی ہے انشاءاللہ رازق میاں ابا جان کی سوانح عمری میں لکھیں گے +

شفقتِ پدری

میری شادی کو ۲۰ سال گذر چکے ہیں دنیا کے دستور کے موافق مجکو ابا جان سے زیادہ روز کے لئے علیحدہ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وداع کا وقت لڑکی کے لئے بہت نازک ہوتا ہے مگر میں اُس وقت سے قطعی ناواقف ہوں

البتہ اتنا یاد ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا بڑے دالانوں کی چھت پر سب سو رہے تھے۔ ہمارا پرانا بڈھا ملازم سامنے چھوٹی چھت پر سو رہا تھا وہ اپنی دُھن میں اکثر گایا کرتا تھا علی الصباح اُس کی آنکھ کھُلی اور منڈھے کے کچھ اشعار گانے لگا وقت کی بات تھی میری آنکھ کھل گئی اور طبیعت پر خاص اثر ہوا میں اپنے پلنگ سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ابا جان کی آنکھ اُسی وقت کھُل گئی۔ ملازم کو روک دیا اور گھبرائے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور میرے پلنگ پر بیٹھ گئے فرمایا "اندر کیوں آئی ہو" چونکہ آنکھوں میں آنسو تھے جواب دینے سے قاصر تھی۔ پھر خود ہی فرمایا۔

"راشدہ بیگم میں دنیا کی رسم ادا کر رہا ہوں۔ اپنی بچی کو جدا نہیں کروں گا جس طرح لڑکے کے مستقبل کا ذمہ دار باپ ہے اسی طرح لڑکی کے مستقبل کا بھی میں نے تمہارے لئے بہت گہری نظر سے مطالعہ کرکے انتخاب کیا ہے مجھے یقین ہے تم ہمیشہ خوش رہو گی مگر شرط یہ ہے شوہر کو خوش رکھنا خدا کی رضامندی اور زندگی کا مقصد سمجھنا" ابا جان کی آواز کسی قدر بھرا گئی تھی مشکل سے میرے پاس دس منٹ گذرے ہونگے کمرہ سے باہر تشریف لے گئے۔ آدھ گھنٹے بعد پھر تشریف لائے اور ادھر اُدھر کی باتیں فرمانے لگے۔

آج سے ۴۰ سال پہلے نکاح سے ایک روز قبل جو الفاظ فرمائے تھے خدا کا شکر ہے پورے ہوئے۔ وہ بیش بہا شفقت پدری جس نے مجکو اپنی زندگی میں جُدا نہ ہونے دیا آہ اب کہاں جتنی روؤں کم ہے جسقدر تڑپوں تھوڑی، خدا ابا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیسے باپ تھے بےمثل لاجواب، جہاں تک اُن کی ذات کا تعلق تھا بچوں کو فکر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور یہی وجہ تھی تمام معاملات میں دخل تھا انتہا ہے محبت کی کہ جس وقت مجکو درد زہ شروع ہوتا گھر میں کسی کو پتہ نہ چلتا مگر ابا جان کی ایک نگاہ سب پتہ لگا لیتی اور وہ اماں جان کو اطلاع کرتے اُسی وقت بغیر کہے لکڑی ہاتھ میں لئے سیدھے دائی کے گھر پہنچتے آگے آگے آپ پیچھے نرس۔ اس سے خود ہی گفتگو کرتے کیونکہ وہم تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں اندر کے کمرہ میں زچہ خانہ ہو رہا ہے باہر کے دالان میں وہ تشریف فرما ہیں عام طور پر زچہ خانہ میں خاصا مجمع ہوتا ہے مگر ابا جان اس کو سخت ناپسند کرتے تھے زچہ خانہ میں اماں جان یا دو ایک عزیز جو مفید ہوتے نرس اور دائی کے علاوہ اگر کوئی اندر جانا چاہتا تو پسند نہ کرتے تھے ادھر بچہ کے رونے کی آواز ابا جان سنتے اُدھر اُن کی آواز مرے کان میں آتی "راشدہ اگر میں" "جی" کہدیتی تو اطمینان ہوجاتا ورنہ بیحد پریشان ہوجاتے تھے۔

میرے بڑے بچے شاہد میاں نے میٹرک کر لیا تو میرا اور شیخ صاحب کا ارادہ ہوا کہ اس کو علیگڈھ بھیجدوں باوجود اس قدر محبت اور شفقت کے ابا جان کا رعب اس قدر تھا کہ اپنے بچوں کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی آخر داخلے کی تاریخ آگئی اور شاہد میاں دہلی میں داخل ہوگئے ایک ہفتہ بعد شیخ صاحب سے فرمایا "میاں عبدالغفور میں سمجھ رہا تھا راشدہ بیگم کی تجویز ہوگی۔ شاہد کو میٹرک کے بعد علی گڈھ بھیجدوں کیوں نہ بھیجا کسی نے منع کیا تھا" شیخ صاحب نے ہنس کر کہا "گفتگو ضرور ہوئی تھی بغیر آپ کی اجازت کے کیسے جاسکتا تھا" پھر فرمایا "میاں صادق جو خدا رکھے بی اے میں پہنچ گئے بہتیرے تڑپے اور تڑپڑائے کہ ایم اے علی گڈھ سے کرلوں مگر میں نے پسند نہیں کیا جس قدر میرے سامنے تعلیم ضروری ہے اُسی قدر بچوں کی نگرانی بھی بچوں کا اپنی آنکھ سے اوجھل ہونا میں پسند نہیں کرتا جب صادق کو الگ نہ کیا تو شاہد کو کیسے کرسکتا ہوں"۔ ایک موقعہ پر میں نے ابا جان سے کہا "آپ نے اپنی لڑکیوں کی فکر تو بہت جلد کی مگر ان لڑکیوں کا فکر نہیں ہے" میں کہہ کر اور وہ سُن کر خاموش ہوگئے پانچ منٹ سکوت کے بعد فرمایا "ہاں کیا کہا تم نے پھر دوہرانا" میں نے خاموشی سے نگاہ نیچی کرلی۔ فرمانے لگے "تمہارا فکر کرنا فطری تعلق ہے یہ تم نے کیسے سمجھ لیا مجکو فکر نہیں میں تمہارے سامنے بچیوں کا ذکر کردوں تو سمجھو گی ابا کو فکر ہے۔ اپنی بچیوں کی فکر کرنے والی صرف مری ذات تھی یہ بچیاں بھی بچی کی بچیاں ہیں ان کی فکر کرنیوالے دو ہیں میں اور تمہاری اماں ہم دونوں کی زندگی میں تمہارا فکر کرنا بیوقوفی ہے جس وقت میری سمجھ میں لڑکے آجائینگے معاملہ طے کردونگا اگر تم کنگاپور ہو گی تو اطلاع دیدونگا۔ نہ تمہارے مشورہ کا بھی انتظار نہ کرونگا تمہارا انتخاب چونکہ پہلا تھا اس وجہ سے چار سال لگائے واجدہ بیگم کے انتخاب میں مشکل سے ڈیڑھ سال لگا۔ اگر زندگی ہے تو

ان کے انتخاب میں اتنا بھی وقت نہ لگیگا"۔

میرا منجھلا بچہ اچھن میاں آٹھ سال کا تھا کہ قدرت نے مجھ سے چھین لیا وہ بچہ مجکو سب سے زیادہ عزیز تھا میں بیان نہیں کرسکتی میرے زخم پر مرہم کا کا پھایا ابا جان نے کس طرح رکھا ان کا سمجھانا لہجہ میں نرمی۔ الفاظ میں درد۔ ہر ہر لفظ کلیجہ کے پار ہوتا تھا۔ فرماتے تھے "مجکو اور اپنی اماں کو تو دیکھو دو بچے، ۸۰ سال کے ایک بچہ ۱۰ سال کا سپرد خاک کرچکا ہوں" ہر ہر طرح اپنا حوالہ دیکر مجکو تسلی دیتے تھے۔ بچہ کے جانے کے مہینہ بھر بعد آموں کا موسم آیا پہلی دفعہ آم آئے۔ میں نے نہیں کھائے دریافت کیا "تم نے آم نہیں کھائے" میں نے کہا "نہیں" خاموش ہوگئے اور پھر سمجھانے لگے۔ دوبارہ پھر آم آئے میں نے نہیں کھائے پھر دریافت کیا "تم نے آج بھی آم نہیں کھائے" میں خاموش ہوگئی وہ بھی خاموش ہوگئے۔ دوسرے روز بازار گئے خود آم خرید کر لائے مجکو دیئے اور فرمایا "آم کاٹو" میں حکم کی تعمیل کرنے میں مصروف ہوگئی آپ باہر چلے گئے دیکھتی کیا ہوں سات سات۔ آٹھ۔ آٹھ سال کے بچوں کو اپنے ہمراہ لئے چلے آرہے ہیں سات آٹھ بچے یہ تھے دس بارہ یتیم بچیاں مدرسہ کی تھیں مجھ سے کہا یہ آم جو تم نے کاٹے ہیں ان بچوں کو کھلادو۔ بچے اور مدرسے کی بچیاں آم کھا کر چلی گئیں جب کھانے کا وقت ہوا تو دستر خوان پر آم رکھے گئے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے سر چکرا تا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے آہ میری طرف دیکھ کر کسقدر محبت بھرے لہجہ سے فرمایا تھا "ہمارا ایک کہا کروگی" میں نے عرض کیا "فرمایئے" "آم چکھ لو" میں جواب دینے بھی نہ پائی تھی فرمانے لگے "تم جانتی ہو آم خربوزہ کس قدر پسند کرتا ہوں اگر تم نہ کھاؤگی تو میں بھی نہ کھاؤنگا۔ تم کو باپ کا خیال نہیں ہے جو تمھاری آنکھ کے سامنے ہے"۔ ابا جان نے اپنی بے مثل شفقت کا اس قدر زبردست اثر چھوڑا ہے کہ پرواز روح تک یاد کرونگی اور تڑپوں گی۔

بے نظیر بیٹے

محترمہ دادی اماں کے انتقال کے وقت میری عمر آٹھ نو سال کی تھی۔ دادی اماں صرف آٹھ دس روز علیل رہیں پرانے زمانہ کی بزرگ تھیں اُن کا عقیدہ تھا کہ ڈاکٹری دوا پینی گناہ ہے اس لئے کہ اس میں شراب کی امیزش ہوتی ہے پہلے روز جب بخار چڑھا تو ابا جان دفتر گئے ہوئے تھے رات کو سینے میں درد اُٹھا۔ دوسرے روز حسب معمول صبح اُٹھیں نماز سے فارغ ہوکر باہر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور ابا جان سے باتیں کرتی رہیں اپنی تکلیف کی مطلق خبر نہ ہونے دی۔ دفتر کا وقت قریب ہوا اور ابا جان مطمئن دفتر چلے گئے۔ اور دادی اماں نے قبیر وطی منگوا کر سینے پر ملوائی اور سکائی کروائی۔ دن گذر گیا مگر تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ ابا جان کے آنے کا وقت ہوگیا۔ دادی اماں نے سختی سے گھر میں تاکید کردی کہ "اُبّی میاں جب آئیں تو اُن سے میرے بخار اور درد کا ذکر کوئی نہ کرے" ابا جان کو دادی اماں اور ددھیال ننھیال والے "اُبّی میاں" کہا کرتے تھے دادی اماں نے لاکھ کوشش کی اُنہیں تکلیف کا علم نہ ہو مگر ابا جان دفتر سے آتے ہی اپنی ماں کو لیٹا ہوا دیکھ کر پریشان ہوگئے اور طبیعت کی کیفیت دریافت کی اور دادی اماں نے اپنی تکلیف کا اظہار معمولی طور سے بیان کردیا اور ابا جان ڈاکٹر کو لینے جانے لگے۔ دادی اماں ڈاکٹر کا نام سُنکر اُٹھ بیٹھیں اور ناراض ہونے لگیں آخر ابا جان حکیم کو لائے دریافت کرنے سے معلوم ہوا حکیم اجمل خاں صاحب باہر گئے ہوئے تھے حکیم علی احمد خاں صاحب جو دہلی کے مشہور اور بڑے حکیموں میں تھے اُن کو لائے دو روز ان کے زیر علاج رہیں۔ کچھ فائدہ نظر نہ آیا تو پھر حکیم قاسم علی صاحب کا دو روز علاج کیا۔ چوتھے روز بغیر کہے ڈاکٹر ہیم چندر کو جو اُس وقت دہلی کے بہترین ڈاکٹر تھے اُن کو لائے بہت مشکل اور خوشامد سے دادی اماں کو رضامند کرلیا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھادیں ڈاکٹر نے نمونیہ تشخیص کیا۔ دونوں حکیموں تیسرے ڈاکٹر تینوں کی متفق رائے نے ابا جان کے ہوش اُڑادئے چھٹی کی درخواست تو ایک روز پہلے ہی دے دی تھی وقت کا ہر لمحہ اُن کی خدمت میں گذارتے رہے۔ دن کی بھوک رات کی نیند اُڑ چکی تھی۔ دن کو پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھے رہتے رات کو اپنا پلنگ اُن کے پلنگ کے پاس بچھواتے اور ساری رات بیٹھے رہتے مجکو اچھی طرح یاد ہے چھ سات روز تک دادی اماں کے پلنگ کی پٹی نہ چھوڑی۔ بخار کے تیسرے روز ابا جان سمجھے کوئلے ختم ہوگئے ہونگے صحن میں آکر ملازم کو آواز دی اور ایک کوئلہ کی بوری منگوانے کو کہا دادی اماں خاصی دُور صدر دالان میں تھیں۔ ابا جان

کی آواز سنکر بہت زور سے آواز دی "ابّی میاں! یہاں آؤ کوئلے کیوں منگواتے ہو سات بوریاں تھیں شاید ایک ختم ہوگئی ہو چھ ضرور ہونگی جب یہ ختم ہو جائیں پھر منگوانا"۔ محترمہ دادی، اس بہت کفایت شعار بزرگ تھیں تمام گرمیوں کھانا پکنے کے بعد کوئلے بجھواتی تھیں اور کئی کئی بوریاں بھروا کر رکھوا دیتی تھیں۔ ایک ایک پیسہ کا بھی سودا چکا کر خریدتی تھیں بھلا ایک بوری کوئلہ کی بغیر چکائے خریدنے کی کس طرح اجازت دے سکتی تھیں دادی اماں کا دماغ اخیر وقت تک صحیح رہا جس صبح رخصت ہونے والی تھیں رات کے تین بجے ابا جان سے کہا "میں چاہتی ہوں مجکو خواجہ باقی باللہ میں دفن کرنا میں جانتی ہوں وہاں کی زمین بہت مہنگی ہے۔ تم گھبرانا نہیں۔ لو یہ کنجیاں کوٹھری میں سبز رنگ کا جو صندوق ہے اُسمیں ایک تھیلی چھالیہ کی ہے وہ تھیلی تم کو اتنا دے دیگی کہ تم کو اپنے پاس سے کچھ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی"۔ ابا جان نے کنجیاں لینے سے ہر چند انکار کیا مگر زبردستی ان کے کمر بند میں کنجیاں بندھوا دیں اور ابا جان دوسرے گھر میں جاکر رونے لگے معلوم نہیں ابا جان کے رونیکی آواز سُنی یا خود ہی آواز دی "ابّی میاں" ابا جان کو اُسی وقت بلایا گیا۔ دادا اماں جھکی ہوئی بیٹھی تھیں فرمایا "مجکو پانی پلاؤ" ان کے ہاتھ سے پانی پیکر ابا جان کو دعا دی "جس طرح تم نے مجھے خوش رکھا اسی طرح خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے"۔ ابا جان پوری طرح لٹا بھی نہ سکے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں سر تھا اور پشت کا حصہ گھٹنے پر کہ ابا جان کی عاشق زار ماں دعائیں دیتی ہوئیں ابا جان کی گود میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

سودائے نقد

ابا جان کی جان رازق میاں کی حالت کن آنکھوں سے دیکھوں جو شخص دن میں چار چار مرتبہ لباس تبدیل کرتا اور گرمیوں میں بغیر موزوں کے رہنا معیوب سمجھتا تھا نفاست کی یہ کیفیت تھی کہ پلنگ کی چادر اور تکیہ کے غلاف روزانہ بدلواتا تھا فراق پدری نے اس کی حالت کچھ سے کچھ کردی گھر سے اُٹھے دفتر جا بیٹھے وہاں سے پھر گھر میں آگئے کہاں کی سیر و تفریح کیسے کھیل تماشے اور کس کی نفاست۔ کپڑے بدلے ہوئے کئی کئی دن ہو جاتے ہیں بیٹھے ہیں تو گُم سم۔ لیٹے ہیں تو چُپ۔ ایک خاموش تصویر ہے کہ سنیما کی تصویروں کی طرح چلتے پھرتے دیکھ لو۔ کمر جھک گئی۔ چہرے کی رنگت تبدیل ہوگئی خاصا گول ڈیل تین مہینے میں گھُل کر ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا دل مرگیا۔ جان گھُل گئی حقیقت تو یہ ہے ابا جان دنیا سے کیا رخصت ہوئے رازق میاں کی بادشاہت اپنے ساتھ لے گئے ایک تصویر ہے جو آنکھوں میں ایک خیال ہے جو دماغ میں ہر لحہ بسا ہوا ہے ابا جان کے مرض کی ترقی کے ساتھ ساتھ رازق میاں کی حالت بدتر ہو رہی تھی دن کی بھوک رہی تھی نہ رات کی نیند۔ دو دو اور تین تین وقت صاف گزر جاتے اور ایک چائے کی پیالی بھی حلق سے نہ اُترتی تھی صورت سے معلوم ہوتا تھا چھ مہینے کے بیمار ہیں۔ ابا جان کی علالت ہی میں رازق میاں کے چہرے پر یتیمی برس رہی تھی جہاں تک سمجھتی ہوں ابا جان بھی رازق میاں کی صورت دیکھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے ہونگے مگر رازق میاں کی صورت کے عاشق ہونے کے ساتھ دور اندیش بھی تھے کس طرح اپنی زبان سے مایوسی کے الفاظ ان کے سامنے کہتے۔ سنتی ہوں جو شخص ایک نیکی کریگا اُس کو دس نیکیوں کا اجر ملیگا قدرت کو ابا جان کی نیکیوں کا کچھ بدلہ دنیا میں دینا تھا۔ ابا جان نے جیسی خدمت آٹھ دن تک اپنی ماں کی کی تھی ویسی خدمت ابا جان کے لال رازق میاں نے متواتر آٹھ ہفتہ کی۔ ابا جان اپنی لائق فرمانبردار اولاد کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے" اس سے بڑھ کر ابا جان کی خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے کہ بچوں کی طرف سے مطمئن رخصت ہوئے خوب سمجھتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے بعد رازق میاں سب کو سنبھال لیں گے مگر رازق کا سنبھالنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس خیال سے جو کیفیت دل کی ہوتی ہوگی اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب تیسری مرتبہ خون آرہا تھا اور کمزوری ترقی کر رہی تھی آنکھیں بند تھیں تو فرمایا "رازق دیوانہ ہو جائیگا" یہ سُن کر میں بے چین ہوگئی اور عرض کیا "ابا کیا کہہ رہے ہیں"۔ دو مرتبہ پوچھا کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نہ سمجھی کہ رازق میاں پر غم کا پہاڑ ٹوٹنے والا ہے اور اس چمن کی بہار لٹنے والی ہے۔ "راشدہ تم نہیں جانتیں رازق کیا چیز ہے" میں نے کہا "جانتی ہوں" فرمایا "نہیں جانتیں" میں نے کہا "کچھ تو جانتی ہوں" فرمایا ہاں کچھ جانتی ہو اگر اچھا ہو گیا تو اب بتا دوں گا کہ رازق کیا چیز ہے"۔ کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا "کس خیال میں ہو۔ ہوش میں آؤ۔ حالات پر نظر ڈالو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس خدمت اور صرف کا انجام

خوشگوار نظر نہیں آتا۔ رازق اپنی محبت میں اندھا ہو رہا ہے ارے غضب ہے دوا پلانے اور غذا کھلانے کے لئے ڈاکٹر آرہے ہیں روپیہ ٹھیکری کی طرح اُڑھ رہا ہے۔ تم منع نہیں کرتیں" میں نے کہا" ابا آپ فکر نہ کیجئے روپیہ آپ پر سے قربان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روپیہ بہت بےغل و غش اُٹھ رہا ہے مگر رازق میاں کو اس وجہ سے نہیں روکتی کہ کہیں میرے کہنے سے اُن کی دل شکنی نہ ہو"۔ "نہیں روکتیں تو نہ روکو" یہ کہہ کے خاموش ہوگئے۔ پھر کمزوری کی وجہ سے غنودی طاری ہوگئی تھوڑی دیر بعد آنکھ کھول کر دیکھا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آئے میں جُھک گئی مگر کچھ نہ سُن سکی میں نے پوچھا" ابا کیا کہہ رہے ہیں"۔ "تم یہی پوچھتی رہتی ہو ابا کیا کہہ رہے ہیں ابا کیا کہہ رہے ہیں۔ نہیں سنتیں تو نہ سنوں" میں نے عاجزانہ لہجہ میں کہا" آپ روپیہ کے صرف کا مطلق خیال نہ کیجئے آپ کی زبردست قوت سے رازق میاں روپیہ بہت سا پیدا کرلیں گے رازق میاں کس کے ہیں اور روپیہ کس کا ہے آپنے اچھا خیال کیا" "تم کیسی باتیں کرتی ہو میں فکر نہ کروں گا تو کون کرے گا"۔ یہ کہہ کر دونوں آنکھوں سے آنسوں ڈھلکنے لگے۔ چونکہ میری طبیعت بگڑ رہی تھی آنسو دیکھنے کے بعد ضبط نہ کرسکی فوراً اُٹھ کر بڑے کمرے میں چلی گئی اُسی وقت صادق میاں نے آکر دوا پلائی۔ اور ممانی جان صاحبہ آئیں اُن سے باتیں کرنے لگے۔ دل پر چھریاں چل رہی تھیں دنیا آنکھوں میں تاریک تھی۔ دو دفعہ ارادہ کیا رازق میاں سے کہوں کہ میاں دونوں پہلو اپنے سامنے رکھنے چاہئیں بہتری بھی اور بدتری بھی۔ طبیعت دیکھ کر حالت کو سمجھ کر نہیں کچھ کہہ سکتی تھی نہ وہ سن سکتے تھے جس طرح ننھے بچے اڈراؤنی چیز سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح اس قیامت خیز آنے والی مصیبت کا خیال بھولے سے کبھی آجاتا تو جسم میں سنسنی اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا۔ اُوکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں میں سر دے لیتے آخر وہ وقت آپہنچا۔ خاموشی کے ساتھ ذمہ داری کا زبردست بوجھ اور افکار کا انبار رازق میاں کے کمزور کندھوں پر رکھ کر رخصت ہوئے۔ چمکی تھی تو دڑی تھی اور پڑی تھی تو سہی تھی اب رازق میاں کی تفریح ابا جان کی آرام گاہ ہے اور خدمت اُن کی کتابیں چھپوانا دلچسپی اُن کے مضمون دیکھنا۔ اور تسکین ان کی یاد میں لکھنا رب العالمین! رازق جیسے سعید کل جہان کو دے۔ الٰہی اس کے دل کو کل دے جسم میں طاقت اور دماغ میں اتنی قوت دے کہ بہنوں اور بھیوں کی خدمت اس طرح کرتے رہیں جس طرح ابا جان کے سامنے کرتے تھے۔

ابا جان کی روح صادق میاں بچپن کی حدود سے نکل کر عالمِ شباب میں قدم رکھ رہے تھے۔ مسرت میں ڈوبا ہوا بیفکر دل ابا جان کی آغوش میں پھول رہا تھا۔ وقت کا ہر لمحہ نازبرداری دل جوئی میں گذر رہا تھا لیکن عمر کی ترقی کے ساتھ یتیمی کا وقت قریب آرہا تھا اور بدنصیبی سر پر کھیل رہی تھی ابا جان کی بیوقت جُدائی نے صادق کی خوشیوں کا خاتمہ اور دل کی بستی سونی کردی جس طرح مالی محنت و مشقت کے بعد ایک قطعہ زمین درست کرکے بہت سی امیدوں کے ساتھ چمن تیار کرتا ہے اُسکی سرسبزی کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو فرحت دماغ کو تقویت اور دل کو سکون پہنچتا ہے اسی طرح ابا جان بہت سی توقعات کے ساتھ اُمنگوں اور ارمانوں کو لئے ہوئے اس آخری چھوٹے پودے کی پرورش میں منہمک تھے اس لہلہاتے ہوئے پودے کے جب کھلنے اور بارآور ہونے کی توقع قائم ہوئی تو ابا جان حسرت و ارمان لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے ابا جان نے گیارہ لڑکوں میں، خدا رکھے ان کی جانوں کو یہ دو پھونسڑے چھوڑے ہیں۔ ان میں بھی ایک بہو کی بہار دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ رازق میاں دیوانہ وار صادق میاں کو سنبھال رہے ہیں ابا جان کی جدائی کے زخم پر اپنی محبت کا پھایا رکھ رہے ہیں۔ خدا اماں جان کا مبارک سایہ سلامت رکھے اور رازق میاں کی عمر میں برکت دے ارحم الراحمین اماں جان اور رازق میاں کے زیر سایہ صادق میاں کو پھولنا پھلنا نصیب ہو۔ رب العالمین ابا جان کی کھیتی کو سرسبز و شاداب رکھیو!

راشدہ

بھائی اَبیّ اور بھابی صاحبہ کے تعلقات

میرے حقیقی چچا زاد بھائی مولانا راشد الخیری (علیہ الرحمۃ) کی بابت عصمت بنات اور کئی رسالوں میں سب طرح کے مضمون چھپ چکے ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمہ صفت موصوف انسان تھے علم و ادب میں ان کا درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا شہرت و ناموری کی انتہا ہو گئی تھی لیکن میں جس بارے میں لکھنا چاہتی ہوں اُسکا کسی کو خیال نہ آیا ہوگا یعنی یہ کہ وہ ایک بے مثل شوہر تھے شہرت اور علم و فضل کے لحاظ سے ہمارے خاندان میں جسے شاہان مغلیہ کے استاد ہونیکا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا ہے اور بھی کئی بزرگ ہوئے ہیں۔ ہمارے پردادا مولوی عبدالخالق مرحوم شاہجہاں آباد کے جید عالم اور حدیث کے بہت مشہور ماہر تھے ان کی بابت سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں بہت شاندار الفاظ لکھے ہیں۔ان کے دونوں لڑکوں مولوی عبدالقادر مرحوم اور مولوی عبدالرب بانئے جامع مسجد سہارنپور نے مذہب کی بہت زبردست خدمت کی تھی۔ مذہبی اقتدار سے شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم محدث دہلی اور مذہبی اور ادبی لحاظ سے شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے۔غرض ہمارے خاندان کے بزرگوں نے مذہب اور ادب کی بہت شاندار خدمت انجام دی ہے اور بہت نام پایا ہے لیکن شوہر کی حیثیت سے مولانا **راشد الخیری** صاحب کی مثال نکلنی بہت مشکل ہے۔مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی راشد الخیری صاحب دونوں صاحبان اپنی اپنی شادی سے پہلے معمولی حیثیت اور معمولی تعلیم کے اشخاص تھے۔

جب ان بزرگوں کی شادیاں ہوئیں تو یہ کچھ بھی نہ تھے سوائے شرافت خاندانی کے۔میرے بزرگ چچا حافظ عبدالواجد صاحب مرحوم اپنے دو بچے نابالغی کی عمر میں چھوڑ کر حیدر آباد دکن میں جہاں وہ محکمۂ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے انتقال فرماگئے تھے ایک لڑکی زاہد بیگم اور ان سے دو سال بڑے ایک لڑکے راشد الخیری صاحب تھے۔لڑکی کا نکاح میرے والد مرحوم نے اپنی ولایت میں دہلی کے ایک معزز خاندان یعنے امام جامع مسجد کے نواسے سے کردیا۔اب میرے یہ بھائی رہ گئے۔میری دادی اماں مرحومہ مغفورہ ان سے بہت ہی محبت کرتی تھیں اور پیار سے "ابیّ" کہا کرتی تھیں ان کا یہ دلی ارمان تھا کہ کسی طرح "ابیّ" کو دولھا بنا دیکھوں۔کئی مرتبہ میرے والد سے کہا "میاں عبدالحامد اس کی شادی کردو" وہ جواب دیتے "آماں کیسے کردوں پڑھتا ہے نہ لکھتا ہے"۔ایک مرتبہ راشد الخیری صاحب کی والدہ صاحبہ اپنے میکے آئیں تو بانئے جامع مسجد ہجہر مولوی شاہ عبدالرحیم صاحب آکر ان کے دیوار بیچ رہے اُن کے چھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ایک دن مولانا موصوف کی والدہ نے ڈولی بھیجی کہ اماں کو دلہن یعنی اپنی ساس کو بلایا ہے۔ میں اُن کے ساتھ ڈولی میں آئی مری دادی اماں مرحومہ اپنے بچوں کی اولاد میں دو سے بہت محبت کرتی تھیں اول راشد الخیری صاحب سے کہ یہ مرحوم بیٹے کی نشانی تھے دوم مجھ سے کہ مجھکو ان کی ایک چھوٹی بیٹی نے جو کم عمری میں بیوہ ہوگئی تھیں اپنے بھائی سے لے کر متبنیٰ کرلیا تھا۔یہ میں نے اس واسطے لکھا کہ میں ڈولی میں ساتھ آئی۔غرض ہم آن کر اُترے تو مولانا موصوف کی والدہ نے اپنی ساس سے کہا کہ "بی اماں ایک لڑکی ہے وہ تم پسند کرلو اَبیّ کے واسطے"۔اور ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔وہ اس قدر اپنی ان بہو سے محبت کرتی تھیں آنسو دیکھ کر بیقرار ہوگئیں۔ اور پوچھا "کہاں ہے؟" بہو نے کہا "پہلے دیکھ تو لو" ساس نے کہا "بس میں کیا دیکھوں گی تم نے دیکھ لیا"۔ان کے گھر کی اور اس گھر کے بیچ کی دیوار میں ایک موکھا تھا۔میری دادی اماں نے دولھن کی والدہ صاحبہ کو آواز دی جب وہ آئیں تو یہ کہا کہ "میرے پوتے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کردو"۔پھر میں نے نہیں سنا کہ کیا باتیں ہوئیں دونوں میں۔کیونکہ موکھا اُونچا تھا اور میرا قد نیچا۔اور نہ مجھکو ان باتوں میں لطف آسکتا تھا ہاں مجھکو یہ یاد ہے کہ قریب عصر جب میں دلہن کے گھر بھاگی ہوئی دیکھنے گئی تو دلہن کی اماں نے میرے سامنے دستر خوان بچھایا

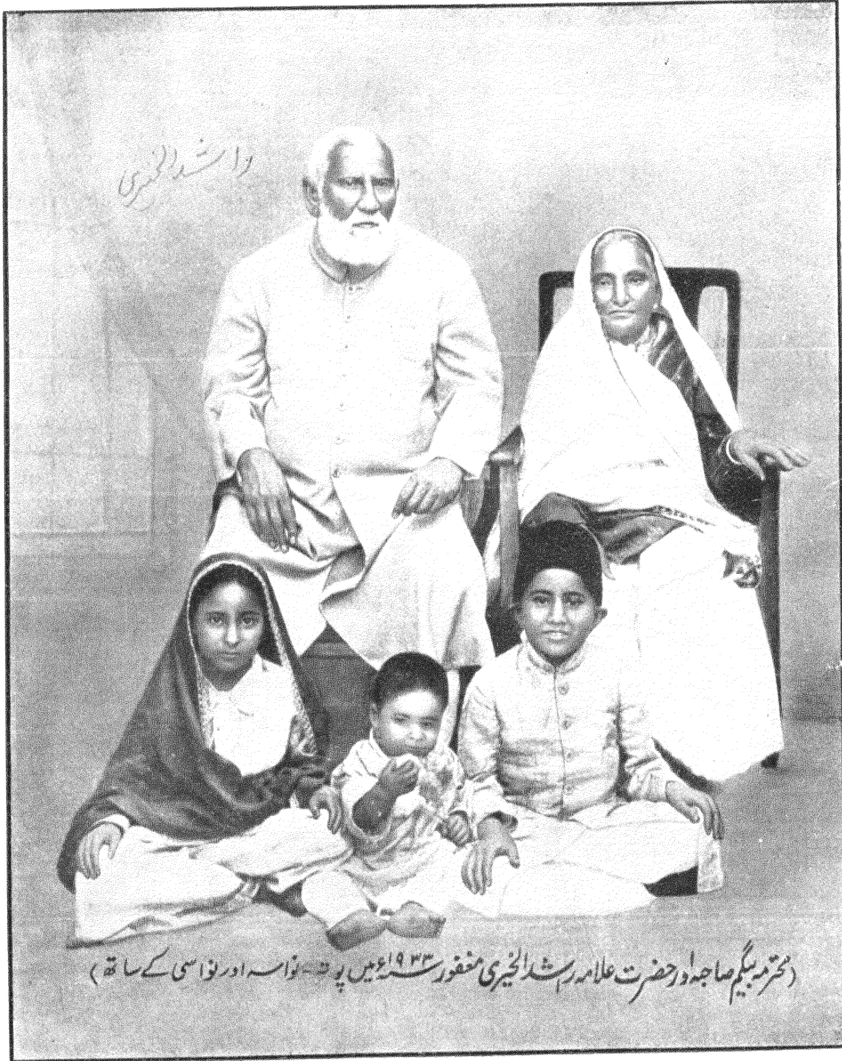
اور ناشتہ رکھا جس سے یہ ثابت ہوا کہ بات ٹھیر گئی۔ جب میں گھر آئی تو میری دادی اماں بڑی خوشی سے ہر ایک سے کہہ رہی تھیں کہ "ہم تو اپنے ابی کی بات ٹھیر آئے ہیں۔ اور میں بھی اڑ گئی کہ ہاں کروا کر جاؤنگی"۔ اللہ اللہ! کیسے شریف لوگ تھے ایک بزرگ بی بی کے کہنے کو نہ ٹالا۔ یہ مجھکو یاد نہیں کہ کے مہینے کے بعد مگر باوجودیکہ دولھن کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ مولانا موصوف کی والدہ مرحومہ کو اپنی ماں کے ترکے سے کئی مکان ملے تھے۔ وہ وہیں رہنے لگیں۔ آہ بھائی دولھا بنے تو ایسے خوبصورت دولھا بنے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس وقت بھی میری آنکھوں میں وہ نقشہ پھر رہا ہے۔ میں نے اور آپا زاہدہ بیگم نے آنچل ڈالا۔ دلہن کی پالکی میں بیٹھے۔ ہماری دادی اماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی مگر بہو سے چھپ کر رو بھی لیتی تھیں اپنے بیٹے کو یاد کر کے۔ یہی حال بہو کا تھا کہ ساس کی آنکھ بچی اور انہوں نے جلدی جلدی دوپٹہ سے آنچل پوچھ لئے ہماری بھابی جہیز بہت سا لائیں خدا انہیں زندہ سلامت رکھے بہت خدمتگذار اور سلیقہ شعار تھیں جن لوگوں کا خیال تھا کہ ابی مڑ کر نہ دیکھے گا حیرت میں رہ گئے۔ اکثر میں نے دعائیں سنی ہیں کہ تیری ایڑی دیکھ کر دوسری کا منہ نہ دیکھے وہاں یہ دعا ختم تھی جس گھڑی بھابی کا قدم آیا گویا لچھمی آ گئی۔ عزت میں شہرت میں۔ غرض ہر بات میں بھائی نے قدم آگے بڑھانا شروع کیا مگر بھابی سے بے انتہا عشق تھا جب تک زندہ رہے اُن کے پھول ناغہ نہیں ہوئے ایک دن کو اپنے سے جدا نہ کرتے تھے۔ دشمنوں کو بخار آیا آرام ہوا۔ ملا نے کھلائے جا رہے ہیں۔ جس کے ہاں جتنی دیر بیٹھے ہیں بھابی کا ذکر ہے اُن کا دل چاہتا تھا میری طرح سب بھابی سے محبت کریں۔ بھابی سے اُنہیں کتنا عشق تھا اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بالعموم کسی کے ہاں کھانا نہ کھاتے تھے جوانی کے زمانہ میں رشتہ کنبہ والوں میں یا بچپن کے بے تکلف دوستوں میں اگر رات کے گیارہ بارہ بج جاتے تو بھوکے رہتے مگر کھانا گھر آ کر بھابی کے ساتھ کھاتے تھے۔ جب ہمارے ہاں آتے بھابی ہمیشہ ساتھ ہوتیں۔ اُن کے جانے سے چند روز پہلے میں اُن کو دیکھنے گئی تو کچھ شرافت خاندانی کا ذکر آیا خاص کر بچوں کی سعادتمندی کا۔ مجھ سے کہا "آج کل ماہ میں لکھ نہیں سکتا تم ایک مضمون عصمت کے واسطے لکھدو تاکہ دوسرے لوگوں کے بچے بھی ایسی ہی اپنے ماں باپ کی خدمت کریں"۔ میں نے کہا ضرور لکھوں گی۔ پھر میں نے کہا کمال کیا ہے شریف ماں باپ کے بچے کیا ہی کرتے ہیں" تو مسکرا کر کہا "شریف باپ نہیں شریف ماں کے بچے" کئی مرتبہ کہا تو میں نے کہا "کیا ہم شریف نہیں ہیں" تو فرمایا "نہیں۔ بتاؤ اپنے باپ کی کیا خدمت کی"؟ وہ ایک بہترین باپ اور بہترین بھائی اور بہترین خسر اور ہر ہر لحاظ سے کنبے والوں کے لئے بہترین تھے اور بہترین برتاؤ کرتے تھے۔ بھائی کی طرح بھابی صاحبہ میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ صانع قدرت نے یہ جوڑا ہی نرالی وضع کا بنایا تھا۔ آہ ایک ان میں سے بچھڑ گیا۔ ہماری بھابی صاحبہ کو خدا زندہ سلامت رکھے۔ اگر ایسی عادت کی نہ ہوتیں تو بھائی ان سے اتنی محبت نہ کرتے۔ بخدا چھیالیس سال میں میاں بی بی میں کبھی کسی بات پر معمولی سی رنجش نہیں ہوئی۔ میری بھابی ایسی ہیں کہ کبھی ہمارے سامنے کسی سے اُن سے جھگڑا نہیں ہوا۔ متواضع ایسی کہ چلتے پھرتے بھی ہم یا کوئی جا نکلے کبھی بغیر ناشتہ کرائے نہ بھیجیں۔ میں نے کبھی بھابی کو گرم آواز سے بولتے نہیں سنا۔ نہ ٹھٹھا مارتے قہقہے لگاتے دیکھا۔ اب بھی اُن کا یہ حال ہے بچوں کے سامنے آنسو نہیں نکالتیں۔ جب بھائی کو لے کر گئے اور تیسرے پہر کھانا گھر میں آیا جھٹ کھڑی ہو گئیں۔ بہو بیٹوں نے منع کیا بھاوجوں نے منع کیا کہ ہم کھلوا دیں گے۔ چپکے سے کہا کہ "بی میں اپنی سسرال والوں کو آپ کھلاؤں گی۔ مجھے کسی کا اعتبار نہیں"! اللہ اللہ کیسی قابل عزت ہستی ہیں۔ بہنیں غور کریں مصیبت و ستم کا پہاڑ جس پر ٹوٹ پڑا ہو اور جس کا بے مثل جوڑا بچھڑ گیا ہو اُس کو اب بھی سسرال والوں کا اتنا خیال!! نئی روشنی کی بیبیوں کو دیکھتی ہوں۔ کہ سسرال والوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتیں۔ مگر بھابی صاحبہ نے سسرال کے ہر چھوٹے بڑے کی عزت حد سے بڑھا دی۔ بھابی صاحبہ اور بھائی کے تعلقات بے مثل تھے اور ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کے بھی عاشق زار تھے۔ مگر

بچے بھی ایسے خدمت گذار اور سعادت مند جن کو دیکھ دیکھ کر دونوں کا دل باغ باغ ہوتا تھا۔ بیماری میں بچوں کی خدمت سے بہت متاثر تھے جو خیریت کو آتا رازق میاں کی تعریف کبھی راشدہ بیگم واجدہ بیگم کا ذکر کبھی صادق میاں کی بڑائی۔ سچ تو یہ ہے کہ انکے گھر کی محبت کی نظیر ہندوستان تو کیا اب دنیا میں بھی ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیشہ ہمیشہ اپنے حبیب پاک کے صدقے سے اس گھر پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ اسپر بھائی کا صدمہ، بہت کچھ لکھنا چاہتی تھی۔ مگر طبیعت کی بے چینی لکھنے نہیں دیتی۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا قاری سرفراز حسین مرحوم کے انتقال پر بھائی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ اب ان چار دوستوں میں صرف میں ان کو رونے کے لئے رہ گیا ہوں۔ میں نے بھائی کو خط لکھا تھا کہ آپ کے مضمون سے میرے آنسو نکل پڑے۔ اس طرح آپنے کیوں لکھدیا کہ میں باقی ہوں۔ آہ اب وہ بھی نہ رہے۔ ایسے اچھے انسان ایسے شفیق بھائی کی جدائی جتنا رُلائے کم ہے۔ ان کی ہنسی مذاق اور محبت و شفقت کی باتیں رہ رہ کر تڑپاتی ہیں۔ مگر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ۔ کل ہماری باری ہے

ایک بات جسکی بابت میں پیشین گوئی کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ بھائی کا بڑا پوتا محترمہ خاتون اکرم کی نشانی اسعد راشد انشاءاللہ العزیز راشد ثانی بنے گا۔ اسکا سر بالکل بھائی کی طرح ہے ہندوستان کی کم عمر بچیوں کو خوش ہونا چاہیئے کہ راشد الخیری اُن کے پاس سے ہمیشہ کے واسطے نہیں گئے۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا کے سٹیج پر کھڑے ہوکر مسلمان بچیوں کی ہمدردی یہ چھوٹا راشد الخیری کرے گا۔ ہم اُس وقت نہ ہوں گے مگر ہمارا یہ فقرہ جلی حرفوں سے بہنوں کو لکھ رکھنا چاہیئے۔

حامدہ الخیری



(محترمہ بیگم صاحبہ اور حضرت علامہ راشد الخیری مغفور سنہ ۱۹۳۳ء میں پوتے۔ نواسہ اور نواسی کے ساتھ)

آہ بھائی علامہ

از کپتان حاجی مولوی حبیب الرحمن خان بہادر۔ سی، آئی، ای، او۔ بی ای، دہلی

بھائی علامہ راشد الخیری مرحوم میری اکلوتی بہن عزیزہ فاطمہ بیگم سلمہا کے شوہر اور میرے برادرِ نسبتی تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سچی محبت و ہمدردی اور اس بے تکلفی کے باعث جو لڑکپن کے زمانہ طالب علمی سے آپس میں چلی آتی تھی مثل میرے حقیقی بھائی اور مخلص دوست کے تھے اور اسی حیثیت سے کنبے کے اکثر معاملات میں اور بھائیوں کے ساتھ وہ بطور ایک رکن خاندان کے شمار کئے جاتے تھے، اور وہ بھی باوجود اس علم و فضل اس بے مثل قابلیت اور بے نظیر قوت حافظہ کے اور اس قدر و منزلت اور عزت و شہرت کے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی تھی، ہماری گھریلو صحبتوں میں اپنے ہی گھر کی طرح نہایت سیدھے سادے اور بے تکلف شامل ہوتے تھے اور اسی وجہ سے ہم پانچوں بھائی (جنمیں سے اب صرف تین زندہ رہ گئے ہیں اور ہم بھی چند روز کے مہمان ہیں) ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ پھر بھائی علامہ مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس قدر اخلاص و بے تکلفی کے ساتھ ہی وہ پرانی تہذیب و معاشرت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے۔ اور آپس کے حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے تھے، اور اس بارہ میں اپنی طرف سے کبھی کسی بھائی کو شکایت کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ حالانکہ عمروں کے لحاظ سے کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ بھائی علامہ کی اور اپنی جوانی کے وقت میں تو ان کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقعہ مجھے بہت ہی کم ملا تھا اس لئے کہ میں ملازمت کے سلسلہ میں جکڑا ہوا چھتیس سال تک گھر سے باہر دور و نزدیک کی فوجی چھاؤنیوں میں رہا، آخر میں ایک عرصہ دراز تک شملہ پر، مگر دس گیارہ برس سے پنشن لیکر بڑھاپے میں جب خانہ نشین ہوا تو مجھے خوش قسمتی سے انکی صحبت تقریباً روزانہ ہی میسر آجاتی تھی، اس لئے کہ میرا جانا ان کے یہاں ہوتا یا نہ ہوتا، مگر وہ اپنی مخلصانہ محبت و مہربانی سے کچھ وقت نکالکر ایک پھیرا صبح یا شام ہمارے ہاں کر ہی جاتے۔ تھے اور اگر سوء اتفاق سے ہم میں سے کسی بھائی کے ہاں کچھ عذر و علالت کی حالت ہوتی تو پھر بے قرار ہو کر دلی ہمدردی سے دن رات میں کئی کئی بار تکلیف اٹھا کر آتے اور صرف معمولی طور پر پوچھ ہی نہیں جاتے بلکہ کسی بڑے طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جانے یا مریض کو دکھانے کی ضرورت ہوتی تو باوجود اور عزیزوں کی موجودگی کے خود ہی کسی ملازم وغیرہ کو ساتھ لیکر اپنی کار میں خاموشی سے چلے جاتے، اور پھر طبی معائنہ اور دوا کا انتظام تسلی بخش ہو جانے کے بعد مریض کے پاس بیٹھکر اس کی تیمارداری میں بھی اپنی خوش تدبیری سے مدد دیکر خود مریض اور اس کے متعلقین کو مسرور و مشکور کر جاتے تھے اسی طرح اگر کبھی ہم بھائیوں میں سے کسی کی طبیعت کچھ پریشان یا کسل مندسی دیکھ لیتے تو اپنی زندہ دلی اور خوش طبعی سے کسی نہ کسی طرح اسے بھی بالکل رفع نہ کر سکتے تو ہلکا ضرور کر دیتے تھے،

بھائی علامہ کا یہ شریفانہ و مخلصانہ حسن سلوک صرف ہم بھائیوں ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ اپنی بھاوجوں کو بھی عزیزہ زاہدہ بیگم سلمہا کی طرح اپنی حقیقی بہنیں تصور کرکے ان کا بھی ہر طرح سے پاس و لحاظ رکھتے تھے اور بھتیجوں اور ان کی دلہنوں اور بھتیجیوں اور ان کے شوہروں کو بھی اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھکر بزرگانہ شفقت سے ان کے مزاج و مذاق اور طبیعت کے موافق اپنے لطائف و ظرائف سے خوش کرتے رہتے، اور اس حسن عمل کا صرف زبانی ہی جمع خرچ نہ تھا بلکہ وہ بڑی فیاضی سے اپنا روپیہ اور بیش قیمت وقت بھی صرف کرتے تھے، چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ جب بھائی علامہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سیر تماشے کو گئے

تو دلی خواہش اور اصرار سے اور عزیزوں کو بھی شرکت دعوت دیدی اور اپنی خوش طبعی سے سب کو ہنسا کھلا کر خود بھی لطف اندوز ہو لئے، ان کی ایسی ہی بزرگانہ شفقتوں پہ نازاں ہو کر ہمارے کنبہ کے لڑکے لڑکیاں اور بچے، بچیاں ان کے گرویدہ تھے۔ اور جب کبھی وہ خود کہیں باہر سیر و تفریح کرنا چاہتے تو سب سے پہلے اپنے انہیں بزرگ مگر جوان ہمت زندہ دل پھوپا جان کو جو ہم بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچہ تھے، آگے رکھ لینے کی کوشش کرتے اور وہ بھی اگر کوئی مجبوری نہ ہوتی تو بڑی خوشی اور شفقت سے معہ اپنے اہل و عیال کے ان کے ساتھ ہو کر پھر لوڑہے بھائیوں اور بھاوجوں کو بھی طرح طرح کے حیلوں اور لطیفوں سے آمادہ کر لینے کی کوشش کر لیتے تھے اور پھر جو جو اُن کے ساتھ جا سکتے تھے ان سب کو گاڑیوں میں بھر کر کبھی دریا اور نہر کی سیر کیلئے او کھلے جا پہنچے اور وہاں مچھلی کے شکار و کباب اور فصلی میوہ جات کے لطف کے ساتھ بچوں کا کھیل کود بھی دیکھا اور بڑوں کو اپنے شعر و سخن اور علمی و تاریخی تذکروں اور مکالموں سے محظوظ کیا اور کبھی قطب صاحب کی لاٹھ یا کسی اور خوش منظر مقام و مقبرہ وغیرہ کے باغ یا سبزہ زار کی طرف جا نکلے اور وہیں جنگل میں منگل منا لیا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کنبے کے کئی لڑکوں نے اپنی فرصت اور خوشگوار موسم کو غنیمت سمجھکر سیر و تفریح کے لئے باہر جانے کی ٹھان لی اور ساتھ لیجانے کے لئے ناشتہ وغیرہ کا بھی چپکے چپکے انتظام کر لیا اور مجھ سے یا کسی اور بھائی سے پہلے ذکر کرنے کی جرأت ان کو اس لئے نہیں ہوئی کہ شاید ہمیں ان کے اس طرح جانے میں تامل ہو، مگر وہ آپس میں مشورہ کر کے سیدھے اپنے ناز برداراہی حضرتؒ "پھوپا جان" کے پاس پہنچے جنہیں ان کی دلجوئی کا ہر حالت میں خیال رہتا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ بھائی علامہ جھومتے جھامتے اور مسکراتے چلے آتے ہیں۔ سلام علیک کے بعد فرمانے لگے کہ بھائی صاحب آج کا دن تو گھر میں لیٹے بیٹھے رہنے کا نہیں ہے، چلئے کہیں آس پاس کچھ سیر و تفریح کر آئیں اور یہ لڑکیاں اور بچے بھی کھیل کود کر خوش ہو لیں، اسی طرح اور بھائیوں سے بھی اپنی خوش طبعی کے انداز میں کچھ جا کہا۔ غرضیکہ جو جو اعزا اس وقت جا سکتے تھے وہ فوراً تیار ہو کر بھائی علامہ کے اہل و عیال کے ساتھ جن میں ان کی تربیت گاہ کی کئی کم سن یتیم بچیاں بھی تھیں پہلے سے منصور کے مقبرہ کو روانہ ہو گئے۔ اور باقی کو وہ خود اپنے ساتھ لیکر بعد میں چلے، اتنے میں وہاں بچوں کے کھیل کود اور کھانے پینے کا سامان اور بڑوں کے آرام وغیرہ کا سب انتظام ہو گیا۔ اور پھر کئی گھنٹے صاف آب و ہوا میں بڑے لطف کیساتھ گذارنے کے بعد سب چھوٹے بڑے ماشاءاللہ خوب تازہ دم ہو کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے،

یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بھائی علامہ جن کے دل میں ملک و ملت کا اور خاصکر طبقہ نسواں کا اس قدر درد بھرا ہوا تھا کہ اپنے درد انگیز انداز بیان اور طرز تحریر سے دم بھر میں ہنستوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلا دینے اور تڑپا دینے میں کمال رکھتے تھے، وہ اپنی گھریلو زندگی میں نہ صرف پرانی وضع کے ایک صابر و شاکر، رمرنجان مرنج خیال کے بزرگ تھے بلکہ دوسروں کے دکھ درد میں دل سے شریک رہنے کے علاوہ خود اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی طرح زندہ دل اور خندہ رو رہکر اپنی نیک نیتی اور خوش طبعی سے بہت سے افسردہ دلوں اور روتوں کو باتوں ہی باتوں میں خوش کر کے ہنسا بھی دیتے تھے۔ اور اس طرح سے وہ اپنی حیات میں نہ صرف مصلحانہ تقریر و تحریر سے ہی دوسروں کی خانگی زندگیاں سنوارنے کی سعی مشکور کرتے رہے بلکہ وہ عملاً خود اپنی گھریلو زندگی بھی ایسے ہی پاک جذبات کے ساتھ گذار گئے جنکی وہ دوسروں کو تلقین کرتے تھے

بھائی علامہ مرحوم کو اپنی بیوی اور بچوں سے جس درجہ کی محبت تھی اس تہتر سال کی عمر میں میں نے تو کہیں دیکھی نہیں ایسے شریف طبیعت نیک طینت اور سعادتمند داماد بھی جیسے کہ وہ تھے اب بہت کم نظر آئیں گے انہوں نے اپنی ساس یعنی میری والدہ مرحومہ کی مثل اپنی حقیقی ماں کے اطاعت کی۔ سچے دل سے ہمیشہ انکا اور ان کے جذبات کا احترام کیا اور ہمیشہ انہیں خوش رکھا، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم جتنے اچھے لکھنے والے تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی، انکی بیشمار تصانیف کی طرح انکی خانگی زندگی کے تمام پہلو سبق آموز ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیکر جنت کے اعلیٰ درجات عطا فرمائے

علامہ راشدالخیری کی تصویر دیکھکر

(جو ٹائیٹل پر شائع کی جارہی ہے)

راشدالخیری کے دورِ زندگی کی یادگار!
آہ اے تصویر! تجھ پہ جان و دل سب کچھ نثار

ظاہری انداز تیری شکل کے ہیں سب وہی
ہے یہ پیشانی وہی، آنکھیں وہی ہیں لب وہی

ہلکا ہلکا سا لبوں پر بھی تبسّم ہے وہی
زندگی لیکن جسے کہتے ہیں بس گم ہے وہی

دیکھتے ہی تجھ کو تازہ ہو گئی یادِ حبیب
آگیا آنکھوں کے آگے پھر کوئی جنت نصیب

کوچہ چیلاں میں وہ اُن کا ٹہلنا یاد ہے
صحبتوں میں اُن کی اِس جی کا بہلنا یاد ہے

لوگ کہتے بھی کہ "ہے کیسا یہ چکر پاؤں میں"　ق
"اک فقط کُرتا گلے میں اک سلیپر پاؤں میں"

"سر برہنہ ہے، بدن پر شیروانی ہے نہ کوٹ"
سُن کے ہو جاتے وہ بس مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ

کہتے "پہنیں کپڑے اب کس کو دکھانے کے لئے
ہو رہے ہیں ہم تو اب تیار جانے کے لئے"

اُف وہ اُنکی وضعداری! اُف وہ انکی سادگی!
اور ہر لحظہ وہ خدمت کے لئے آمادگی!

واحدی[1] کے گھر، کبھی عارف[2] کے گھر آ بیٹھنا
گرمیوں میں شام ہوتے باغ میں جا بیٹھنا

❊

راشدالخیری! تجھے افسوس اب پائیں کہاں؟
ڈھونڈھنے کے واسطے جائیں تو ہم جائیں کہاں؟

تیرے ہی دم سے شگفتہ تھا چمن احباب کا
تھا مگر تو ہی چراغِ انجمن احباب کا

وہ ہنسی تیری وہ تیری شادمانی یاد ہے
وہ تیری پیرانہ سالی میں جوانی یاد ہے

تو وہاں ہے اب جہاں دخلِ بشر ممکن نہیں
زندگی بھر، لاکھ ہم چاہیں گذر ممکن نہیں

اس بڑھاپے میں تجھے سوجھی یہ اچھی دُور کی
جا چھپا اُس جا، جہاں بستی ہے دنیا نور کی

رات دن اب جرعہ ہائے آبِ کوثر اور تُو
حور و غلماں کے کمربستہ وہ لشکر اور تُو

خیر! تو خوش ہے تو ہوتا ہے ہمارا دل بھی شاد
سچ بتا لیکن کبھی آتی ہے یہ دنیا بھی یاد

سچ بتا دل میں کبھی آتا ہے رازق[3] کا خیال
یا کبھی بے چین کر جاتا ہے صادق[4] کا خیال

غم تو ہوتا ہی نہیں سنتے ہیں، خلد آباد میں
کیا کوئی آنسو گرا یا واجدہ[5] کی یاد میں

[1] علامہ مرحوم کے دوست ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی
[2] علامہ مرحوم کے مرحوم دوست مولانا عارف ہسوی
[3] علامہ مرحوم کے فرزند اکبر　[4] علامہ مرحوم کے فرزند اصغر
[5] علامہ مرحوم کی دختر نیک اختر

کچھ خیال حالتِ لختِ جگر بھی ہے تجھے؟ کیا گذرتی ہے یہاں سب پر خبر بھی ہے تجھے؟
کچھ خبر ہے؟ سعدؔ نے دو دن سے کچھ کھایا نہیں تو نے لحظہ بھر کو آ کر اس کو سمجھایا نہیں؟
کچھ خبر ہے؟ جھک گئی دو دن میں رازقؔ کی کمر کچھ خبر ہے؟ تجھکو روتے ہیں یہ سب آٹھوں پہر
اک طرف احباب کی آنکھوں سے ہیں آنسو رواں اک طرف دنیائے نسواں رنج سے گریہ کناں
تربیت گاہِ بنات اک خانہ غم بن گئی "بزم عصمت" اب سراپا بزم ماتم بن گئی
سب کو روتا چھوڑ کر اس طرح جاتا ہے کوئی ایسی بیدردی سے ہنستوں کو رلاتا ہے کوئی

ایک تیری موت سے یہ حشر سب برپا ہوا
شاد باشی! خیر جو کچھ ہوگیا اچھا ہوا

سعید بریلوی

(حاشیہ: ۵ مارچ ۳۶ء کو دو سال پورے ہوئے [مبہم])

غمِ راشدؒ

آنریبل سر عبد القادر ممبر انڈین کونسل۔ لندن۔

دہلی میں میرا قیام تو صرف دو سال رہا مگر دہلی اور اہل دہلی سے دلی لگاؤ برسوں پہلے سے تھا، اب تک ہے اور تا زیست رہیگا یوں تو شاہجہاں آباد کے در و دیوار تک دلچسپ ہیں اور ہندوستان کی تاریخ کے بہترین مناظر دنیا کی نظروں نے اس تاریخی سرزمین پر دیکھے ہیں، لیکن ان سے بھی بڑھ کر میرے لئے اس شہر کی دلچسپی یہ تھی کہ زبان اردو کا گہوارہ ہے۔ اور اردو کے اکثر بڑے شاعر اور نثر نگار اسی سرزمین سے پیدا ہوئے اور زیادہ تر یہیں پیوند خاک ہوئے۔ بقول مولانا حالی مرحوم ؎

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ پھر دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

آہ! ہمارے دوست، ادب اردو کے محسن، تعلیم نسواں اور حقوقِ نسواں کے حامی مولانا راشد الخیری بھی اسی خزانے میں چلے گئے، اور ہندوستان اس علمی، اور ادبی دولت سے محروم ہوگیا۔ جو خدا نے انہیں عطا کی تھی اور وہ بے دریغ لٹا رہے تھے، دہلی جانے سے پہلے ان سے میری غائبانہ دوستی تھی، دہلی میں ملاقات شروع ہوئی اور وہیں ختم ہوگئی اس کے بعد میں نے ایک دفعہ انہیں لاہور میں دیکھا جب وہ وہاں کی انجمن میں تقریر کے لئے تشریف لائے، اور غالباً ایک دفعہ اور بھی دہلی میں ان سے ملا، مگر وہ دو سال جو دہلی میں گذرے، ان میں شاید کوئی دن ایسا نہ تھا جس میں ان سے ملاقات نہ ہوئی ہو یا گھنٹوں باتیں نہ ہوئی ہوں۔

آغاز مراسم خط و کتابت سے ہوا، جب میں نے رسالہ مخزن لاہور سے شائع کیا، اسوقت مرحوم گورنمنٹ کی ملازمت میں تھے۔ میرے پاس ان کا ایک خط اور مضمون پہنچا۔ انہوں نے لکھا تھا "رسالہ انہیں بہت پسند آیا اور وہ کبھی کبھی

اس کے لئے مضمون عنایت کریں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مضمون کی تعریف لکھتے ہوئے یہ لکھا کہ مجھے زیادہ خوشی یہ ہوئی کہ اس مضمون میں مولانا نذیر احمد کی طرز تحریر کی جھلک ہے، انہوں نے جواب میں بتایا کہ انہیں اس طرز تحریر کے سیکھنے کا خاص موقع ملا ہے، کیونکہ مولانا سے ان کو قرابت ہے خط وکتابت کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ مولانا راشد الخیری محسوس کرتے تھے کہ سرکاری دفتر کی میز اور اس کی خشک مصروفیتیں ان کے لئے ایک قید بے زنجیر تھیں، اور ان کی خداداد ذہانت اور جودت طبع کا کوئی صحیح مصرف وہاں نہیں ملتا۔ ایک دفعہ جب انہوں نے خط میں اس خیال کا اظہار کیا تو میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر کوئی علمی کام کریں، خدا اسی میں برکت دیگا یہ مشورہ ان کو پسند تو ضرور آیا مگر ایک عرصہ تک متذبذب رہے۔ لگا ہوا مستقل روزگار چھوڑ کر ادبی مشاغل کی غیر مستقل آمدنی سے گذارہ کرنا مشکلات سے خالی نہ تھا آخر یہ صلاح ٹھیری کہ وہ پہلے رخصت لیکر گھر آئیں اور کچھ علمی کام شروع کریں، اور اگر کام چلتا نظر آئے تو ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ مجھے اب ٹھیک یاد نہیں کہ جب میں نے ۱۹۰۵ء میں بیرسٹر ہونے کے بعد دہلی میں وکالت شروع کی اور رسالہ مخزن کا دفتر بھی میرے ساتھ لاہور سے دہلی منتقل ہوا تو ملازمت چھوڑ چکے تھے یا اس کے بعد چھوڑی مگر غالب یہ ہے کہ انہی دنوں میں انہوں نے پہلے رخصت لی اور پھر مکمل آزادی حاصل کی۔ بس پھر کیا تھا ان کی ادبی خدمات کا دور شروع ہوا۔

دہلی میں میرے دو دفتر تھے، ایک وکالت کے لئے کچہری کے قریب کشمیری دروازہ میں اور دوسرا مخزن کے مطبع اور دفتر کے لئے، دریا گنج کے ایک بڑے مکان میں جہاں پہلے ایک کارخانہ تھا اور اسے میل والا مکان کہتے تھے۔ اور بعد میں جہاں مولانا محمد علی مرحوم رہتے اور جو ہمدرد، کامریڈ کا دفتر تھا۔ اس مکان کے مقابل شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ مرحوم کا مکان تھا، ہمارے کرمفرما خواجہ حسن نظامی بھی جب شہر میں آتے تو اسی قرب وجوار میں ٹھیرتے تھے مولانا راشد الخیری کا گھر بھی قریب تھا مرحوم قاری سرفراز حسین عزمی بھی زیادہ دور نہ تھے، علمی ذوق رکھنے والے نوجوانوں میں مسٹر آصف علی جو اب میدان سیاست کے شہسوار ہیں، ان کا گھر بھی میل والے مکان کے دیوار بہ دیوار تھا۔ میں صبح کو کچہری والے دفتر میں کام کرتا اور پچھلے پہر دفتر مخزن میں جاتا جس کی کارپردازی شیخ محمد اکرام کے ذمے تھی۔ اور وہ وہیں مقیم تھے۔ شام کو محفل ادب گرم ہوتی تھی ہمارے مکرم جناب آغا شاعر دہلوی اگر دہلی سے باہر نہ ہوتے تو اکثر وہ بھی رونق افروز ہوتے تھے، مولوی ذکاءاللہ صاحب جن کے مقابلہ میں ہم سب خورد تھے کبھی کبھی وہاں تشریف لاکر ہمیں مستفید کرتے تھے۔ مگر باقی سب تو اکثر مل بیٹھتے تھے اور ہنسنے بولنے کے علاوہ اردو کی ترقی کی صلاحیں مشورے ہوتے رہتے تھے،

انہی صحبتوں میں "صبح زندگی" کا آغاز ہوا۔ مولانا راشد کی ایک کتاب منازل السائرہ جو مولانا نذیر احمد کے رنگ میں لکھی گئی تھی، چھپ کر مقبول ہو چکی تھی مگر جب مولانا کی ملاقات مجھ سے ہوئی وہ نایاب تھی۔ میں نے انہیں ترغیب دی کہ وہ اسے دوبارہ شائع کریں اور ان سے اجازت حاصل کرکے اسے مطبع مخزن نے چھاپا، ان دنوں میں دوستانہ مراسم کے علاوہ مولانا راشد نے دفتر مخزن کا کچھ علمی کام اپنے ذمے لے لیا۔ ان دنوں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک رسالہ عورتوں کے فائدہ کے لئے بھی جاری کیا جائے۔ مشورے سے یہ قرار پایا کہ مسز محمد اکرام اس رسالہ کی ایڈیٹر ہوں اور مولانا راشد الخیری اس کے لئے مضامین لکھیں جو لڑکیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہوں جنہیں پڑھنے سے انہیں دلچسپی بھی ہو اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو، بہت غور وفکر کے بعد اس رسالہ کا نام "عصمت" تجویز ہوا اور رسالہ بڑی آب وتاب سے نکلا اور نکلتے ہی مقبول ہوا۔ اس سلسلے میں جو گفتگو ہوتی رہتی تھی اس میں ایک دن میں نے مولانا راشد سے یہ کہا کہ

مضامین جو وہ لکھے ہیں بجائے خود مفید ہیں لیکن اگر وہ ایک کتاب لکھیں جس میں کہانی کا بھی لطف ہو اور لڑکیوں کے لئے معلومات بھی ہوں تو اس سے لڑکیوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ لکھیں گے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کتاب کا نام میں نے تجویز کیا۔ جب مولانا نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جو حصہ لکھا جاتا وہ شام کو پڑھا جاتا، یعنی مولوی صاحب پڑھتے اور محمد اکرام اور میں سنتے اور حسب موقع داد دیتے صبح زندگی بعد تکمیل مطبع مخزن سے شائع ہوئی اور اسے قبول عام کا خلعت حاصل ہوا۔ پہلی اشاعت کا حق دفتر مخزن نے مولانا مرحوم سے لے لیا تھا۔ جب پہلا ایڈیشن فروخت ہو گیا تو بعد کے ایڈیشن مولانا خود شائع کرتے رہے، ۱۹۰۹ء میں میں نے اپنے پرانے مسکن یعنی لاہور کی راہ لی اور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ مخزن پھر لاہور سے شائع ہونے لگا مگر عصمت بدستور دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ محمد اکرام انگلستان چلے گئے اور عصمت کا اہتمام مولانا راشد کے حوالے کر گئے، انہوں نے اس خوبی سے چلایا اور جو خدمت طبقہ نسواں کی اس کے ذریعہ کی وہ محتاج توصیف نہیں۔ رسالہ کے ہزاروں پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں خود اس کی معترف ہیں۔

مولانا کو طبقہ نسواں کی بہتری کا خیال ہمیشہ سے تھا اور وہی ان کی اکثر تصانیف کا محرک ہوا۔ مگر رسالہ عصمت اور صبح زندگی کی مقبولیت نے اس خیال کو اس قدر تقویت دی کہ مولانا نے خدمت نسواں کو اوڑھنا بچھونا سب کچھ بنا لیا۔ گویا یہ ان کا مقصد زندگی تھا "صبح زندگی" کے بعد "شام زندگی" لکھی اور کئی اور تصانیف میں نسوانی زندگی کے سب مراحل طے ہوئے۔ جو ہر وقت کے لئے مناسب ہدایات دلچسپ پیرائے اور دلکش زبان میں لکھی گئیں اور اس پر اکتفا نہیں۔ عملی طور پر مفلس اور نادار لڑکیوں کی تربیت کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا اور بڑی عمدگی سے نباہا۔ اسی سلسلہ میں انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو مسلمان اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں کو ان کے شرعی حقوق وراثت سے محروم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مقامی رسم کا تابع بتاتے ہیں ان کو اس کردار سے شرم دلائی جائے اور انہیں عورتوں کے حقوق دینے پر آمادہ کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو زور سے شروع کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے مرتے دم تک اس میں کوشاں رہے، لاہور کی انجمن میں جب تقریر کرنے آئے تو ان کی تقریر کا یہی موضوع تھا، جہاں جہاں ہو سکا انہوں نے اس خیال کو پھیلایا، ان کے اثر سے بہت سے لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے۔ اور گو وہ اس جہان سے اٹھ گئے، ہمیں امید ہے کہ یہ تحریک زندہ رہے گی اور کامیاب ہوگی،

ان کی تصانیف میں غمناک کہانیاں اس قدر ہیں اور اکثر ایسی رقت آمیز طرز میں لکھی ہوئی ہیں کہ وہ ادبی دنیا میں "مصور غم" کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر ان کے ملنے والے جانتے ہیں کہ گو وہ غم کی تصویر کھینچنے میں بہت مشاق تھے، مگر خود غم کی تصویر نہ تھے، ان کا چہرہ بشاش تھا۔ کسی دوست کو دور سے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی۔ جو سو خوش آمدید کی ایک خوش آمدید تھی،

مرحوم دوستوں سے میل جول میں مجسم اخلاق تھے۔ مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول یا اپنی رائے کو بدلتے نہ تھے۔ اپنی دُھن کے پکے، اپنے مذہب میں پختہ۔ اور پیغمبر اسلام کے سچے عاشق تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

عبدالقادر

باغِ اردو میں خزاں

(از مسز سوشیلا دیوی شرما - ام اے - بی - ٹی)

آج چار ماہ سے تمام ملک کی بیبیاں اور بچیاں ماتم کر رہی ہیں اور ان کا رنج ان کے دلوں کو پھوڑ کر آنکھوں کے راستے باہر آ رہا ہے کہ ان کا سب سے بڑا سرپرست، ان کا زبردست حامی اور ان کے حقوق کے لئے مردوں سے لڑنے والا فرشتہ صفت انسان اس دنیا سے ملک عدم کو کوچ کر گیا۔ جو بھلا ہوتا ہے اسے سب چاہتے ہیں جس سے سنسار محبت کرتا ہے اس سے خدا کو بھی محبت ہوتی ہے اس لئے وہ اُسے اپنے پاس بلا لیتا ہے، مولانا راشد الخیری کے نیک کاموں کی فہرست بتانا ایک بہت مشکل کام ہے، جب سے انہوں نے مضامین لکھنے شروع کئے مردوں کو عورتوں کی پست حالت کا خیال ہونا شروع ہو گیا عصمت نے دنیا کو بہت کافی سبق سکھایا ہے، بہت سے لوگوں نے عصمت میں مولانا کے مضامین دیکھ کر عورتوں کی فلاح و بہبودی کے بارے میں مضامین لکھنے شروع کر دئے، اب سے اٹھائیس برس پیشتر جبکہ عورتوں کو تعلیم دینا بیوقوفی ہی نہیں بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا، یہ آپ ہی کی ہمت تھی جو آپ نے اس مشکل کام میں قدم رکھا اور "عصمت" جیسے رسالہ کو عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لئے جاری کیا، ضرب المثل ہے کہ "ہمت مرداں مددِ خدا" آپ نے جب یہ مشکل کام اپنے ہاتھ میں لیا خدا نے مدد کی اور رسالہ کو بہت کامیابی ہوئی، یہ رسالہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دور دراز کے ملکوں میں مقبول ہے اور دوسرے ممالک سے عورتیں مضامین عصمت میں بھیجتی ہیں، اسی سے اس کی کامیابی کا پتہ چلتا ہے جو آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا راشد الخیری میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ آپ بیواؤں کے سچے سرپرست تھے، اور آپ قلم ہی سے نہیں دامے درمے قدمے جتنی بھی امداد ہو سکتی تھی کرتے رہتے تھے۔ واقعی آپ عورتوں کے روحانی باپ تھے، آپ غریبوں، محتاجوں، یتیموں کے سرپرست اور گمشدوں کو صحیح راستہ بتانے والے رہنمائے اعظم تھے، آپ کا برتاؤ ہندو مسلمان سب کے ساتھ یکساں تھا،

مولانا صاحب اردو زبان کے بہت بڑے مصنف تھے، آپ نے عورتوں کی بھلائی کے لئے ہزاروں مضامین سینکڑوں افسانے اور بیسیوں کتابیں لکھیں، آپ کی موت سے افسانہ نگاری اور ناول نویسی کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے، دکھانت (Tragedy) لکھنے میں آپ مشرق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، کہیں کہیں آپ کے ناول شکسپیر کے ڈراموں سے ٹکر کرتے ہیں۔ خاصکر دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حال تو پڑھنے والوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلا دیتا ہے، آپ کے قلم میں وہ جادو تھا کہ پتھر کے کلیجے کو بھی پگھلا کر موم کر دیتے تھے، آپ کی تصانیف میں ایسے ایسے بلند خیالات ہیں کہ جس سے انسان کو انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے، پھر آپ نے دنیا کی معمولی سی معمولی باتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ بیتی پڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ زبان بھی ایسی بامحاورہ اور لچھے دار ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا جی پھڑک اٹھتا ہے، اور ایک بار کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑی نہیں جاتی، آپ کی تمام زندگی ملک کی بہتری خاصکر عورتوں کی بھلائی میں صرف ہوئی ہے اور اس وجہ سے آپ کے انتقال کر جانے سے کسی قوم کی ہی نہیں بلکہ سارے

ملک کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے، اردو جیسی زبان میں عورتوں کے مطلب کی کتابوں کا ملنا اب سے پچیس تیس برس پہلے بہت مشکل بلکہ اِن کا خیال ایک خواب سا تھا، اب وہی خواب اصلیت میں بدل گیا ہے، جہاں پہلے اردو میں اخلاق خراب کرنے والی عشق کی بے ہودہ کہانیاں ملتی تھیں۔ وہاں اب مولانا صاحب کے دفتر سے اسی زبان میں کم سے کم سو کتابیں شریف بہو بیٹوں اور معصوم بچیوں کے پڑھنے کے قابل چھپ چکی ہیں، اور اب بہت سے لوگ دیکھا دیکھی اس راستے پر چل رہے ہیں۔ اس طرح آپ کی زندگی کے پہلوؤں کو مدنظر رکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ وہ باغباں ہیں کہ جس نے اردو لٹریچر کے باغ میں طرح طرح کے بوٹے پودے اور پھولوں کو لگا کر گلزار سدا بہار بنا دیا وضع وضع کے درخت لگائے اور بوٹوں کو پانی سے سینچ کر وہ رونق پیدا کی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے لیکن جب پھلنے پھولنے کے بعد لطف اٹھانے کا موقع آیا تو باغ کو چھوڑ کر آپ نے بہشت کی راہ لی، ان کے جانے سے اُردو کے باغ کو بڑا بھاری نقصان پہنچا ہے بلکہ اس میں خزاں آگئی ہے، آخر میں دعا ہے کہ خدا ان کی روح کو نجات اور انکے خاندان کو صبر دے

کس کو کہکر یہ پُکارینگے "ہمارے خیری"

ختم دلّی نہ کبھی ہوگا یہ رُونا تیرا
ہائے لٹ اجڑے چمن، ہیچ ہے ہونا تیرا

اُٹھ گیا۔ کیسا قلمکار۔ قلم کا افسر
آہ مولانا عجب وقت دکھایا تم نے

اپنی[1] بگڑی ہوئی قسمت کو بنایا تم نے
یک بیک چھین لیا موت نے کیا آفت ہے

دولتِ علم وادب اور وہ مہرِ پدری
رکھتے تھے فرقہ نسواں کا جو دردِ جگری

ہمکو پیارے تھے اجل کو بھی وہ پیارے ٹھہرے
صنفِ نازک کے لئے کیسے اٹھائے صدمے

غم نسواں کے وہ حضرت نے مرقعے کھینچے
کس طرح بھولیں گے احسان تمہارے خیری

شبِ ظلمت میں چراغ ہمکو دکھایا تم نے
گرتے تھے قعرِ ضلالت میں بچایا تم نے

عزت و شان تھی دِلّی کی تمہارے دم سے
فوت مولانا ہوئے کون گماں کرتا ہے

ان کی تصنیف کا ہر رنگ جدا ہوتا ہے
دخترِ ہند کی موجودہ مصیبت کے لئے

اشکِ غم سے تیرے رخسار کو دُھوتا تیرا
جس کو بھایا، کبھی۔ بیکار نہ سونا تیرا

داغ ہے راشد خیری کا ادب کے دلپر
پہلے کس کس طرح رولتوں کو ہنسایا تم نے

گرتے تھے قعرِ مذلت میں۔ اٹھایا تم نے
ہائے افسوس! بڑا ملک یہ بدقسمت ہے

نعمتِ فضل سدا ہاتھ سے جن کے بکھری
آہ سونی پڑی ہے آج انہیں کی نگری

ہم بھی نیارے ہوئے وہ آپ بھی نیارے ٹھہرے
رات دن ایک کئے کیا کیا مضامین لکھے

اب نہ دیکھیں گے نہ دیکھیں گے کبھی ہم مرکے
اب کسے کہہ کے پکارینگے "ہمارے خیری"

علم کیا شے ہے۔ بلا پوچھے بتایا تم نے
کس کو انسان کہیں، ہمکو سُجھایا تم نے

ادبستان میں تھی جان تمہارے دم سے
جھوٹ ہے جھوٹ ہے بہتان ہے اور دھوکا ہے

وہ اُمر[2] میں یہی ہر لفظ ہمیں کہتا ہے
پیشِ خالق وہ اُما پہنچے برأت کے لئے

([illegible])

[1] فرقہ نسواں کی [2] جو کبھی نہ مرتا ہو

اشکِ حسرت

بر وفات حسرت آیات، مصوّرِ غم، فاضل زمانہ، غمگسار بیچارگاں، محسن نسواں، ادیب العصر حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور علی اللہ مقامہٗ و طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ

از محترمہ نوشابہ خاتون قریشی۔ بی۔ اے۔ حیدرآباد دکن

(۱) وا دریغا! بجھ چکی شمع شبستانِ حیات　　چھپ گیا بدلی میں وہ مہر تابانِ حیات

(۲) بادِ صرصر نے اُجاڑا ہے گلستانِ حیات　　آج پامالِ خزاں ہے ہائے بستانِ حیات

(۳) تھی ضیا پاشِ جہاں جس کی منور زندگی　　چھپ گیا افسوس وہ خورشید رخشانِ حیات

(۴) زندگی جس کی تھی دنیا میں دبستانِ حیات　　دوڑتے تھے جس کی جانب تشنہ کامانِ حیات

(۵) خدمتِ مخلوق تھا جس ذات عالی کا شعار　　صنفِ نسواں کی حمایت جس کی تھی شانِ حیات

(۶) یاد دلواتا رہا جو قوم کو بھولا سبق　　جس نے ملت کو بتایا رازِ پنہانِ حیات

(۷) وہ بزرگ نیک خو، عالی صفات و نیک دل　　زندگی تھی جس کی یا رب! اپنا سامانِ حیات

(۸) وہ وسیع الحوصلہ، عالی شیم، والا ہمم!　　تنگ تھا جس کے لئے افسوس دامانِ حیات

(۹) آہ وہ بزمِ ادب کی شمع آخر بجھ گئی　　تشنگانِ علم! ہے تاریک میدانِ حیات

(۱۰) درد و غم کا وہ مصوّر، تھا ہمہ دانِ حیات　　آہ وہ فطرت شناس ناشناسانِ حیات

(۱۱) غمگسارِ صنفِ بیکس، آہ رخصت ہو گیا!　　کر گیا دنیا کو جو ممنونِ احسانِ حیات

(۱۲) اب سنائیں گے کسے ہم درد و غم کی داستان؟　　کون بتلائے گا اب تدبیر و درمانِ حیات

(۱۳) لُٹ گیا افسوس وہ سرمایۂ نقدِ حیات ہائے محوِ جستجو ہیں یاں غریبانِ حیات

(۱۴) سایۂ شفقت الٰہی کاش ہو جاتا دراز ابرِ رحمت کی طرح تھا آہ فیضانِ حیات

(۱۵) فیض پاشی سے ہمیشہ کاش ہوتے مستفید کاش ہم کھاتے نہ دل پر داغِ حرمانِ حیات

(۱۶) دیکھتے ہی دیکھتے گُل ہو گئی شمعِ ادب ہو گیا اک لمحہ بھر میں چاک دامانِ حیات

(۱۷) نکہتِ گُل کی طرح رخصت ہوئی وہ روحِ پاک ہاتھ ملتے رہ گئے احباب و اخوانِ حیات

(۱۸) رحمتِ خالق سے وصل راشد الخیری ہوئے اپنے مسکن کو سدھارے آج مہمانِ حیات

(۱۹) زندگی بے کیف ہے، سونی ہوئی بزمِ ادب کیا کہوں، کیونکہ کہوں، جاتی رہی جانِ حیات

پھول برسائیں دعا خوانی کے مرقد پر سدا

ہدیۂ اخلاص لائیں تنگ دستانِ حیات

بندِ دوم

(۲۱) اضطرابِ روح سے دل کو نہیں یارب قرار ڈھا گئی دل پر ستم کیسا حیاتِ مستعار

(۲۲) غمگسارِ طبقۂ نسواں کی رحلت ہے غضب! کون اپنے حال پر ہو گا بھلا اب اشکبار

(۲۳) مجلسِ علم و ادب کا بجھ گیا روشن چراغ ہو نہ جائے آہ دنیا کس لئے تاریک و تار

(۲۴) اٹھ گیا وہ ناخدائے کشتیِ صنفِ لطیف اب لگائے گا الٰہی کون اس بیڑے کو پار

(۲۵) حامیٔ کارِ غریبان، مونسِ بیچارگاں وہ فدائے قوم و ملت وہ ہمارا غمگسار

(۲۶) گلشنِ اردو کی جس نے آبیاری کی سدا جس کی خدمت کی بدولت یہ چمن ہے لالہ زار

تھا وہ تزئینِ ادب، جانِ ادب، کانِ ادب
یعنی اقلیمِ سخن کا تاجدار ذی وقار

بزمِ عالم پر اداسی چھا گئی ہے چار سُو
ساری دنیا اس کے ماتم میں بنی ہے سوگوار

وہ شہنشاہِ قلم، وہ شہریارِ علم و فن
وہ ادیبِ وقت، جس پر تھا کمالِ فن نثار

مدتوں دیتا رہا جو درسِ تفسیرِ حیات
اس سے خالی ہو چکی ہے، گیتیٔ نا پائدار

آہ وہ بحرِ معارف، پیکرِ صدق و صفا
چشمۂ جُود و عطا وہ معدنِ حلم و وقار

ذات جس کی تھی نمونہ اہلِ عالم کے لئے
زندگی تھی جس کی ہر پہلو سے، یارب کامگار

زندگی بھر کی نہ غفلت، فرض کے احساس سے
نیک نفس و نیک نام و نیک دل نیکو شعار

راشد الخیری اگرچہ ہم سے رخصت ہو گئے
روح ان کی عالمِ بالا میں زندہ برقرار

قالبِ خاکی، نظر سے لاکھ پنہاں ہو گیا
کارنامے ان کے دنیا میں ہیں دائم یادگار

ہے یہی تفسیر کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کی
ہے حباب آسا سراسر ہستیٔ ناپائدار

گریہ و خندہ، خوشی و غم، سدا توام ہیں یاں
ایک حالت پر نہیں ہے گردشِ لیل و نہار

تا بکے نوشابہ ناشاد فریاد و فغاں
اب اُٹھیں دستِ دعا، پیشِ جنابِ کردگار

روحِ راشد کو ملے، اعلیٰ علیین میں مقام
ہو عطا ان کو جوارِ رحمتِ پروردگار

برکتیں نازل ہوں ان کی روح پر شام و پگاہ
رحمتِ رب ان کے مرقد پر رہے ابرِ بہار

ان کی اولاد سعادت مند خوش اقبال ہو
باپ کا نقشِ قدم ہو ان کی ہستی کا شعار

نوشابہ

پیغمبرِ ادب

اس زمانہ میں جبکہ تعلیم کی برکتیں اپنا اثر وسیع کرتی جا رہی ہیں اکثر و بیشتر حضرات قلم پکڑنے کی حیثیت پیدا کرتے جا رہے ہیں لیکن حقیقت میں ادب کی ترقی اور زبان کا عروج علم و واقفیت کی اس وسعت سے کوئی خاص تعلق اس معنی میں نہیں رکھتا کہ حقیقی ادب جو تہذیب و تمدن، علم و فن اور صنعت زبان کے خزانوں میں قابل قدر اضافہ کرے صرف چند ناخدایان فن کی جنبش قلم تک محدود ہے۔ ادیب وہی ہو سکتا ہے جو قوم کے ساکن جذبات میں ایسی کیفیت پیدا کر دے جو صنعت فن کی باریکیوں کو پرکھنے کے قابل ہو جائے اور ذہن و مزاج عامہ میں ترتیب و توازن کی خو پیدا کر دے۔ غریب زبان اردو جو ابھی چند دنوں سے اس قابل ہوئی ہے کہ قوم ملک کے حسیات و جذبات اور دیگر سماجی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کو اپنے آئینہ میں نمایاں کر سکے۔ گنتی کے چند ایسے ناخدایان فن کی مرہون منت ہے جو تنقید و تجسس کی کسوٹی پر پورے اتریں گے یوں تو جودت طبع اور قوت فکر و جستجو کے لحاظ سے اکثر ایسے حضرات گذر چکے ہیں۔ جو اگر راہ راست سے بھٹک کر فرضی اور خیالی قصوں اور کہانیوں کی گنجلک گھاٹیوں میں سر نہ پٹکتے تو حقیقی معنوں میں قوم و ملک کی خدمت کے لحاظ سے بالعموم اور زبان و ادب کی ترقی و عروج کے لحاظ سے بالخصوص زبان اُردو کے محدود خزانوں کو لال و گہر سے بھرنے میں اپنے مابعد والوں سے کہیں آگے رہتے لیکن وہ تو ہوا قصہ ماضی اور اسپر آنسو بہانے سے فی الحال کچھ حاصل بھی نہیں۔ اب رہا یہ کہ وہ گنتی کے چند ادیب کون ہیں جنکی آویزش قلم میں فرض و اصل کا توازن ہو اور جس کی حسیات و جذبات میں ایسی ہمہ گیری ہو جو ملک و قوم کی قوت تمیز میں ایسی کیفیت پیدا کر دے جو زر و جواہر کو سنگریزوں سے ممتاز کر سکیں۔ فن کا کمال یہ ہی ہونا چاہیئے کہ اس میں ایسی شان ہو اور ایسی عالمگیریت ہو جو صرف کسی خاص طبقہ کے حسن فکر تک محدود نہ ہو جائے بلکہ اس کا حقیقی اثر خواہ وہ کسی صورت میں ہو تہذیب و تمدن کی عام وسعتوں تک پھیل کر رہے۔ اکثر ادیب ایسے بھی ہیں جو درحقیقت کیفیات عامہ کو اپنے لب و لہجہ میں ادا کرتے ہیں لیکن انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف مخصوص طبقہ کے لئے باعث لذت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیگور اس کی زندہ مثال موجود ہے لیکن موضوع زیر بحث میں ہمارا مطمع نظر ایسا ادیب ہے جو قوم و ملک کے ہر طبقہ کی یکساں ملکیت ہو اور جس کے موئے قلم سے بہتے ہوئے دریا میں۔ اعلیٰ و ادنیٰ دونوں کے لئے ایک ہی طرح کا سامان سیرابی موجود ہے۔ یہاں بلندی فکر، حسن تصویر، فلسفہ کی چاشنی اور حلاوت زبان کا ایسا معجون مرکب ہوتا ہے جو ہزاروں بیماریوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ یہی شان اکسیر کی ہوتی ہے۔ زبان اُردو جسے زندگی کے ابتدائی دور میں قانون زندگی کے ماتحت اکثر و بیشتر لوگوں سے دوچار ہونا پڑا ایسے ہی کئی اطباء کی ممنون منت ہے جنہوں نے اکسیر ادب کی چند خوراکوں میں اس کے رگ و پٹھوں میں زندگی کا اثر رواں دواں کر دیا۔

علامہ **راشد الخیری** مرحوم و مغفور عام نظروں میں ایک حزن نگار ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ بحیثیت حزن نگار کے **علامہ مغفور** اپنا ثانی نہیں رکھتے اور حزن نگاری کے لحاظ سے ادب اردو میں جیسا درجہ میر انیس اور دیگر نا خدایان سخن کا صنف نظم میں ہے۔ علامہ راشد الخیری مرحوم صنف نثر میں ایسے ہی ممتاز ہیں مضمون زیر بحث کا موضوع اگر عام نہ ہوتا تو یہی بحث اتنی وسیع ہو سکتی تھی جو بحیثیت خود ایک مضمون ہو جاتی لیکن اس وقت چونکہ مرحوم و مغفور کی عام اول حیثیت پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہے اس لئے اس اہم موضوع کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ موقع ہوا تو پھر کبھی اس پر بحث ہو سکے گی یا میری ہی جیسی توفیق اگر دوسروں کو بھی ہوئی تو یہ فرض ہم سے پہلے ہی کوئی ادا کر دیگا۔

علامہ خیری مرحوم حقیقت یہ ہے کہ ان ادیبوں کے زمرے میں تھے جو کسی مقصد حیات کے ساتھ آتے ہیں اور جنکی تحریروں اور تقریروں کے زیر سطح ایک خاص پیغام ہوتا ہے حقیقی ادیب وہی ہے جس کے پیش نظر ایک مقصد کارہا اور جو صرف زمانہ کی سرد و گرم ہواؤں کے سہارے بہتا نہ پھرے۔ ایسا ادیب اپنے پیغام کے بارے دبا رہتا ہے اور اُس پر باد حوادث کے جھونکے اثر نہیں کر سکتے۔ خدمت کے انجام پا جانے کے بعد اسکا ساحل سے آلگنا یقینی ہے۔ ایسے ادیب سے یہ امید رکھنا کہ وہ فن ادب کے ہر صنف میں جولانی دکھلائیگا سراسر غلط ہے۔ قدرت کا منشا یہی ہے کہ ہر انسان ہر کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اسی اصول کے مطابق علامہ مرحوم نے اپنی زندگی صنف نازک کی بدحالیوں، مصیبتوں اور بدقسمتیوں کے مختلف گوشواروں کو ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے میں ختم کر دیں۔ لازمی طور پر ایسے مطالب کے ادا کرنے کی زبان یا تو حزن انگیز ہوگی یا طعن آمیز۔ مرحوم کا آلہ کار حزن و نوحہ تھا جس میں اثر زیادہ ہوتا ہے طعن آمیز زبان کی مدد سے تہذیب و تمدن میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو پیش کرنے والوں میں دنیا کا ممتاز ترین ادیب اس وقت میں برنارڈ شا ہے اور وہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ مرحوم نے اپنی فطرتی نرم دلی اور حزن انگیزی کی وجہ سے پہلا آلہ کار چنا اور بڑی حد تک کامیاب رہے لیکن افسوس کہ ہماری سوسائٹی کچھ ایسی سخت قلب واقع ہوئی ہے کہ اس نے مولانائے مرحوم کے حُسن طبیعت کی ایسی قدر نہ کی جیسی ہونی چاہئے تھی اور ایسی سوسائٹی کے لئے یقیناً برنارڈ شا جیسے تیر و تفنگ والے ہی موزوں ہیں لیکن اسکے باوجود اپنی زندگی ہی میں عورتوں کی ذہنی کیفیات میں جو انقلاب پیدا کر گئے وہ ان کو زندہ جاوید بنا چکا ہے۔

مرحوم کے شہپارے درحقیقت ان کے نظریہ زندگی کی جیتی جاگتی اور بولتی پھرتی تصویر ہیں۔ وہ کوئی ڈراما نویس نہ تھے لیکن تمثیلی کیفیتیں ان کی ہر ہر سطر میں پوشیدہ ہیں۔ اثر و جذب کے لحاظ سے جو کامیابی اپنے جیتے جی ان کو حاصل ہوئی وہ دوسرے ادیبوں کو کم حاصل ہوتی ہے انہوں نے اپنی قوم کی معاشرت، اخلاق اور دیگر کیفیات زندگی کا جائزہ ہمیشہ محبت، رواداری ہمدردی اور حلاوت کے ساتھ لیا۔ انہیں ان کیفیات میں ایسے رازہائے سربستہ نظر آئے جن کی مدد سے اگر دیکھا جائے تو عام لوگوں کی روزانہ اور غیر دلچسپ زندگی کی تہ میں اور تنگ و تاریک گوشوں میں ایسی چنگاریاں ملیں گی جنکو ہوا دینے سے قومی زندگی کی سرد مہری جوش و اثر کے حرارت انگیز شعلوں سے کافور ہو جائے گی۔ حزن انگیزی کے ساتھ ساتھ روحانیت مولانائے

مرحوم کی خاص ادبی شان ہے۔ مولانا کے بیان سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ بہہ کر خشک ہو جانے والے نہیں ہوتے۔ بلکہ انہیں سمندوں کی طوفان خیزی موجود ہوتی ہے۔

سوسائٹی کے متعلق مولانا کا نظریہ عام طور پر یہ ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت کو سماج کی بندشوں میں جکڑ کر تنگ نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ بر خلاف اس کے سوسائٹی کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ وہ اپنے افراد کی ترقی اور خوبیوں کی وسعت کو جگہ دینے کے لئے اپنے دامن وسیع کرے۔ سماج کے خلاف ان کا ہمیشہ یہ احتجاج رہا کہ اسے انسانی روح کی ترقی و بلندی میں سدراہ نہیں ہونا چاہیئے۔ قدیم وجدید معاشرت واخلاق کا سوال ہمیشہ مرحوم کے لئے باعث حزن ورنج رہا۔ سماج اور فرد کے درمیان جو واسطہ ہونا چاہیئے اسی نظریہ کے مطابق ہمیشہ اس کا رونا روتے رہے کہ موجودہ دور مادیت کے طوفان میں پھنسکر روحانیت کا جو انسانی زندگی کی عنصر لطیف ہے گلا دبائے دیتا ہے۔ تصنع۔ سماج کے مصنوعی قوانین کی استبدادیت اور اس قسم کے دیگر اثرات زندگی کے جوہر کو مٹی بنائے دے رہے ہیں۔

زبان کی ترقی وعروج کے لحاظ سے مولانا کی خدمات ہمیشہ ہمارے لئے باعث فخر رہیں گی۔ مولانا ہم سے اس قدر نزدیک تھے اور ان کا اثر ہماری زندگی پر کچھ ایسا ملا جلا رہا کہ ان کی حقیقی ادبی شان کا ہم صحیح معنوں میں اندازہ نہیں کر سکتے تمہیداً میں نے جو کچھ ایک ادیب کی شان کے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ محض سرسری اور جزوی طور پر تھا اور ادب اردو کو مولانا کی خدمات نے کہاں تک مالا مال کیا ہے اس کا اندازہ بغیر غور و فکر اور تحقیق وجستجو کے نہیں ہو سکتا لیکن قطع نظر فنی اور صنعتی خصوصیات کے زبان پر جو مرحوم کا احسان ہے وہ چشم ظاہر بیں سے بھی نہیں چھپ سکتا۔ مولانا ہی جیسے ادیبوں کی خدمات سے ہمیں اردو زبان کی قوتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ مولانا نے بالخصوص جو خدمت زنانہ لٹریچر کے لحاظ سے اردو کی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے پہلے اردو زبان اس لحاظ سے کیا تھی اور آج کیا ہے۔ کم سے کم ناظرات عصمت سے تو یہ راز اب پوشیدہ نہیں رہا۔ ہم مولانا ہی کے صدقہ میں اب اپنے اندر یہ صلاحیت پا رہے ہیں کہ اپنی آواز کے جذب واثر کا اندازہ کر سکیں اور دل میں خیالات کے جو جزر و مد پیدا ہوتے ہیں ان کو زبان پر لاسکیں اور یہی نہیں بلکہ پہلے جو خیالات دل میں بھی پیدا نہ ہوتے تھے وہ اب پیدا ہوتے ہیں اور زبان سے گذر کر عالمگیر وسعت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا نے صرف مجبور ولاچار صنف نازک کی عام ضرورت ہی کو پورا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی گود کو انکی حیثیت سے زیادہ لال وجواہر سے بھر دیا۔

علامہ مرحوم نے اپنے پیغام کو ملک وقوم تک پہونچانے کا ذریعہ مخصوص طور پر مختصر فسانوں اور ناولوں کو بنایا اور اس لحاظ سے وہ بہت بڑی حد تک کامیاب رہے۔ واقعات کے تمثیلی Dramatic پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں مولانا مرحوم اردو ناول نویسوں میں جس قدر کامیاب ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی اور یہی مولانا کا مخصوص طریقہ کار ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ہمیشہ اپنی حیثیت کو پس پشت رکھتے ہیں اور اپنے کرداروں Characters کو بغیر کسی

ترجمان کے اپنے اثرات وکیفیات خود ظاہر کرنے دیتے ہیں۔ اکثر وبیشتر اپنے کرداروں کو پس پشت ڈال کر خود مختلف مضوعات پر عام خیالات کا اظہار مصنف کی زبان سے ناول کے مسلسل اثر کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ ٹیگور باوجود اپنی ادبی ہمہ دانی کے بحیثیت ناول نویس بڑی حد تک ناکامیاب ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ خود اپنے کو اپنے کرداروں سے زیادہ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ ناول کی جان پلاٹ ہوتا ہے اور اس میں ربط وتسلسل کا لحاظ حد درجہ ضروری ہے۔ واقعات وحالات کے نشیب وفراز میں پڑ کر سلسلہ اکثر چھوٹ جاتا ہے اور ربط کا خون ہو جاتا ہے۔ مولانا کے ناول ہمیشہ اس سقم سے پاک نظر آئیں گے۔ ناول کا اولین مقصد انسانی زندگی کی کشمکش دکھانا ہوتا ہے اور فلسفہ کی چاشنی موقعہ ومحل سے داخل کرنی ہوتی ہے۔ مولانا جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں ایک پیغامبر ادیب تھے اور اس لحاظ سے ناول کے ذریعہ سے پیغام پہونچانا ذرا مشکل امر تھا لیکن جس خوبی سے مرحوم نے اس مشکل کو حل کیا ہے صرف انہیں کا حصہ تھا۔ مرحوم کے تاریخی ناولوں پر فنی حیثیت سے میں عصمت کی ایک قبل کی اشاعت میں بحث کر چکی ہوں اور چنداں طوالت کے خوف سے بھی اس مخصوص بحث کو چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عنوان مضمون کے ماتحت جتنی بحثیں ہیں ان پر خود بسیط مضامین ہو سکتے ہیں مگر نہ وقت ہے نہ موقع۔

حزن نگاری کے ساتھ مرحوم نے مزاحیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے مگر جزوی حیثیت سے اور اس لحاظ سے کہاں تک کامیاب رہے ہیں اس کے متعلق بھی علیحدہ ایک مضمون ہو سکتا ہے۔ زبان کی سلاست و فصاحت کا فقدان یہاں بھی نہیں۔ مرحوم ان باتوں کے بادشاہ تھے۔ مرحوم کی اس صنف کی کتابیں جو خاص امتیاز رکھتی ہیں ان میں معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود بھی قصہ کے پلاٹ کا ایک جزو ہے اور کردار پڑھنے والے سے گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ قہقہوں کی فراوانی اور مسکراہٹوں کی جولانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اپنے مخصوص انداز بیان اور مقصد کار کو مولانا یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

الغرض علامہ **راشد الخیری** مرحوم ومغفور کی موت سے ملک وقوم کو جو زبردست نقصان ہوا ہے وہ قلم سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے کونسی دولت جاتی رہی۔ مولانا جیسے ادیب آئے دن پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے اس نقصان عظیم کی تلافی کب ہوگی کون کہہ سکتا ہے۔ مولانا کا غم صرف رازق بھائی ہی کا نہیں قوم وملک اور ادب وزبان کا غم ہے اور ہم اس کا جتنا بھی سوگ منائیں کم ہے۔ اگر رازق وصادق نے اپنا حقیقی باپ کھویا تو علمی برادری کا روحانی باپ جاتا رہا۔ مگر کرنا ہی کیا ہے جو مشیت الٰہی ہو اس پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں +

شہر بانو مظفر پور

آہ! محسنِ نسواں

محترمہ بیگم صاحبہ رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر مرحوم

جب سے علامہ راشد الخیری مرحوم نے لڑکیوں کے لئے تربیت گاہ قائم کی اس وقت سے مجھ کو اس مدرسے کو دیکھنے کا اکثر موقع ملا اور میں جا کر دیکھا کرتی تھی کہ وہاں غریب اور نادار لڑکیوں کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا جاتا تھا اور ان میں اور امیر لڑکیوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ مولانا کی کامیابی کی وجہ ان کی کوشش اور محنت تھی جو خدا کے فضل سے کامیاب ہوئی۔ ایک موقع پر میں نے عطیہ فیضی صاحبہ کے لئے مدرسہ میں جلسہ کرایا جس میں لڑکیوں نے اپنی تعلیم اور تربیت کا بہت اچھا مظاہرہ کیا۔ میں اس مدرسے میں اکثر جا کر بچیوں کو دیکھ کر متاثر ہوتی تھی۔

بیشک مولانا کی وفات سے بیحد نقصان ہوا ہے اور اسکی تلافی نہیں ہو سکتی۔ جبتک ہم کوچہ چیلاں میں رہتے تھے، مولانا (محمد علی صاحب) سے انکے بہت زیادہ تعلقات تھے اور اکثر صبح وہ مولانا کے پاس آتے اور مولانا کو اُن سے اور ان کو مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی۔ اسکے بعد اگرچہ وہاں سے چلے آنے کی وجہ سے ملاقاتیں تو اکثر نہ ہوتی تھیں مگر "عصمت" کے ذریعہ جسکا میں بہت عرصے سے مطالعہ کرتی ہوں۔ ان کے خیالات سے واقف ہوتی رہتی تھی۔

مولانا نے عورتوں پر جو احسانات کئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ کوئی ان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اور ان کے لئے مولانا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مرنا جینا تو ہر ایک کے ساتھ ہے اس لئے ان کو بھی یہاں سے جانا پڑا مگر جو کام وہ کر گئے ہیں وہ مسلمان عورتوں کے لئے خاص طور پر بہت بڑا ذخیرہ ہے اور مجھے امید ہے کہ ان کے صاحبزادے اپنے والد ماجد کی طرح "عصمت" کے ذریعہ نہایت گرمجوشی سے عورتوں کی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

انہوں نے اپنی تحریر یا تقریر اور مضامین کے ذریعے سے عورتوں میں زندگی کی روح پھونک دی وہ نہ صرف اپنے فرائض کو سمجھنے لگیں اور ان کو اپنے حقوق کا احساس ہو گیا بلکہ وہ مضامین بھی لکھنے لگیں۔ اس سے پہلے وہ اس سے ناواقف تھیں "عصمت" کے مطالعہ سے اُن کو مضمون لکھنا آ گیا جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا مردوں پر اظہار کرنے لگیں تمام ہندوستان میں جو ان کا ماتم کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف اُردو ادب بلکہ عورتوں کی خدمات کی وجہ سے ان کا درجہ نہایت بلند تھا۔

مولانا نے جو عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں جدوجہد کی، مثلاً ترکۂ پدری، خلع، عقدِ بیوگان، تعدادِ ازدواج وغیرہ، اسکی تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر تعلیم یافتہ شخص مولانا کے ان کارناموں سے بخوبی واقف ہے۔ ان مختصر الفاظ سے میرا مطلب یہ ہے کہ مولانا راشد الخیری صاحب نے جو احسانات ہندوستان کی عورتوں اور خصوصاً مسلمان عورتوں پر کئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ عورتیں اُن سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتیں۔

میری خواہش ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ وہ پودا جو انہوں نے لگایا ہمیشہ ہرا بھرا رہے اور اس سے ایسی عورتیں پیدا ہوں جو عورتوں کی خدمت کرتی رہیں۔

میری بیگم راشد الخیری صاحبہ اور ان کے بچوں سے دلی ہمدردی ہے +

ہندوستانی زبان کا جنازہ

از محترمہ مسز برلاس ۔ ٹوکیو۔ (جاپان)

ٹکڑے ہوتا ہے جگر پڑھ کے فغانِ رازق   ہے مگر نشترِ الماس زبانِ رازق
ہم نے مانا کہ حقیقت میں ہے جانا سب کو   پھر بھی کافی ہے رُلانے کو بیانِ رازق

یا خدا مارچ کے **عصمت** کا ماتمی پرچہ کس قدر دل کو دہلانے والا ہے۔ خصوصاً صفحہ اول کا سفید متن اور سیاہ حاشیہ دل کے ٹکڑے کئے دیتا ہے۔ مجھے توصفِ ماتم بچھی دکھائی دے رہی ہے۔ جسکے چاروں طرف بیکس یتیم فرقہ نسواں نوحہ خواں ہے۔ جیف **عصمت** بے نصیب یتیم، بیوہ جو کچھ سمجھئے سب ہی رنگوں میں الگ الگ نظر آرہا ہے۔ ہے ہے **عصمت** کے اس سوگوار پرچہ نے دل کے پرخچے اُڑا دیئے۔ خدا کے حکم کے آگے کس کی مجال ہے جو دم مارسکے۔ خداوندا ہر حالت میں تراشکر ادا کرنا چاہئے۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ یہ وہی پرچہ ہے جس میں کسی کے مبارک ہاتھوں نے عورتوں کی حمایت میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر دیئے۔ اور آخری وقت تک جدوجہد جاری رکھی جس مقصد کو لے کر کھڑے ہوئے تھے آخری سانس تک اُسی پر اڑے رہے۔ آج اسی پرچہ میں اس مقدس اور ہر دل عزیز ہستی کے اس دارالمحن سے رحلت کی خبریں بھری پڑی ہیں۔ بوڑھاپے کی موت کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آدمی آدمی میں فرق ہے۔ ایک نوجوان کی زندگی سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو ایک بوڑھے کی شمع حیات گل ہو جانے سے نقصان ہو جاتا ہے۔ دنیا کو علم ہے کچھ اس میں سراہنے کی ضرورت نہیں کہ **علامہ محترم** نے اپنی حیاتِ مستعار میں وہ کارہائے عظیم کئے ہیں۔ جو آیندہ نسلیں یادرکھیں گی۔ اور نہ صرف یاد رکھیں گی بلکہ مرحوم کی تحریروں کو دیکھیں گی اور بلکیں گی۔

"حیاتِ راشد" کا آخری باب" صفحہ ۲۰۰ تک میں نے ہچکیاں لے لے کر بمشکل تمام ختم کیا ہے۔ نماز جنازہ اور تصویر جنازہ دیکھ کر فلک یاد آگیا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ برسوں رہیئے ایک نہ ایک دن اس جنجال کو خیرباد کہنا ہے۔ اور سب عزیز و رفقا کو یہیں چھوڑنا ہے۔

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے   سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

بہت کم لوگ ہیں جنہیں عالم روتا ہے۔ کان سُن چکے ہیں آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ بڑے بڑے پیسہ والے امیر کبیر اس دنیا سے منہ موڑتے ہیں۔ کوئی جانتا بھی نہیں کہ کون مرا ہے۔ اور کیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ زندگی بھر دولت میں کھیلتے رہے۔ قومی کاموں سے قطعی کوئی واسطہ نہ رکھا کسی کی آگ کو اپنے دلوں میں روشن نہ کیا۔ ان کی میت پر سوائے چند عزیز اقربا کے آنسو بہانے والا کہاں سے آئے۔ بندگان خدا کی خدمات اور خصوصاً مظلوم عورتوں کی دل وہی بڑا اجر رکھتی ہے۔ دنیا ہی

میں دیکھ لیجئے۔ علامہ کے سوگ میں گھر گھر صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اپنے پرائے دور نزدیک سب ہی تڑپ رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ چراغ سحری تھے۔ اور عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ تاہم ہر آنکھ جل تھل بھر رہی ہے۔ کیا جوان کا سوگ منایا جائے گا جو اس ضعیف شخصیت کا منایا جارہا ہے۔ ہندوستان بھر کے اخبارات و رسائل نوحہ خواں ہیں۔ میں سمجھتی ہوں مردوں کو چھوڑ کر صرف عصمتی حلقہ کی بہنوں ہی کے آنسو اس قدر جمع ہوگئے ہوں گے کہ ایک کشتی بخوبی پار بہہ سکتی ہے۔ اب کچھ تو اس بندۂ خدا میں روحانی قوت تھی جسکے لئے لاکھوں دل بسمل ہیں۔

ہندوستانی زبان کا مزہ اللہ بخشے اس عورتوں کے وارث کے ساتھ دفن ہوچکا۔ اب کوئی کیا لکھے گا۔ نہ ویسی طبیعت پائیگا نہ وہ مذاق حاصل کرسکے گا کس کس بات کو یاد کریں۔ اور کس کس کو روئیں۔ علامہ محترم نے اپنی نظموں کے مجموعے "رودادِ قفس" میں نظم کے اندر ہندوستان کی مظلوم بے زبان اور با وفا عورت کا جو صحیح نقشہ کھینچا ہے کس قدر عبرت انگیز ہے۔ بڑے فخر سے ایک جگہ لکھا ہے ہندوستانی عورت گھر بھر کو کھلا پلا کر پیچھے پتیلی پونچھ کر دوزخ بھر لیتی ہے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ ہر ہر طریقہ سے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے رہنے کے درس دیئے ہیں۔ اور وہ موثر کتابیں لکھی ہیں کہ پتھر سے پتھر دل موم ہوجائے۔ یہ سب کچھ عورتوں ہی کی بہبودی کے لئے تھا۔

"حیاتِ راشد کے آخری باب میں صفحہ ۱۸۶ پر علامہ محترم نے بستر علالت پر جو گفتگو ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب سے کی ہے اس کے ایک فقرہ پر دنیا کی دولت نثار کر ڈالئے تب بھی اس کے مقابلہ کا بولنے والا میسر نہ آئے گا۔ فرمایا تھا میری بیماری میں میرے بچوں نے پوٹا ٹیک رہا ہے"۔ انصاف شرط ہے۔ یہ زبان سوائے علامہ محترم کے طاقت ہے کہ کوئی بول سکے؟ کئی مرتبہ پڑھا اور مزہ لیا۔ یہاں تک کہ آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ افسوس اسی قابل ادیب کے منہ سے آخری موتی رولے گئے ہیں۔ میں نے رسالہ میں اس لفظ پر سرخ پنسل سے نشان کر دیا ہے۔ جب پڑھتی ہوں زبان کی چاشنی مزہ دیتی ہی۔

خلقِ خدا وسیع ہے اس میں ایک سے ایک بڑا انسان ہوگزرا ہے۔ اور موجود بھی ہے اور آیندہ بھی پیدا ہوگا۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ کہ جو رنگ **مصور غم** نے اختیار کیا تھا وہ دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ علامہ نے آخر تک اسے ایسا نبھایا جو نبھانے کا حق ہے۔ مقابلہ تو بڑی چیز ہے۔ لکھنے والے اگر نقل بھی کرتے ہیں۔ تو آخر میں جا کر چت ہوجاتے ہیں۔ پلاٹ کو ہرگز نہیں نبھا سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دانت نکوس رہے ہیں۔ آج کل بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی تعلیم کچھ بڑی بات نہیں۔ لڑکے لڑکیاں برابر حاصل کر رہے ہیں۔ ڈگری لیکر تو وہ اپنے خیال میں عالم فاضل بن جاتے ہیں ڈپلومہ یعنی سند کا پروانہ ان کی قابلیت کا بہترین آلہ ہے۔ چاہے ہندوستانی زبان صحیح لکھنے کا بھی سلیقہ نہ ہو۔ آج کل تعلیم زیادہ کہ مغز کھوکھلے ہوجائیں اور قابلیت کم۔ پہلے تعلیم کم قابلیت زیادہ تھی۔

عرصہ سے میرے مطالعہ میں اخبارات اور رسائل میں ایسے قصے اور افسانے آرہے ہیں کہ واللہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ان کے لکھنے والے ماشاء اللہ یونیورسٹی اور کالجوں کے پاس شدہ ہیں۔ دوسطری عبارت لکھنے کے بعد نظر آتا ہے۔ کہ

حلیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا میں ان قصوں کو پڑھ کر خلجان میں پڑ جاتی تھی کہ یا الٰہی یہ کس قسم کی عبارت ہے۔ سب پڑھ جایئے متکلم کا نام بعد میں نظر آئے گا۔ بڑا اس صاحب سے جھگڑتی تھی کہ یہ کیا طرز تحریر ہے ہم بھی تو سمجھیں۔ وہ کہتے تھے انگریزی طرز کی نقالی ہے۔ نہ کسی کی طرفداری ہو اور نہ کسی کی مخالفت میں تو اللہ لگتی بات کہہ رہی ہوں۔ جو مزہ اپنی با محاورہ ہندوستانی زبان میں آتا ہے۔ وہ نقالی میں کب نصیب میں کوئی بڑھیا نہیں۔ دقیانوسی خیال کی پیرو نہیں۔ اسی صدی کی پیدائش ہوں۔ جدید باتیں مجھے خود بھاتی ہیں۔ مگر یقین کیجئے کہ پنج رنگی زبان جسے لوگوں نے معجون مرکب بنا دیا ہے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بھانی کیا معنے زہر لگتی ہے۔ اچھے اچھے قابل لوگوں کی تحریریں دیکھی ہیں جو خدا کے فضل سے بجائے عورت کے چھوکری لکھتے ہیں۔ میں ہوں کہ دل ہی دل میں جل جل کر بھسم ہوئی جاتی ہوں۔ کہ زبان کی کیا مٹی پلید ہو رہی ہے۔ دہلی والے کبھی بھول کر بھی عورت کو چھوکری نہیں لکھیں گے۔ میں خود کسی قابل نہیں کہ لوگوں پر نکتہ چینی کروں مگر زبان کا بے ڈھنگا پن ناگوار گذرتا ہے۔ اہل زبان چھوکری۔ لونڈی۔ باندی۔ خدمت گزار زر خرید کو کہتے ہیں۔

ہائے غضب ہو گیا قلم کا بادشاہ ہم سے بچھڑ گیا۔ اب ہماری زبان کی رکھوالی کون کرے گا! **عصمت** کے ماتمی پرچہ میں محترم آصف علی صاحب بیرسٹر نے جو چند جملے مولانا مغفور کی زبان کے لکھے ہیں سبحان اللہ۔ شروع سے آخر تک آنکھ بند کر کے پڑھ جائیے اور پھر انصاف سے کہئے کہ کیسے پاکیزہ الفاظ اور آسان فقرے ہیں کہ معمولی سی استطاعت کا آدمی بھی چٹخارے لیتا رہے۔ مجھے تو یہ رونا ہے خود گئے اور ہندوستانی زبان کو لے گئے!

قاعدہ ہے ملک کی زبان میں دنیا کا لٹریچر ہوتا ہے۔ اور زبان کی ترقی ایک ایسی چیز ہے جس پر قومیں فخر و ناز کرتی ہیں۔ ملک کی زبان میں تعلیم حاصل کر کے انسان ترقی کے مدارج طے کرتا ہے۔ ہمارا حال برعکس ہے۔ ہمارے کدرے غیر زبانوں پر جان نثار کئے بیٹھے ہیں۔ اور اپنی زبان سے غفلت برت رہے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ میں غیر زبانوں کے سیکھنے کی مخالف ہوں ہرگز نہیں۔ ضرور سیکھنی چاہیئے لیکن یہ نہیں کہ تمام علوم غیر زبانوں میں سکھائے جائیں +

علامہ محترم کے خانگی زندگی کے چند پہلو میں رسالہ ساقی میں "**راشد الخیری نمبر**" کے لئے لکھ چکی ہوں۔ یہاں صرف چند باتیں عرض کروں گی۔

علامہ محترم باوجود معمر اور قدیم رسم و رواج کے شیدائی ہونے کے جدید باتوں کے بھی دلدادہ تھے۔ مجھے جب پہلی مرتبہ شرف نیاز حاصل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس عمر کا انسان اس قدر روشن خیال جس سے آج کل کے بعض نوجوان بھی دور ہیں۔ آپ اگر عورتوں کی بجا شرم و حیا کو پسند فرماتے تھے تو ساتھ ہی ان کو حق بجانب آزادی دینے کے بھی سب سے بڑے مؤید تھے۔ پچھلے سمے یاد آ آ کر تڑپا رہے ہیں۔ ایک روز میں دولت خانہ پر حاضر ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا چھوٹے مکان کے اندر کے کمرہ میں ننگے بدن ایک تہہ بند باندھے گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کچھ لکھ رہے

ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قلم رکھدیا۔ ملازمہ فراشی پنکھا کھینچ رہی تھی۔ فرمانے لگے "پنکھے کے نیچے آن بیٹھو۔ غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں۔" بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شام کے کھانے پر برلاس صاحب بھی بلائے گئے تھے۔ بڑے مکان کی چھت اُس وقت کھلی ہوئی تھی۔ بغلی کمرہ بعد میں پڑا ہے۔ رازق بھائی اس کوٹھے پر رہتے تھے۔ فرمانے لگے "نیچے گرمی ہے۔ رازق کے کوٹھے پر ہی سب بیٹھیں گے اور وہیں کھائے پیئیں گے۔" ممانی جان نے کھانے کا وہیں انتظام کیا۔ کھانے سے فراغت ہونے کے بعد میں نے گھر واپس جانے کی اجازت چاہی۔ فرمانے لگے "رات کا وقت ہے۔ ڈولی ڈنڈے کی ضرورت نہیں یونہی چلی جاؤ۔ ورزش بھی ہو جائیگی ہوا بھی کھا لوگی۔" میں نے برقعہ نہ ہونے کا عذر کیا۔ فرمانے لگے اپنی ممانی کا لے لو اور صادق کو ساتھ لے جاؤ وہ برقعہ لے آئیں گے۔" مجھے کچھ تامل ہوا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا اور برلاس صاحب کے ساتھ یونہی روانہ کیا۔ دراصل عورتوں کی تکلیف اور حبس بیجا سے علامہ محترم کو روحی تکلیف ہوتی تھی۔

صادق میاں کا عقد مجھے یاد ہے میں اس میں شریک تھی۔ صبح کو جا کر جب میں اتری ہوں اور ممانی جان کو دیکھا تو دل ہی دل میں حیرت کرتی رہی۔ سر سے پیر تک سوئی کا ٹوٹا بنارسی لباس عمر کے لحاظ سے ہلکے رنگ کا پہنے ہوئے تھیں۔ سمدھیانے میں گئے تو وہاں میری کئی ملنے والیاں مل گئیں۔ اور ہم سب نوشاہ کی والدہ کے لباس کی باتیں کرتے رہے۔ ممانی جان اپنی عمر میں سب کچھ پہن اوڑھ چکی ہوں گی۔ اس وقت جو لباس زیب تن تھا وہ اس شیدائی شوہر کے تقاضے سے پہنا گیا تھا جو عمر بھر بیوی کا گردیدہ رہا۔ دنیا ایسے مردوں سے پٹی پڑی ہے کہ بیوی کو جھوٹے منہ نہیں پوچھتے۔ اگر بنی سنوری ہے تو پرواہ نہیں اور اگر سر جھاڑ منہ پہاڑ ہے تو بلا سے۔ کہنے کو سب میاں بیوی ہیں مگر حقیقت میں میاں کے لقب کا مالک کون ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی قابل رشک تھی۔ وقت کی قدردانی کی ایک مثال لکھتی ہوں صادق میاں کے نکاح کے بعد ماموں جان نے اُن سے کہا کہ "تمہارا کام ختم ہو گیا تم کالج جاؤ۔" چنانچہ وہ چلے گئے۔ عورتوں کو دولھا دلھن دیکھنے کی خوشی ہوتی ہے۔ چاروں طرف سے دولھا کی پکار پڑی۔ مگر دولھا کا پتہ نہیں۔ آخر معلوم ہوا کہ ان کو پڑھنے بھیج دیا گیا ہے۔

دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ پرانے لوگوں میں بڑی وضعداری تھی اور ان میں کچھ ایسی باتیں پائی جاتی تھیں جو آج دیکھنے میں نہیں آتیں۔ برلاس صاحب کے تین ماموں کا حال میں بخوبی جانتی ہوں اور اپنی شادی سے قبل ان معزز حضرات کے حالات سے واقف تھی۔ مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم برلاس صاحب کے حقیقی بڑے ماموں تھے ان کا سہاگ کھاری باؤلی بھر میں مشہور تھا۔ چنانچہ کنبے کی شادیوں میں مرحوم کے سر کا سیلا بطور شگون کے ہر گھر میں منگوایا جاتا تھا۔ اور ان کی بیگم صاحبہ کی نتھ بطور شگون دلہن کو پہنائی جاتی تھی۔ دوسرے حقیقی ماموں جناب اسعد حسین صاحب عرشی جو خدا کے فضل سے اس وقت حیات ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ یعنی حامدہ بیگم صاحبہ الخیریہ سے شگون کے طور پر دلھن بنوائی جاتی تھی۔ ان دونوں کے سلوک بھی مشہور ہیں۔ علامہ محترم برلاس صاحب کے رشتہ کے ماموں تھے

ان کا سلوک تو زبان زد عام ہے۔ آپ لمبے لمبے دوروں پر جاتے تھے اور ممانی جان صاحبہ ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک دن کی جدائی کبھی گوارا نہ کی۔ انسان کی نصیحت کا اثر دوسروں پر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ خود باعمل ہو۔ آپ نے خود کر کے دکھا دیا کہ بڑھاپا قدامت پرستی کی نشانی نہیں ہے۔ آدمی ہمیشہ زمانہ کے ساتھ چل سکتا ہے"۔

دلفگار مسنر برلاس

بے زبانوں کی زباں

مقصدِ علم و ادب ہی ہو گیا افسوس فوت — کس بلا کا سانحہ ہے راشد الخیری کی موت

وہ کہ جس کے دل کے اندر بے کسوں کا درد تھا — وہ کہ علم و فن میں بے ہمتا، ادب میں فرد تھا

وہ کہ تھا پردوں میں رونے والیوں کا ترجماں — صنفِ نازک کا مفسّر، بے زبانوں کی زباں

وہ کہ اِس دُھن میں رہا تا مرگ، پابندِ فغاں — ہند میں پیدا ہوں سچّی مائیں، اچھی بیٹیاں

وہ کہ جس کی عقل کا سینہ تھا غم سے داغ داغ — دل تو دل، دل کی طرح جس کا دھڑکتا تھا دماغ

وہ کہ جس نے خار و خس کو رشکِ سنبل کر دیا — ہاں اُسی مشعل کو بادِ مرگ نے گُل کر دیا

اب کسی لب پر، غریبوں کے لئے نالہ نہیں — صنفِ نازک کا کوئی اب پوچھنے والا نہیں

سوگوار اس غم میں تیرے صنفِ نازک ہی نہیں — ہے پریشاں علم و انشا کی بھی زلفِ عنبریں

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو، اُٹھ گئی
دہر سے وہ کیا اُٹھا، دہلی سے اُردو اُٹھ گئی

جوش ملیح آبادی

مرگِ عالم ہے موت عالم کی

از حضرت دعا ڈبائوی

(۱) اک نہ اک روز موت آنی ہے — موردِ مرگ زندگانی ہے
ذاتِ حق صرف جاودانی ہے — باقی جو چیز ہے وہ فانی ہے
کوئی دنیا میں آج تک نہ رہا
بادشاہوں کا راج تک نہ رہا

(۲) دستِ بُردِ اجل سے کون بچا — ساری دنیا کو ہے یہی رونا
موت یوں تو ہے سب کی غم افزا — سانحہ ہے مگر قیامت کا
کسی قابل کا کوچ کر جانا
فردِ کامل کا کوچ کر جانا

(۳) مرگِ دل سوز راشد الخیریؒ — ایک تمہید ہے مصیبت کی
فخرِ ہندوستان تھی وہ ہستی — آج گویا اجڑ گئی دلّی
ایسی عادات یہ صفات کہاں
اُن میں جو بات تھی وہ بات کہاں

(۴) ہائے علّامہ راشد الخیریؒ — ان کے دم سے تھی شان دہلی کی
کیجئے کون سی بیاں خوبی — آپ تھے خلق میں مثال اپنی
نہ رہی کوئی انتہا غم کی
مرگِ عالم ہے موت عالم کی

(۵) عورتوں کا وہ یاور و ہمدم — "سچا ہمدرد و محسنِ اعظم"
جس کو کہتے تھے سب "مصوّرِ غم" — چل دیا ہائے سوئے مُلکِ عدم
بے نواؤں کا آسرا نہ رہا
صنفِ نازک کا رہنما نہ رہا

(۶) عورتوں کا بہت بُرا تھا حال — ہر طرف راہ میں بچھے تھے جال

تھا کسی کو ذرا نہ اُن کا خیال رات دن محوِ رنج، وقفِ ملال
چشمِ عالم میں کچھ وقار نہ تھا
کوئی پرسانِ حالِ زار نہ تھا

(۷) قدر دنیا میں کچھ نہ تھی ان کی دیکھتا تھا کوئی نہ مڑ کر بھی
موردِ ظلم و جور تھیں اتنی بزمِ دنیا میں کوئی قدر نہ تھی
سخت دل ہوگیا تھا عالم کا
کوئی احساس ہی نہ تھا غم کا

(۸) مرد کے دل پہ کچھ اثر ہی نہ تھا کچھ بھی دُکھ درد کی نہ تھی پروا
جانور جیسے کوئی پال لیا حال بے حال تھا غریبوں کا
آہ کرنے میں آن جاتی تھی
ضبط کرنے میں جان جاتی تھی

(۹) کیا کہوں منہ سے حال کیا تھا وہ تھیں اور آبرو کا رونا تھا
پڑھنے لکھنے سے واسطہ کیا تھا صرف مردوں کا وہ تو وِرثا تھا
نام کو صرف بنتِ حوّا تھیں
ورنہ احباب سوچ لیں کیا تھیں

(۱۰) واقعی یہ کسی نے ٹھیک کہا آہِ بے کس کا ہے بڑا رُتبا
صنفِ نازک نے جب کیا نالہ آگیا اک فرشتہ رحمت کا
راشد الخیری اُس کا نام ہوا
خدمتِ نسواں اُس کا کام ہوا

(۱۱) کی حمایت حقوقِ نسواں کی اک نئی لہر سب میں دوڑا دی
بات جو کی وہ دل میں جا اُتری اُس کی تحریر تھی کہ جادو تھی
چُوک بھی جاتا ہے کمان کا تیر
نہیں کرتا خطا زبان کا تیر

وہ تھا اور اُن کی ترجمانی تھی اِک رسالے کی داغ بیل پڑی
دل میں اُتری جو مُنہ سے بات کہی صنفِ نازک کی وہ وکالت کی

اُن کی بدقسمتی کو دُور کیا
گھر کی لونڈی سے رشکِ حُور کیا

(۱۳) ایسا حامی جب اُن کے ہاتھ آیا — صنفِ نازک کا بڑھ گیا پایا
مرد اپنے کئے پہ پچھتایا — اُن کا حق لڑ جھگڑ کے دِلوایا
آج جو عورتوں کی عزت ہے
راشد الخیری کی بدولت ہے

(۱۴) خادمِ قوم کے علاوہ بھی — اُس کی ہستی تھی مجمعِ خوبی
خلق میں کوئی بھی نہ تھا ثانی — ایسا معجز بیاں نہیں کوئی
بزمِ علم و ادب کی رونق تھی
ذاتِ راشد سے سب کی رونق تھی

(۱۵) نثر میں سحر آفرینی تھی — نظم میں انتہا کی تھی شوخی
وہ عبارت کی ہائے رنگینی — تھی غنیمت جہاں میں ذات اُسکی
ایسا جادو رقم نہ پاؤ گے
خوش بیاں خوش قلم نہ پاؤ گے

(۱۶) یوں تو دنیا کو موت آئے گی — چیز جو آئی ہے وہ جائے گی
مرگِ راشد لہو رُلائے گی — چین کس طرح خلق پائے گی
قوم ابھی تشنۂ نصیحت تھی
ابھی مرنے کی کیا ضرورت تھی

(۱۷) اے دعا شرحِ غم کہاں تک اب — داستانِ الم کہاں تک اب
محوِ ماتم قلم کہاں تک اب — گریۂ دم بدم کہاں تک اب
اب دعا کے لئے اٹھاؤ ہاتھ
سب دعا کے لئے اٹھاؤ ہاتھ ۔

(۱۸) یا الٰہی بحق شاہِ ھدیٰ — مرتضےٰ کا بتول کا صدقہ
واسطہ خاندانِ اطہر کا — پہونچے راشد بہشت میں سیدھا
کھانے کو میوہ ہائے جنت ہوں
حور و غلماں پئے اطاعت ہوں

مرسلہ بیگم دعا ڈبائوی

علّامہ راشد الخیری کا درجہ ناول نگاری کے فن میں

(از جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ۔ کیفی دھلوی

جمالیات کا فلسفہ ابھی اس نوبت کو نہیں پہنچا ہے کہ متیقن اور تسلی بخش متصور ہو۔ پھر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن[1] کے ارتسام کی خارجی صورتیں خواہ کچھ ہی ہوں اس کا انخطاط صریحًا دماغ کا فعل منصبی ہے جبکہ وہ حس باصرہ یا دوسرے جسمانی حواس سے متاثر ہو۔ حواس خمسہ ظاہری کے تاثرات حسن سے استخطاط اور بہرہ مندی کی ایک عام شکتی پیدا ہوتی ہے جس کی طرف حساس اشیا صراحتًا ہی نہیں بلکہ حافظہ اور تخیل کے ذریعے کنایتہً بھی رجوع لاتی ہیں۔ ایسا بالواسطہ ارسام قطعی اور بدیہی نہیں ہوتا لیکن وہ حقیقی ہوتا ہے اگر حواسوں کے ذریعہ صورت پذیر ہو۔ خارجی عمل محض اشکال صدری یا نقوش کا ایک تسلسل ہوا کرتا ہے اور جب یہ تسلسل خوش اسلوب اور منظم ہو اور معقول مقصود رکھتا ہو تو ہم اُسے مستحسن یا پسندیدہ کہتے ہیں۔ یہاں حسین اور مفید کا باہمی تعلق ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس بحث میں نہ پڑ کر خلاصہ کلام یہ ہے کہ خوبصورت اشیا و عوارض سے حظ اُٹھانے کی خواہش خاص حواسوں کے فعل سے حافظہ یا تخیل کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ اس مقام پر آرٹ یا فنون کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غرضکہ تاثرات یا احساسات کا اظہار جب ہی آرٹ کی حیثیت کو پہنچتا ہے۔ جبکہ وہ استخطاظ جمالی کے لئے استعداد ذہنی کو تحریک کرے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ نیچر کی محض نقالی کو آرٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں ضروری ہے کہ تنوع اور تخیلی قوت ہو۔ اور یہ کام شاعر تمثیل کار یا ناول نگار کا ہے۔

اس تمہید سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ناول نویسی ایک اعلیٰ فن یا آرٹ ہے جس کی بنیاد سائنٹیفک اصولوں اور نفسیاتی حقائق پر قائم ہے۔ اور کہ اس اعتبار سے ہمارے مرحوم دوست کے ناول کیا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ بتانا ضروری ہو کہ ناول ہے کیا چیز؟ کسی معروض کی جامع و مانع تعریف پیش کرنا ایک اہم کام ہے جو پہلے مبادیات کی بحث چاہتا ہے۔ اس لئے سادھارن طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ناول ذہن کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا مظہر ہے جس کے ذریعہ انسانی فطرت کی مکمل واقفیت۔ اس کے بیم و رجا اور شادی و غم کے تنوعات کی ترجمانی کی جائے اور بذلہ سنجی اور جودت و فطانت کے شاہکار فصیح اور دلپذیر زبان میں دنیا کے پیش کئے۔ جو قسمیں حقیقی۔ نیچرل تخیلی وغیرہ فنون لطیفہ میں گنائی جاتی ہیں۔ اور جن کو ناول۔ ناٹک اور نقاشی پر عاید کیا جاتا ہے وہ اکثر صورتوں میں مصنوعی اور استبدادی ہیں۔ کیونکہ میری دانست میں کوئی نقش قلم کا ہو یا مُوقلم کا فن کی دنیا میں صورت پذیر اور دلنشیں نہیں ہو سکتا جب تک تخیل سے استمداد نہ کرے۔ محض نقالی کا فن سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترجمانی کو نقالی سمجھ بیٹھنا سخت غلطی ہے۔

اس سائنٹفک معیار کو سامنے رکھ کر ہم نے مرحوم کے ناولوں پر نظر ڈالی۔ تبصرہ کا نتیجہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہو۔

حضرت راشد الخیری مرحوم کا ناول پہلا "حیات صالحہ" ہے جو انہوں نے سنہ ۱۸۹۵ء میں لکھا لیکن اس کی طباعت و اشاعت سنہ ۱۹۰۲ء میں ہوئی بسنہ ۱۹۳۰ء کے شروع میں مصنف نے قریبًا پچیس برس بعد اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن نکالا۔ ہمارا خیال ہے کہ ادھر اُدھر لفظی تبدیلی شاید

---

[1] اس تحریر میں لفظ حسن (لہذا حسین) عمومی معنی و مفہوم نہیں ہو سکتا ۱۲

کی ہو مگر قصہ جوں کا توں رکھا۔ خلاصہ پلاٹ یہ ہے کہ سید کاظم جو حسب نسب سید ہے عربی فارسی اور دینیات کا اعلیٰ درجے کا ماہر اور پورا مولوی ہے مگر وہی دقیانوسی مُلّا جس جماعت کے خلاف کچھ برس گزرے جناب نیاز فتحپوری نے بیدردی کے ساتھ جہاد شروع کیا تھا۔ یہ شخص پکی عمر کا ہے اور زمانے کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔ جب کہ بڑھاپا ممٹی سے جھانک رہا ہے بیوی چار بچے چھوڑ کر رحلت کر جاتی ہے۔ یہ شخص سانحۂ کربلا سے زیادہ بیوی کا ماتم کرتا ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ جو مرد بیوی کی موت پر بہت ہی واویلا کرتے ہیں وہ بہت ہی جلد پھر شوہر بنجایا کرتے ہیں۔ ایسا ہی حال سید کاظم کا ہوا۔ بیاں وہ یا جو بیوی طینت کی قصائی۔ ان معصوموں کا جو حشر ہوا نہایت جگرخراش ہے تین برس کی بچی سوتیلی ماں کی بیرحمی اور بیدردی کی بھینٹ ہوئی۔ اولاد میں سب سے بڑی صالحہ تھی اس کو جو ایذائیں سگے باپ اور سوتیلی ماں کی طرف سے پہنچیں ان کی روئداد سے پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی سگھڑ اور نیک بچی کہ جس گھر میں جاتی اسے چار چاند لگاتی۔ اس کا ناٹکی نکاح سوتیلی ماں کے بھائی سے کیا گیا جس کے ہاتھوں اس نیک بی بی کی شہادت ہوئی۔ کاظم مر گئے۔ گھر میں آگ لگی۔ دوہاجو بیوہ کو دھن ہوگئی۔ اسی زندگی میں کیفر کردار کو پہنچکر لاوارث بھکارن کی حالت میں دنیا سے چل بسی۔

ممکن ہے بعض کو اُف مبالغہ آمیز معلوم ہوں لیکن اصلیت یہ ہے کہ ایسے واقعات ہماری مشرقی معاشرت میں دبلا تخصیص مذہب وملت آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی کُلیہ ہے۔ کہ جن میں ابتدا سے تصنیف و تالیف کا جذبہ ہو وہ اپنی پہلی تصنیف۔ یا ناٹک میں وہ سب کچھ لاکر رکھدیتے ہیں جو ان کے دل میں بھرا ہو۔ یہ مصرع انہیں پر صادق آتا ہے۔

کاغذ پہ رکھدیا ہے کلیجہ نکال کے

یہی کیفیت راشد مرحوم کے اس اولین ناول کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کتاب حشویات سے پاک ہے۔ قصّہ کا تسلسل اور بیان کی روانی برابر قائم رہتی ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کی آنکھ اور ہمدرد دل مصنّف اپنے ساتھ لایا تھا۔ واردات قصہ وہ ہیں جو مساوی صورتوں میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ غرض وغایت فسانہ کی یہ ہے کہ جب شباب کی ڈھلان شروع ہوگئی ہو اور اولاد بھی کافی ہو تو ہر مرد یہ حوصلہ نہیں رکھتا کہ مری ہوئی بیوی کی جگہ اس وجاہت سے پُر کرے کہ بچوں کی یتیمی دور ہو جائے۔ یہ فرض نہیں کہ ان صورتوں میں جو مرد اچھا شوہر ہو وہ اچھا باپ بھی رہ سکے۔ فرض کو نفس پرستی کے اوپر جگہ دینی چاہئے۔ جو ہر ایک کا کام نہیں۔ آمنہ (کاظم کی پہلی بیوی) کے بعد کاظم اور اُس کے گھر کی جو حالت دکھلائی گئی ہے اس میں اگرچہ مبالغہ ہو۔ مگر جیسا کہ آگے کہا گیا ہے اوّلین تصنیفوں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ قصہ بالجملہ عبرت خیز اور نصیحت آمیز ہے۔ لوگوں کو کاظم کی زندگی سے سبق لینا چاہئے جو کچھ اس کتاب میں ہے اگرچہ طبقۂ اوسط کے مسلمانوں سے متعلق ہے لیکن ایسے حالات بلاقید مذہب وملت ہر کہیں پیش آتے ہیں۔

ایام جہالت میں یعنی بعثت سے پہلے کے عرب میں دختر کشی کا عام رواج تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں لڑکی پر لڑکے کو ترجیح دی جاتی ہے یہ کیوں؟ آیا یہ پُرانی عربی رسم کا نفسیاتی بقیہ ہے یا ہندوؤں کی معاشرت کا اثر۔ بہر حال راشد مرحوم کو یہ بات کھلی اور انھوں نے کئی جگہ اس بدرسم کو فسانہ کا موضوع قرار دیا۔ طوفان اشک میں پہلا افسانہ محروم وراثت اسی موضوع پر ہے۔ بگڑودہ میں یہ موضوع ارتقا پذیر ہوا۔ وقف علی الاولاد کی آڑ لے کر جو بیٹیوں کو وراثت سے محروم کیا جاتا ہے نہایت افسوسناک ہے۔ اسلام کی معاشرتی فضیلت علاوہ اور باتوں کے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے۔ زیادہ تر اس پر مبنی تھی کہ اس کی شرع اولاد مادینہ کے حقوق وراثت کا پورا لحاظ رکھتی ہے۔ میرے مرحوم دوست کو کیوں نہ تعجب بلکہ تاسف ہوتا کہ ہندو تو اپنے قدیم ضابطہ وراثت میں حکومت سے ترمیم کرا کر بیٹی اور بہن کو وراثت کا حقدار بنائیں اور مسلمان دیئے دلائے حقوق سے اپنی بیٹیوں کو محروم کریں۔ معاشرت کے استبداد اور مہذب انسانی بربریت نے جو ستم بیچاری مگو دہ پر توڑے وہ اس سے کم ہیں یا زیادہ جو غریب صالحہ کے حصّہ میں آئے۔ یہ بحث بے سود ہے۔

جب انسان پر نفس اور تکبر غلبہ پا جائے تو انسان انسان نہیں رہتا۔ ایک وحشی درندہ کی ذہنیت اس کے دل دماغ، رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

گھر گرہستی اور جماعت کی اصلاح۔ مذہب کی تلقین اور اخلاق کی تعلیم کے تحت مسلمانوں کو اچھا مسلمان اور اچھا دیندار بنانا۔ اور مطالبہ حقوق نسواں۔ یہ اور ان سے متعلقہ مسائل علامہ مغفور کی کتابوں میں جابجا آئے ہیں جس زور اور خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنے مسلمہ اصولوں پر عمل پیرائی کی وکالت کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کی عالمگیر واقفیت اور زبردست واقعیت ایسا مسکت استدلال ہے جو چون وچرا کی اجازت نہیں دیتا۔ و باجو بیاہ۔ تعدد ازدواج۔ بیواؤں کی شادی بیٹی اور بیٹا۔ طلاق اور وقف علی الاولاد وغیرہ اور ان کے متشابہ مسائل ان کی کتابوں میں مسلوک ہوئے ہیں سماج پر ان تصنیفوں کا کیا اثر ہوا؟ اس کی جانچ پڑتال یہاں بحث سے خارج ہے۔ عام طور پر نفس پرستوں کے لئے جن کی ہر کہیں اور ہر زمانہ میں اکثریت ہوا کرتی ہے۔ ان ناگوار مسائل کے باوجود کہ ان کے ہاں متاہل زندگی میں باہمی محبت کے سوا جسے آجکل رومان کہا جاتا ہے اس کا نام ونشان تک نہیں۔ ہر کتاب ہر افسانہ نہایت دل آویز اور دلکش ہے۔ کتاب کو ختم کئے بغیر چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ تبلیغی ناولوں کے نقائص سے یہ کتابیں قطعاً مبرا ہیں

معاشرت اور خانہ داری کے اہم مراحل میں سے شاید کوئی مرحوم کی نظر اصلاح سے بچا ہو۔ اولاد کی محبت جانوروں تک کو ہوتی ہے سب (خصوصًا مائیں) اولاد کو پروان چڑھانے میں اپنا آپا گلا دیتے ہیں۔ پھر اگر ہندوستانی والدین اپنی اولاد کے رکھ رکھاؤ میں زحمت اُٹھائیں۔ تو اس میں اعجوبہ بات نہیں۔ مگر خرابی یہ ہے کہ وہ اولاد کے عاشق ہوتے ہیں۔ ان کا عشق شاعر کے غزلیاتی عشق کا سا ہوتا ہے۔ بچاری مامتا کی ماری ماں کا تو ذکر ہی کیا۔ اکثر باپ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان۔ چند مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر جسے انگریزی میں ڈسپلن کہتے ہیں وہ ہمارے بچوں میں نہیں ہوتی۔ اس دو عملی یعنی مغرب زدگی کے دوران میں یہ خرابی اور بڑھ گئی۔ بچّہ کا کرتہ اسی خرابی پر روشنی ڈالتا ہے۔ فیروزہ جیسی مائیں۔ حارث جیسے بیٹے اور ریحانہ جیسی بھویں کسی کے علم سے باہر نہیں۔

بعضوں سے یہ سنا گیا کہ مصور غم کے خیالات میں قدامت پرستی بھری ہوئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت ویسے ہی ہوں جیسے ایک ہزار برس پہلے ہوا کرتے تھے لیکن امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ علامہ مرحوم حق پسند اور راستباز تھے اُنھوں نے کسی کے نقص اور عیب کو کبھی نہ چھپایا۔ مولانا سید کاظم کا افسانہ آپ سُن چکے ہیں۔ موقع پر وہ مولویوں کو لتاڑنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ملاحظہ ہو:-

"اگر اسلام اس کا نام ہے جو علما اسلام نے میرے سامنے پیش کیا۔ تو میرا اس اسلام کو دونوں ہاتھوں سے سلام۔ مگر نہیں۔ میں مسلمان ہوں۔ اور خود غرض عالموں سے ہزار درجہ بہتر۔۔۔۔۔" (سیلاب اشک صلا)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں کے نکاح ثانی کو دین وایمان سمجھ کر بھی ہم حَسَن کے اس نکاح کو جائز نہ کہیں گے۔ اگر مجبوری و معذوری سے تسلیم کر بھی لیں تو ضرورت تھی کہ حَسَن احکام اسلام کے بموجب مساوات کا ایسا سرمہ لگا کر دونوں (بیویوں) کو دیکھتا کہ پہلی بیوی کی آنکھ میں ملال کا میل تک نہ آتا۔۔۔۔" (طوفان اشک۔ ۳۱)

اسی غریب عطیہ کی آخری فریاد گوش دل سے سننے کے لائق ہے:-

"للہ ایمان سے کام لو اور بتاؤ اگر ہم نے حکم طلاق کے آگے کبھی اُف کی ہو۔ تم نے بے گناہ بے قصور طلاقیں دیں اور ہم نے گردنیں جھکائیں۔ مگر اُسی رسول اور اُسی مذہب نے ہم کو خلع کا حق دیا تھا۔ مگر ہے کوئی مسلمان جو آج کہہ سکے کہ

اس نے ایک بدنصیب بیوی کو خلع دلوا کر ظالم شوہر سے چھٹکارا دلوا دیا۔" .... (طوفانِ اشک - ۳۶)

اس سوال کا جواب کہ مسلمان بچیوں کے لئے وہ کونسا معیار پیش کرتے ہیں ان کی تودا ع خاتون سے وضاحت کے ساتھ ملتا ہے جو حاشیہ کا محتاج نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تصانیف کی غرض وغایت اپنی پرانی تہذیب ومعاشرت کا احیا یا اس کی اصلاح ہے لیکن نئی روشنی اور مغرب زدگی سے بھی وہ بیخبر نہ تھے۔ ایک دو افسانے بھی اس موضوع پر ہیں۔ حیاتِ صالحہ کی تیسری اشاعت کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"رفتارِ زمانہ کی بدولت مسلمان لڑکیاں آج زندگی کی اس منزل پر گامزن ہیں کہ وہ ساس خسر کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں اور زنانہ پرچوں میں اس بحث پر زور شور سے خامہ فرمائی ہو رہی ہے"۔

اجتماعی نفسیات کی یہ نہایت اہم حقیقت ہے کہ جب جماعت کی ذہنیت ایک طرف کو شدومد سے کھچی جا رہی ہو جسے تم خطرناک سمجھتے ہو تو تم اسی شدومد سے اُسے دوسری طرف کھینچنے کی کوشش کرو۔ نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ "خیر الامور" کی صورت نکل آئے گی۔ مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں اس وقت مغربی رجحانات ہمارے ہر طبقہ اور فرقہ کی ذہنیت پر حاوی ہو رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی لوگ گر گر کر سنبھلتے اور سنبھل کر گر رہے ہیں۔ اس تمام ہلچل اور سماجی انقلاب کا حشر کیا ہوگا اسکے لئے کسی جوتشی سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں۔ مصوّرِ غم جیسے دور اندیش حضرات کی کوششوں سے بہتری کی اُمید رکھنی چاہیئے۔

مرحوم کو مصورِ غم کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تصانیف میں درد اور سوز بھرا پڑا ہے۔ وہ دہلی میں اس وقت پیدا ہوئے جب جدھ شرا ور پرتھی راج، شاہجہاں اور اورنگ زیب کی راجدھانی اپنی گزشتہ عظمت اور مان کا ماتم کر رہی تھی۔ پانسو برس سے زیادہ کی بنی بنائی سجی سجائی معاشرت اور کلچر ماند پڑ رہی تھی۔ اس فضا میں جس نے آنکھ کھولی ہو اس کی طبیعت کی افتاد اور کیا ہوگی؟ پھر عام مشرقی ذہنیت کا بھی لحاظ رکھنا تھا کہ وہ کس درجہ درد آشنا ہے۔

نوبت پنج روزہ۔ مرحوم کی آخری تصنیفوں میں ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کی رُوداد درج ہے۔ اس کا ہر صفحہ بزمِ آخر سے کچھ بڑھ کر ہی دلچسپ ہے۔ قلم کا زور، اسلوب کی چستی اور شگفتگی، بیان کی روانی اور برجستگی ان کی پہلی یا کسی کتاب سے کم نہیں۔ واقعات ہیں کہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔ موضوع اگرچہ دلخراش مگر تاریخی تھا۔ دہلی کے آخری تاجدار سے عقیدت واقعہ نگاری کی سدِراہ نہیں ہوئی۔ اصلی واقعات جن کا علم تھا بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیئے۔ ان کی طبیعت اور قلم بڑھاپے میں بھی جوان تھے۔

میں پھر کہوں گا کہ مرحوم کو جو مصوّرِ غم کہا جاتا ہے یہ ٹھیک کہا جاتا ہے۔ جب سماج کی حالت غمناک اور رونے کے قابل ہو اور مطمعِ نظر اس کی اصلاح اور مذموم رواجوں کی ترمیم ہو تو گلے والی پلٹن کے کمیدان من بدیعا کا انتظار فضول ہے۔ سرشار نے روتوں کو ہنسایا تو شرر نے سوتوں کو گدگدایا۔ راشد الخیری نے کھسیانی ہنسی ہنسنے والوں کو رُلا دیا۔ بایں ہمہ اصل بات یہ نہیں کہ وہ چھپاتی بستیوں کو گورغریباں بنا گئے۔ جو نقص بڑے اور کثیر التصانیف ناول نگاروں میں ہوا کرتا ہے۔ چارلس ڈکنس کی نسبت نقادوں کی رائے ہے کہ ان کے ناولوں کا بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہیبت ناک اور ناگوار سین اپنے ناولوں میں بھر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے ایک واحد ناول بلیک ہوس Bleak House میں ایک نہیں پوری نو موتیں وارد ہوتی ہیں۔

پہلے کہا گیا ہے کہ ناول نگاری مرحوم کا دل بہلاوا یا قارئین کی دل لگی کا سامان ان کے لئے نہ تھا۔ بلکہ انھیں معاشرت کی اصلاح مدنظر تھی اور اس مقصد براری کے لئے اُنھوں نے ناول کو آلۂ کار بنایا۔ اگرچہ اُن کا مصوّرِ غم ہونا ناگزیر تھا لیکن اُن کے قلم میں تحریک

خندہ کا عنصر بھی تھا۔ نانی عشو بھی تو مصوّر غم ہی کے رشحات قلم سے ہے۔ وہ چاہتے تو نانی عشو جیسی بیسیوں کتابیں لکھ ڈالتے۔ اور ثقہ سے ثقہ اشخاص کے معدوں میں قراقر قہقہہ پیدا کردیتے۔ مگر یہ شغل ان کے لائحہ عمل سے باہر تھا۔

شروع میں کہا گیا ہے کہ ناول ذہن کی بڑی سے بڑی طاقتوں کا مظہر ہے جس کے ذریعہ انسانی کی مکمل واقفیت۔ اس کے بیم و رجا اور شادی و غم کے تنوعات کی ترجمانی کی جائے اور بذلہ سنجی اور جودت و فطانت کے شاہکار فصیح اور دلپذیر زبان میں دنیا کے پیش کئے جائیں۔ اسے تعریف تسلیم کیا جائے یا ایک معیار، مصور غم کے ناول اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے ہاں منتہا صرف ایک ہوتا ہے۔ فضا بالکل قدرتی یا واقعی ہوتی ہے۔ پشتانہ یا پس منظر جہاں کہیں ہے جچا تلا اور پیش منظر پر چھایا ہوا نہیں۔ کردار نگاری کا یہ حال ہے کہ اُن کے کسی ناول کو اُٹھا لو اور اچھے سے اچھے ڈرامے سے ملا لو۔ اس بارے میں ہیٹا نہیں رہے گا۔ واقعات وہ آتے ہیں جن کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور اُس کے ارکان میں حشو و زوائد سے پرہیز ان کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے، زبان۔ ای تو یہ جملے ہیں کہ امرت کی چھالیں۔ جس کو صحیح اور فصیح اُردو سیکھنی منظور ہو وہ **راشد الخیری** مرحوم کے ناول پڑھے سیکڑوں لفظ اور محاورے بیسیوں روزمرہ ایسے ہیں جو ان کی کتابوں سے استاد کی خدمت اور اہل زبانوں کی منت کے بغیر گھر بیٹھے سیکھ سکتے ہیں۔ زبان ان کی ٹکسالی مگر رسم پرستی سے آزاد۔ بیان اُن کا بلیغ مگر موشگافی اور دقت پسندی سے مبرا۔ اسلوب ان کا نہایت دلپذیر۔ اور شگفتہ لیکن بلند آہنگی اور ادب لطیف کے چونچلوں سے معصوم۔ ہر قصہ رواں دواں اور ہر واردات اپنے ماسبق سے منطقی وابستگی رکھنے والی فضا پردازی کوئی ان سے سیکھے۔

افسانہ کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا دو حالتوں کے درمیان معلق ہو جائے۔ ابھی تو مصنف پر آمنا کہتے اس کا حلق سوکھے اور ابھی ارکان قصہ کے درمیان کود پڑنے کو کمربستہ ہو جائے یعنی کسی کو سزا دینے اور کسی کو جزا دینے کو آستین چڑھالے۔ یہ اخیری کیفیت اُس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جبکہ مصنف ہمارے جذبات اور احساسات پر مکمل تسلط جما لیتا ہے۔ اور ہماری شخصیت شعوری طور پر اس کی افسانوی خلقت کا ایک جُز بن جاتی ہے۔ بعض واردات ایسی سامنے آجاتی ہیں جو ہم پر گذر چکی ہوں یا جیسی ہمارے دیکھنے میں آچکی ہوں یا یہ ہو کہ ایک کیفیت جو صرف ہمارے تخیل میں تھی فسانے کے صفحوں پر جیتی جاگتی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان اور ایسی صورتوں میں ہم کیرکٹروں یعنی قصہ کے اہل کردار کو بھول جاتے ہیں۔ میر داستان کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں اور خود بے ساختہ قصہ کی رَو میں کود پڑتے ہیں۔ اور اپنی شخصیت کو مصنف کے تخیل میں غوطہ دے کر نیا تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ افسانہ سچا ہے۔

یہ مقناطیسی اثر علامہ مرحوم کے ناولوں میں اکثر اور بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی تصدیق وہ پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں کرینگی جن کی تنبیہ اور جن کی حق رسی کے لئے مرحوم نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

اس مجمل انتقاد کو اب ختم کیا جاتا ہے۔ راشد مغفور کے ناولوں کے مفصل تبصرے کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہے +

مشرقی تہذیب کے گہوارے پر مولانا کے آنسو

از محترمہ شائستہ اختر بانو سہروردی۔ بی۔ اے۔ (آنرس)

حکومت اور تمدن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب تک کسی قوم کی حکومت رہی۔ اُس وقت تک اُسکے تمدن و تہذیب کا سکہ دنیا بھر میں چلتا رہا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ جب بابل و مصر کی قومیں دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور تھیں تو اُن کی تہذیب کی ساری دنیا مقلد و معتقد تھی۔ روم و یونان کا لوہا جب دنیا مانتی تھی تو ساتھ ہی ساتھ ان کی پیروان کی تہذیب کی دلدادہ اور ان کے فلسفہ کی مفتون تھی۔ عجم کا ستارہ جب چمک رہا تھا۔ تو متلون مزاج دنیا اسی طرح اس کے رسم و رواج کی مداح تھی۔ اور جب عرب کا ہلالی پرچم لہلہا رہا تھا تو یہ دنیا اسی طرح اس کے تمدن کی گرویدہ ہو رہی تھی۔ آج یورپ کی قومیں حکمراں ہیں تو ان کی تہذیب کی دنیا عاشق اور ان کی معاشرت کی ہر قوم مداح ہے۔

یہ بھی ہوتا آیا ہے کہ کوئی سی تہذیب ہو اُس کے آخری دور میں اس کی شکل بہت کچھ مسخ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں آگے لکھ چکی ہوں تمدن اور حکومت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور حکومت پر اس وقت ہی زوال آتا ہے جب اہل حکومت کے کیرکٹر کمزور ہو جاتے ہیں اور یہ کیرکٹر کی کمزوری معاشرت پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ اور اُس کو اپنی اصلی حالت سے بہت گرا دیتی ہے۔

مشرق کے اقبال کا ستارہ جب زوال پر آیا تو اُس کا تمدن اور تہذیب بھی بگڑ گئی۔ مشرقیوں کی نظریں فاتح قوم کی طرز معاشرت سے خیرہ اور ان کے خیالات اور اصولوں کی گرویدہ ہو گئیں۔ ان کی معاشرت میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ فاتح قوم کی ادائیں ہمیشہ منظور نظر ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیب سے مشرق کے بسنے والے بے زار ہو گئے۔ انہوں نے اس کے بہار کے دن نہ دیکھے تھے۔ اس کے عروج کے زمانہ سے واقف نہ تھے اس کے حسن سے نا آشنا تھے۔ اور اس نا واقفیت کے عالم میں اسے بُرا سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔

ایسی حالت میں جب ایک ایک کر کے مشرقی خوبیاں فنا ہو رہی تھیں۔ ایک قلم نے صرف اس اجڑے ہوئے باغ کی بہار کے گیت گائے ایک ہستی نے مشرقی چراغ کے بجھ جانے کا ماتم کیا۔ ہاں صرف ایک شخص نے اس دور کے سمے اپنے سحر نگار قلم سے کھینچ کر ایسے باندھے کہ ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مغربی معاشرت کی حمایت میں لکھنے والے جدید طرز کو سراہانے والے تو بہت نکلیں گے لیکن صرف ایک آواز نے مشرق کی تہذیب کے مٹنے پر نالہ وزاری کی۔ مشرقی تہذیب کے گہوارے پر حضرت علامہ **راشد الخیری** رحمۃ اللہ علیہ کے آنسو اردو ادب کے خزانے کے وہ انمول موتی ہیں جن کی قدر جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ کیونکہ ہمارے ہی دور میں پُرانے وقتوں کی باتیں دیکھے ہوئے لوگ تو کیا اس زمانے کے قصے سُنے ہوئے لوگ بھی اب بہت ہی کم دکھائی دیتے ہیں اور چند سال بعد تو اُس دور کے نام لیوا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گے۔ لیکن مولانا مرحوم کے قلم نے مشرقی تہذیب کے جو سمے دکھائے ہیں وہ آنے والی نسلوں کو بتاتے رہیں گے کہ ان گدڑیوں میں کیا کیا لعل تھے۔ ہماری تہذیب بھی کیا چیز تھی۔ ہماری زندگی کا فلسفہ کتنا بلند۔ اور ہماری عورتوں کے جذبات کتنے پاکیزہ تھے جن رسموں پر ہم آج ہنستے ہیں۔ جو رواج ہمیں بے معنی معلوم ہوتے ہیں انہیں محبت و مروت کے کیا کیا دفتر پنہاں تھے۔ رسموں کے پردے میں غریبوں کی کتنی دل جوئی اور محتاجوں کی کتنی مدد ہوتی تھی۔ رسموں کے بہانہ سے کس طرح غیرت دار غریبوں کے جذبات کو بغیر ٹھیس لگائے ان کی مدد ہو سکتی تھی

مولانا پُرانے وقتوں کے یادگار تھے مشرقی تہذیب سے ان کی واقفیت بہت گہری تھی ادنی سے ادنی رسم کی مصلحت انہیں

معلوم تھی۔ دیکھئے ان کے سحر نگار قلم نے شادی کے وقت بہن کا بھائی کے سر پر آنچل ڈال کر لانا جیسی معمولی سی رسم کو کیا پیارا کیسا محبت انگیز کتنا مصلحتوں سے بھرا ہوا دکھایا ہے فرماتے ہیں۔

"ماں باپ کو اس سے زیادہ عمر میں کونسی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے کیا یہ ضرور نہیں ہے وہ اس خوشی میں بیٹی داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت وہ کسی طرح لازمی وضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنچل ڈالے اور بہنوئی دولھا بنائے تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے۔ کچھ زور رسموں کا بھی پڑے۔ اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہوا ہے وہ دُور سے آیا ہے تو اس کا نیگ بھی مقرر کر دیا کہ ماں باپ دیکھ کر کہ بیٹی داماد کا کیا اُٹھا اس رقم کو نہ صرف ادا کریں۔ بلکہ موقع ہو اس بہانہ سے سلوک کریں۔

دوسری بات اور ہے کہ دولھا گھر میں آیا وہ دولہا کی حیثیت سے تمھاری رائے میں ہشاش بشاش ہو گا۔ مگر ہماری رائے میں اس کی حیثیت میں شرم وحیا بھی ہے کہ بڑی بوڑھیوں کے سامنے دندناتا ہوا داخل ہوگیا۔ وہ اگر تنہا ہو گا تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازہ ہی پر برابر کی کئی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کریں۔ ایک تیسری بات اور ہے دولہا اس سے پہلے گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دولہا ہے ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دولہن والیاں اُس وقت سامنے آ نہیں سکتیں۔ کیا یہ معقول تدبیر نہیں کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے لیں۔ ایک چوتھی بات اور سنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چپکے سے دولہا سے کہنی ہیں یا کچھ ہدایت کرنی ہے کیا اس وقت کانا پھوسی کرنی بدتہذیبی نہیں۔ آنچل کے بہانہ سے یہ ضرورت پوری ہوگئی" عصمت میں "میاں مٹھو کی بکواس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اس مضمون میں پُرانے زمانے کے ایک گیت کی تشریح بیان فرمائی ہے۔ یہ گیت شادی کا ہے اور یوں شروع ہوتا ہے۔

"بنا بنڑی کے لئے سُبھ گھڑی آیا ری بنا"۔ پہلی بات دولہا کے داخل ہوتے ہی جو اس کے کان میں پڑتی ہے وہ کس قدر خوشگوار ہے۔ "بنا بنڑی کے لئے سُبھ گھڑی آیا ری بنا" اس کو عمر بھر ان الفاظ کی لاج رکھنی ہے"

اس گیت کا ایک شعر یہ ہے۔

ماں کے قدموں میں گرا۔ باپ کی چھاتی سے لگا		بہنوں کے آنچل تلے کھیلتا آیا ری بنا

"خدا نے جو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا جو مکھی اُڑانے کے قابل بھی نہ تھا آج اس لائق ہوا کہ دولھا بنے اور جوان ہو سب سے پہلے ان قدموں میں گرتا ہے جو جنت ہیں اس کے بعد باپ کی چھاتی سے لگتا ہے۔

کیا اس تخیل کی جس میں حفظ مراتب کا اس قدر اچھا لحاظ رکھا گیا داد نہ دوگے؟

بہن بھائیوں کے جوش محبت کو ترقی دینے کے علاوہ دور جہالت کی اس رسم میں خاص مصلحت یہ تھی کہ سخت گرمی کا موسم ہو دولھا گھنٹوں سے کپڑے پہنے جکڑا بیٹھا ہے بہنوں کے آنچل چھتری کا کام دیں گے اور دھوپ کی زحمت سے محفوظ رہیگا"۔

(عصمت۔ مارچ ۱۹۲۰ء

ایک اور مضمون میں بتایا کہ امیر رشتہ دار غریب رشتہ داروں سے کس طرح جُھک کر ملتے تھے کس کس طرح ان کی دلجوئی کرتے تھے۔ وہ کیا زمانہ تھا جب غریب سے غریب رشتہ دار کی شرکت بھی ضروری سمجھی جاتی تھی اور امیر منتیں کرکے غریبوں کو لے جاتے تھے۔ امیر خالہ غریب بھانجی کے ہر ایک عذر کو کس خوبی سے دور کرتی ہے اور اسکے الفاظ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس کی گفتگو ہے یا محبت وہمدردی کا ایک دریا۔

ہم آج سمجھتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں عورتوں کو کسی طرح کی تفریح نصیب ہی نہ تھی۔ بے چاریوں کی ساری عمر کوٹھڑیوں میں بند رہ کر ختم ہو جاتی تھیں اور دراصل پرانی تہذیب کی جو بگڑی ہوئی شکل ہم آج دیکھتے ہیں وہاں یہی نظر آتا ہے کیونکہ وہ دل وہ امنگ وہ دور سب ختم ہو گئے آج جن کے پاس روز سینما جانے کے لئے پیسے ہیں۔ ان کی تفریح کے ذرائع ندارد۔ لیکن جب مسلمانوں کے دل زندہ تھے جب ان کی طبیعتیں فطرت سے ذوق رکھتی تھیں اس وقت کی بہاریں کچھ اور ہی تھیں۔ مئی ۱۹۳۵ء کے عصمت میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مولانا نے ایام گذشتہ کی تفریحوں کی ایسی موثر تصویر کھینچی تھی کہ بار بار پڑھو اور دل نہ بھرے۔ پڑھو اور حسرت آئے کہ ہائے کیا صورتیں تھیں کیا زمانہ تھا۔ کیا چہل پہل تھی! واقعہ یہ تھا کہ کسی نے قطب صاحب جانے کی ٹھیرائی۔ آج کل کا خاندان تو تھا نہیں کہ دو میاں بیوی ایک آدھ بچے موٹر میں بیٹھ چل دئے پورا کنبہ ساتھ ہوتا ہے کھانے پینے کا سامان لیا جاتا ہے۔ پھر قطب کے آگے سب اُترتے ہیں جھولے ڈالے جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں لہک لہک کر گا رہی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں پاندان کھولے بیٹھی ہیں۔ کڑاہیاں چڑھ رہی ہیں۔ پکوان تل تل کر اتر رہے ہیں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ اس سمے کو مولانا نے ان الفاظ میں باندھا ہے۔

"ساون کا مہینہ تھا اور دو دن پہلے سے قطب صاحب کے اندھیری باغ میں جھولے پڑ گئے تھے۔ اندھیری باغ تھا تو یہی گلدستہ کا باغ سچ مچ کا باغ تھا جہاں رستہ چلتوں کے سر پر چمپا اور مولسری کے پھول مہکتے تھے۔ آموں کے جھنڈ اور اودی اودی جامنوں پر طوطے اور ان کے لال لال کنٹھ ایسا گنگا جمنی سماں۔ اب کیا خاک دیکھنے میں آئیگا۔ صبح چار ہی بجے سے سب پہنچ گئے اللہ کی رحمت بھی ایسی ہوئی کہ سبحان اللہ یا تو تین دن سے آسمان تا نا ہو رہا تھا یا آدھی رات سے جو سہا گنی گھٹائیں کالی کالی اور بھوری بھوری اٹھنی شروع ہوئی ہیں تو دن بھر میں جل تھل کر دیا۔ دوپہر بعد ذرا ہلکا ہوا اور پھوار پڑی۔ تو شرابور لڑکیوں بالیوں نے کڑاھیاں چڑھائیں۔ پھوپی آمنہ کی پھلکیاں۔ چچی شہزادی بیگم کے قلمی بڑے خالہ جان کے گلگلے۔ اور چھوٹی سلطانہ کے اندرسے"

اسی سال "ساٹھ برس پہلے" کی ایک برسات کی تفریح دکھائی ہے۔

"کیا اچھا وقت تھا۔ مینہ دھائیں دھائیں پڑ رہا ہے اور عورتیں کھانے پینے کی تیاریاں کر رہی ہیں کوئی آم باندھ رہی ہو کوئی بیسنی روٹی پکا رہی ہے۔ کوئی سرکہ اور پیاز کی چٹنی تیار کر رہی ہے اور کوئی اپنے دودھ پیتے بچے کو گھرک رہی ہے جو اتفاق سے جاگ اُٹھا ہے۔ سواریاں بیٹھنی شروع ہوئیں۔ ایک بھارکس آٹھ دس سواریاں۔ دس بارہ بجے ایک کے اوپر ایک جب سب بیٹھ گئے تو بھارکس روانہ ہوئی۔ شہر کی فصیل سے نکل کر تین چار بیویاں اتر پڑیں۔ کچھ دور پیدل چلیں پھر بیٹھ گئیں۔ اور دوسری اتریں۔ نیچے اترنے والیاں جن کے ساتھ محلے کے بھی غریب غربا ہیں برسات کے گیت گا رہی ہیں مولوی صاحب اور ماموں مغل پیچھے ہیں۔ سڑک والی عورتیں لہک رہی ہیں اور گاڑی والیاں اُن کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ آگیا۔ ماموں مغل نے جھولا پہلے ہی ڈلوا دیا تھا پانچ چار جھولے کو لپٹیں۔ باقیوں نے کڑھائی چڑھائی۔ پالک قلمی بڑے۔ سہال۔ پھلکیاں گرم گرم اتر رہی ہیں۔ اور جھولے والیاں زور شور سے لہک کر ملہار گا رہی ہیں!

سبحان اللہ کیسی پُر لطف صبح ہے۔ جھولوں میں لال سبز پٹریاں پڑی ہوئی ہیں اور میری پھوپی زاد بھاوج پندرہ روز کی دولھن ہلکا سا گھونگھٹ نکالے جھولا جھول رہی ہیں۔ اور مقابل کے جھولے میں نند بیٹھی ہوئی ہے۔ نند بھاوجیں جھول رہی ہیں۔ اور بی مجن اس طرح جُھلا رہی ہیں۔

سکھی آئے بدروا جھوم کے

میرے سنگ کی سہیلیاں پہونچیاں اللہ میں بھی تو پہونچوں لاج سے"

سراب مغرب میں اسی طرح ساون کی خوشیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ لڑکی سسرال میں ہے۔ ساون آیا ہے اور وہ گاتی ہے۔

نیم کی نبولی پکی، ساون بھی کبھی آوے ہی گا

جیوے میری ماں کا جایا، ڈولی بھیج بلاوے ہی گا"

جذبات کی نزاکت و مسرت کو دیکھئے۔ پردیس بیٹی ساون کی آمد پر خوش ہے۔ کیونکہ یہ رسم ہے کہ اس موقع پر بھائی بہن کو لینے آتے ہیں دیکھئے تو کس خوبی سے رسم کے پردے میں اس ضرورت کو پورا کرایا ہے۔ نہ سسرال والے کچھ کہتے ہیں نہ شوہر ہی کو ناگوار گذرتا ہے اور لڑکی میکے پہنچ جاتی ہے۔ اور ذرا ان لوگوں کی انسانی فطرت سے واقفیت تو دیکھئے لڑکی کے بلانے کا کونسا وقت مقرر کیا ہے ساون! جب کہ کھیل کود کا موقع ہے تاکہ میکے میں آزادی سے چل پھر کر اپنا دل خوش کرسکے۔

ماں باپ کے بعد ڈر ہے کہ بھائی بہنوں کی خبر نہ لے اس لئے یہ رسم کردی ہے کہ جب بھائی کے گھر بال بچہ ہو بہن کی شرکت ضروری اور لازمی ہے۔

"بھائی کھاتا پیتا ہے جس کو خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ بہن بدقسمتی سے غریب ہے مفلس ہے اور مشکل سے زندگی بسر کررہی ہو مگر رشتہ کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ایک ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے، دولت کا امتیاز اور تغیر کی مصیبت رشتہ مساوات میں حائل نہیں ہے۔ وہ اپنی دولت میں خوش ہے تو یہ اپنی مفلسی میں مگن۔ بھائی کے ہاں بیٹا ہوا تو اس وقت کا تمدن اس طرح شروع ہوتا ہے۔ یہ مثل ملحوظ رہے کہ بہن پچاس برس کی اور بھائی پانچ برس کا یعنی دونوں برابر ہیں۔ بہن خوشی کے مارے اچھل پڑی بھائی کی کمائی سے نیگ جوگ کے بہانہ سے کچھ ملیگا، مگر ایسا نہ ہو کہ اس کی مفلسی بھاوج کی نگاہ میں وجہ ذلت ہو جائے اس لئے پہل اس کی طرف سے ہوتی ہے اور سب سے پہلے وہی بھتیجہ کا کرتا ٹوپی تیار کرتی ہے اور خود لے کر بھائی کے یہاں پہنچتی ہے ذرا اس وقت کی زچہ گیری کو دیکھنا بہن کیا کہہ رہی ہے۔

میں تو ہولر سنکر آئی - بیرن بھیا - میں تیری ماں کی جائی۔

اللہ اللہ کیسا موثر وقت ہے۔ بھائی بھاوج خدا کی اس نعمت پر باغ باغ ہیں۔ چاروں طرف سے مبارکبادیں مل رہی ہیں ہر شخص اپنا اپنا حق طلب کرتا ہے کہ دفعتہً مدتوں کی چھوٹی بہن کی یہ صدا اس بہانہ سے کان میں آتی ہے۔ وہ بھیک نہیں مانگتی۔ اپنا حق نہیں جتاتی۔ پہلے آنے کی وجہ بیان کرتی اور کہتی ہے۔

میں تو ہولر سنکر آئی - بیرن بھیا - میں تیری ماں کی جائی

اس وجہ کو بیان کرنے کے بعد بے ساختہ اس کی نگاہ بچہ پر پڑتی ہے۔ دل بھر آتا ہے۔ بھائی کی محبت جوش کرتی ہے اور دل سے یہ دعا نکلتی ہے۔

باغوں میں جیسے آم پھلے رے ایسا پھلے میرا بھائی

بیرن بھیا! میں تیری ماں کی جائی

اب اس کو اپنی غربت اور بھائی کے تمول کا خیال آتا ہے۔ اور سوچتی ہے کہ بھائی تو خیر اپنا ہے۔ کہیں بھاوج مجھکو غریب سمجھ کر حقارت سے نہ دیکھے - یہ خیال آتے ہی وہ بھاوج سے کہتی ہے۔

جئے میری بھاوج، جئے میرا لالہ، نند ہینی نہیں آئی

بھاوج کو دعا دیتی ہے۔ بھتیجے کی درازی عمر کی خواہش کرتی ہے۔ اور دبی زبان سے اپنا مطلب بھی کہہ دیتی ہے کہ خالی نہیں آئی ہوں۔

تیرے للہ کو ہنسلی رے کڑ دے، تجھ کو میوہ لائی

بیرن بھیا! میں تیری ماں کی جائی

اب اتنا کہہ چکی تو اپنا حق جتاتی ہے اور کس زور سے کہتی ہے کہ لونگی اور لے کر جاؤنگی۔

شو کے چڑھن گوڑا لوں گی۔ اپنے بدن کو جوڑا"

(سراب مغرب)

اسی طرح جوہر قدامت میں بہن کے کرتہ ٹوپی لانے اور بھاوج کے دودھ پلانے کی رسم کی حمایت میں ساجدہ کی زبانی کتنی پُرزور تقریر فرمائی ہے۔ کہ اس رسم کا اصل فلسفہ ذہن نشین ہو جاتا ہے اور بزرگوں کی اس رسم میں جو مصلحتیں تھیں وہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح ہر کتاب میں اور ہر موقع پر مولانا مرحوم نے مغربی تہذیب پر مٹی ہوئی اور غیروں کا کلمہ پڑھنے والی بدنصیب قوم کو بتایا ہے کہ اس کی اپنی تہذیب بھی کچھ ایسی گئی گذری اور اس کی تمام رسوم ایسی لغو بے معنی اور فضول نہ تھیں۔ تہذیب مشرقی میں کتنی روحانیت ہے۔ مشرقی فطرت کتنی درد آشنا مشرقی نقطہ نگاہ کتنا پاکیزہ ہے اس کو ہماری مغرب زدہ قوم پر کس خوبی اور کمال کے ساتھ سمجھایا اور کس طرح سے مشرق کے معیار، اخلاق و فلسفہ حیات کا مغرب سے زیادہ بلند و عمیق ہونا ثابت کیا ہے مشرق کا قانون اخلاق خوف خدا اور خدمتِ خلق پر مبنی ہے۔ مشرق کی فطرت میں سوز و گداز ہے۔ اپنے پرائے کا درد ہے۔ مشرق کے بسنے والے غریبوں کی آہ سے ڈرتے ہیں اور محتاجوں کی دل آزاری سے کانپ اُٹھتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ع

خرید اگر ملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

مولانا کی کوئی سی کتاب اٹھا لیجئے اس میں مشرق کی اس قابل تقلید اور لائق تحسین معاشرت کی خوبیاں سمجھائی گئی ہیں اور اتنے پرزور الفاظ میں کہ دل میں اتر جائیں اور جی میں گھر کریں۔ قدامت کے کیا کیا جوہر تھے۔ وہ جوہر قدامت پڑھ کر آپ دیکھیں جسکے ہر ہر صفحہ پاس تہذیب کا جو ہماری بدقسمتی سے مٹ گئی اور اس تمدن کا جو کہ اجڑ گیا اس جہان کا جو کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ایسی تصویریں ملیں گی۔ جو دل کو تڑپا دیں گی۔ جو آنکھوں کو رلوا دیں گی جن کو پڑھ کر ہر دل درد آشنا اور ہر دل بیدار ہو جائے گا۔ مشرق کی تہذیب کی یہ ایک تصویر ہے جس وضع کو ترک کر دیا ذرا اس کی شان ملاحظہ ہو۔

امیر بیگم اپنے کوٹھے سے غریب ہمسائی کی مصیبت کا حال دیکھتی ہے اور فوراً وہاں جانے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی گفتگو مشرقی و مغربی تہذیب کا آئینہ ہے۔

بیوی۔ میں ذرا آٹھ گھرے تک جانا چاہتی ہوں۔ ہو آؤں۔

میاں۔ کیوں خیریت۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی۔

بیوی۔ نیم والی بڑی بی کے یہاں جاؤں گی۔

میاں۔ وہ فقیرنی ٹکڑگدی۔ مغرور اتنی کہ بھوکی رہے اور یہاں آکر جھانکے تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تمہاری

شان کے لائق نہیں۔" (جوہر قدامت صفحہ ۳۶)

مشرقی بیگم کس ادب سے غریب پڑوسن کے یہاں جاتی ہے کس عجز سے اس کی اعانت و امداد کرتی ہے۔ کتنا فرق ہے۔ کتنی روحانیت ہے۔ مشرق کے اس طریقہ خیرات میں اور مغرب کے اس رویہ میں کہ فقیروں کی صورت دیکھی تو بدن جل گیا لنگڑے لُولے سامنے آئے تو گھن آنے لگی۔ خیرات کہو زکوٰۃ کہو نیکی کہو تو وہ کانفرنسوں اور جلسوں میں چندے دینا ہے۔ مانا کہ کمیٹیوں کی ذریعے اور اسکولوں کی معرفت غریبوں ہی کی امداد ہوتی ہے۔ لیکن ان میں چندہ دینا اور بات ہے اور محلہ کے غریبوں اور بے مانگنے والے محتاجوں کی خود جاکر مدد کرنا اور بات ہو۔ آج کتنی عورتیں ہیں جو ایک محتاج عورت کے گھر جائیں گی اس کی ہمدردی کریں گی اس کے دُکھ درد کو سنیں گی۔ آج کل تو سب کا وہ خیال ہے جس کا اعادہ ساجدہ کے شوہر نے کیا کہ غریب کا فرض ہے کہ امیر کی چوکھٹ پر جبیں فرسائی کرے۔ غریبوں کی عزت مشرقی تہذیب میں ہے۔ مغربی تہذیب میں نہیں۔ مشرق کی غربا پرستی اور خوفِ خدا کے مقابلے میں مغرب کی یا دوسرے لفظوں آج کل کے لوگوں کی سنگدلی و خود غرضی و بے دردی کے نمونے بھی مولانا نے جگہ جگہ دیئے ہیں تاکہ لعلوں کے مقابلے میں ان ٹھیکروں کی قیمت معلوم ہو جائے۔

"جوہر قدامت" ہی میں شاہدہ کا سلوک رحیما کے ساتھ اور آگے چلکر اس کا سنگدلانہ برتاؤ اسکے بچہ کی انابستی کے ساتھ صرف نمونے ہیں اسی رویہ کی مثال ہیں اسی سنگدلی کے جو مغربی تہذیب کا عطیہ ہے اور جسے ہم اندھا دھند اختیار کر رہے ہیں۔ بلکہ مغربی تہذیب کا عطیہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ مغرب میں بھی یہ شقاوت یہ سنگدلی نہیں ہوتی بلکہ یہ نتیجہ ہے اس خیال کا جو ہمارے دل میں جم گیا ہے کہ ہماری فلاح وبہبود اسی میں ہے کہ جو کچھ آج تک کرتے آئے ہیں۔ انہیں بے سوچے سمجھے چھوڑ دیں۔ ہم انگریز بننے کی کوشش میں کچھ ایسے بن گئے ہیں کہ شیطان بھی شرمائے۔

رحیمن کے ساتھ شاہدہ کا سلوک ہرگز مبالغہ نہیں اور محض قصہ نہیں واقعہ ہے۔ نئی روشنی کی روشن پتلیاں آئے دن ایسی حرکات کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ انہیں خدا کا خوف نہیں سکھایا گیا دکھے ہوئے دلوں کی آہ سے ڈرنا نہیں سکھایا گیا وہ نوکر کو سمجھتی ہیں آلہ اپنی خدمت کا مشین اپنے آرام کی۔ بیمار نوکر کو کام سے معافی نہ دینا اس کے جذبات کا خیال نہ کرنا۔ اس کے دکھ درد سے واسطہ نہ رکھنا۔ یہ آج کل کی ہر ایک مغرب زدہ خاتون کی خصلت ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ وطیرہ جان بوجھ کر اختیار کرتی ہیں اس کو نوکروں پر رعب رکھنے پر محمول کرتی ہیں۔ ایک تڑپتی ہوئی ماں سے اس کے بیمار بچے کو اس لئے جُدا کر دینا کہ متعدی مرض میں گرفتار ہے اور ایسا نہ ہو ان کا اپنا بچہ بیمار ہو جائے۔ یہ تو ان کے نزدیک حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آہ جو اس بیکس ماں کے دل سے نکلے گی وہ سو متعدی مرضوں سے زیادہ جلاکر خاک کر دینے والی ہے تو یہ تو جاہلانہ توہمات ہیں جس کی پروا نہ کرنا اُن کی تعلیم کا مقصد اولین ہے

جدید تہذیب اور ترقی کے یہ کرشمے نئی روشنی کی یہ تاریکیاں مولانا کو مشرقی تہذیب کے جنازے پر خون کے آنسو رلواتی تھیں وہ ہماری تعلیم کے حامی اور ترقی کے معاون تھے پر ان کی نظریں بہت دوربین تھیں اور وہ دیکھتے تھے کہ مسلمان جس راستے جا رہے ہیں وہ انہیں ترقی نہیں تنزل کی طرف لیجا رہا ہے۔ وہ خدا سے کتنے دور اور انسانیت سے کتنے نا آشنا ہوتے جاتے ہیں۔ وقت کی پابندی، متعدی امراض سے پرہیز اپنی صحت کا خیال۔ کانفرنسوں اور پارٹیوں کی شرکت۔ اپنے حقوق کی حفاظت بذات خود بُری باتیں نہیں۔ مگر جس طریقہ سے وہ برتی جا رہی ہیں جس طرح سے ان باتوں کے آگے جو محض معمولی ہیں اخلاق اور انسانیت کے اعلیٰ قوانین کو پس پشت ڈال دیا جا رہا ہے یہ یقیناً قابل اعتراض ہے۔

قومی جلسوں کی شرکت مستحسن لیکن فرخندہ کا شوہر کو بخار میں پھنسلتا ہوا چھوڑ کر چلے جانا (بنت الوقت صفحہ ۴۱) قابل نفرین۔ مرض متعدی سے پرہیز اچھی بات پر ایک غریب عورت کو جاڑوں میں ویٹنگ روم سے اس قصور پر نکال باہر کرنا کہ اس کا بچہ بیمار رہے۔ (جوہر قدامت صفحہ ۱۵۰) شقاوت۔ جلسے کرنا۔ اور ہائے قوم دوائے قوم کے نعرے لگانا۔ اور اپنی ڈیوڑھی سے محتاج عورتوں بیکسوں اور مظلوم یتیموں اور اپاہج فقیروں کو دھتکا کر نکالنا ترقی اور لیاقت نہیں تنزل اور جہالت ہے بمضمون کی طوالت کا خوف ہے ورنہ "سراب مغرب" "بنت الوقت" "جوہر قدامت" "شوتنی" کے صفحے کے صفحے ایسے ہیں جن پر مشرق کی مٹی ہوئی تہذیب کا ماتم ہے۔ ان کتابوں میں مولانا نے آنسو گرائے ہیں مسلمانوں کی مٹی ہوئی حمیت پر کھوئی شرافت پر۔ گنوائی ہوئی ہمدردی وانسانیت پر اس بے حسی وغفلت پر جو درد کو درماں اور مرض کو شفا سمجھے ہوئے ہے۔

پھر سب سے گرانقدر سب سے قیمتی سب سے افضل ترین ہیں وہ آنسو وہ خون کے آنسو وہ اشکِ حسرت وہ ماتم کے آنسو جو مولانا نے مشرقی عورت کی مشرقیت کی بربادی پر گرائے ہیں۔ مشرق کی عورت کیا تھی؟ اسکا دستور العمل کیا تھا؟ اسکا ایمان کیا تھا سنو مولانا کے کوثر کی دُھلی ہوئی زبان میں دلّی کی نکھری اُردو میں سُنو! دور گذشتہ کی ایک جھلک دکھاتے ہیں دیکھو۔ فرماتے ہیں۔

"لو ہشیار ہو مجلسِ فانی قریب آگئی۔ دل بھر کے دیکھ لو چاند مرہم ہوا، چاندنی پھیکی پڑی، تارے جھلملا گئے۔ چراغ ٹمٹماتے ہیں۔ رات گذر گئی اور یہ پھول جو ساری رات مہکے اب مرجاتے ہیں ان کی سادگی پر نہ جاؤ ان کی باتوں پر نہ ہنسو دنیائے نسوان کی وہ مورتیں جن کے منہ سے باتوں میں پھول جھڑتے ہیں اور جنکی صورتوں پر ادائیگی فرائض کا مینہ برس رہا ہے ان کے سفید بالوں میں خلوص کی کنگھی ہے۔ ان کے پاک ہاتھوں میں صداقت کے گلدستے مرغ کی اذان نے ان کو بستر استراحت سے بیدار کیا رات ان کی زندگی پر مرحبا کہتی ہوئی رخصت ہوئی اور صبح صادق نے جانماز پر ان کا استقبال کیا میرے دوستو ادب کے ہاتھ اُٹھا کر ان بزرگ ماؤں کے سلام کو جھک جاؤ جنہوں نے شوہروں کے آرام پر اپنی راحتیں قربان کیں اور اپنے ہاتھ سے پکانا فخر سمجھا بہتر سے بہتر کھلایا اور اچھے سے اچھا پہنایا بچی بچائی کمائی اور پُرانا دھرانا پہنا مگر کام کے وقت اور ضرورت کے موقع پر جب مایوسی نے کمر ہمت توڑ دی تو ان نیک کوک کی بیٹیوں اور شریف بیبیوں نے اشرفیاں نکال کر آگے رکھدیں۔ آسمانی فرشتوں نے ان کی خدمات پر آفرین کہی۔ اور بزرگوں کی پاک روحیں ان کی زندگی پر فخر کرنے لگیں ان کی خموشی اور سنجیدگی پر نہ جاؤ۔ یہ گھروں کی بااختیار شہزادیاں شوہروں کی لونڈیاں ہیں۔ یہ طرار نہ ہوں ان میں چٹک مٹک نہ سہی مگر ان کی پیشانیاں دیکھو نسوانیت کے جھومر جگمگا رہے ہیں ترقی ان کی جہالت پر قربان ہوگی۔ اور تصنع ان کی سادگی کی بلائیں لیگا۔ ان کی کتابِ حیات میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ ان کے باغیچہ زندگی میں سدا بہار پھول ہیں۔ ان کی جسد خاکی کی تہہ میں ممتاز راز ہیں۔ یہ یتیموں کی مائیں۔ عزیزوں کی عاشق ہیں یہ رانڈوں کی وارث ہیں۔ یہ خدا کے نام پر قربان ہونے والی نور کی پتلیاں اور شوہروں کی پرستش کرنے والی خدا کی بندیاں ہیں۔ یہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ نہ ہوا ویر کی شوں شان نہ سہی مگر ان گھروں میں سب کچھ ہے یہاں زندگی کی بہاریں ہیں۔ جینے کا لطف اور رہنے کا مزا ہے۔ ان گھروں میں برکت اور گھر والیوں میں خدا کی رحمت ہے۔

دیکھو وہ جلوہ ختم ہورہا ہے۔ اور وہ متبرک ہستیاں اب دھندلی سی تصویر رہ گئیں۔ بزرگ ماؤں ذرا صبر کرو

اپنے قدم آگے بڑھاؤ کہ میں ان کو بوسہ دوں اپنے ہاتھ میرے سر پر رکھو میں جانتا ہوں تمھاری نورانی صورتیں اب نظر نہ آئیں گی۔ مگر تمھاری زندگیاں زندہ رہیں گی۔ تمھارے مبارک ہاتھ جو چراغ جلائیں گے جب تک یہ روشن ہیں اسلام زندہ رہے گا اور جن گھروں میں ان چراغوں سے چراغ جلیں گے۔ وہ نمونہ جنت ہوں گے۔ اچھا میری ماؤں رخصت ہو"۔ (بنت الوقت ۵۵ و ۵۶)

حسرت سے ڈوبی غم سے بھری کیا دردناک تصویر ہے اس بزم آخر کی۔ خون کے آنسو کیوں نہ گریں کہ اب یہ صورتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ اب ساجدہ جیسی دیندار۔ زاہدہ جیسی وفا شعار۔ منور جیسی ایثار کی پتلی قیصر اور محمودہ جیسی صابر عورتوں کی جگہ مس رفیقہ جیسی ظاہر پرست۔ حارثہ افضال جیسی خود غرض۔ فرخندہ سفیر جیسی لا مذہب اور مس احسان جیسی بے وفا عورتیں رہیں پر چاہے کچھ ہو۔ مغرب کے سیلاب کے آگے ترقی تہذیب کا جہاز نہ ٹھہر سکے۔ ہمارا تمدن مٹ جائے۔ ہماری رسوم ختم ہو جائیں۔ ہمارا رواج اُٹھ جائے لیکن اُردو ادب کے چمن میں علامہ راشد الخیری نے مشرقی تہذیب کی یادیں جو پھول کھلائے ہیں وہ سدا بہار ہیں۔ اور ہمیشہ مہکیں گے۔ جب مشرق کی تہذیب کو جاننے والا ایک انسان بھی نہیں رہیگا جب یہ ساری باتیں خواب وخیال ہو جائیں گی تب مولانا کے آنسو تہذیب مشرقی کے گہوارے پر وہ موتی ہوں گے جن کی چمک کے آگے مغربی تہذیب کی روشنی ماند پڑ جائے گی +

مولانا راشد الخیریؒ کا آٹوگراف

از محترمہ صغرا ہمایوں مرزا۔ حیدرآباد دکن

مولانا راشد الخیری صاحب کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا تھا کہ کبھی اپنے سے جُدا نہ کرتے تھے۔ چند روز کے سفر میں بھی ساتھ ہوتی تھیں بچوں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ دونوں لڑکے جوان ہیں مگر گلے کے تعویذ کی طرح ساتھ رکھتے تھے۔ مرحومہ بہو خاتون اکرم کو اکثر یاد کرتے تھے غرض شوہر، باپ، خسر، دادا، ہر حیثیت سے وہ اپنا محبت بھرا سلوک دنیا کو دکھا گئے کہ تم خوشگوار زندگی گذارنی چاہتے ہو تو اس طرح رہو۔ جب تک زندہ رہے دنیا کو سبق دیتے رہے، مرنے کے بعد بھی ان کے نایاب کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

۱۹۲۸ء میں جب میں دہلی گئی تو دو تین مرتبہ مجھے اور بیرسٹر صاحب کو بلایا اور کئی دفعہ خود بھی ہماری قیام گاہ پر تشریف لائے میں نے اوٹوگراف میں کچھ لکھدینے کی درخواست کی تھی۔ اسی وقت یہ سطریں تحریر فرما دی تھیں جواب میرے پاس اُن کی نشانی ہیں:-

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدو کہ تمھاری نماز اور نیند، زندگی اور موت، سب اللہ کے واسطے ہے۔

آج ۳۰ نومبر کی سہ پہر کا وقت عزیزہ سیدہ صغرا ہمایوں مرزا کی چاء پر گذرا۔ سید صاحب کی گفتگو، سیدہ صاحب کے خیالات کس قدر پاکیزہ اور شستہ تھے، بے انتہا فرحت ہوئی۔

یہ دونوں محترم میاں بیوی قوم بدبخت کا جو درد، دل میں رکھتے ہیں کاش دوسرے مسلمان اس سے سبق لیں +

راشد الخیری
۳۰ نومبر ۱۹۲۸ء

علّامہ! تیری موت سے دِلّی اُجڑ گئی

از افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دھلوی

پہلے ہی۔ اپنے مُلک میں قحطُ الرجال تھا اے موت! تونے۔ اور قیامت یہ کی بپا
راشد کو۔ ہم سے چھین لیا۔ وامصیبتا وہ ایک ہی بقیہ تھا۔ اہل کمال کا
وہ جُرعہ نوشِ عرفی وطالب نہیں ہے اب
وہ۔ یادگارِ مومن وغالب نہیں ہے اب

وہ ناسخ رسوم وجوانمرد اب کہاں؟ وہ چارہ سازِ بیکس وپُردرد اب کہاں؟
ہر نقص کو جو کرتا تھا بے پردہ اب کہاں؟ غیروں کے واسطے وہ دمِ سرد اب کہاں؟
قسمت ادب کی، غم کے مُصوّر، بگڑ گئی
علّامہ! تیری موت سے دِلّی اُجڑ گئی

اے موت! تو بُروحِ مشیّد میں جائے گی یہ سچ ہے جامِ مرگ۔ ہر اک کو پلائے گی
ذی روح جس قدر ہیں تو مردہ بنائے گی لیکن۔ جو رُوحِ کُل ہے اُسے بھی مٹائے گی؟
انصاف کر۔ یہ عدل نہیں کچھ ٹھیرتا ہے؟
اللہ تو۔ کسی پہ نہیں۔ ظلم کرتا ہے

شاعر نہ مان۔ نثر کا وہ شہریار تھا بیواؤں کا رفیق۔ غریبوں کا یار تھا
بیکس ستم زدوں کا تو وہ غمگسار تھا کس درجہ اُس کو فرقۂ نسواں سے پیار تھا
اُن کے حقوق۔ یاد دِلاتا تھا۔ یا نہیں؟
سچ کہنا۔ اُنپہ۔ رحم دلاتا تھا۔ یا نہیں؟

بیشک! وُہ منفرد تھا زمین وزمان میں اُس کے قلم میں زور تھا قوت بیان میں
تحریر کیا تھی؟ سحر تھا۔ جادو زبان میں سعدی تھا۔ اپنے وقت کا ہندوستان میں
عورت کا دل سمجھتا تھا۔ ہمراز کے لئے

مست ولا تھا۔ "بلبلِ شیراز" کے لئے

پشت و پناہ تھا جو غریبوں کے واسطے
روشن چراغِ راہ۔ ادیبوں کے واسطے

قانون تھا وہ خاص طبیبوں کے واسطے
مامن بنا تھا۔ ظلم نصیبوں کے واسطے

اُس کا کلام نسخہ اکسیر ہو گیا
جو کہدیا۔ نوشتۂ تقدیر ہو گیا

تھا۔ سادگی سے گوشہ خاطر بھرا ہوا
کذب وریا سے جس کا تھا دامن بچا ہوا

طینت کا صاف بخل و تکلف سے پاک تھا
ایسا تھا۔ جیسے ہوتے ہیں۔ مردانِ باخدا

ہر سانس۔ اس خیال میں۔ آتش بجان تھا
ہمدرد۔ صنفِ نازکِ۔ ہندوستان تھا

اس غمکدے میں آکے وہ اُلجھا نسیم سے
ہر وقت۔ روشناس تھا۔ اُمید و بیم سے

اکثر دعا یہ کرتا تھا۔ ربّ کریم سے
"یارب! پناہ دینا مجھے۔ ہر لئیم سے

مایوسیاں ہوں۔ نے ہدفِ شیخ و شاب کر
یارب مرے مشن میں۔ مجھے کامیاب کر

واقف ہے تیری ذات کہ ہوں بندہ حقیر
لیکن۔ جو عزم کر لیا۔ اب وہ ہے ناگزیر

اصلاح قوم کے ہیں کھٹکتے۔ جگر میں تیر
اِس پر۔ یہ دردمند بہت ہو چلا ہے پیر

اُمیدوار ہوں۔ کہ دعا مستجاب کر
ذرّے کو اپنی مہر سے تو کامیاب کر"

شاعر وہ جگری دوست جہاں سے چلا گیا
عصمت۔ بنات۔ جوہرِ نسواں ہیں گلکدا

یہ اُس کی یادگار ہیں۔ خالق ہے۔ رہنما
حق پر رہی نگاہ۔ تو پھر کام بن گیا

کُل کا بھلا وہ چاہتا تھا۔ سب کا درد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مصورِ غم کے معتقد

اگر کسی شخص کی نیکیوں کا شمار کرنا ہو اور اُس کی خوش اعتقادی کا اندازہ لگانا ہو تو اُس شخص کے معتقدوں کا شمار کیجئے جن کے دل اس کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ حضرت علامہ مصورِ غم رحمتہ اللہ علیہ کے معتقدین کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ نہ صرف ہندوستان تک ہی محدود ہے بلکہ ممالک غیر سے بھی ان کے معتقدوں کی ماتم کناں صدائیں آرہی ہیں۔ ان کے وصال سے نہ صرف اپنے ہی سیاہ پوش اور سینہ کوش نظر آرہے ہیں بلکہ باشندگان ممالک غیر کے دلوں کی بستیاں بھی تاراج و تاریک ہوگئیں ہیں جس کا اندازہ ان بے شمار ماتمی خطوط اور نوحوں اور مرثیوں سے چل رہا ہے جو فروری سے اب تک "عصمت" "بنات" "جوہر نسواں" اور دیگر جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مدتوں یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ اور مولانا مغفور کے معتقدوں کے دلوں سے اُن کی کبھی فراموش نہ ہونے والی یاد بھلائے نہ بھولے گی۔ اور اس صدمۂ شدید اور نقصانِ عظیم کی تلافی نہ ہوسکے گی۔

مصورِ غم کی تصانیف "صبح زندگی" "شام زندگی" "شب زندگی" نے اُن کی خوش اعتقادی کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بجوا دیا۔ اور ہر وہ چھوٹا بڑا جس نے اُن کی تصانیف پڑھی یا سُنی تھیں مولانائے مغفور کی زیارت کا تمنائی و شیدائی بن گیا تھا۔

اب سے کوئی دس یا بارہ برس پہلے کا ذکر ہے کہ مصورِ غم کی آمد کا غلغلہ ریاست کپورتھلہ میں ہوا تو مصورِ غم کے معتقدین نے ان کے جائے قیام پر ڈیرے جمائے تھے اور تمام مرد و زن بچے بوڑھے ہر شخص پروانہ وار نثار ہو کر علامہ مغفور کے وعظ گراں بہا سے مستفیذ ہونے کے لئے ہمہ تن گوش نظر آرہا تھا۔

یہ ایک عام بات ہے کہ جو شخص لکھنے میں اس قدر طاق ہو وہ بولنے میں ایسا نہیں ہوتا لیکن مولانا مغفور کا وعظ سُنکر میرے بڑے بھائی ارشمند صاحب نے گھر آکر کہا کہ "ہر ایک مرد و زن جس نے وعظ و لکچر سُنا ہے رطب اللسان ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ علامہ راشد الخیری جیسے لکھنے میں الم نگاری فرماتے ہیں ویسا ہی بولنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس قدر مؤثر پیرایہ میں رقت انگیز وعظ فرمایا کہ لوگ جو مبہوت کھڑے سُن رہے تھے سب کی آنکھیں بھر آئیں۔"

مجھے بھائی صاحب کی زبانی علامہ راشد الخیری کے متعلق اب تک مذکورہ الفاظ یاد ہیں۔ اور واقعی میں نے ان کی تصانیف کو ویسا ہی موثر پایا جیسا کہ سُنا تھا۔

یہ در اصل ان کی مغفرت کی ایک بیّن دلیل ہے کہ ہر چھوٹا بڑا مرد و عورت علامہ مغفور کی روح پر خوش اعتقادی کے پھول برسا رہے ہیں۔ زبانِ خلق میں رضائے الٰہی پوشیدہ ہے۔ اور درحقیقت علامہ نے اپنے نیک اعمال و افعال سے رضائے الٰہی حاصل کرلی۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو

گ۔ ن۔ بنت ڈاکٹر شیخ ابو الفضل ایڈووکیٹ کپورتھلہ

مصوّرِ غم کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر اعظم صاحب کُریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد کے قلم سے

افسانہ۔ کہانی۔ داستان قریبًا ہم معنی الفاظ ہیں دنیا کو قصہ کہانی سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے اس وقت میں جبکہ دنیا میں تہذیب و تمدن کا آفتاب جلوہ فشاں نہ تھا انسان قصہ کہانی کا شیدائی تھا۔ عہد قدیم کے متعلق جو کچھ تاریخی مواد ملتا ہے وہ سب انہیں قصہ کہانیوں سے ماخوذ ہے۔ یہاں افسانہ نگاری کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اتنا لکھنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی ابتدا افسانہ سے ہوئی بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ دنیا خود ایک افسانہ ہے اور ہم سب اس افسانہ کے کردار ہیں جس نے اس افسانہ کو اچھی طرح سے بیان کیا وہی کامیاب افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے کسی قوم یا ملک کی تمدن یا معاشرت کا اندازہ لگانا ہو تو آپ اس کا افسانہ پڑھیں کسی ملک یا قوم کی صحیح حالت معلوم کرنے کے مختلف ذرائع ہیں ان میں ادب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور ادب میں افسانوں کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے کیونکہ وہ قوم و ملک کی زندگی کا زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں یہاں ان مخرب اخلاق بازاری افسانوں کا ذکر نہیں جو نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرتے ہیں بلکہ ان افسانوں سے مطلب ہے جن سے ملک و قوم کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی ہے۔

میں مختصر سے مختصر الفاظ میں اچھے افسانہ کی یہی پہچان بتا سکتا ہوں کہ جن میں زندگی کو کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کا راز مل جائے لیکن یہ راز وہی افسانہ نگار بتا سکتا ہے جس نے دنیا اور دنیا والوں کا کافی مشاہدہ کیا ہو جس نے حساس اور درد بھرا دل پایا ہو وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ اتنے غور سے کرے کہ چھوٹی بڑی ہر چیز اُس کے سامنے ہو افسانہ میں جس ماحول کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اُس سے خوب واقف ہو ورنہ وہ کامیاب آرٹسٹ یا افسانہ نگار کی حیثیت سے نمایاں درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا "کیمرہ" سے تصویر غالبًا ہر شخص اُلٹی سیدھی کھینچ سکتا ہے لیکن باقاعدہ اور مکمل تصویر کھینچنا اعلیٰ پایہ کے مصور ہی کا کام ہے۔

افسانہ نگار کا دوسرا لیکن سب سے زیادہ اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس بات کا اندازہ کر سکے کہ اسے ایک موقع پر کس چیز کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت ہے اور کس سے بچنا ضروری ہے۔ افسانہ لکھا جائے ہندوستانی عورت کا اور اُس کے جسم پر ایرانی یا تورانی لباس دکھایا جائے تو وہ اچھا افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں دو باتوں پر افسانہ نگاری کی بنیاد قائم ہے اگر بنیاد ہی کمزور ہو گئی تو عمارت اچھی نہیں بن سکتی جس افسانہ نگار کا مشاہدہ اچھا نہ ہو گا جو اس کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اُسے کس موقع پر کس چیز کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت ہے اور کس چیز سے بچنا لازم ہے وہ کامیاب افسانہ نگار ہرگز نہیں کہا سکتا۔ ان کے بعد زبان۔ پلاٹ۔ کردار نگاری وغیرہ کا نمبر آتا ہے مگر ایک لحاظ سے یہ سب ان

دونوں صفات میں آجاتی ہیں۔ اب صرف افسانہ کا موضوع رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بیس سالہ افسانہ نگاری کے تجربہ پر کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ کا بہترین موضوع وہی ہوتا ہے جس میں کسی نہ کسی اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی یا نفسیاتی کا پہلو نمایاں ہو۔ جب میں اس کسوٹی پر (یعنی شاہدہ۔ زوربیان۔ زبان۔ پلاٹ اور موضوع وغیرہ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں) علامہ راشد الخیری کے افسانوں کو دیکھتا ہوں تو مرحوم کا مرتبہ بہت بلند پاتا ہوں۔ ان کا خاص موضوع نسوانی دنیا رہا اس رنگ میں ان سے بڑھ کر لکھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔ علامہ حقیقت میں محسن نسواں تھے ان سے بڑھ کر آج تک کسی نے مظلوم عورت کے جذبات کی ترجمانی نہیں کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں سے عورتوں میں حوصلہ۔ عزم۔ جفاکشی۔ ضبط وتحمل۔ علم و عمل وشوہر پرستی کی تعلیم دی اخوت وہمدردی کے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد دلایا۔ میں اپنے دعوی کی دلیل میں اب علامہ کے مختلف افسانوں سے چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ افسانہ نگاری کی دنیا میں مصور غم کا مرتبہ کتنا عالی وارفع تھا۔

ایک بہت مختصر لیکن مکمل افسانہ ملاحظہ فرمایئے "دنیا کی بڑی جنت" کے عنوان سے مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کائنات کا مطالعہ کیا۔ میری نظر آبادی میں پہنچی میں نے دنیا کے گوناگوں رنگ دیکھے کہیں جنازے قبرستان جارہے تھے کسی جگہ براتیں ہشاش بشاش نکل رہی تھیں۔ میں نے عالیشان محل دیکھے۔ رنج دیکھا اضطراب دیکھا یہاں تک کہ وہ پوشیدہ گھر دیکھا جہاں دو میاں بیوی اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے......... یہ دنیا کی بڑی جنت تھی"۔ (قلب حزیں)

اچھے افسانہ کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ سب اس مختصر ترین افسانہ میں موجود ہیں۔ یہ دنیا کا افسانہ ہے دیکھنے میں مختصر لیکن ہر لحاظ سے مکمل اور شاہکار۔ جس بات کو سنبھالنے کے لئے ضخیم کتابیں بھی ناکام ثابت ہوتی ہیں اسی بات کو علامہ نے چند لفظوں میں سمجھا دیا۔ یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ دنیا کو جنت بنانے کا کوئی راز بتا دے اس مختصر افسانہ میں مصور غم نے رنج وخوشی۔ کا فلسفہ بھی بتایا اور اس کے ساتھ ہی میں وہ طریقہ بھی بتایا کہ ہم اپنی زندگی کو کس طرح سے بسر کر کے دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔

علم وعمل کی تحریک وتلقین کے لئے صرف پند وعظ کی خشک مجلسیں ہی موثر ثابت نہیں ہو سکتیں بلکہ ضرورت ہو کہ افسانوں اور کہانیوں کے پردہ میں کوئی اچھا سبق دیا جائے کونین کوئی خوشی سے کھانے کو تیار نہیں ہوتا لیکن ایسی کونین پر اگر چینی کا غلاف چڑھا دیا جائے تو کونین کھانے سے مریض منہ نہیں بناتا۔ علامہ ہماری ذہنیت سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے والے۔ نئی روشنی کے رسیا خشک وعظ سننے کو ہرگز تیار نہ ہوں گے چنانچہ انہوں نے خشک سے خشک موضوع کو اپنے افسانوں کے رنگ میں دلچسپ بنا دیا۔ "منازل ترقی" میں ایک مقام پر علامہ ایک ننگ اسلام جی حضوری نالائق اور ظالم مجسٹریٹ کے ظلم پر تنبیہ کرتے ہیں مجسٹریٹ کی خدا ترس نیک دل

ماں اپنے ظالم بیٹے سے کہتی ہے۔

"تجھے خبر ہے کہ اب ایک بے گناہ۔ بے وارثی اور بے مددگار عورت کا گھر تیرے حکم سے زبردستی چھینا جاتا ہے تجھے علم ہے۔ کہ تیرے ظلم نے ان یتیم بچوں پر ستم توڑ دیا جن کا وارث خدا کے سوا کوئی نہیں۔ میں واقف ہوں کہ زندگی کے فانی جلوؤں نے تیری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں باخبر ہوں کہ ترقی کی جھوٹی امیدوں نے تیرا ایمان غارت کر دیا شیطان تیرے سر پر۔ دنیا تیرے دل پر اور نفس تیرے وجود پر سوار ہے۔ لیکن ڈر اس انجام سے۔ لرز اس نتیجہ سے اور کانپ اس وقت سے جو آنکھیں دیکھیں گی دل اٹھائے گا اور جسم بھگتے گا۔ یہ مسرت کے سامان۔ یہ فرحت کے اسباب۔ یہ بلبل کا نغمہ۔ پھولوں کی کلیاں غور سے دیکھتا اور حقیقت کو ٹٹولتا تو فنا کا سبق اور عبرت کا درس تھیں۔ بلبل شاخ گل پر چہکی اور اڑ گئی۔ نغمہ ہوا میں گونجا اور ختم ہوا۔ کلی پھول بنی اور مرجھا گئی۔ باغ، باغ کا ہر ذرہ، درخت، درخت کا ہر پتہ۔ کائنات کا ہر جزو آنکھیں ہوتیں تو دکھا دیتا اور کان ہوتے تو سنا دیتا کہ ہر ہستی فانی اور ہر وجود مٹنے والا ہے۔ عزت اور ذلت۔ تمول افلاس۔ جاڑا اور برسات۔ دن اور رات ہر مرحلہ بے ثبات اور باقی رہنے والی صرف ایک ذات۔ تو کیا تیری حکومت کیا۔ بڑے بڑے جلیل القدر شہنشاہ کانوں آنکھوں والے۔ عزت حکومت والے اس در پر جھک گئے او بد نصیب ہستی توبہ کر اور غافل نہ ہو اس وقت سے جس کا نام موت ہے تو نے سنا اور میں نے سنایا کہ ایک مظلوم عورت۔ ایک بیوہ عورت ایک بدنصیب عورت نے تیری آنکھوں کے سامنے۔ تیرے مکان کے اندر تیرے دہلیز کے اوپر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیا۔ یہ وہ نام ہے جس کے اشارے پر تجھ جیسے ناہنجار کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اے ذلیل انسان کس بوتے پر تا پانی مسلمان ہو کر اسلام کی یہ وقعت!"

میں سچ کہتا ہوں کہ علامہ کے اس ادائے بیان کو ہندوستان کا شاید ہی کوئی افسانہ نگار پہنچا ہو۔ آپ کے افسانے اپنی انتہائی لطافت اور زور بیان کی وجہ سے بھی دنیائے افسانہ کے بہترین کارنامے ہیں۔ آپ کے افسانے کے ٹکڑے اپنی انتہائی نفاست کی وجہ سے بہت جلد زبان زد ہو جاتے ہیں ملک کے بعض مشہور افسانہ نگاروں اور انشا پردازوں نے علامہ کی قائم کردہ روش پر خامہ فرمائی کی مگر ناکامیاب رہے۔

شاعر ہو یا افسانہ نگار دونوں کی حیثیت رہنما اور رہبر سے کم نہیں اپنے ما فی الضمیر سے لوگوں کو خبردار کرنا اسکا فرض منصبی ہے۔ علامہ قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہ سچے مسلمان تھے ان کے دل پر ہر اس چیز کی عظمت تھی وقعت تھی قدر تھی جو قوم کو دوسری قوموں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ آج کل کے نئی روشنی والے جنھیں قدامت سے نفرت ہر جو اپنے بزرگوں کو "آثار الصنادید" کا لقب دئیے ہوئے ہیں جن کے نئے ہندوستان کی عظمتیں اور ان کی یادگاریں افسانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو بڑے بوڑھوں کی صرف اتنی قدر کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" وہ بزرگوں کو

یاد کرنا وقت کی بربادی اور قدامت پرستی کو فضول سمجھتے ہیں۔ علامہ کو ایسے ناخلف نوجوانوں کی حالت پر ہمیشہ افسوس رہا ایسے یورپ زدہ نوجوانوں کی روش کو مولانا نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جب مولانا نے دیکھا کہ مغربی تہذیب نے ہمارے افراد قوم کے دل و دماغ کو کچھ اس طرح مسخر کر لیا ہے کہ وہ قریب، قریب اسی رنگ ڈھنگ کے ہو گئے ہیں۔ غور و فکر کی قوت زائل کر چکے ہیں مغربی اصولوں کا ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر پڑا ہوا ہے کہ اب ہندوستانی نام بھی رکھنا نہیں چاہتے تو مولانا کا دل تڑپ اُٹھا۔ علامہ کا حساس بھرا دل بزرگوں کے کارناموں کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُنہوں نے بزرگوں کے ذکر کو افسانہ سمجھ کر نہیں بلکہ تاریخ کا ایک زرین ورق سمجھ کر پڑھا اور دوسروں کو سُنایا۔ جہاں بھی دلی غریب دلی اجاڑ دلی کا ذکر کیا ہے تو درد و اثر کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

"دلی کے مشہور قبرستان میں جہاں بزرگانِ دین دفن ہیں مولانا پہنچ جاتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں:۔

دل رو رہا تھا مگر آنکھ خاموش تھی۔ کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصروف کار تھا۔ مہندیوں کا وسیع میدان کو سونا زندہ انسان کا نشان نہیں دلی کا مشہور قبرستان ہے مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا مقتدر خاندان اسی سرزمین میں محو خواب ہو درگاہ میں داخل ہوا تو شکستہ آثار اور کالی کلوٹی دیواریں مسلمانوں کے احساس کی تفسیر کر رہی تھیں۔ ایک خاندان کے ان سات بزرگوں کی آرامگاہ مولانا شاہ ولی اللہؒ مولانا شاہ عبدالقادرؒ مولانا شاہ عبدالرحیمؒ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ مولانا شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاقؒ اور وہ محترم ماں جس کے پیٹ سے یہ لال پیدا ہوئے آج پردہ دنیا پر یگانہ روزگار ہیں نت سہیلیوں کا آسمانی گھاہرات ان کے مقدس نام چومتا ہوا نمودار ہوتا ہے ہوا ان کے کارناموں کو گنوا کر ان پھولوں کو چومتا اور درختوں کی سرسبز پتیوں نے ان کے مبارک مزاروں پر چڑھائے صاف کر رہی تھی"۔

میں دلی کا رہنے والا ہوں جوانی کی سیاہی اسی سرزمین پر بڑھاپے کی سفیدی سے بدلی۔ بارہا میتوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ کی غرض سے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے مگر آج تک اس چبوترے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی تاریخ جس وقت مملکت علوم کے ان تاجداروں اور مذہب اسلام کے ان خدمت گذاروں کی حکومت اور خدمت سامنے لاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے اور اقلیم سخن کے ان شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیر بن کر پڑ جاتا ہے تھرا جاتا ہوں اور دور سے اس جھنڈے کو سلام کرتا ہوا سلٹے پاؤں واپس ہوتا ہوں جو ان مبارک ہاتھوں نے اسلام کی حمایت میں گاڑا اور جو آج بھی اتنا مستحکم و استوار ہے کہ انقلاب زمانہ کی زبردست سے زبردست آندھی اس کو جگہ سے نہیں سرکا سکتی۔" (دہلی میں میلہ یا غدر کی ماری شہزادیاں)

"دلی اے دلی تیری خاک سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے اور تیرے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں فنون کے کیسے کیسے تاجدار دفن ہیں جن کی روشنی ایک دنیا کو جگمگا گئی"۔

(دہلی میں میلہ)

ہائے اب تو اس دلّی کی داستان سنانے والا مصوّرِ غم بھی ہمیں داغ مفارقت دے گیا اب ہمیں کون ہمارے بزرگوں کی داستان سُنا کر خود روئے گا اور ہمیں رولائے گا۔ اگر کوئی کچھ لکھنے کی کوشش بھی کرے تو وہ مصوّرِ غم کی زبان کہاں سے لائے مولانا کی موت فی الحقیقت ادب اُردو کی موت ہے!

مصوّرِ غم کا افسانہ لکھنے سے کبھی یہ مقصد نہیں رہا کہ لوگ طلسم ہوش ربا۔ امیر حمزہ نامہ وغیرہ کی طرح اپنی پامال شدہ عظمت کا ذکر سُن کر محوِ حیرت ہو جائیں۔ اور منم فلاں ابن فلاں کا نعرہ لگائیں بلکہ اُن کے افسانوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں ان قدیم کے قصوں کو اپنی نظروں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھیں۔ عبرت حاصل کریں اور انہیں دیکھ کر آنسوؤں کے عقیدت بھرے موتی ان پر نثار کریں انہوں نے مسلمانوں کے زرین کارنامے کچھ ایسے درد بھرے لفظوں میں لکھے ہیں انہیں پڑھ کر آنکھیں تو کیا دل بھی رونے لگتا ہے اور اسی لحاظ سے علامہ کو ادبی دنیا نے "مصوّرِ غم" کا خطاب دیا۔ آپ کے افسانوں کا ہر باب سوز و گداز سے بھرا ہوتا ہے۔ ایک مقام پر مصوّرِ غم کا قلم یوں اشکبار ہے۔

"میری وہ راتیں جو بیلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں شہزادیاں بھی قلعہ اور بادشاہ کو اتنا نہ روئی ہوں گی جتنا میں دلّی اور دلّی والوں کو رو رہا ہوں۔ عمر گذشتہ کی یاد بڑھاپے میں سوہان روح ہوتی ہے کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور جب جوانی کی بہاریں سامنے آتی ہیں تو گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں تیر بن کر دل میں گھستی ہیں مگر جس شخص کی جوانی بڑھاپے سے بدتر ہو جو پیدا ہوا تو روتا ہوا اور زندہ رہا تو روتا رہا قہقہے بھی آنسوؤں میں شرابور ہوں اور جس کی مسرت بھی افکار سے لبریز وہ روئے گا تو اپنے آنسوؤں پر اور بلبلائے گا تو اپنے آرام پر۔ زندگی کا وہ زمانی دور جو جوانی کے نام سے تعبیر ہوتا ہے مجھ پر بھی گذرا ہے فطرت انسانی کے اس اصول سے میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں مگر جوانی جب یاد آئی اُس کے پہلو میں ہمیشہ بچھڑی ہوئی صورتیں دیکھی ہیں۔ دلّی اور دلّی والے بیلے کے میلے میں جن گھروں کو رو رہے تھے وہ تو خیر رخصت ہو ہی چکے تھے ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک کر کے سب اُٹھ گئے۔ میں ان راتوں میں رونے والوں کا ہمنوا تھا آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا بھی نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملائے۔ (بیلہ میں میلہ)

ہائے کیا انقلاب ہے علامہ کو کیا معلوم تھا کہ ان کا یہ لکھنا "ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے" ان کے بعد پڑھنے والوں کو کتنا رُلائے گا۔ کبھی مصوّرِ غم "تنہا" تھے ان راتوں میں رونے والوں کے ہمنوا تھے مگر آہ اب دلّی اجڑ گئی اُردو ادب کا بادشاہ ہم سے جُدا ہو گیا۔ آج وہ بلبل ہزار داستان ہم میں مادی حیثیت سے موجود نہیں ہے جو مُردوں کے ذکر سے مٹی ہوئی زندگیوں کو زندہ کر رہا تھا آج بیلہ تو کیا بیلہ کا ذکر کرنے والا بھی ہم میں کوئی نہیں۔ پھر بھی جب تک ادبی دنیا زندہ ہے مصوّرِ غم کے افسانوں پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے رہیں گے۔

مولانا "فرشتہ بیوی" میں ایک مقام پر شاہجہان آباد کو یاد کرکے یوں روتے ہیں۔

ہائے شاہجہان آباد! تیری زمین وہی، تیرا آسمان وہی، مگر تیری حالت میں تغیر ہے! تیری صورت میں فرق ہے! کدھر مٹادیں اُس نے وہ صورتیں جن کی زندگی کو انسانیت نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ کہاں غارت کردئے تو نے وہ مکھڑے جن سے دم گفتار پھول جھڑتے۔ وہ سماں کہاں گیا وہ محفلیں کدھر مٹیں۔ آنکھیں دیکھتی ہیں اور روتی ہیں کہ جہاں پھول کھلتے تھے وہاں خاک اڑ رہی ہے اور جہاں بلبل چہکتے تھے وہاں اُلّو بول رہا ہے وقت ترقی کر رہا ہے اور زمانہ نئے نئے تماشے دکھا رہا ہے۔ دنیا نئی نئی تحقیقات پر نازاں اور تمدن طرح طرح کے انقلاب پر فخر کناں ہے۔ مرد میدان تعلیم میں سرپٹ دوڑ رہے ہیں عورتیں آزادی کی ہوا میں تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں لیکن اجازت دے اے خاک تیرا سرمہ بناؤں تجھے بوسہ دوں تجھے سجدہ کروں اس لئے کہ تیری آغوش میں وہ سپوت بھی پروان چڑھ چکے ہیں اور وہ بیویاں کھیل چکی ہیں جن کے نام سے آج تک دنیائے انسانیت زندہ ہے اور جن کے نام سے اب تک تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔" (نسوانی زندگی)

افسانہ نگار کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ جس زمانے، وقت یا مقام کا ذکر کرے اُس کی تصویر کھینچ دے مصور غم کے لئے یہ معمولی بات تھی کتنا حسرت انگیز ہے یہ جملہ کتنی عبرت آمیز ہے یہ تحریر کہ "جہاں بلبل چہکتے تھے وہاں الو بول رہا ہے.... مرد میدان تعلیم میں سرپٹ دوڑ رہے ہیں عورتیں آزادی کی ہوا میں تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں"۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے غلط ہے۔

مشرق کی تہذیب کے سامنے مولانا نے مغربی تہذیب کو کبھی نہیں سراہا "ستونتی" میں ایک مقام پر مولانا مشرق و مغرب قدامت اور نئی روشنی کا موازنہ کرتے ہیں۔ افضال ایک فیشن پرست، قدامت کا دشمن نئی روشنی کا دلدادہ بیرسٹر ہے اس کی محفل میں سوسائٹی میں" بڑھے ٹھڈوں، پرانے دہراؤں۔ دقیانوسی قل اعوذیوں گٹے بازوں اور ملا ڈاڑھیلا کی تضحیک دلچسپ مشغلہ ہے لیکن اس ہندی نژاد یورپ زدہ بیرسٹر کی بیوی منور پرانے خیال کی پابند صوم وصلوٰۃ شوہر پرست عورت ہے، مولانا اپنے جادو نگار قلم سے بیرسٹر صاحب اور ان کی بیوی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں

"وہ تمام معاشرہ جس کا افضال دشمن تھا منور کے یہاں موجود تھی وہاں ایک خوشنما غلاف میں ہار نیم یہاں زندگی کے جزدان میں کلام مجید وہاں چھی سی اچھی میز اور بہتر سے بہتر میز پوش یہاں خوبصورت سے خوبصورت چیز نماز کی چوکی اور جانماز وہاں موتیوں کی لڑی گلے میں یہاں تسبیح کے دانے ہاتھ میں۔ وہاں دن رات میں چار پانچ مرتبہ کھانا اور چائے یہاں ہر جمعرات کا روزہ وہاں زکوٰۃ گناہ اور خیرات حرام۔ یہاں ہر کھانے میں مسجد کا ملا اور خانقاہ کے طالب علم کا حصہ ضروری اور لازمی غرض اجتماع ضدین اور بُعد المشرقین تھا۔ افضال دن تھا تو منور رات۔ وہ سفید تھا تو سیاہ

اور وہ مغرب تھا تو یہ مشرق لیکن اس اختلاف اور تنفر اور رنجش و تکدر میں ایک عیب یا ہنر منور اپنی گھٹی میں ساتھ لائی جو اگر غلاظت تھا تو اسکی چھینٹیں اور جوہر تھا تو اس کی کرنیں تمام گھر پر پڑ رہی تھیں اس کا نام طاعت شوہر تھا اور اس حال میں بھی کہ کامیابی ہر سمت سے مسدود اور خود مردود ہو چکی تھی وہ اس کوشش میں ہمیشہ منہمک رہتی کہ آفضال کو خوش کر سکے ؛؛

(دستو نتی)

مشرق و مغرب کا موازنہ اس سے بڑھ کر شاید ہی کسی ناظم یا ناثر نے کیا ہو۔ افسانہ نگار کے لئے سخت ضرورت ہے کہ وہ لکچرار یا واعظ نہ بن جائے بلکہ اپنے افسانے میں ایسے واقعات دکھائے ایسی باتیں لکھے جن کا فیصلہ پڑھنے والا خود کرے افسانہ نگار کا فرض واقعات کا پیش کرنا ہے اور بس۔ اس معیار پر مصور غم افسانہ نگاروں کے اولین صف میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ اپنی طرف سے مغرب یا مشرق کی کچھ بھلائی یا برائی نہ کی لیکن پڑھنے والے کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اس وقت معمورۂ عالم میں جو قومیں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تمام ترقیاں صرف "مادیات" ہی تک منحصر ہیں۔ بقول لسان العصر حضرت اکبر رحمۃ اللہ علیہ

تمہیں دھوکہ میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے — وہاں سایہ حکومت کا ہے یاں غربت کا پردہ ہے

مصور غم محسن نسواں تھے وہ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ہی ان کی تربیت پر خاص طور سے زور دیتے تھے لیکن وہ اس تعلیم کے خلاف تھے جن سے لڑکیاں مذہب کو خیرباد کہکر پوری میم صاحب بن جائیں۔

افسانہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ چند لفظوں میں ایک داستان بیان کر دی جائے مولانا کے ہر افسانہ میں یہ صفت نمایاں ہے ان کے افسانے زیادہ تر ایسے ہیں جن کا تعلق شہری زندگی اور طبقۂ نسواں سے ہے انہوں نے اپنے افسانوں کے پلاٹ کے لئے عموماً مسلمان گھرانوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کی تہذیب و معاشرت کے نمونے افسانوں کی شکل میں پیش کئے اور ان افسانوں سے ایک ریفارمر یا مصلح کا کام لیا ہے۔

دلی اجڑ گئی اسلامی سلطنت ختم ہو گئی جنھوں نے کبھی حکومت کی تھی وہ اب ذلیل و خوار ہیں پھر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں آمدنی سے زیادہ ان کا خرچ ہے۔ دلی کے ایک بگڑے فضول خرچ شہزادہ کا عالم ملاحظہ فرمائیے۔

"قمر کا شوہر شہزادہ سلیم ان نامعقول شوہروں میں سے تھا جنھوں نے کمایا کبھی نہیں اور کھایا سب سے بہتر پندرہ روپے جو سرکار سے ملتے تھے وہی اس کی تنخواہ آمدنی یا کمائی تھی اور وہ بھی جس روز لاتا تھا تو اپنی دانست میں بیوی۔ بچوں پر اتنا زبردست احسان کرتا تھا جس کا معاوضہ ممکن ہی نہ تھا اس پر طرہ یہ تھا کہ شہزادہ پورے شہزادے تھے تنخواہ گھر تک آتے آتے چار پانچ روپے تو راستہ ہی میں ختم ہوتے تھے۔ کبھی آموں کا ٹوکرا بغل میں ہے تو کبھی خربوزوں کی جھلی سر پر۔ جاڑے ہیں تو منہ میٹھا کرنے کے لئے حلوہ سوہن اور گرمی ہے تو ایک آدھ شربت یا کیوڑے کی بوتل۔ یہ سب لاتے بیوی بچوں ہی کے واسطے تھے مگر بعض دفعہ ایسا

بھی ہوتا تھا کہ قمرا ور اس کے بچے منہ ہی تکتے رہے اور مرزا صاحب نے حلوہ سوہن ختم کر دیا۔"

(سیلاب اشک کا افسانہ "حج اکبر")

مولانا مصور غم تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے فطرت یا حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا آپ نے اتنی احتیاط وسلیقہ سے ہماری معاشرت کو اردو ادب میں اس طرح سے جذب کیا ہے کہ جس کی مثال نہیں سکتی۔ عہد حاضر میں اردو نثر میں جو انقلابات ہو رہے ہیں ان کو دیکھ کر ہم میں بعض خوش ہوتے ہیں اور بعض کڑھتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تمام نیا نئے نئے خیالات اور نئے نئے تجربات کے فکر میں ہے اور ایک نا معلوم لیکن موثر طریقہ پر ہمارا ذہن و دماغ ان سے متاثر ہو رہا ہے قدیم و جدید کے تصادم سے جو شعلہ اُٹھا ہے اس نے بہتوں کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں مگر مصور غم کا قلم کبھی نہیں بہکا وہ اپنی وضع کے پابند تھے جس مخصوص رنگ میں لکھنا شروع کیا اسی کو اخیر تک نباہ دیا ان کے افسانوں میں نہ تو "مرمریں کلائیاں تھیں نہ "مرتعش و سنگین ہونٹ" کے غیر مانوس" الہامات" بلکہ علامہ نے ہمیشہ سیدھے سادھے الفاظ میں انسانیت اور حقیقت کی ترجمانی کی اور الفاظ اور فقروں کے بجائے انہوں نے واقعات اور حالات کی ترتیب پر زور دیا زمانہ کے نشیب و فراز اور تلاطم حیات کے جزر و مد کو ملحوظ رکھا۔ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جو عین فطرت یا قرین قیاس وعقیدہ نہ ہو۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس موثر طریقہ سے اس انداز سے کہا کہ سننے والے اور پڑھنے والے کے دل پر خاص اثر پڑتا ہے۔

علامہ اپنے افسانوں کے پلاٹ اپنے کرداروں کے اعمال ان کی نقل و حرکت اور افسانے کی ترکیب میں نفسیاتی پہلو کو بے حد ضروری سمجھتے تھے نفسیات کا دوسرا نام فطرت سے مطابقت ہے چنانچہ مصور غم نے اپنے ہر افسانے میں خاص طور سے قوم کی ذہنی بے حسی کو دور کرنے کی "تلقین" کی ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر افسانے کی دلچسپی اور کیف میں کہیں کمی نہیں آئی جنگ طرابلس میں اٹلی نے مسلمانوں پر جو ظلم کئے اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے بھلا علامہ کے درد بھرے دل پر اس کا اثر کیوں نہ ہوتا ان کا تو اصول ہی تھا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آپ نے ہندی مسلمانوں کو مصیبت زدہ مظلوم طرابلسی مسلمانوں کے حال زار پر اپنے افسانوں کے ذریعہ سے توجہ دلائی۔ بقر عید کے علی الصباح ایک بدنصیب مسلمان عورت طرابلس کی ایک پہاڑی پر کھڑی ہے صورت مجسم صدمات کی تصویر ہے جاڑے کا موسم برف کے تودے چاروں طرف جمع ہیں مگر یہ بدنصیب جس کے پاس صرف پھٹا ہوا چیتھڑا بدن کے ڈھانکنے کے واسطے ہے سکڑی کھڑی ہے اور فریاد کر رہی ہے۔ مولانا اس کے جذبات کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں۔

" ہندوستانی مسلمانو! اس لئے اور صرف اسلئے کہ میں بھی تمہارے کلمے کی شریک ہوں اگر تمہارے لحاف اور توشکیں

اجازت دیں تو میری حالتِ زار دیکھو۔ بھائیو! برس کے برس دن ایک دور افتادہ بہن کی مبارکباد قبول کرو۔ اُس بہن کی جسکی ایک چھاتی سے خون اور دوسری سے دودھ کا دریا بہ رہا ہے۔ یہ دودھ ان بچوں کی یادگار ہے جو مہینوں اور برسوں میرے سینے پر لیٹے اور چھاتی پر لوٹے اور جو میدان طرابلس میں میرے حکم سے کلمۂ طیبہ کی حفاظت میں میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے۔ اپنے بچوں کو کلیجہ سے لگانے والی ماؤں اور شفقتِ پدری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلیجہ سے لپٹانے والے باپو۔ میرے کلیجہ کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو۔ چار بچے خون میں نہلا کر تمہارے سامنے آئی ہوں۔ زخمی چھاتی انہیں، کلیجہ کے ٹکڑوں پر دودھ بہا رہی ہے جن کے دم سے زندگی کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اولاد والے بہن بھائیوں تمہارے بچے زندہ اور تمہاری مامتا ٹھنڈی رہے میرے پھول بھی تمہاری طرح نو نو مہینے میرے پیٹ میں رہے ہیں میں نے بھی خونِ جگر پلا کر بڑا کیا تھا عمر بھر کی کمائی یہی چار لال تھے جن کی لاشیں بے کفن پڑی ہوئی ہیں۔ ظالموں نے مرتی دفعہ مجھے کملائے ہوئے چہرے بھی دیکھنے نہ دیئے!

(شہید مغرب۔ طرابلس سے ایک صدا)

الفاظ نہیں تیر ہیں نشتر ہیں جو سینے کو چھید کے ڈالتے ہیں کون ایسا سنگدل ہوگا جو طرابلسی عورت کی فریاد کو مصورِ غم کی زبان سے سُنکر تڑپ نہ اُٹھیگا۔ الفاظ کی شُستگی اور زورِ بیان نے فریاد میں جان ڈال دی ہے۔

علامہ کی افسانہ نگاری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ نے عورتوں کی زبان ہی میں عورتوں کی مظلومیت کے افسانے لکھے خود روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اس صنفت میں علامہ کا کوئی دوسرا حریف نہیں۔ آپ کی ساری زندگی نسوانی دنیا کی خیر خواہی ہی میں گذری آپ نے اس مظلوم ہستی کی بہبودی اور مرتبہ بلند کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی آپ اپنے افسانوں میں مردوں کو عورتوں کے متعلق ہمیشہ یہی پیام دیتے رہے کہ" وہ تمہارا لباس ہیں۔ اور تم اُن کا لباس ہو"۔

زمانہ جاہلیت میں مرد اپنی لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کردیتے تھے۔ ہمارے آقا و مولا سردار عالم فخر دو جہاں سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دختر کشی کی رسم کو موقوف کرادی مگر ہماری بدقسمتی سے اسلامی تعلیمات سے غفلت برتنے کی وجہ سے اس زمانے میں بھی ایسے ظالم باپوں کی کمی نہیں جو لڑکیوں کو زمین میں زندہ تو دفن نہیں کرتے مگر ان کے ساتھ انتہائی ذلت کا سلوک کرتے ہیں۔ اسلام نے تو جائداد میں لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے مگر ظالم باپ اور خود غرض بھائی لڑکیوں کو اس سے محروم کردیتے ہیں۔ محروم وراثت رکھنے کے لئے لڑکیوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جاتا ہے اسلام میں عورت و مرد کا ایک ہی مرتبہ ہے لیکن بدقسمتی سے اس قوم کے اکثر افراد لڑکیوں کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن لڑکے کی پیدائش پر جشن مناتے ہیں۔ علامہ افسانہ نگار کے پردہ میں معلم قوم تھے وہ لڑکیوں پر ظلم و ستم کیسے دیکھ سکتے تھے چنانچہ اسی موضوع پر انہوں نے ایک دردانگیز

افسانہ "موؤدہ" لکھا جس کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی ظالم مرد کی نظر سے یہ افسانہ گذر جائے تو اس کا دل موم ہو جائے گا اور وہ لڑکیوں پر کبھی ظلم نہ کرے گا اگر اس افسانے کو پڑھنے کے بعد بھی کوئی مرد اپنی لڑکی کو محروم وراثت رکھے تو وہ انسان ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ "موؤدہ" میں ایک ایسے ہی ظالم باپ کا بیان ہے۔ جب اس کو پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا یہ عالم ہوا۔

"ظالم باپ موؤدحسن کو جب پتہ چلا کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو یہ یقین ایک بلا تھی ایک مصیبت تھی ایک آفت تھی غصہ کے مارے چہرہ سُرخ، آنکھیں لال۔ بدن میں لرزہ اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ منہ سے کف اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ ٹہلتا اور سانپ کی طرح سر دُھنتا رہا کئی دفعہ قصد کیا کہ لڑکی کو اُٹھا کر زمین پر دے پٹکے یا گلا گھونٹ دے مگر جانتا تھا کہ خبر چھپنے والی اور بات دبنے والی نہیں۔ سزا یقینی اور نتیجہ ظاہر"

ظالم باپ نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ لڑکی کو صرف اتنا کھانے کو دیا جائے کہ وہ صرف اپنا پیٹ بھر سکے وہوتر کا کرتہ اور گاڑھے کا پجامہ پہنا کر زمین پر ٹیخ دو کہ کسی طرح گھر اس مصیبت سے محفوظ اور خاندان اس آفت سے پناہ میں رہے۔

ماںتا کی ماری ماں اپنے ظالم شوہر کا حکم سُن کر سناٹے میں آ جاتی ہے مگر اف نہیں کرتی۔ مگر جس کو خدا نہ مارے اسے کون مار سکتا ہے معصوم موؤدہ ظلم و ستم سہتی ہوئی بھی تندرست و زندہ رہی لیکن ۔

"جوں جوں بچی کی عمر ترقی کر رہی تھی باپ کی نفرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور اب اس کو یہ یقین ہو رہا تھا کہ ناشدنی موؤدہ جیئے گی مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری مصیبت یہ تھی کہ اس کی (باپ) نفرت سے زیادہ موؤدہ کی رغبت باپ کی طرف بڑھ رہی تھی ہر چند ماں احتیاط کرتی تھی کہ یہ سامنے نہ جائے مگر اس فتنی کا یہ حال تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں قدم رکھا اور اُس نے ابا! ابا! کہہ کر چیخنا شروع کیا۔ مجبوراً محسنہ (موؤدہ کی ماں) کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ باپ کے داخل ہوتے ہی ایک ماما اُس کو روتا دھوتا زبردستی گود میں لے سامنے سے ہٹ جاتی"

ظالم باپ کے لئے مصورِ غم۔ خالق جذبات کا یہ فقرہ کہ "مگر اس فتنی کا یہ عالم تھا کہ جہاں باپ نے گھر میں قدم رکھا اور اس نے ابا! ابا! کہہ کر چیخنا شروع کیا" بذات خود ایک مکمل افسانہ ہے جس کی تشریح نہیں کی جا سکتی مولانا نے بچی کی معصومیت اور محبت کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ مستغنی از داد ہے۔ کتنی سچی۔ کتنی پیاری اور کتنی سادی تصویر ہے ایسی تصویر کھینچنا کسی معمولی مصور کا کام نہیں ہے۔

موؤدہ کا ہر باب مظلومیت اور بیکسی کا مرقع ہے یہاں پر گنجائش نہیں کہ مفصل لکھا جائے افسانہ کی خوبی پوری کتاب پڑھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ میں اس افسانہ کے چند سین کہیں کہیں سے اور دکھائے دیتا ہوں تا کہ میرے دعویٰ کی تصدیق ہو جائے۔

جب مصیبتیں سہ کر موؤدہ جوان ہوئی تو اس کو حکم ملا کہ وہ بھولے سے بھی باپ کے سامنے جانے کی جرأت نہ کرے باپ اس کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ ایک طرف موؤدہ خادماؤں سے بھی بدتر حالت میں رکھی جاتی تھی اور اسی گھر میں اس کے بھائی شہزادے بنے رہتے تھے لڑکپن میں بھائیوں کو بہن سے کچھ کچھ ہمدردی تھی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو علاقہ کی تقسیم اور باپ کے خیالات کا اثر بھائیوں پر پڑا اور وہ بھی بہن سے فرنٹ ہو گئے۔ ایک مرتبہ ظالم باپ پر فالج کا حملہ ہوا اور حالت نازک ہو گئی تیسرا دن اور شام کا وقت تھا بڑا لڑکا (جو باپ کا لاڈلا اور جائداد کا وارث تھا) نہا دھو کر کپڑے پہن ہوا خوری کو جاتے وقت کھڑے کھڑے بیمار باپ کو بھی دیکھنے آیا۔ باپ کی حالت نازک تھی وہ بہت مشکل سے ایک آدھ بات کر سکتا تھا اشارے سے بیٹے کو بلایا اور اشارہ ہی سے کہا کہ تیل کے مالش کی ضرورت ہے۔ لاڈلا بیٹا بھلا باپ کی اس ضرورت کی کیا پروا کرتا۔ ہوا خوری کا وقت تھا سیر سپاٹے کے دن جانے کو دیر ہو رہی تھی ایک ایک لمحہ گھنٹہ تھا "بہت اچھا" کہکر اٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا۔

لاڈلے بیٹے کا بیمار باپ کے ساتھ سلوک دیکھ لیا اب ذرا اس بیکس مظلوم بیٹی موؤدہ کا بھی برتاؤ دیکھئے۔ وہ بیٹی جس کی صورت سے بھی باپ کو نفرت تھی جو اس کی جان کا دشمن تھا اسی بیٹی کی محبت کی کتنی دلگداز تصویر مصور غم نے کھینچی ہے۔

"جس دن سے باپ بیمار ہوا موؤدہ ہر نماز کے بعد بلبلا بلبلا کر اس کی تندرستی کی دعائیں مانگتی اس نے باپ کی بہار تو کیا پیار بھی نہ دیکھا تھا مگر ذاتی جوش تھا کہ پردے کے پاس کھڑی دور سے بلائیں لیتی اور نثار ہوتی۔ باپ کی ضرورت اور بھائی کی لاپرواہی اس نے اپنی آنکھ سے دیکھی اور کان سے سنی تڑپ گئی مگر مجبور تھی کہ سامنے جانے کا حکم نہ تھا محسنہ (ماں) معذور تھی (بیمار تھی) اس کا ایک ہاتھ بالکل بیکار تھا شام سے رات ہوئی اور رات بھی آدھی موؤدہ ڈرتے ڈرتے باپ کے کمرہ میں داخل ہوئی روشنی دھیمی کی اور تیل کی شیشی اٹھا آہستہ سے اس کی پائنتی کے پاس بیٹھی اس خیال سے کہ صورت دیکھ کر باپ کو اذیت نہ ہو اس کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا اس نے اپنی گردن گھٹنوں میں دے کر منہ چھپا لیا اور مالش شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ گھر کے تمام آدمی نیند کی لپیٹ میں بیہوش تھے اور صرف ایک بدنصیب ہستی موؤدہ اپنی جان کے دشمن حقیقی باپ کی خدمت میں مصروف تھی گرمی سخت تھی اس کے موٹے کھدی کپڑے پسینے میں شور بہ شور تھے اور جب باپ کی لونڈیاں تک ململ اور لٹھے سے گھبرا رہی تھیں وہ گاڑھے میں خاموش تھی۔ پٹھوں اور رگوں میں گرم تیل کی حرارت پہنچی تو موؤدہ (باپ) کی آنکھ کھلی پہلے سمجھا محسنہ (بیوی) ہے مگر گزی کے کرتہ نے اس خیال کو بدل کر اس کی محبت کا پتہ دیا جس کی جان کا دشمن تھا تیمارداری کی رات کا باقی حصہ مریض کی طرح آنکھوں میں کٹا یہاں تک کہ نماز فجر کی آواز کان میں آئی تو باپ نے دیکھا کہ بچی نے گڑگڑا کر باپ کی صحت کے واسطے ہاتھ اٹھائے آنسو جاری تھے اس کے قدموں پر آنکھیں ملیں اور الٹی ٹانگ کو جو بے حس تھی بوسہ دے کر کھڑی ہوئی اور اس خیال سے کہ کہیں باپ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ میری صورت دیکھ لے ہوئے ہوئے آگے بڑھی اور باہر چلی گئی"

متواتر سات راتیں اسی طرح گذریں دوسری رات سے بیمار ماں بھی بیٹی کو دعا دیتی رہی اور دونوں ماں بیٹیوں نے پلک سے پلک نہ جھپکائی ماں آگ اور رواڑ دیتی اور مودودہ مالش کرتی"۔

آہ مصورِ غم خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آپ نے جذبات نگاری کی حد کردی تھا ظالم سے ظالم باپ بھی ہوگا تو آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر خون کے آنسو بہائے گا مظلوم بیٹی کی معصومیت اور محبت کا ایسا پر اثر منظر دکھانا مصورِ غم ہی کا حصّہ تھا۔

باپ کو جب کچھ صحت ہوئی تو بجائے اس کے کہ مودودہ پر نظر رحم کرتا اس کی نفرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ماں بھی ظالم باپ کے ہم خیال تھی۔ نہیں ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو علامہ کی افسانہ نگاری پر حرف آتا۔ ماں غریب بیٹی کے رنج و غم میں ہی یہ کہتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوگئی۔

"مسلمان بچی مسلمان باپ کے مال میں ایک پیسہ کی حقدار نہیں"

مودودہ کا کیا حشر ہوا اور آخر میں جب باپ اور بھائی جیل جانے والے تھے اس نے کس طرح رہائی دلائی یہ پورا افسانہ پڑھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ افسانہ ہر مسلمان باپ کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ مولانا کی افسانہ نگاری کا رنگ اس میں خاص طور سے نمایاں ہے۔

علامہ کے افسانوں پر یہ مضمون لکھتے ہوئے سب سے بڑی دقت جو مجھے پیش آئی وہ یہ تھی کہ میں نے جس افسانہ کو دیکھا ایک سے ایک بڑھ کر پایا اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید علیہ الرحمۃ نے مسلمان لڑکوں کو سدھارنے کی کوشش کی تو علامہ نے مظلوم طبقہ نسواں کا ساتھ دیا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ سے خواتین کو علمی و ادبی شوق کی ترغیب دی آپ کا شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں کسی نہ کسی پہلو سے طبقہ نسواں کی وکالت نہ کی گئی ہو اور ان کے حال زار پر آنسو نہ بہایا ہو چنانچہ آپ کی افسانہ نگاری نے طبقہ نسواں پر جو سلوک کیا ہے وہ فراموش نہیں کیا جاسکتا خواتین اپنے اس محسنِ اعظم کو کبھی نہیں بھول سکتیں۔ یہ آپ کے افسانوں کی ادنیٰ صفت ہے کہ عورت و مرد یکساں لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے بھی علامہ کے افسانے یکساں مفید ہیں ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ علامہ کے افسانے زنانہ و مردانہ اسکولوں کے نصاب میں داخل کئے جائیں۔ عورت محبت چاہتی ہے یا دولت اس کا پتہ چلانا ہو تو مولانا کے افسانوں کا مجموعہ "جوہرِ عصمت" ملاحظہ کیجئے۔ عورت کی محبت کی قیمت روپیہ پیسہ کی صورت میں جو لوگ ادا کرنا چاہتے ہیں وہ عورت کا دل اور اس کی قیمت ہرگز حاصل نہیں کرسکتے ہاں اس کا گوشت پوست خرید سکتے ہیں جس کا ثبوت مالدار بڈھوں کی کم عمر اور جوان لڑکیوں کی شادیوں سے مل سکتا ہے۔

مگر جہاں سچی محبت ہوتی ہے مرد و عورت کی محبت ہوتی ہے وہاں روپے پیسے کا سوال نہیں آتا مگر خود غرض مرد عورت کو محبت کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے روپے پیسے اور زیور ہی کا لالچ دیتے ہیں جو عورت اس لالچ میں آجاتی ہے اس کی زندگی تباہ ہوجاتی ہے لیکن جس نے پیسہ کو ٹھکرا دیا اس نے اپنی عاقبت بنالی اگر عورت کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کی محبت کی قیمت روپے

کی صورت میں ادا کی جانے والی ہے تو یہ خیال ہے اس کے لئے موت کا پیام بن جاتا ہے علامہ ہمدرد نسواں تھے نسوانی دنیا کے سچے خیر خواہ وکیل تھے آپ نے اپنے افسانوں میں جا بجا عورت کی سچی حمیت کے جلوے اور مردوں کی اس حماقت کا جو عورتوں کو دولت کا غلام سمجھتے ہیں جابجا مضحکہ اڑایا ہے عصمت عورت کا سب سے بیش قیمت زیور ہے اس زیور کے سامنے وہ دنیا کی دولت کو بھی ٹھکرا دیتی ہے وہ اپنی عصمت کی حفاظت پر اپنی جان پر کھیل جاتی ہے" جوہر عصمت کا ایک سین ملاحظہ کیجئے۔

"سرزمین اکبر آباد اور ایک کچی دیواروں کا ٹوٹا سا گھر۔ دو ماں بیٹیاں اپنے اپنے کام دھندوں میں لگی ہوئی ہیں لڑکی کے کپڑے میلے چکٹ ہیں۔ کرتے میں پیوند۔ ڈوپٹہ میں کھونپ۔ ہاتھ میں سوئی۔ گھٹنوں پر کپڑا ہے خبر بیٹھی سی رہی ہیں...... چشم بینا غور و تامل کی اعانت سے اس ظاہری کثافت کی تہ میں نفاست کے خزانے پوشیدہ دیکھ رہی ہے اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان عارضی زیور سے لدے ہوئے نہ ہوں مگر اس کا ایمان لازوال دولت سے مالا مال ہے عفت و عصمت کا بیش بہا زیور اس کے چہرہ کو جگمگا رہا ہے اور گو عسرت و افلاس کی انتہا ہے لیکن جوہر شرافت پر بیش بہا جواہرات قربان ہو رہے ہیں"

نیچرل افسانہ نگاری اسی کو کہتے ہیں کہ جس کا ذکر کیا جائے اس کی ہو بہو تصویر کھینچ جائے مصور غم کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی ان کے افسانوں میں قدرتی مناظر کی نہایت دلکش تقریریں ہیں۔ (جوہر عصمت جہانگیری عدل)

غربت و افلاس کی تصویر دکھا کر مولانا ایک اور منظر دکھاتے ہیں سعد اللہ خاں کوتوال شہر کی طرف سے ہزاروں اشرفیوں کے تحفے لے کر ایک دلالہ اس غربت و افلاس کے گھر میں پہنچ کر کوتوال کی دولت و حکومت کا ذکر کر کے لڑکی کو شادی کا پیام دیتی ہے۔ شادی کا پیام سنتے ہی۔

"لڑکی کے تیور بدل گئے ناتجربہ کاری نے آتش غیرت بھڑکا دی اس سنگین عمارت کی بنیاد جو قصر عصمت سے تعمیر تھا ایسے صناع کے ہاتھوں نہ چنی گئی تھی کہ زرد دولت کی جھڑیاں متزلزل کر دیتیں۔ یہ بنیاد افغانی خون اور سادات کے گارے سے پیوستہ تھی تھرا اٹھی ...."

دلالہ کو ماں بیٹیوں نے دھتکار دیا لیکن وہ پھر دوبارہ پہنچی اور لڑکی کو دولت کا لالچ دیا تو...... پٹھانی کو تاب نہ رہی۔ حمیت کی آگ پر کباب کی طرح بھن رہی تھی بید کی مانند تھر تھر کانپنے لگی منہ سے کف جاری ہو گئے آنکھوں میں خون اتر آیا نشتر افلاس نے زخم عصمت پر کچوکے دئیے ہوش و حواس کی قربانی کا وقت تھا (لڑکی جوش غضب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ) بڑھیا اسکی ماں آگے بڑھی تجربہ نے دنیا کے نشیب و فراز دکھا دئیے تھے اور عمر کی منزلوں نے حاکم و محکوم کا رشتہ بتا دیا تھا وقت نازک تھا اور موقع خطرناک۔ خاندانی جواہر ریزے خاک میں مل رہے تھے اور ایک بچی بچائی دولت جس کو مدتوں سے کلیجہ سے لگا رکھا تھا آج وہ بھی زبان مشاطہ کے ڈاکو چھین رہے تھے پھر بھی صبر کے قدموں سے سامنے آئی اور دور اندیشی کی زبان سے کہا۔

"بی بی دلالہ، ہم غریب ہیں فقیر ہیں ہم کو نہ ستاؤ۔ کوتوال صاحب کی دولت ان کو مبارک ہو ہم سوکھے ٹکڑوں میں

ہیں خوش اور فاقوں میں رہنے والے لوگ اس زر و جواہر کی قدر کیا جانیں۔ ہماری تقدیر ایسی نہیں ہے ہم کو تو یہ میلے کچیلے کپڑے لہسن کی چٹنی اور پیاز کی گٹھیاں زربفت و کمخواب ہیں۔ خدا کا واسطہ ہم پر رحم کرو۔ اور کوتوال صاحب سے کہہ دو کہ رعیت کی بہو بیٹیاں اپنی ہی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔" (جہانگیری عدل)

عصمت و پاکیزگی۔ دولت اور افلاس۔ خودداری اور نسوانی شان کی کتنی مکمل مصوری کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے افسانوں پر مفصل مضمون کے لئے رسالے کے چند صفحات بالکل ناکافی ہیں۔ مولانا کے افسانوں کا ایک ایک فقرہ خود مکمل افسانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر صفحے کے صفحے لکھے جائیں پھر بھی مکمل خوبیاں نہیں پیش کی جاسکتیں مصورِ غم ایک خاص رنگ ایک خاص طرز کے موجد تھے ان کا رنگ ان کے ساتھ گیا اب تو آج کل بدقسمتی سے بزبان مولانا رح

"ادب کے قابل قدر جرائد حسن فروشوں کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ کہیں انگلیوں کی تھرتھراہٹ ہے کہیں کلائی کی کپکپاہٹ۔ کوئی گردن کی مٹک پر فریفتہ ہے کوئی کمر کی لچک پر۔" (جوہر عصمت)

مصورِ غم کے افسانوں کا دامن مخرب اخلاق مضامین سے ہمیشہ پاک رہا ہے اگر کسی کے افسانوں کی مقبولیت کی یہی پہچان ہوسکتی ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کی خوب شہرت اور اشاعت ہو تو اس لحاظ سے بھی مولانا کا ہر افسانہ ایک نہیں کئی کئی بار شائع ہوا ہے اور مجموعی حیثیت سے کتابی صورت میں بھی انکے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اس لحاظ سے بھی ہندوستان کے بہت کم افسانہ نگاروں کے افسانے اتنے مقبول خاص و عام ہوئے ہوں گے۔

سوسائٹی اپنے نظام سے عورت کے حقوق کی نگراں سمجھی جاتی ہے وہ عورت کے حقوق کی محافظ ہے ذمہ دار ہے مگر افسوس ہے کہ اس بہانے سے سوسائٹی نے سماج نے عورتوں پر وہ ظلم ڈھائے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ علامہ نے اپنے افسانوں میں سوسائٹی کے ان مظالم کو جو لڑکیوں پر۔ بیویوں پر۔ بیواؤں پر۔ سوتیلی اولاد پر۔ غرضیکہ نسوانی دنیا پر روا رکھے جاتے ہیں خاص طور سے بے نقاب کیا ہے۔ آپ کے افسانوں میں سوسائٹی کے مظالم۔ اس کی کمزوریاں اور اصلاح طلب باتیں ایسے موثر اور دلنشیں طریقہ سے بیان کی گئیں جن کی تعریف اس مختصر سے مضمون میں ناممکن ہے میں نے مصورِ غم کے افسانوں کے جو چند اقتباسات دئے ہیں ان سے میرے قول کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

علامہ کے افسانوں کا ایک دلچسپ اور قابل تعریف پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں بازاری اور مخرب اخلاق افسانوں کے خلاف عورت کی ظاہری و مادی نہیں بلکہ اس کے روحانی حسن کو سراہا گیا ہے اور اس طرح سے مولانا نے ادب اردو میں عورت کو ایک خاص حیثیت عطا کردی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے علامہ کے افسانوں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور اس کے ثبوت میں افسانوں کے کچھ اقتباسات بھی دیدئے ہیں مگر میں نے ان کی زبان پر خاص طور پر کچھ نہیں لکھا اس کے متعلق مختصر طور پر میرا اتنا لکھنا کافی ہے کہ اردو ان کے گھر کی لونڈی تھی وہ اس دہلی کے رہنے والے تھے جس کے شرفا (پردیسی نہیں بلکہ قدیم باشندوں) کی زبان

اس گئے گذرے زمانے میں بھی مستند مانی جاتی ہے اور جس کے متعلق مشہور شاعر نسیم دہلوی نے بالکل بجا کہا ہے۔

نسیم دہلوی ہم موجدِ باب فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

علامہ کی شیریں زبانی کا کچھ اندازہ آپ ان اقتباسات سے بھی کر سکتے ہیں جو میں نے اس مضمون میں پیش کئے ہیں۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ کہ مولانا نے افسانہ نگاری میں کیا غلطیاں کیں اس کے متعلق عرض ہے کہ بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کانٹوں سے بچ کر پھول چُن لیتا ہوں اور کانٹے چشم حاسد کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ علامہ کے افسانوں پر تنقید و تبصرہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ طبقۂ نسوان کے محسن اعظم مصورِ غم علامہ راشد الخیری رح کی یاد میں میری نذر عقیدت سمجھئے اور بس۔ گو آج علامہ اس دنیا میں موجود نہیں۔ موت نے آپ کو ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے مگر ان کی پھونکی ہوئی روح ہمارے اندر اپنا کام ہمیشہ کرتی رہے گی اور یہی ان کی افسانہ نگاری کا کمال ہے معراج ہے علامہ نے اپنے جادو نگار قلم سے وہ وہ گُل کھلائے ہیں جن سے ادبی دنیا کا باغ ہمیشہ ہمیشہ معطر رہے گا۔

علامہ راشد الخیری کی ملاقاتیں

(از نواب ڈاکٹر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات تین مرتبہ ہوئی یوں تو مدت دراز سے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین پڑھنے کا اتفاق رہا تھا لیکن ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں نیاز حاصل ہوا جب وہ میرے والد محترم حاجی محمد موسیٰ خانصاحب سے ملنے کے لئے ہماری کوٹھی مشرف منزل علیگڈھ تشریف لائے تھے حسن اتفاق سے بسلسلۂ تعطیلات میں بھی حیدر آباد سے جناب والد ماجد کی قدمبوسی کے لئے آیا ہوا تھا مجھے یاد ہے کہ مغرب سے ذرا پہلے کا وقت تھا کہ علامہ رح مولوی سمیع اللہ خانصاحب کیل کے ساتھ تشریف لائے علامہ موصوف سے تقریباً دو گھنٹہ باتیں رہیں اور ان کی گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ انکے دل میں ملک اور قوم کا صحیح جذبہ موجود ہے اور انکی عین خواہش ہی ہماری معاشرت کی حقیقی بنیاد یعنی صنف نازک کی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ملک اور قوم کی ترقی ہو۔ دوسری اور تیسری مرتبہ اسوقت ملاقات ہوئی جب ۱۹۳۰ء میں علامہ موصوف حیدر آباد تشریف لیگئے تھے پہلی مرتبہ وہ میرے محب نواب ناظر یار جنگ بہادر کے یہاں ملے، اور تقریباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ تک اپنے چہیتے ادارے تربیت گاہ بنات کے انتظامات کی تشریح فرماتے رہے اسکے بعد میں نے اپنے یہاں تشریف لانیکی انہیں تکلیف دی اور اس مرتبہ بھی مسئلہ زیر بحث مسلمان بیبیوں کی معاشرتی سطح کو بلند کرنیکے ذرائع کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو نہ تھا علامہ موصوف ان نادر ہستیوں میں سے تھے جو محض زبانی جمع خرچ کی بجائے کر کے دکھا دیتے تھے۔ ہماری قوم کی یہ بد نصیبی ہے کہ ایسے افراد چل بستے ہیں اور اپنا حقیقی نعم البدل نہیں چھوڑتے۔ دوسرے ممالک اور دوسری قوموں میں ایک جاتا ہے اور اسکی جگہ دس آتے ہیں۔ ہمارے یہاں کسی شعبہ زندگی کو لیجئے، جو ممتاز ہستی چلی گئی اس کی جگہ خالی رہ گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مجھے اس بات سے اطمینان ہے کہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے مولانا رازق نے بیڑا اُٹھایا ہے کہ اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کے کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچائیں گے خداوند تعالیٰ ان کے اس عزم میں کامیابی عطا فرمائے۔

بجا ہے جو بھی ہو ماتم مصورِ غم کا

۱۹۳۶ء

از حضرت ابو الاعجاز - ازل - لاہور

(۱)
نہ چھیڑ ذکر تو ہمدم - مصورِ غم کا ہے کون جس کو نہیں غم - مصورِ غم کا
کریں نہ کس لئے ماتم - مصورِ غم کا لکھیں نہ مرثیہ کیوں ہم - مصورِ غم کا
کہ نوحہ خواں ہے اک عالم - مصورِ غم کا

(۲)
وہ نثر لکھنے میں اک طرزِ خاص کا بانی جو کھینچ دیتا تھا تصویر ہو بہو غم کی
دیارِ ہند میں شہرت ہے چار سو جس کی ادیب اردو زباں اس سا اب کہاں کوئی
ہو جس قدر بھی ہے کم غم - مصورِ غم کا

(۳)
وہ گرچہ پیر تھا ہمت مگر تھی اس کی جواں چلایا اس نے رسالہ کو جھیل کر کڑیاں
ہو کس زبان سے عصمت کی خوبیوں کا بیاں پئے ترقی و اصلاحِ فرقۂ نسواں
اگر تھا وقف تو بس دم - مصورِ غم کا

(۴)
زبوں نہ اور بھی ہو جائے اُن کی حالتِ زار ہمیں نہ ہر گھڑی تڑپائے ان کی حالتِ زار
نظر نہ پھر کبھی یہ آئے اُن کی حالتِ زار ہو جس طرح بھی سدھر جائے ان کی حالتِ زار
یہی تقاضہ تھا ہر دم - مصورِ غم کا

(۵)
بھلے کو ان کے ہی لکھی کتاب جو لکھی ہمیشہ مدِ نظر ان کی ہی فلاح رہی
نہ خرچ کرنے کی پروا نہ فکر صحت کی گذار دی اسی خدمت میں نصف عمر اپنی
کرم یہ ہم پہ نہیں کم - مصورِ غم کا

(۶)
کسی طرح بھی نہ کٹتی مصیبتِ نسواں کسی طرح بھی نہ ٹلتی نحوستِ نسواں
بدلتے لاکھ - بدلتی نہ حالتِ نسواں کبھی بھی بھرتا نہ زخمِ جہالتِ نسواں
نہ ملتا گر اُسے مرہم - مصورِ غم کا

(۷)
ہمیشہ ہوتی تھی راشد کی گفتگو معقول وہ باتیں کرتا تو جھڑتے تھے منہ سے گویا پھول
وہ اُس کی صورتِ زیبا وہ اُس کے پاک اصول وہ صاف گوئی وہ خوفِ خدا وہ حبِ رسول
وہ زہد و تقوے میں عالم - مصورِ غم کا

(۸)
رہیں گے ہند میں گو علم و فضل کے چرچے پھر اُس سا لائق و فائق مگر نہ دیکھیں گے
جہاں میں ہوتے ہیں انسان پیدا کب ایسے لہو نہ کس لئے روئے خیال کر کر کے
ہمارا دیدۂ پر نم - مصورِ غم کا

(۹)
غم و الم کے نہ چھا جائیں دل پہ کیوں بادل بسانِ برق رہے جاں کیوں نہ پھر بے کل
نہ آئیں آنکھوں سے کیوں اشک بار بار نکل پھر ایسی روح کو آنا ہے کب جہاں میں ازل
بجا ہے جو بھی ہو ماتم - مصورِ غم کا

۱۹۳۶ء

مرسلہ بیگم ازل

"سیدہ کا لال" علامہ راشد الخیری کی نظر میں

(از فصیح اعظم پروفیسر مولانا السید محمد صاحب زیدی)

جذبات حیوانیت کی رو میں نغمات غم بھر لانے والا اور بہیمیت کو آٹھ آٹھ آنسو رلا کر فطرت سلیمہ کے قدموں پر جھکا دینے والا، ساز تعیش میں مستور درد پیدا کرنے والا، دولت کی فراوانیوں میں صاحبان حقوق کو حقوق یاد دلانے والا کون تھا وہ۔ جو دہلی میں پیدا ہوا اور یہیں سپرد خاک ہو گیا (منہا خلقنکم و فیہا نعیدکم) جس نے پانی کے آنسوؤں میں خون کا رنگ دوڑایا۔ دل کو پگلا کر غم کے موتی بنائے، جذبات کو تخیل کا لباس پہنا کر عالم میں شہود میں دکھایا وہ کون تھا، وہ جس نے آنسوؤں کے موتی لٹا کر جہان آباد کا نام رکھ لیا، دنیا سے مصور غم کا خطاب لیکر جزیہ ادب وصول کیا اور ان من البیان لسحرا۔ پر مہر تصدیق لگا دی۔ طوفان آیا اور رک گیا۔ دریاؤں کے دھارے بدل گئے۔ محیط میں خشکیاں ابھر آئیں، لہروں میں سکون پیدا ہو گیا۔ مگر جن آنسوؤں کو اس نے جاری کیا تھا۔ جن جذبات کو اس نے ابھارا تھا وہ نہیں رہا۔ مگر وہ ہیں۔ اور رہیں گے۔ جب دنیا نے مسرت کو تبسم میں تلاش کیا تو اس نے آنسوؤں کی دنیا میں راز مسرت کو پا لیا، یہی وہ ذات تھی جس نے رلا کر دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور دل کی فریادوں، بیواؤں کی آہوں اور یتیموں کے نالوں، بیکسوں کے شیونوں کا لشکر لیکر پتھر جیسے دلوں پر چڑھائی کر دی اور جیت کر ان کو موم بنا دیا۔ آہ کو واہ بنا کر دلوں کو موہ لیا اور جگر کی ٹیس پر آنسوؤں سے بھگو کر پھاہا رکھ دیا۔ امراض مزمنہ کو چشم زدن میں اچھا کر دیا، یوں تو مرحوم کی ہر تصنیف ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مگر اس آنسوؤں کے بادشاہ نے "سیدہ کے لال" میں جس ہیرو کو منتخب کیا ہے آنسوؤں کا مصرف اس سے بہتر کہیں نظر نہیں آیا۔ اہل دنیا نے اس جگر گوشہ بتول پر کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ختم نہ کر دی ہو تو حضرت علامہ نے بھی ایسا کوئی لفظ نہیں چھوڑا جو درد و الم نہ بتلاتا ہو مذہبی رائے کو چھوڑ کر جہاں واقعات کربلا بیان کئے ہیں وہاں آنسوؤں کا فرات بہا دیا ہے، عبارات پڑھ کر دل متاثر ہو نہیں سکتا جب تک کہ لکھنے والا خود متاثر نہ ہو۔ کتاب کے حرف حرف کو دیکھ لیجئے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی کی جگہ خون دل سے لکھا ہے۔ ضبط گریہ کی سرخی میدان کربلا کی تصویر نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ سیدۂ عالم کو پرسہ دیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم خیال میں مصنف خود سیدہ کے دروازہ پر پہنچ کر دھاڑیں مار رہا ہے۔ رسول کا دامن تھام کر تعزیت دے رہا ہے۔ شیر خدا کے حضور میں سر بزانو ہے اور ساقی کوثر کے پیاسے لال کو آنکھوں کی کٹوریاں آنسوؤں سے لبریز کر کے خود پیش کر رہا ہے

رسول کو اجر رسالت صرف اہل بیت کی محبت سے دیا جا سکتا ہے۔ ان کے الم میں الم اور ان کی مسرت میں مسرت بھی علامت محبت ہے۔ رسول کاندھے پر چڑھا لے تو خوش ہوں۔ قاتل سینہ پر سوار ہو تو دل خون کر دیں۔ اور یہ نہ آئے تو علامہ راشد الخیری سے سیکھ لیں۔ تیرہ سو برس کی مسافت بعیدہ پر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود میدان کربلا میں موجود رہکر یہ واقعات لکھے ہیں۔ کس خوبی سے کہتے ہیں۔

"آج جمعہ کا روز ہے اور دنیائے اسلام کے ہر حصے میں عید المومنین منائی گئی ہے، خطبے ختم ہوئے، نمازیں پڑھی جا چکیں۔ نعرہ توحید اور صدائے تکبیر بلند ہو چکی اس وقت سے چند لمحے پہلے عربستان کی مسجدوں میں جس پیغمبر آخر الزماں کا نام گونج رہا تھا اس کے نواسے اس کے بیٹے، اس کے پیارے، اس کے جگر گوشے،

حسین کے سینے میں سنان بن انس کا نیزہ وار پار ہے اور دوش رسول کا سوار کربلا کی جلتی جلتی ریت میں چت گرا ہوا ہے۔ عمر و سعد اور اس کی فوج خوشی کے مارے اچھل رہی ہے، اور حسین بن علی کے تڑپنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ آخر سنان نے نیزہ باہر کھینچا۔ اور اس کے ساتھ ہی جگر کے ٹکڑے باہر آگئے، شمر اسوقت خنجر لیکر آگے بڑھا تو دیکھا چہرہ پر مسکراہٹ ہے۔ حیرت زدہ ہوکر خاموش ہوگیا تو خولی قریب پہنچا اور کہا دم واپسیں ہے۔ اگر زندہ حسین کا سر کاٹوں گا تو یزید مالا مال کردے گا۔ یہ کہہ کر اس سینے پر سوار ہوا جس کو فاطمہ رض اور علی رض بوسے دیتے تھے جس کو رسول عربی نے آنکھوں سے لگایا تھا، امام عالی مقام نے خولی سے کچھ فرمانا چاہا مگر خولی نے مہلت نہ دی اور سیدہ کے لال کا سر تن سے جدا کرکے نیزہ پر بلند کردیا۔ (صفحہ ۲۰۶)

اللہ اللہ پیاری بہن زینب کے دل فگار بَین۔ جو عرش اعظم کو ہلا دینے والے، کروبیوں کو رلانے والے۔ جھولا جھلانے والے، امین کو تڑپا دینے والے تھے اگر سننے ہوں تو مصور غم کے حضور میں آکر سنئے۔ تاب شنیدن نہ ہو تو سیدہ کے لال میں دیکھیے،

شمر تیری آنکھیں پھوٹ جاتیں اس سے پہلے کہ زینب بنت علی پر نظر ڈالتا۔ زمین شق ہو جاتی اور میں سما جاتی اس سے پہلے کہ بے حجاب تیرے سامنے کھڑی ہوتی، آج میرے معصوم چہرہ کو تیری خونخوار نظروں سے بچانے والے شہید ہو چکے۔ جفا کار اپنی آنکھیں پھوڑ ڈال اور مجھکو نہ دیکھ! او سنگدل میں زینب بنت علی ہوں، اسوقت میرا باپ علی اور میرے بھائی حسن اور حسین زندہ نہیں ہیں او ملعون میرے دو نوں بچے تیری فوج نے ذبح کردیئے۔ ملعون میرے سامنے سے ہٹ جا، میں رسول زادی ہوں اور اس رسول کی نواسی ہوں جس نے حاتم طائی کی قیدی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے بردا اوڑھائی۔ (صفحہ ۲۰۷)

دربار یزید کا منظر اس قدر دلخراش تھا کہ اگر کسی کے دل میں رتی بھر بھی آل رسول اور اولاد فاطمہ رض کی محبت ہے تو اس کو یاد کرکے بیخود ہو جاتا ہے، حواس رخصت اور الم سیاہ پوش ہوکر اس کی جگہ لے لیتا ہے، کس درد سے اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں۔

"بی بی زینب نے جواب دیا" تو کربلا میں موجود نہ تھا۔ مگر دمشق میں اس رسول کی بچیاں جس کا تو کلمہ پڑھتا ہے۔ رسیوں سے جکڑی بے حجاب تیرے سامنے کھڑی ہیں کیا یہ کچھ کم ظلم ہے؟ تو نے جس کو اپنا دشمن سمجھا تجھ سے بہت بہتر تھا اور میرا باپ اور بھائی تجھ سے اور تیرے ماباپ سے بدرجہا افضل تھے"۔

داخلہ دمشق کا روح فرسا منظر۔ آہ کس قدر اہل بیت کے لئے درد افزا تھا۔ حاکم محکوم بنکر جا رہے تھے، دنیا کو قید شرک سے آزاد کرنے والے خود قیدی تھے۔ تکبیر سکھانے والے اپنے قاتلوں کی تکبیریں سن رہے تھے۔ اللہ اکبر۔ کلمہ گو کلمہ سکھانے والوں کو دمشق میں لا رہے ہیں۔ کاش آج محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے، فاطمہ ہوتیں علی ہوتے تو یہ دن کاہے کو نصیب ہوتا۔ قتل پر رونے والے مر چکے تھے اور ظلموں پر خوش ہونے والے زندہ تھے۔ مگر بالکل دنیا خالی نہ تھی۔ پتھروں میں سے ہیرا کیونکر نکلتا ہے۔ اس کو مصور غم کی زبانی سنئے۔

جس وقت سادات کے اونٹ قلعہ کے قریب پہونچے تو فاطمہ بنت زیاد منہ پر نقاب ڈالے باہر نکلی اور دور سے خاموش کھڑی یہ سماں دیکھتی رہی یہاں تک کہ عمر و سعد اور شمر کے حکم سے رسی سے بندھی ہوئی

سیدانیاں اتاری گئیں، عابد بیمار کی حالت گرمی کی شدت اور سفر کی تکان سے بگڑ رہی تھی، ظالموں نے عورتوں کے ساتھ بیمار کے ہاتھ بھی کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے اور قدم نہ اٹھ سکتا تھا۔ اونٹ سے اترتے وقت بیمار کو ضعف آیا اور بے حال ہو کر گرا۔ زینبؑ اور شہر بانو، سکینہؑ اور مسلمؓ کی شہزادی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، ان کے دل رو رہے تھے، لیکن اتنی مجال نہ تھی کہ اُف کر سکیں، یا ایک قدم بڑھا سکیں عابد کے گرنے سے سر زخمی ہوا اور خون نکلنے لگا تو زینب نے بے قرار ہو کر کہا "ارے سنگدلو ظلم کی انتہا ہو چکی" فاطمہ بنت زیاد یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ قریب آئی اور کہا "جس بھائی نے یہ ستم توڑے ہیں اس کی بہن ان قدموں کی خاک اکسیر سمجھتی ہے۔ کاش ماں مجھکو نہ جنتی کہ میں خاندان نبوت کا یہ حشر ان پھوٹی آنکھوں سے دیکھتی۔ عبید خدا اس پر بجلی گرائے اس حکم سے پہلے زمین میں دھنس جاتا۔" (صفحہ ۲۱۳)

کیا تصویر غم اس سے بہتر کچھ سکتی ہے، اس صدی میں ممکن نہیں اور آئندہ کی خبر نہیں،

فاطمہ کی جائی، حسین کی پیاری بہن، شیر خدا کی بیٹی، کیونکر اپنے بچوں کو رخصت کرتی ہیں۔ یہ وہ منظر ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے عمر بھر کی کمائی بھائی پر لٹائی جا رہی ہے اور کس التجا سے۔ بچے میدان جنگ میں جانا چاہتے ہیں۔ محبان اہل بیت آئیں اور دیکھیں۔

"حسین بھیا تکلیف کے وقت صدقہ دیا جاتا ہے۔ حدیث صحیح ہے کہ صدقہ بلا کو رد کرتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ عون و محمد کو اسوقت ماں جائے بھائی پر قربان کردوں، شاید یہ بلا ٹل جائے، بھائی یہ بحث کا وقت نہیں ہے بھائی تو بہنوں کے بڑے بڑے مان رکھتے ہیں اسوقت زینب کے بچوں کو میدان کی اجازت دیکر اس کا دل رکھ لے، بھیا اسوقت میرا سفارشی کوئی نہیں ہے، ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا، بھائی حسن بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، آج ہماری کشتی کے ناخدا تم ہو، قیامت کے روز زینب کس منہ سے ماں باپ کی خدمت میں حاضر ہوگی، بھائی حسین خدا کا واسطہ دے رہی ہوں، اماں کی روح کا صدقہ۔ میرے بچوں کو رن کی اجازت مرحمت ہو۔" (صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۳)

ہے کوئی دل جو پڑھے اور نہ روئے، ہے کوئی آنکھ جو دیکھے اور آنسو نہ بہائے۔ پتھر کے دل اور لوہے کی آنکھیں اگر رکھتا ہو تو متاثر نہ ہوگا ورنہ جگر کی ٹیس دل کا درد۔ آنکھوں کے آنسو چین نہ لینے دینگے۔

دنیا کیا صلہ دیگی ایک آنسو کی قیمت ممکن نہیں۔ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اے راشد الخیری دنیا میں تمہارے لئے جو ممکن نہ تھا، اب آسان ہے۔ حضور فاطمہؓ اور دربار محمدی میں پہنچ چکے ہو لیلو جو لینا ہے۔ دنیا کے لئے جو لکھا اوس کو تو دنیا والے جانیں۔ آخرت والوں کے لئے جو لکھا تھا اب اس کی جزا کا وقت آچکا۔ جاؤ فاطمہ کو آنسوؤں سے تر دامن دکھاؤ۔ رسول کو ماتم دار دل دکھاؤ۔ خود جن پر روتے ہو ان کے سامنے تو جاؤ، ملے گا اور سب کچھ ملے گا۔ اس لئے کہہ دیتے ہیں جنہوں نے اپنی دنیا بیچ کر آخرت پر قبضہ کرلیا ہے۔ مَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَۃً نَّزِدْ لَہٗ فِیْھَا حُسْنًا۔

ہندوستانی عورتوں کا زبردست نقصان

(از مسز نائک بی اے، بی۔ٹی پرنسپل سندر نعمی گرلز ہائی سکول)

جناب مولانا راشد الخیری صاحب کے انتقال سے مجھے بہت رنج ہوا، کیونکہ انکی وفات ہندوستانی عورتوں کو شدید نقصان پہنچا گئی، چالیس برس تک کسی ایک کام کو اس طرح کرنا کہ نئی نئی مشکلات اور پریشانیاں پیدا ہونیکے باوجود استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آئے، بہت ہی مشکل کام ہے، اور پھر عورتوں کی بہبودی اور ترقی کے لئے قریب قریب نصف صدی تک اپنی کوششوں کو جاری رکھنا مولائے مرحوم کا ایسا زبردست کارنامہ ہے جسکی مثال کم سے کم ہندوستان میں نہیں ملتی، انہوں نے درجنوں کتابیں لکھیں عورتوں کے لئے سارے ہندوستان میں دورہ کرکے تقریریں کیں عورتوں کے لئے مکتب قائم کیا بچیوں کے لئے کئی کئی رسالے جاری کئے، لڑکیوں اور عورتوں کیلئے۔ غرض مولانا صاحب نے جس جس طرح بھی ممکن ہوا عورتوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم کے لئے نیز عورتوں کی شادی شدہ زندگی کامیاب اور خوشگوار بنانے کے لئے اتنا زبردست کام کیا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں مدتوں ان کے احسانات یاد رکھیں گی،

مولانا صاحب کی تحریریں اس قدر دردیدہ کہ دل پر بہت اثر ہوتا ہے مولانا صاحب مغربی تہذیب کی نقالی کے بہت خلاف تھے۔ اپنی کتابوں اور مضامین میں انہوں نے ہندوستانی عورتوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ تم ہندوستانی بن کر ہی ترقی کر سکتی ہو۔ اگر تم نے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی لیکن تمہاری خانگی زندگی ناخوشگوار اور ناکام رہی تو قوم اور ملک کو تم پر فخر نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں ہندوستان کے کسی مصنف نے عورتوں کے واسطے اتنی کتابیں نہیں لکھیں اور شاید کسی اردو مصنف کو اپنی زندگی میں اپنی کتابوں کی اتنی مقبولیت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی

مولانا کا رسالہ عصمت اٹھائیس برس سے شائع ہو رہا ہے جو میرے خیال میں ہندوستان میں عورتوں کا سب سے پرانا رسالہ ہے اور عورتوں کی حالت سدھارنے اور انکی ترقی کے لئے نہایت قیمتی اور قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے جس طرح مولانا صاحب کی کتابوں سے مسلمان عورتوں کے علاوہ غیر مسلم عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں اسی طرح اس رسالے سے بھی اردو جاننے والی تمام ہندوستانی عورتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہ رسالہ بھی مولانا صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے جسے ہندوستانی عورتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں رسالہ جوہر نسواں یعنی زنانہ دستکاری کا رسالہ بھی مدرسوں اور کالجوں کی لڑکیوں اور دستکاری کا شوق رکھنے والی دوسری خواتین کی ایک شدید ضرورت کو پورا کر رہا ہے غرضیکہ مولانا صاحب نے ہندوستان کی عورتوں کیلئے اتنے زبردست کام کئے ہیں کہ ان سے پہلے کسی نے ہندوستان میں انجام نہیں دئے خواتین کو ان کے انتقال کا جتنا رنج ہو کم ہے میری دعا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کیلئے مولانا جو ساری زندگی کوشش کرتے رہے اس کا نیک اجر

آہ علامہ راشد الخیری

(از جناب نواب میر مسعود عالم خالصاحب بہادر سی آئی ای الٰی ریاست بیلہ)

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا ہیں آپکی حسب تحریر جناب جناب علامہ راشد الخیری صاحب کی رحلت ہندوستان کی خواتین کیلئے بہت بڑا ستم ہوگیا میرے خیال میں تو ایسا کوئی شخص نہ ہوگا، جس نے طبقہ نسواں کیلئے ایسی زبردست خدمت کی ہو حقیقتاً ہندوستان کی خواتین کے لئے ان کا دم غنیمت تھا کہ جنہوں نے ہماری ان پردہ نشین بہنوں میں ایسی علمی بیداری پھیلائی کہ اب تک کسی مسلمان بھائی نے یہ خدمت انجام نہ دی تھی اگر خدا ان کو چند سال اور زندہ رکھتا تو مجھکو قوی امید تھی کہ ہماری بہنیں انکی علمی لیاقت سے بہت زیادہ مستفیض ہو جاتیں، دنیا میں انسان پیدا ہوتا ہے مگر ایسی خوبیاں ہونی مشکل ہیں کہ جن سے بعد مرگ نیک نام اور قابل یاد رہے یہ بہت بڑی بات ہے حضرت علامہ راشد الخیری کو میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی مستورات خواہ وہ کہیں بھی رہتی ہوں یاد نہ کریں ان کا ایک آخری خط جو انہوں نے مجھکو گذشتہ سال بھیجا تھا، فائل میں سے تلاش کرکے آپ کو روانہ کر رہا ہوں میں نے اس تحریر کو بار بار پڑھا اور انکی علمی لیاقت اور بلند خیالات پر داد دی اور چشم پرآب ہوگیا اور میں نے رب العزت سے یہ دعا مانگی کہ اے پروردگار ایسی قابل قدر ہستی کو جس نے اپنی زندگی قومی بہنوں کی خدمت کیلئے وقف کردی تھی جنت الفردوس میں جگہ دے آمین، سچ تو یہ ہے کہ اب رد و ادب میں انکی قابلیت کا ثانی ملتا نظر نہیں آتا، انکی خدمات نسواں اور علمی قابلیت اور انکے اخلاق وعادات کی جتنی تعریف ہو کم ہے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آخر میں میری دلی دعا ہے کہ خداتعالیٰ آپ دونوں بھائیوں کو صبر جمیل عطا کرے اور آپ اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلیں اور جو امور کہ علامہ راشد الخیری صاحب نے سرانجام دئے انکو آپ دونوں بدستور جاری رکھیں

مصورِ غم علامہ راشد الخیری کا "پیامِ مسرت"

"نوحۂ زندگی"

(از جناب مولوی عبدالحی صاحب عباسی بی اے۔ ایل۔ ایل بی۔ فیض آباد)

ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت سے ہمکنار ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے چونکہ موت دائمی طور پر سلسلہ حیات کو اس طرح منقطع کر دیتی ہے کہ راہی ملک عدم اپنے وابستگان کی کیفیات سے بالکل ہی لاعلم ہو جاتا ہے۔ ایک "انوکھی موت" ہم وہ پیش کرتے ہیں جس میں مرنے والا مر مر کے جیتا ہے۔ طبقہ نسواں وہ سخت جاں طبقہ ہے کہ معین دن سے قبل اسے موت کی گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے، تہذیب۔ شرم و حیا۔ شرافت اور رسم و رواج کی چوکھٹ پر اس قدر قربانی اس بے زبان طبقہ کی گزرانی گئی ہے کہ تاریخ عالم مثال پیش کرنے سے عاری ہے۔ ایک عورت کے سر سے شوہر کا سایہ اُٹھ جانا اسکے لئے پیام موت ہے کہیں عورت کو شوہر کی چتا پر جل کر خاک سیاہ ہو جانا حق رفاقت ادا کرنا کہا جاتا ہے تو کہیں نام نہاد شرافت کی آڑ پکڑ کر بے زبان عصمت کی دیویوں کو فطرت کے خلاف جنگ پر آمادہ کر کے دنیا کے سامنے پاکدامنی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہیں رسم و رواج کے نام پر آٹھ نو سال کی معصوم بچیوں کو بیوہ کہکر مندروں کی داسیاں اور بالاخانہ کی شاہدان بازاری بنا کر دنیا کو رسوا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ دنیا نے بیوہ عورت پر طرح طرح کے مظالم توڑے ہیں۔ عرب میں مبعوث ہونے والے اُمی رسول صلعم نے اپنے عمل سے اس رسم کی لعنت کو ختم کیا اور بیواؤں کے ساتھ عقد ثانی کر کے انہیں حقیقی زندگی عطا فرمائی۔

غریب ہندوستان تو رسم و رواج کی آماجگاہ ہمیشہ بنا رہا ہے۔ یہاں رسم و رواج نے اس درجہ غلبہ حاصل کر رکھا ہے کہ اسے مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسلام کے مدعی بھی اس ملک میں پہونچکر نام نہاد شرافت کے جال میں اس طرح پھنسے کہ اپنی لڑکیوں کو معاذ اللہ ازواج نبی صلعم سے زیادہ شریف متصور کرنے لگے اور بیواؤں کے عقد ثانی کی تلقین تک بند کر دی،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے طبقہ نسواں پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی گئیں۔ پنجاب و صوبہ اودھ میں رواج کو شرع محمدی پر ترجیح دیکر لڑکیوں کو ترکہ سے محروم کر دیا گیا۔ خلع کے شرعی قانون کو نظر انداز کر کے ظالم شوہروں کے ہاتھوں ہی عورت پر ستم نہیں ڈھائے گئے ہیں بلکہ سوکن کو گھر میں بٹھا کر سینہ پر کودو دلوائی گئی ہے۔ چونکہ مسلمان بادشاہوں کے عہد حکومت میں اسلامی قوانین کی پابندی ہوتی تھی، اور طبقہ نسواں کو جملہ حقوق حاصل تھے، لہذا غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نئی حکومت اور وہ بھی غیر اسلامی حکومت کے قیام سے مردوں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر عورتوں کے جملہ حقوق غصب کر لئے اور مثل قیدیوں کے بجائے لوہے کے سونے و چاندی کے طوق و زنجیر پہونچی و کڑے (بجائے ہتھکڑیوں کے) اور پیروں میں توڑے ڈال کر بلکہ خوشی خوشی پہنا کر اور سامان زینت کہکر مکانات کی چہار دیواری کے اندر مقید کر دیا۔

چونکہ غدر ۱۸۵۷ء میں مظالم کی حد دہلی پہونچکر ہوئی تھی۔ لہذا خاک پاک دہلی ہی سے رسم و رواج کے قیدیوں کو نجات

دلانے والا۔ بیواؤں کے مغموم و مردہ دلوں کو "مسرت کا پیام" پہونچانے والا "نوحہ زندگی" کی شکل میں منظر شہود پر ظاہر ہوتا ہے "نوحہ زندگی" علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور کی وہ نایاب اور بے مثل کتاب ہے جو ایک طرف قلوب انسانی کو حزن و ملال کا آماجگاہ بنا دیتی ہے تو بیوہ عورت کو اس طرح "پیام مسرت" سناتی ہے کہ مردوں کو سنت خیر البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عامل ہونے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ عقد بیوگان کی طرف علامہ مرحوم نے دنیا کو خاص کر مسلمانوں کو اس انوکھے انداز سے بلایا ہے کہ غریب بیوہ کا احترام قلوب انسانی میں پیدا ہوگیا ہے۔ اس طبقہ کی طرف سے اگر علامہ موصوف کو مسیحائے زماں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ "نوحہ زندگی" کے ذریعہ جو پیام مصور غم نے پہنچایا ہے اُسے "پیام مسرت" کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ ادبی لحاظ سے علامہ کی تصانیف کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، یوں تو اصلاح معاشرت مولانا کی تصانیف کی امتیازی شان ہے۔ مگر انسان کی وہ خدمت جو اپنا ایک مستقل اثر قلوب انسانی پر چھوڑ جائے وہی حقیقی خدمت نوع بشر کے نام سے یاد کیجاتی ہے۔ سوسائٹی کی حالت گزشتہ نصف صدی میں اس درجہ ابتر ہو رہی تھی کہ ظلم ظلم نہیں کہا جاتا تھا، ایک طرف زبان سے متبع شریعت ہونے کا ادعا کیا جاتا تو دوسری طرف عمل سے نفس کو محض وجہ زندگی بنا لیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم کی مختصر مگر سبق آموز تصنیف سوکن کا جلاپا اس قابل ہے کہ اسے معاشرتی اصلاح کے اداکاروں کی طرف سے تقسیم کرایا جائے۔ مصنفین دنیا میں بہت گزرے ہیں جن کی کتابوں کا مطالعہ لوگ شوق سے کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں مگر علامہ مرحوم کی تصانیف نے لوگوں کو عمل کی طرف مائل کردیا ہے، ذیل میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جس سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ علامہ کی تصانیف نے کس طرح مجروح اور شکستہ دلوں کو "پیام مسرت" پہنچا کر طمانیت بخشی ہے۔

فیض آباد اودھ کا قدیم دارالسلطنت ہے، یہ وہی شہر ہے جسے اجودھیا کے نام سے تاریخوں میں ذکر کیا جاتا ہے اسی خاک پاک میں اس نیک نفس اور مجسمہ ایثار و قربانی نے جنم لیا ہے جسے سری رام چندر جی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس محترم ہستی نے طبقہ نسواں کی ایک معصوم دیوی کو جسے اہل دنیا نے ذلیل کر رکھا تھا اس بلند مقام پر پہونچا دیا کہ آج "سیتا رام" ہر شخص کے ورد زباں ہے" اس گرے ہوئے زمانہ کا یہ ذکر ہے کہ نواب صفدر حسین رؤسائے قدیم میں سے ایک بزرگ ہیں جن کی کوٹھی شہر کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ نواب صاحب پرانی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں، کھانے پینے سے خوش ہیں، اللہ نے ایک فرزند خوش رُو بھی عطا کیا۔ رؤسا کے یہاں، رشتہ ناتہ کی کمی کہاں۔ صاحبزادے ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہونچے تھے۔ کہ نواب زادہ دلاور حسین کے لئے سلام و پیام آنے لگے۔ نواب زادہ کو لوگ عام طور پر چھوٹے میاں کہکر یاد کرتے ہیں چھوٹے میاں لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، اور اکثر مجھ سے دارالمطالعہ میں ملاقات ہوتی اور اردو ادب کی کتابوں کا ذکر آتا میں نے علامہ راشد الخیری کی کتابوں کا ذکر کیا تو فرمانے لگے۔

" بھائی یہ مصنف تو جادوگر ہے۔ فطرت انسانی کا اس نے ایسا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی تصانیف میں ایک کشش ہے جو قلوب انسانی کو مسخر کرلیتی ہے۔ ایک کتاب "نوحہ زندگی" ہے جسے اب تک چھ بار پڑھ چکا ہوں۔ مگر طبیعت سیر نہیں ہوئی ہے بھائی عباسی صاحب میں نے اپنی جگہ پہلے کرلیا ہے کہ کسی بیوہ خاتون ہی سے عقد کروں گا"

چھوٹے میاں تعلیم کا زمانہ ختم کرکے وطن تشریف لائے خوشی کے شادیانے بجے، نواب صاحب کے اعزاز و احباب میں شادی خانہ آبادی کا چرچہ شروع ہوا۔ چھوٹے میاں نے فرمایا کہ میں شادی کا مخالف نہیں مگر سنت رسول صلعم پر عمل

کرنا چاہتا ہوں۔ اس خیال کے اظہار کرنے ہی سَو منہ اور سو باتیں طرح طرح کے کھوم اور بدشگونیوں کا ذکر ہونے لگا، کسی نے یہ کہا کہ شرافت میں بٹا لگے گا، کسی نے یہ کہا کہ خاندان پر کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ نواب چھبن کے بیٹے کا دوسرا عقد تھا اور وہ ایک بیوہ بیاہ کر لایا اور ہفتہ ہی کے اندر اندر صاحبزادے کا انتقال ہو گیا۔ غرضیکہ نواب صفدر حسین صاحب کو مدعیان نے شرافت اور رسم و رواج کے پجاریوں نے نرغہ میں لے لیا، مگر چھوٹے میاں اسی پر مُصِر رہے کہ شادی تو بیوہ ہی سے کروں گا۔ قدرت کو علامہ مرحوم کی تعلیمات کا عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ بہت سنجیدہ اور پرانی وضع کی بی بی تھیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے بیٹے کی اس خواہش کو پسند فرمایا۔ اہل دنیا کا رنگ دیکھتے دیکھتے یوں بدلتا ہے۔ بڑے بڑے رئیس گھرانوں سے بیوہ بیگمات کے پیغامات آنے لگے مگر قدرت کو تو ایک شکستہ دل جھونپڑے میں زندگی کے دن پورے کرنیوالی شریف صاحبزادی کو "پیام مسرت" سنانا مقصود تھا۔ نواب صاحب کے ایک قریبی عزیز بہو بیگم صاحبہ کے مقبرہ کے قریب ایک خام مکان میں رہتے ہیں۔ اللہ نے ان کو صرف ایک لڑکی عطا کی تھی حسن صورت کے ساتھ ساتھ والدین نے زیور علم و تہذیب سے آراستہ کر رکھا تھا۔ شادی کے تیسرے ہی دن یہ معصوم بچی بیوہ ہو گئی اور ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ دو سال تک برابر اس بچی نے بوڑھے باپ کی خدمت اور یاد الٰہی میں بسر کئے۔ کشیدہ کاری میں اسے کمال حاصل تھا، بازار میں رومال اور تکیہ کے غلاف اکثر دوکانوں پر اسی معصوم بچی کے کشید کئے ہوئے نظر آتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی نظر انتخاب اسی بچی پر پڑی اور چھوٹے میاں کا عقد ہو گیا۔ یہ بچی نواب صاحب کے گھر میں پہنچکر "نواب دلہن" کے نام سے مشہور ہوئی اپنے حسن انتظام اور اخلاق حمیدہ سے تمام خاندان کے لوگوں کے دل موہ لئے خدا کے فضل سے یہ خاندان اوج ترقی پر ہے۔ علامہ مرحوم کی ایک معمولی تصنیف کا یہ زندہ اعجاز ہے۔ آخر میں میری تجویز ہے کہ علامہ کی تصانیف کو بہتر طریقہ پر طبع کرا کر رواج دیا جائے۔

علامہ راشد الخیری رح

نسلِ آدم جلوہ گر تھی مختلف انداز میں
بندگی میں مست کوئی، محو کوئی ناز میں

رازِ فطرت تھا ابھی پنہاں حجابِ راز میں
تھی ابھی نشو و نمائے زندگی آغاز میں

لے کے مشعل کوئی اٹھا تھا نہ طورِ علم سے
بیٹیاں محروم تھیں حوا کی نورِ علم سے

آدمی کیا، آدمیت تشنۂ ناکام تھی
صنفِ نازک مبتلائے گردشِ ایام تھی

بربریت کا تسلط تھا جہالت عام تھی
بے شرف انسان تھا، انسانیت بدنام تھی

ڈوبنے والی تھی کشتی ناخدا کوئی نہ تھا
کارواں گمراہ تھا اور رہنما کوئی نہ تھا

ناگہاں اک پیکرِ بیدار اک مردِ سلیم
اس خراب آباد میں چمکا یہ عنوانِ عظیم

اختیار اک راہِ نو کی چھوڑ کر راہِ قدیم
محو دل سے کر دیا اندیشۂ امید و بیم

قلبِ طوفاں میں قدم اپنے جما کر رکھدئے
حوصلے بدعت پرستوں کے مٹا کر رکھدئے

دامنِ عالم پہ کر کے ثبت عظمت علم کی
طبقۂ نسواں کو دی جاگیر دولت علم کی

نقشِ لوحِ دل پہ فرمائی حقیقت علم کی
دامنِ "عصمت" پہ پھیلا کر طریقے علم کے
لے بڑھا دی زندگی کی اپنے پیغامات سے
کام لے کر خدمتِ ملت کے احساسات سے
پھونک دی اک روحِ نو ہر گوشۂ آباد میں

دل نشیں پیرائے میں دے کر پیامِ زندگی
از سرِ نو پھر ہوا قائم نظامِ زندگی
تربیت، تہذیب، علم و فن کی ارزانی ہوئی

قومیت کے ساز پر نغمے نئے گاتا رہا
ہر فرازِ دلپستی، عالم کو سمجھاتا رہا
گل بداماں کر دیا ہستی کے ہر ایوان کو

ثبت فرمائی رگِ ہر گل پہ "رودادِ قفس"
شاد و آسودہ ہوئی ہر روحِ ناشادِ قفس
طائرانِ خوشنوا مسرور و خنداں ہو گئے

ملک و ملت کو سنوارا کلکِ گوہر بار سے
کر کے "اصلاحِ تمدن" قوتِ افکار سے
کام آخر احتجاجِ پختہ کار آ ہی گیا

آہ وہ مردِ وفا، وہ محسنِ عالی وقار
تھی قلم کی جنبشوں میں جس کی نبضِ روزگار
ہو یقیں کیونکر کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گیا

"دہلی مرحوم" میں اب وہ درخشانی کہاں
"غم کی نقاشی" کرے ایسا کوئی مانی کہاں
موت اک دردآشنائے قوم کی بری ہوئی

شورِ ماتم عصمت و عفت کے کاشانوں میں ہے
سوگواری لالہ زاروں میں بیابانوں میں ہے
بجھ گئی وہ شمع تھی جس کی تجلی جہل سوز

دادخواہِ صنفِ نازک اے امیرِ کارواں
ذکر تیرا حشر تک ہو گا بہ اندازِ فغاں
گو نہیں موجود ہم میں پھر بھی تابندہ ہے تو

کر دیا افشا کسے کہتے ہیں جنت علم کی
دے دئے ہر ذہن کو روشن سلیقے علم کے
جہل کے پردے جلائے گرمئ جذبات سے
کر دیا ہمدوشِ انوارِ سحر کو رات سے
خونِ دل شامل کیا اس دور کی بنیاد میں

کھول ڈالے رازہائے "صبح و شامِ زندگی"
مشرقِ تازہ بنا ماہِ تمامِ زندگی
تھی جہاں تاریکی مطلق درخشانی ہوئی

اپنی غم انگیز تحریروں سے تڑپاتا رہا
لعنتیں بد رسموں کی دُور فرماتا رہا
اک نئی نعمت عطا فرمائی ہندوستان کو

گونج اٹھی گلشن و صحرا میں فریادِ قفس
وسطِ گلشن میں بنا اک قصرِ آزادِ قفس
ہر قدم پر نقشِ آزادی نمایاں ہو گئے

آگ ذروں میں لگا دی گرمئ گفتار سے
ہر طرف غنچے کئے تخلیق نوکِ خار سے
طبقۂ نسواں میں دورِ پُر وفا آ ہی گیا

روح جس کی نیکیوں کا ایک زریں شاہکار
جس کا اک اک لفظ تھا اصلاح کا آئینہ دار
کس کو باور ہو کہ وہ خود نقشِ عبرت ہو گیا

وہ ادب کی زندگی وہ شعر سامانی کہاں
کوئی کر سکتا ہے اب یوں خون کو پانی کہاں
حشر کا ساماں "وفاتِ راشد الخیری" ہوئی

ذکر نقاشِ ادب اپنوں میں بیگانوں میں ہے
اک اداسی مشتعل ہستی کے ایوانوں میں ہے
معترف تھا جس کی تابانی کا مہرِ نیم روز

قلبِ گیتی محو کر سکتا نہیں تیرا نشاں
داستاں دہرائے گی تیری خواتینِ جہاں
ہے حیاتِ دائمی تیرے لئے زندہ ہے تو

منتظر صفی اکبرآبادی۔ مدیر گلکدہ آگرہ

بیسویں صدی کا مُصلح اعظم

از جناب احسان اللہ خاں صاحب لودھی - بی - اے - لاہور۔

موت کی چیرہ دستیاں منشائے ایزدی کے تحت میں انفرادی ہستیوں کو نیست و نابود کرکے قیامتِ صغریٰ کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ جاتی ہے۔ جب کوئی ایسی ہستی حیاتِ مستعار سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور جب دنیاوی اسٹیج پر ہیرو کے پارٹ کا شاہکار آخری ڈراپ سین میں مستتر ہو جاتا ہے تو عموماً قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس کی خوبیاں۔ اُس کے اوصافِ حمیدہ اُس کی برگزیدہ خصلتیں۔ اس کی فہم رسا۔ اُسکا ادراک الارتقا۔ اُس کی فوق العادۃ خصوصیات اور دیگر ستودہ صفات اُس کے ساتھ ہی مدفون۔ اور دُنیا اُس کی کیف آرائیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ اسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہوکر اُس کا ماتم کیا جاتا ہے۔ اور خرمنِ سکون میں کچھ عرصے کے لئے ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے کس قدر جلد دنیا اس سانحۂ جانگداز کو فراموش کر دیتی ہے۔ کوتہ بین نگاہوں میں ایسی ہستی "مر" جاتی اور حرماں نصیب دلوں میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ کہ اب یہ ہستی واپس نہ آئے گی۔ لیکن ذرا عقل کا پردہ اُٹھا کر دل کی آنکھوں سے دیکھو تو ایسی ہستیاں ہم سے جدا ہی کب ہوئیں؟

کیا آج ہم سینکڑوں صدیوں بعد قرونِ اولیٰ و قرونِ وسطیٰ کے بہترین دماغوں سے متکلم نہیں ہوتے؟ کیا ہم ایک پل میں ارسطو۔ ہومر۔ سقراط۔ غزالی۔ خیام۔ سعدی۔ حافظ۔ شیکسپیر۔ گوئٹے۔ ملٹن۔ کالیداس۔ اور بھرتری ہری کے حضور اعزازِ تکلم حاصل نہیں کرتے؟ کیا یہ اُن کے قلم اور دماغ کا معجزہ نہیں کہ باوجود تفاوتِ عظیم ہمیں اُن سے معانقہ نہایت آسان ہے؟ ہم اُن کی حضوری میں اسیطرح سرشار ہوتے ہیں جس طرح اُن کے معاصرین۔ بلکہ نقادانِ سخن کی تدقیق کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہیں۔ پھر کون کہ سکتا ہے کہ **بیسویں صدی کے مصلح اعظم** کو موت نے ہم سے جُدا کر دیا؟ کیا یہ تین مہینے ہزاروں سالوں سے بھی زیادہ منفاصل ہیں؟ **علامہ راشد الخیری** اُنکی نگاہوں میں "مرے" ہونگے جو اُن سے واقف نہ تھے۔ بلکہ موت نے تو انہیں اس قدر ہمارے نزدیک کر دیا ہے کہ بجائے آنکھوں کے دل میں لا بٹھایا ہے۔ اگر کسی کو دل میں بٹھانا اُس کی موت سے متشابہ ہے تو میں مان لوں مگر میرے دماغ پر بھی اُنہیں کا قبضہ ہے لہذا معذور ہوں۔ دل نہیں مانتا کہ علامہ موت کی آغوش میں جا سوئیں اور عقل آواز دیتی ہے ادب! گستاخی نہ کر!!!

علامہ مرحوم نے نقاشِ ازل کے بہترین شاہکار (عورت) کی تزئین کی۔ صنفِ نازک کے حُسنِ باطنی کو ترتیب دی۔ مغربی و مشرقی تہذیب کے تصادم میں اماں حوا کی جو گمراہ بیٹیاں معاشرتی۔ اخلاقی۔ و تمدنی ورطۂ تذبذب میں پھنسی ہوئی تھیں ان کی دستگیری کی۔ جو سچ پوچھو تو طبقۂ نسواں کے لئے ایک علیحدہ دنیا قائم کی۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورت کو

مکمل شرعی آزادی حاصل ہے مسلمان عورت خاوند کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف تو عورت کو آزادی کا درس دیا جس میں خاوند کی رضامندی اور خوشنودی لازم و ملزوم گردانی اور دوسری طرف مرد کو حقوقِ نسواں کا پاس دلا کر مرعوب کیا۔ عورت اور مرد کے تعلقات کو قانونِ قدرت کی وضاحت سے مواصل کر کے ازدواجی زندگی میں نہایت دلچسپ لطافت پیدا کی یہ عفت و عصمت کا علمبردار دریائے انحطاط کی موجوں کے تھپیڑوں میں بھی ساحلِ اخلاق۔ تہذیب۔ تمدن و معاشرت کی جانب بہا چلا آیا۔

اللہ غنی! خدا مغفرت کرے کیا اعجاز تھا علامہ مرحوم کا! بیک جنبشِ قلم ہندوستان میں سینکڑوں علم و ادب سے آراستہ و پیراستہ زرین رقم قلم والیاں پیدا کر دیں۔ موجودہ لڑکیاں مغربی تہذیب کے جس مخرب الاخلاق عنصر کی دلدادہ ہیں اور جس سے ہماری پرانی اسلامی روایات متزلزل ہیں اُسکے خلاف علامہ مرحوم تمام عمر برسرِ پیکار رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی طریقۂ تعلیم نسواں کی خامیوں کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اور انشاء اللہ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب لڑکیاں اور عورتیں امہات المومنین کے اسوۂ حسنہ کی تقلید پر واپس لوٹ آئیں گی۔

لارڈ بائرن کہتا ہے:۔ صانعِ حقیقی کا آرٹ عورت کی بناوٹ میں ختم ہے۔ لیکن عورت مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ نسوانیت کے اُصولوں سے واقف نہ ہو" علم النفسیات کا یہ اصول کس قدر صداقت سے معمور ہے مسلمان عورت پر جس نے ان ابدی اُصولوں کو منکاشف کیا وہ علامہ مرحوم ہی کی ذات بابرکات تھی حسنِ صورت تو خداداد ہے حُسنِ سیرت پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کروں گا۔ اگر میں یہ کہوں کہ علامہ مرحوم نے **عورت کو عورت بنکر دیکھا**۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں عورتوں کے دلوں میں اُترے۔ اُن کو عورت کے مختلف اوراقِ زندگی کا علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے قلم نے کبھی لغزش نہ کی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے حقیقت پر مبنی تھا۔

رابعہ بصری فرماتی ہیں :۔ ایک اچھی عورت دنیا میں اپنے لئے بہشت قائم کر لیتی ہے لیکن ایک بُری عورت دنیا کے لئے دوزخ ہے" امورِ خانہ داری و سینا پرونے سے لے کر انہوں نے عورت کو علم و ادب کے ارتقائی منازل کی سیر کرائی لیکن شرع کی کڑیوں سے آزاد نہ ہونے دیا۔ غرضیکہ عورت کے اچھا ہونے میں جو جو خوبیاں درکار ہیں اُنہوں نے اُن صفات کو مسلمان عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد میں مفقود پا کر اپنی زندگی کو مسلمان عورت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اور یہ ان ہی کی پیہم کاوشوں کا ثمر ہے کہ آج لاکھوں بہنیں گھر کی چار دیواری میں زندگی کے زرین لمحات سے لطف اندوز اور فردوسِ بریں کی فضاؤں سے سرشار ہو رہی ہیں۔ ایسی متبرک ہستیاں بہت کم پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے عورت کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ چونکہ مرد کا عورت کے ساتھ قدرت نے ایسا تعلق پیدا کیا ہے کہ مرد کی ترقی کا دارومدار اور اُس کے مقصدِ حیات کی تکمیل کا انحصار عورت پر ہے۔ لہذا مرد کی اصلاح اور بہبودی دوسرے الفاظ میں عورت کی اصلاح اور بہبودی سے وابستہ ہے۔ اس لئے علامہ مرحوم نہ صرف طبقۂ نسوان کے مصلحِ اعظم تھے۔ بلکہ دائرہ ذکور بھی بڑی حد تک

علامہ مرحوم کا گرویدہ احسان ہے۔عورت بذات خود مرد کی اصلاح کرتی ہے۔جو سچ پوچھو مرد کا کریکٹر ہی عورت بناتی ہے۔ سلیقہ شعار پڑھی لکھی اور صفات بالا رکھنے والی عورت اپنے خاوند کے گھر کو بہشت بنا دیتی ہے اُس کے لئے گھر کے اندر ہی ہر قسم کا سامان تفریح اور دلآویز اسباب مہیا کر دیتی ہے کہ اُسے اپنے دل کو لگانے کے لئے بیرونی دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے اور اُس کا گھر ہی اُس کا دُنیاوی مرکز بن جاتا ہے۔مولانا مرحوم نے حقائق و دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے لئے یہی ایک صراط المستقیم ہے جس سے دنیا میں سرخروئی ہے اور آخرت میں نجات ہے۔

لُطف یہ ہے کہ اِس جید عالم نے قوم کی فلاح و بہبودی کی جو نئی طرز اختیار کی وہ مذہب کی چاشنی سے معرّا نہیں ہے۔عورت کی سوشل زندگی کو مذہب کے ایسے قالب میں ڈھالا ہے کہ عورت کا ہر فعل عبادت کے رتبہ پر پہنچتا ہے۔قرآن پاک اور احادیث شریف کے ستونوں پر جدید معاشرتی زندگی کا ایوانِ عالیشان قائم کیا حسنِ بیان و خوش کلامی کی پچی کاری۔تخیلات۔استعارات و تشبیہات کی گلکاری اور مؤثر و جاذب دلائل کی مرصع کاری سے اس ایوان کی خوبصورتی کو دوبالا کیا۔علامہ مرحوم نے کیسے آڑے وقت میں تاڑا کہ قوم اس وقت نہ صرف فلاکت و عسرت کی جانب اندھادھند اُمڈی چلی جارہی ہے بلکہ مسلمان عورت کی آزادانہ روش اور مغرب کی حیاسوز و ایمان شکن تقلید قوم کے اخلاق کا پیغام اجل ہے۔مغربی طرز بود و باش و آزادمنش سوسائٹی کی قربانگاہ پر مذہب کو بھینٹ چڑھتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے عورت کے لئے وہ کام کیا جو انیسویں صدی کے سالار اعظم سر سید احمد خاں نے مرد کے لئے کیا۔

قوم کے اِس ہمدرد فرد نے بقائے دوام کا مصلح پیدا کر کے صنفِ نازک کے بختِ خفتہ کو بیدار کر دیا ہے۔اس مصلح اعظم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان عورت دین متین کی پابندیوں میں گرفتار رہ کر بھی اپنی آزاد غیر مسلم بہنوں کے دوش بدوش رفتارِ زمانہ کے مطابق چل سکتی ہے۔اس عظیم الشان ہستی نے صنفِ نازک پر وہ احسان کیا ہے کہ ہم اس کی خداداد قابلیت اور اعجازِ مسیحائی کے ہمیشہ رہین منت رہینگے۔یہ وہ ہستی تھی جس نے اپنے دل کے ٹکڑے نذر دوراں کر دیئے۔

مرسلہ فرخندہ اختر (لاہور)

قطعہ تاریخ وفات مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

تیرے مرنے کا رنج ہے بے حد | خلد آرام راشد الخیری
اس فنا کا فنا نہیں مقصد | لیک یہ غم نہیں حقیقی غم

کیوں کہ وجہ بقاہے یہ تاریخ
رفت راشد بہ گلشنِ مرقد
۱۹۳۶ء

سید ذاکر علی ذاکر ٹونکی

علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے

ادیب کے لئے حساس دل حسن بیان اور جودت طبع لوازمات سے ہیں۔ ان اسباب میں ایک بھی کم ہوجائے تو ادیب کا رتبہ گر جاتا ہے۔ کتنا ہی حسن بیان ہو لیکن ادیب کے دل میں درد نہیں ہے تو اسکے کلام میں تاثیر ممکن نہیں۔ شاید حسن بیان بھی درد کی ہی ایک صورت ہو۔ حالانکہ ایسے باکمال بھی دیکھے گئے ہیں جن کے طرز بیان میں ساری خوبیاں موجود ہیں مگر درد نہیں۔ ایسے ادیبوں کی بندشوں کی اور ترکیبوں کی داد تو دی جا سکتی ہے مگر پڑھنے والا اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ مولینا راشد الخیری مرحوم میں یہ تینوں اوصاف موجود تھے۔ اور یہی ان کی ادبی کامیابی کا راز ہے۔ انہوں نے نہایت دردمند دل پایا تھا اور اُسکے ساتھ ہی حق پرور بھی۔ وہ متوسط طبقے میں پیدا ہوئے اور اس طبقہ کی معاشرت کے ہر ایک پہلو سے واقف تھے۔ اس کی خوبیاں اور برائیاں دونوں ہی اُن کے پیش نظر تھیں۔ اسی سوسائٹی میں صالحہ جیسی حیا پرور اور خوددار لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ کاظم جیسے دیندار، پرہیزگار بزرگ بھی ان کے دل پر ان کیریکٹروں کا گہرا نقش تھا۔ مگر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ عصری معاشرت میں کچھ ایسی برائیاں سرایت کرگئی ہیں جن کی سموم فضا میں خوبیاں روز بروز مٹی جاتی ہیں اور عیوب روز بروز پانوں پھیلاتے جاتے ہیں۔ انہوں نے انفرادی فطرت نہ پائی تھی۔ ان کی فطرت کا رنگ اجتماعی تھا۔ صالحہ اور کاظم کی حیثیت افراد کی ہے۔ وہ اپنے طبقہ کے نمایندے ہیں۔ انہیں کے ذریعہ مولانا راشد سوسائٹی کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں سوسائٹی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ توہمات اُسکے گلے کا ہار ہو رہے ہیں۔ پیروں اور مریدوں نے اُسے تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ شرک نے مذہب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اسراف ایک عذاب ہوگیا ہے۔ اور انگریزی تہذیب اپنی نمائشوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سوسائٹی کے حقیقی اجزا کو منتشر کرتی جارہی ہے۔ رواداری کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کنبہ پروری عنقا ہو رہی ہے۔ خودغرضیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ نفسانیت کا رنگ غالب ہے۔ روحانیت معدوم ہو رہی ہے۔ عورت مظلوم ہے۔ اُسے اُسکے حقوق سے محروم کردیا گیا ہے۔ اُس پر جسمانی اور روحانی قیدیں اس کثرت سے عائد کردی گئی ہیں کہ وہ مفلوج ہوگئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی رفیق حیات نہ رہ کر محض اس کی تفریح کی چیز بن گئی ہے۔ اُس کی ذلّت اور پستی کی مثالیں آئے دن ان کے تجربہ میں آئی ہوں گی۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کا دردمند دل اُس زبوں حالی پر رو اٹھتا تھا اور اُس کی اصلاح کے لئے بیتاب ہوجاتا تھا۔ ان کے افسانے اور ناول زخم خوردہ دل کے نالے ہیں جن میں تاثیر کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

ہمارا شاعر اور ادیب بالعموم قوت عمل سے خارج ہوتا ہے۔ دنیا اس کے کیفیات قلب کی تحریک کا آلہ ہے۔ اسے اپنی کیفیات دنیا سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ دنیا کے حالات سے اُسی حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اس کی کیفیتیں بیدار ہوجائیں۔ اس سے زیادہ اُسے دنیا سے دلچسپی نہیں۔ مولانا راشد محض ادیب نہ تھے۔ وہ مفکر بھی تھے۔ اور مصلح بھی۔ یوں اُردو میں اور بھی

ناولسٹ ہوئے ہیں جنہوں نے تمدنی مسائل پر افسانے لکھے ہیں۔ مگر اُن کی تصانیف میں چوٹ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیواؤں کی شادی یا پردہ یا طلاق وغیرہ مسائل کو محض اس لئے اپنا موضوع بنایا کہ وہ اس پر آسانی سے افسانے گھڑ سکتے تھے۔ یا اس لئے کہ پبلک کو ان مسائل سے دلچسپی تھی اور ایسی وقتی تصانیف مقبول ہو سکتی تھیں۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ سوشل نقائص سے انہیں روحانی کوفت ہوتی ہے۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں وہ ایک مستقل اصلاحی جوش کے عالم میں لکھ رہے ہیں۔ مولانا راشد الخیری کے افسانوں میں صداقت ہے، درد ہے، غصہ ہے، بیچارگی ہے، جھنجھلاہٹ ہے۔ جیسے وہ سماج کی بے اثری، بے حسی، بے دردی سے نالاں ہیں اور دست بدعا ہیں کہ اُن کے لفظوں میں تاثیر پیدا ہو، لوگ اُن کی باتیں سُنیں اور ان پر غور اور عمل کریں۔ ان کے جتنے سوشل ناول اور افسانے ہیں اُن میں بھی جوش و اصلاح لبریز ہے۔ وہ استدلال سے بھی کام لیتے ہیں نصیحتوں سے بھی حُسن بیان سے بھی اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی۔ چاہتے ہیں کاش ان کی آواز میں صور اسرافیل کی سی ہنگامہ خیزی ہوتی۔ اس انہماک میں بعض اوقات ان کی تصانیف میں فنی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی خطیب کی اپیل ہے، کوئی ادبی تخلیق نہیں۔ اکثر مصلح اور مفکر ادیب پر غالب آگیا ہے۔ لیکن مولینا راشد حقائق سے اتنے قریب تھے اور ان سے اس درجہ متاثر ہوتے تھے کہ اُن کا ذہن فنی اصولوں کو نظر انداز کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا۔ بیشک دنیا آرٹسٹ کی محدود فکر سے کہیں وسیع تر ہے، خدا کی دنیا اور انسان کی دنیا میں کوئی نسبت نہیں۔ خدا کی دنیا میں آئے دن ایسی صورتیں پیش آتی رہتی جنہیں انسان کی دنیا گوارا نہیں کر سکتی۔ جو انسان کے فہم سے بعید ہے۔ واقعیت چاہتی ہے آرٹسٹ دنیا کو اسی طرح دکھائے جیسے وہ اسے دیکھتا ہے۔ اگر اس سے اسکے انسانی احساسات کو صدمہ پہونچتا ہے تو پہنچے۔ اگر اس سے اُسکے حسِ انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے۔ پر اُسے واقعیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں۔ مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈیلسٹ بننے کے لئے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے اُسے بیتاب کرینگی۔ ہمنے اگر نئی دہلی نہیں دیکھی ہے تو ہم اپنے قصبے کی گندگی اور عفونت سے کیونکر بیزار ہونگے۔ بے قناعتی کے لئے کسی اونچے آئڈیل کا ذہن میں ہونا لازمی ہے۔ تنقید وہی کر سکتا ہے جو صحیح سے واقف ہے۔ ادب بھی تو تنقید حیات ہی۔ اگر کسی بہتر زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو کھینچکر اصلاح کی کس منزل مقصود کی طرف لے جائیں گے؟ مولینا راشد الخیری آئڈیلیسٹ تھے۔ اُن کا تمدنی آئڈیل اسلام کا ابتدائی دور تھا جب لوگوں کے دل میں خدا کا خوف تھا اور ایمان کی روشنی تھی، جب لوگ مہمان نواز تھے۔ اور اخوت پسند تھے۔ جب توحید اپنی خالص صورت میں جلوہ گر تھی۔ جب عورت کے حقوق سلب نہیں کئے گئے تھے۔ جب اُسے چاردیواری کے اندر قید نہیں کیا گیا تھا۔ جب وہ دینی مسائل پر رائے زنی کرتی تھی۔ جب وہ اپنے حقوق سے ہی واقف نہ تھی۔ اپنے فرائض سے بھی آگاہ تھی جو فی الواقع ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ جو لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنے شوہر کے دوش بدوش

میدانِ جنگ میں جاتی تھیں۔ اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں جب وہ صحیح معنوں میں خاندان پر حکومت کرتی تھیں مولینا راشد الخیری کا آئیڈیل وہی سنہرا اسلامی دور تھا۔ وہیں سے انکے قلم کو تحریک ملتی تھی۔ بیشک وہ قدامت پسند تھے دور حاضرہ کی نمائشی تہذیب نے انہیں فریفتہ نہیں کیا تھا۔ ان کی نگاہ حق کی زندگی پر تھی۔ کتنی عفت مآب تھیں وہ پُرانے زمانے کی دہ بویاں، کتنی حیا پرور، کتنی متحمل اور صابر، کتنی مستقل مزاج جو کٹھن سے کٹھن موقعوں پر بھی وضعداری کا نباہ کرتی تھیں۔ کتنی خود دار جو حوادث روزگار کا مردانہ وار مقابلہ کرتی تھیں جو خاندان کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں جنھیں مرجانا قبول تھا بجائے اسکے کہ کسی کی شرمندہ احسان بنیں۔ آج اس دل ودماغ کی عورتیں کہاں ہیں؟ اور جو کچھ کور کسر تھی وہ اس مہاجنی، نفسیاتی مغربیت نے پوری کر دی جب سینما دیکھنا بچوں کی نگہداشت سے زیادہ مرغوب ہے اور خود آرائی روحانی تسکین کا ذریعہ جب خود پروری اور نازک مزاجی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب حقوق کے نقارخانے میں فرائض کی طوطی دہن بستہ ہو رہی ہے جب تعلیمی برکت کی جگہ لعنت ثابت ہو رہی ہے جس نے ایثار اور محبت اور ہمدردی اور انکسار کا خاتمہ کر دیا۔ جب کتوں کی محبت انسان سے زیادہ پیاری ہے اور جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ عیش کرنا چاہتا ہے چاہے دوسروں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

اور جسے ہم قدیم کہتے ہیں کیا وہ اسی لئے موردالزام ہے کہ وہ قدیم ہے! آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ قدیم ہی نئے دور کی منزل ہے۔ وہی پرانی اخوت، وہی پرانی سادگی اور سچائی آج اس نئے دور کی منزل مقصود ہے۔ نیا دور پھر اس قدیم کی طرف جا رہا ہے۔ تمدن کی غلط تفسیر نے سوسائٹی پر بے معنی پابندیاں عائد کیں، پردہ کی قید امارت اور ریاست کی شان میں داخل ہوگئی توہمات ایمان کا جزو بن گئیں۔ اور ہم اُسی تاریکی میں رستہ ٹٹول رہے تھے کہ نئے دور نے آکر ہمیں بتایا تم غلط رستے پر جا رہے ہو۔ یہ عروج کا رستہ نہیں پستی کا راستہ ہے۔ لیکن جب ہماری آنکھوں کی چکا چوندمٹی تو ہمیں معلوم ہوا کہ قدیم معاشرت اپنی اپنی سادگی اور خلوص میں نئی معاشرت کی نمائش اور تکلف سے کہیں بہتر تھی۔ اور روسو نے فطری زندگی کی جو آواز اُٹھائی تھی اور جس کا اُس وقت مضحکہ اُڑایا گیا تھا آج ساری دنیا کے مفکر اُس آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ انسان کی نجات فطرت کی طرف واپس جانے میں ہے۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم زیادہ فطری غذا کھانے، زیادہ فطری زندگی بسر کرنے زیادہ فطری لباس پہننے کی جانب مائل ہیں۔ حالانکہ ہماری قدامت ابھی ان تبدیلیوں کو بد مذاقی اور عریانیوں کے نام سے ہی پکار رہی ہے۔ ہمنے محکومیت کی اُس جان کندنی میں یہ سمجھ لیا کہ ہمارا تمدن، ہمارا مذہب، ہمارا سب کچھ ذلیل ہے۔ اور مغرب کا تمدن اور مذہب اور سب کچھ قابل ستایش۔ مگر اب اتنے دنوں کے بعد ہمیں معلوم ہونے لگا ہے کہ اس تمدن سے مغرب خود اپنی نجات نہیں حاصل کر سکا۔ وہاں بھی مفکروں کے دماغ ایک نئی تہذیب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہاں بھی وہ طبقہ جس میں سرمایہ داروں اور ملوکیت پرستوں کی کثرت ہے برسر اختیار ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں فوجیں ہیں، اور پارلیمنٹیں ہیں۔ اور حکام میں اُسی کی آواز آخری آواز ہے۔ اور اگرچہ عوام کا طبقہ صدیوں سے سرمایہ داروں کے اس قلعہ کو توڑنا چاہتا ہے مگر قلعہ اتنا

مضبوط اور کھائیوں سے اتنا گہرا اور مہلک اسلحہ سے اس قدر مسلح ہے کہ اس میں ایک شگاف ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے۔
مولینا **راشد** کی قدامت پرستی دور جدید سے خائف ہونے کے بدلے اُن کا خیر مقدم کرتی تھی۔ مگر اُسی حد تک کہ اسکے مضر اثرات سوسائٹی میں نہ پھیلنے پائیں۔ اُن کے موضوعات فلسفہ یا نفسیاتی مسائل پر مبنی نہ ہوتے تھے۔ زندگی کے نقشے اس طرح کھینچنا کہ معاشرت کی موجودہ خرابیاں دُور ہوں یہی اُن کا مقصد تھا اور اس میں وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔ اسراف اور بے معنی رسوم اور باطل اعتقادات اور نفس پرستی وہ خاص اسباب ہیں جنھوں نے سوسائٹی کی یہ دُرگت بنا رکھی ہے۔ اور آپ نے بار بار مختلف پیرایوں میں ان کی جڑ کھودنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کو خانہ داری کے امور کی وہ واقفیت تھی جو آج شاید پُرانے خاندانوں کی بڑی بوڑھیوں کو ہو تو ہو۔ "حیات صالحہ" میں آپ نے صالحہ کی شادی کے موقعہ پر کپڑوں اور گوٹے ٹھپے کی جو تفصیل دی ہے اُس کی نوعیت سمجھنے کے لئے ایک لُغت کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ وہ چیزیں اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں غیر معمولی سیرتیں بہت کم ہیں بیشتر وہی انسان ہیں جنھیں ہم روز دیکھتے ہیں۔ اور اگرچہ وہ فرد نہیں۔ بلکہ اپنے طبقہ کے نیابت کنندے ہیں۔ لیکن مولینا ان کے ظاہر و باطن سے اس قدر مانوس ہیں کہ ان عام سیرتوں میں بھی شخصیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ ان کی نفسیاتی تحلیل نہیں کرتے۔ اور نہ ہمیں اس توجیہ کی کوئی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ حالات اس قدر شاہد اتی ہیں کہ باطن کے انکشاف کی کوشش بیکار معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے تخیل اور ایجاد سے اتنا کام نہیں لیا جتنا تجربہ سے۔ اس لئے ان کے کردار عام طور پر فطری ہوتے ہیں۔ ان میں الجھاؤ اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ جب افسانہ نگار ایسے کردار کی تخلیق کرتا ہے جن کا وجود محض اُسکے ذہن میں ہے۔ جسے اُس نے شعوری حالت میں کبھی نہیں دیکھا تو اُسے نفسیات اور قیاسات سے کام لینا پڑتا ہے ایک خاص سیرت کا انسان مخصوص حالات میں کیا طرز عمل اختیار کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اُسے یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کہیں سیرت مخصوص اور اس کے طرز عمل میں کوئی نامطابقت نہ پیدا ہو جائے۔ مگر مولینا **راشد** کے افراد تو وہ ہیں جنھیں انہوں نے جیتے جاگتے دیکھا ہے۔ ان کے متعلق انہیں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ وہ مخصوص حالات میں وہی برتاؤ کریں گے جس کی اُن سے اُمید کی جاتی ہے یا جن کا مولینا نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے افراد یا تو قدامت پرست ہیں اور ہر ایک نئی چیز کے دشمن چاہے وہ سوسائٹی کے لئے کتنی ہی مبارک کیوں نہ ہو۔ یا وہ نئی روشنی کے دلدادہ ہیں اور ہر ایک پُرانی چیز کے دشمن چاہے اس میں کتنے ہی محاسن کیوں نہ ہوں۔ آپ کے کیرکٹروں میں ارتقا کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے وہ اتنا فطری اور ماحول سے اتنا ہم رنگ ہے کہ فوری تغیرات بھی ہمیں اُلجھن میں نہیں ڈالتے۔ "حیات صالحہ" میں "صالحہ" کے اطوار میں جو تغیر ہوتا ہے وہ اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ہمیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ وہی لڑکی جو سید کاظم حسین کی آنکھوں کی پُتلی تھی ماں کے مرنے کے بعد اس قدر افسردہ خاطر ہو جاتی ہے کہ نہ اُسے خانہ داری کی فکر رہتی ہے نہ اپنے عزیز باپ کی آسایش کی پروا۔ جب دیکھو ماں کو یاد کرکے روتی رہتی ہے۔ گھر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ بچے آوارہ پھرنے لگتے ہیں۔ کاظم حسین دوسری شادی کرنے پر راضی تو بڑی مشکل سے ہوتے ہیں مگر شادی ہوتے ہی

سلیقہ دار اور جوان تمیزن انپر جادو سا کر دیتی ہے۔ صالحہ کی طرف سے اُن کی آنکھیں پھر جاتی ہیں۔ وہی بیٹی پر جان نثار کرنے والا باپ اُسکا دشمن ہو جاتا ہے اور ایک بدمعاش آدمی کے ساتھ اُسکا نکاح کر دینے بھی پس وپیش نہیں کرتا۔ شادی کے بعد صالحہ کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اُسپر بدمزاج شوہر کی سختیاں اور بھی ناقابل برداشت۔ ایک روز وہ ظالم صالحہ کو اس قدر پیٹتا ہے کہ قریب قریب اُس کی جان ہی لے لیتا ہے۔ صالحہ ایک صابر و شاکر لڑکی ہے۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے باپ کی زیارت کے لئے بیتاب ہے۔ مگر کاظم حسین کو اُسپر قطعی رحم نہیں آتا۔ اور صالحہ اسی بیکسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ حالات وہی ہیں جو ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ مگر اس واقعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ کہیں فسانہ کا گمان نہیں ہوتا۔ محض تخیل سے صالحہ جیسے کیرکٹر کی تخلیق مشکل ہے۔ وہ تو ان صدہا لڑکیوں میں سے ایک ہے جو مصنف کی نذر سے گذری ہیں۔ اور کاظم حسین بھی دیکھے بھالے آدمیوں میں ہیں جو فرشتہ خصلت ہونے پر بھی نئی بیوی کے حسن اور شباب اور سلیقہ وصفائی پر اتنے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی ساری فضیلت دہری رہ جاتی ہے۔ نئی بیوی پاکر انسان اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں کا ایسا دشمن ہو سکتا ہے! "حیات صالحہ" محض قصہ نہیں ہے۔ وہ سچ مچ حیات ہے۔ اس میں بیاگرفی کی حقیقت اور تفصیل اور زندگی موجود ہے۔

"حیات صالحہ" میں اگر نسائیت کا اونچا آئیڈیل پیش کیا گیا ہے تو "طوفان حیات" میں ایک کم عقل، اڑاؤ، باطل پرست، ضدن، عورت کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ شوہر کی کیا حالت ہے اس کی اُسے مطلق پروا نہیں۔ وہ تو دل کھول کر خرچ کرے گی۔ چھوٹی چھوٹی معمولی تقریبوں میں بھی وہ اس فراخدلی سے اہتمام کرتی ہے کوئی دفینہ موجود ہے۔ خفیف الاعتقاد حد درجہ کی۔ پیروں اور ملانوں کو خدا سمجھنے والی۔ اسکا شوہر انعام حالات زمانہ سے باخبر ہے، اصول پرور بھی، مگر نہایت کمزور۔ بیوی کی ضد اور حجت کے سامنے لاچار۔ ساری جائداد برباد ہو جاتی ہے۔ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ قرقی آتی ہے۔ میاں بیوی گھر سے بھاگتے ہیں۔ ایک شریف بزرگ کو انپر رحم آتا ہے۔ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ماں کی یہ تو کیفیت ہے۔ اور اس کی لڑکی ناصرہ حد درجہ سلیقہ شعار حسن انتظام میں لاثانی۔ نہایت دیندار۔ شرک سے کوسوں دور رہنے والی۔ اس کے حسن انتظام سے انعام کو زندگی کے آخری دنوں میں کچھ سکون حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس لڑکی کی شادی ایک گمراہ مشرک سے جسے پیروں اور فقیروں کا خبط ہے۔ مُلّانے ناصرہ کو مخل دیکھ کر اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ میاں بیوی میں ان بن ہوتی ہے۔ ایک شاہ صاحب نے انعام کو تسخیر کر رکھا ہے۔ ان کے ایماسے ناصرہ گھر سے نکال دی جاتی ہے۔ مگر بعد کو قلعی کھلتی ہے کہ پیر صاحب رنگے سیار تھے۔ غضب کے مفسد اور حرام خور۔ مریدوں کی سہل اعتقادی کے مزے لوٹا کرتے تھے۔ پارسائی کا ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ سیدھے سادھے ضعیف اعتقاد والے اُس میں پھنستے رہتے تھے۔ آخر انعام کو معلوم ہوتا ہے کہ اس ملانے اُس کے بڑے لڑکے کو زہر دیا ہے۔ ملا ٹھوکریں مار کر نکال دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں انعام اور ناجرہ خاص افراد ہیں۔ دونوں میں واقعیت کا کمال موجود ہے۔ انعام یا ناجرہ کے کیرکٹر میں کہیں بھی ایسا موقعہ نہیں آتا۔ کہ دل میں کوئی شبہ پیدا ہو۔ حقیقت کا وہم اول سے

آخر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے ناجرہ اور انعام دونوں ہی کی تخلیق ایک خاص منشا سے کی ہے۔ اُن سے وہی حرکات سرزد کرائی ہیں جو ان کی منشا کو پورا کریں۔ ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلوائے ہیں جو انہیں افسانہ کے مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری معلوم ہوئے۔ لیکن کہیں افسانہ کا گمان نہیں ہوتا۔

مولانا راشد الخیری کے طرز تحریر میں روانی ہے۔ اور سلاست ہے۔ دہلی کی بیگماتی زبان لکھنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے بعض اوقات وہ ایک ہی خیال کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جملے لکھتے چلے جاتے ہیں جس سے عبارت میں ترنم زیادہ ہو جاتا مگر بلاغت کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ ضرب الامثال کا آپ کے پاس لازوال خزانہ ہے۔ سوسائٹی کے دردناک مناظر کھینچنے میں آپ کو یدطولیٰ ہے۔ ایسے موقعوں پر آپ جذبات کا اور الفاظ کا ایسا استعمال کرتے ہیں کہ ناظر کا کلیجہ ہل جاتا ہے۔

غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لئے لکھا ہے۔ جس طبقہ کو اُٹھانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے۔ اتنا ہی نہیں کہیں کہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تبلیغ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر آپ نے اُردو میں عورتوں کے لئے جو لٹریچر مہیا کیا ہے وہ زندہ جاوید ہے۔ اور اُس کے لئے اُردو زبان ہمیشہ آپ کی ممنون رہے گی۔

چند آنسو

پریم چند

خضر نسواں محسن اعظم مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کے مزار مقدس پر

ہو گیا خاموش کیوں اے بلبل ہند آہ آہ — پھر لب معجز نما سے کچھ تو کہہ بہر اللہ
کوئی صورت زندگی کی اب نظر آتی نہیں — وہ تیری آواز شیریں کان تک آتی نہیں
اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں تیرے مضمون الم — جس کے اک اک لفظ پر دھنتے تھے سر اہل قلم
تھا تیرے دم سے بہار بوستان علم فن — رو رہے ہیں تجھ کو اے شیریں نوا اہل وطن
راہ سیدھی زندگی کی اب ہمیں دکھلائے کون — خضر نسواں اب ہماری رہبری کو آئے کون
کون اس مظلوم فرقے کی کرے گا دلدہی — کس کو خون رُلوائے گی ہم بیکسوں کی بیکسی

اے مکین فردوس کے کچھ ہے ہماری بھی خبر
تیری فرقت میں جو گریاں ہیں مثال ابر تر

انور جہاں اورنگ آباد

جناب مولانا راشد الخیری مرحوم و مغفور

از خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب بانیٔ مسلم گرلز کالج علی گڈھ

مولانا راشد الخیری مرحوم ہماری قوم میں اُن چند ہستیوں میں سے تھے جن کی وفات پر ہر چھوٹا بڑا جو اُن کے اوصاف سے اور ان کے کارناموں سے واقف تھا کہ اُٹھا کہ ہائے اُن کی رحلت سے قوم کو نقصان عظیم پہونچ گیا۔ یہ آواز سُن کر سعدی کا یہ زرین خیال یاد آگیا۔

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر — زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

لیکن اس خیال کے ساتھ اس امر کا بھی احساس دل میں پیدا ہوا کہ مولانا مرحوم کی نسبت صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے، کہ وہ اچھے انسان تھے اور اب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بلکہ ان کی نسبت ہر شخص بہت دنوں تک کہا کرے گا کہ ایک مفید زندگی کا خاتمہ ہوا اور اُس کے خاتمہ سے ہم کو نقصان پہونچا۔ **مولانا راشد الخیری** صاحب اُردو زبان کے چوٹی مولفین و مصنفین میں سے تھے اور ان کی تصانیف سے اُردو لٹریچر میں بہت ہی قیمتی اضافہ ہوا۔ زبان کی شستگی اور سادگی مولانا مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کی تصانیف کو ہندوستان کے کونہ کونہ میں مقبولیت کا درجہ حاصل ہوا۔ دہلی و لکھنؤ کے مصنفین اس بات کا بہت کم خیال رکھتے ہیں کہ اردو ہندوستان کے مسلمانوں اور ایک بڑی تعداد کے ہندوؤں کے لئے عالمگیر مادری زبان کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے اور ہم کو اپنی تحریروں میں وہ طرز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کل اُردو دان آبادیٔ ملک کے لئے آسان و عام فہم ثابت ہو۔ ہمارے مولانا مرحوم نے اس بات کو اپنی تصانیف میں ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی وجہ سے ہندوستان میں ان کی اُردو نویسی کی دھاک ہے اور غیر صوبوں کے رہنے والوں کو بھی ان کی تصانیف کا پڑھنا مرغوب طبع ہے۔

مولانا نے جس قدر کتابیں لکھیں ان کی تعداد تو یاد نہیں ہے لیکن اُس زمانہ سے جب وہ علی گڈھ کی کلکٹری میں ملازم تھے میں ان کی تصانیف دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ زیادہ تر زنانہ لٹریچر کو ترقی دینے کی طرف مائل رہے۔ دہلی کی بیگمات کی زبان جو اس درجہ میٹھی اور سلیس زبان سمجھی جاتی ہے مولانا مرحوم کو اُس کے خوشنما چربے اُتارنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

زبان تو اظہار خیالات کا ایک آلہ ہے۔ ایک مصنف کے لئے سب سے پہلی ضرورت زباں دانی نہیں ہے۔ بلکہ اچھے خیالات کی آمد ہے۔ بعض وقت مجبور ہو کر ایک مصنف یا شاعر آورد سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن خواہ آمد ہو یا آورد دماغ میں خیالات کا ایک معقول ذخیرہ جمع رہنا ہر مصنف و شاعر کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے مصنفین یعنی اُردو کے مصنفین میں اقت

تک عموماً جو کمی دکھائی دیتی ہے وہ خیالات کی کمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ برساتی حشرات الارض کی طرح بہت سی تصانیف کو کبھی دوبارہ کسی پریس میں جانا نصیب نہیں ہوتا۔ پیدا ہوتے ہی اپنے خاتمہ کی سند بھی ساتھ لاتی ہیں ایسی حالت میں ہماری قوم کے وہ مصنفین جو خیالات کی اعلیٰ سطح پر پہونچکر حالات دُنیا یا جذبات قلبی کے صحیح چربے اُتار کر ہمارے لئے بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمارے سچے محسن ہیں اور ہم کو ان کے احسانات کا معترف ہونا چاہئے۔ **مولانا راشد الخیری** صاحب کی متعدد تصنیفات آیندہ نسلوں کے لئے ہمارے علمی ذخیرے میں شامل ہوکر بطور یادگار کے باقی رہینگی۔ اور قوم ہمیشہ اُن کا احسان مانتی رہے گی۔

مولانا راشد الخیری صاحب کو فرقہ اُناث سے خاص ہمدردی تھی اور انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ صنف نازک کے سود و بہبود کے مشاغل میں صرف کیا **عصمت**۔ **بنات** دو رسالے ہندوستان کی عورتوں کے دل میں مولانا کی ہمدردی کا احساس پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ان رسائل کے ناظرین اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں۔ کہ علاوہ انتخاب مضامین کے جو کچھ اُنہوں نے سپرد قلم کیا اُن کے ہر ہر لفظ سے فرقہ اُناث کی ترقی و بہبودی کے خیالات ظاہر ہو رہے ہیں۔

عورتوں کو چاہیئے کہ وہ مولانا کی یادگار میں ایک ایسا فنڈ قائم کریں کہ اُس سے غریب ہونہار لڑکیوں کو وظائف دے کر تعلیم دی جائے۔ اور اُن وظائف کا نام **راشد الخیری وظائف** رکھا جائے۔ مولانا نے ایک عرصہ ہوا دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں لڑکیوں کی بڑی تعداد تعلیم پاتی تھی۔ یہ بھی اُنہوں نے ایک بڑی خدمت کی تھی۔

اب اس تحریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے صاحبزادگان کو جن میں سے مسٹر رازق الخیری صاحب اپنے باپ کے نہایت لائق بیٹے ہیں۔ صبر جمیل عطا کرے اور ان کو لائق باپ کے لائق بیٹے بننے کی قابلیت عطا کرے +

خون کے آنسو

(۱) جگر شق ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے مرے مولا
تلاطم بحرِ غم میں، اشک کا سیلاب ہے اُمڈا
رواں ہے آنکھ سے خون جگر کا آہ اک دریا
کہ خود اک بحرِ بے پایاں ہے جس دریا کا ہر قطرہ

(۲) لبوں پر ہیں وہ آہیں خونِ دل کی جن میں سُرخی ہے
کروں کیا ضبط رہ رہ کر جگر میں ٹیس اٹھتی ہے
اِدھر اشکوں کی بارش ہے اُدھر آہوں کی بجلی ہے
اندھیرا غم کا ہے دل پر گھٹائے یاس چھائی ہے

(۳) عجب غمناک ہے اے زندگی اب تیرا مستقبل
فسانہ دورِ ماضی کا خدارا مت سنا اے دل!
ہیں بحرِ یاس کی موجیں نظر آتا نہیں ساحل
ٹٹولوں راہ اب کیسے ہوئی گُل مشعلِ منزل

(۴) چھپا یا آفتابِ آرزو سے طلعت انور
پس پردہ ہوا پوشیدہ اب تقدیر کا اختر
بُجھی وہ شمع غربت میں مسافر کی جو تھی رہبر
یہ پروانے جلیں گے آتشِ فرقت میں تا محشر

(۵) خبر بھی ہے تجھے دنیا کی کچھ اے ہند کی عورت
کہ خوش قسمت تھی کل تک آج ہے یک لخت بدقسمت
زمانہ پھر گیا! ہے عہد گُل گلزار سے رخصت
خزاں کے دستِ جور افزا نے تیری لوٹ لی جنت

(۶) بھرا تھا درد تیرے دل کا اُف جس کی طبیعت میں
شریک غم تھا تیرا آہ جو ہنگامِ حسرت میں

بہائے جس نے آنسو ساتھ تیرے شامِ غربت میں
وہ تیرا باپ، جاکر سوگیا ہے کنجِ تربت میں

(۷) وہ جس کے دیدۂ بینا نے تیرا رازِ دل ڈھونڈا
کتابِ غم کا تیری جس نے ہے اک اک ورق اُلٹا
وہ جس نے تیری غمگیں آنکھ کو اک داستاں سمجھا
وہ ہی جو مرتے دم تک تیرا ہی کلمہ رہا پڑھتا

(۸) ترے غم میں مثالِ شمع جس نے زندگی کاٹی
زباں بن کر ترے خاموش دل کی ترجمانی کی
ترے نالوں میں جس نے قوتِ پرواز پیدا کی
ترے دل کی گھٹی آہوں کو دے دی راہ آزادی

(۹) ترے اشکوں کو جس نے اپنے دامن میں سمیٹا تھا
ترے آنسو کو جس نے نقدِ جاں دے کر خریدا تھا
ترے زخموں کو جس نے دستِ ہمدردی سے پونچھا تھا
ترے ناسورِ دل پر مرہم تازہ لگایا تھا

(۱۰) مٹا دی اپنی ہستی جس نے یوں عورت کی خدمت میں
فنا جو ہو گیا دل سے یتیموں کی حفاظت میں
ملا جو خاک میں رانڈوں کی خاطر اور محبت میں
لڑا جو نیرِ دولت سے ذرّوں کی حمایت میں

(۱۱) دکھایا جس نے مردوں کو کہ شوہر ہو تو ہو ایسا
بتایا جس نے عالم کو برادر ہو تو ہو ایسا
انیسِ بے کساں مظلوم پرور ہو تو ہو ایسا
مصیبت میں شریکِ غم برابر ہو تو ہو ایسا

(۱۲) مسلمانوں کی وہ اک یادگارِ بہترین یعنی
وہ اک ہلکی سی ضو یعنی چراغِ شامِ رفتہ کی
وہ اسلامی تجلی کی مٹی سی اک نشانی تھی

دریغا حسرتا! وہ نقدِ ملت ہم نے یوں کھو دی

(۱۳) فرشتو! میں نے مانا خلد کو اب اُس کی حاجت تھی
وہاں روحوں کو بھی اک شمع ایمان کی ضرورت تھی
مگر اُن سے زیادہ ہم غریبوں کی مصیبت تھی
نہ تم نے یہ ذرا دیکھا کہ کیا عورت کی حالت تھی

(۱۴) شبِ تاریک ہے منجدھار میں عورت کی ہے کشتی
ہوائیں ہیں مخالف ہے گھٹائے یاس مستولی
پکاریں آہ اب کس کو نہیں ہے ناخدا کوئی
اجل! تجھ کو مبارک ہو ترا یہ ذوق بیدردی

(۱۵) فرشتوں خلد تک یہ آہِ آتش ساز پہونچا دو
خدارا۔ آسمان تک بن کے تم ہم راز پہونچا دو
مرے نالے کو کب ہے قوتِ پرواز۔ پہونچا دو
کہ "مولانا" کی جانب دکھ بھری آواز پہونچا دو

(۱۶) سلام آرزو پہونچے جمالہ روح راشدؒ کو
کہ مقبولِ نگاہِ لطف اک آنسو کا قطرہ ہو
بس اتنی عرض ہے میری خدا کے واسطے سُن لو
وہاں بھی یاد کر لینا کبھی "مظلوم عورت" کو

بلقیسِ جمال بریلوی

عصمت کے اس راشد الخیری نمبر کے علاوہ

بنات، جوھر نسواں، اور ساقی ان تین پرچوں کے خاص نمبر بھی حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شائع ہوں گے۔ بنات کا خاص نمبر ۲۰۔ اگست کو۔ ساقی کا یکم ستمبر کو اور جوہر نسواں کا ۱۰۔ ستمبر کو۔ بنات کے خاص نمبر کے لئے مضامین ۲۰۔ جولائی تک آجانے چاہئیں +

منیجر

دہلی مرحوم

از حضرت لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی

اس مضمون کی سُرخی کے لئے میں مولانا حالی کا ممنون ہوں۔ اور میری نظر میں مولانا راشد الخیری کی موت دہلی کی موت ہے!

حالی نے جب اپنے "شہر آشوب" کی ابتداء

"تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ"

سے کی ہوگی تو اُس وقت وہ کن جذبات کا معمول تھے؟ ان کے پیش نظر کونسی محفلیں تھیں؟ اور انھیں کن صحبتوں کی یاد تڑپا رہی تھی؟ ان کے محسوسات کا صحیح اندازہ کرسکنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ بہرحال گزشتہ و موجودہ دہلی کا تقابل ان کے سامنے تھا، اور موجودہ کے مقابلے میں گزشتہ کی یاد ان کے "نوحے" کا محرک بن گئی۔ حالی کے لئے دہلی جس سے مراد تھی، وہ دربار مغلیہ کی عظمت وشوکت اور خانوادہ تیموری کا جاہ وجلال تھا۔ اور اس کا مٹ جانا دہلی کے مٹ جانے کے ہم معنی تھا۔

لیکن حالی کے بعد کی نسل کے لئے دہلی جس سے عبارت تھی وہ اُسکا گہوارۂ علم وادب ہونا اور اس کی محفل شعر وسخن تھی۔ علم وادب کی یہ محفل حالی کے زمانے میں بھی رونق پر تھی۔ اور شعرائے متاخرین کے نغموں سے دہلی کی فضا معمور ہونے کے باوجود ان کے لئے دہلی "مرحوم" تھی۔ پھر دائے برحال ما کہ ہمنے اگر دہلی کو دہلی جانا تو اس کی محفل شعر وادب ہی کی صورت میں! لیکن آج جب میر ناصر علی خاں، قاری سرفراز حسین کے بعد مولانا راشد الخیری رخصت ہوچکے ہیں تو تو پھر بتلائیے دہلی کہاں رہی؟ یہ بزرگ ہستیاں دہلی کی آخری شمعیں تھیں اور مولانا راشد الخیری کی موت سے اس محفل کی آخری یادگار بھی اٹھ گئی۔

دور حاضر کے دہلوی ادیب وانشاپرداز مجھے معذور رکھیں کہ مولانا راشد الخیری کی موت سے دہلی فی المعنی "مرحوم" ہوگئی، اور اب دہلی کی ادبیت ومرکزیت کا علمبردار کوئی نہ رہا۔

مولانائے مرحوم سے میرے تعلقات کا زمانہ چوبیس پچیس سال ہے، اور میں بجا فخر کرسکتا ہوں کہ مولانا کو میرے ساتھ خصوصیت تھی۔ اس زمانے میں میرا قیام بمبئی میں تھا۔ ربط وتعلق کی ابتدا مراسلت سے ہوئی۔ اور پھر میں نے محض شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ اس ملاقات کا نقشہ اس وقت بھی میری نظروں میں ہے۔ اور اُس کی یاد آج بھی میرے حافظے کا اُبھرا ہوا نقش ہے۔ کیونکہ میرے عہد شعور میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے مشرقی شرافت

اور اسلامی خلوص قلب کا اندازہ ہو سکا۔ اس موقعے پر میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اسی ملاقات نے میرے ذہن و دماغ کے مغربیت کی طرف رجوع ہونے کی اصلاح کی اور میرے قلب میں مشرقیت کی قدر کا سچا احساس پیدا کر دیا۔

مولانا سے میری خط و کتابت کی ابتدا ان کا افسانہ "شاہین و دراج" تھا۔ اس فسانے کو شائع ہوئے اگرچہ کم و بیش تیس سال گزر چکے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ میں نسبتاً کچھ بہتر سمجھنے کے قابل ہوں اور باوجود اس کے کہ اردو زبان کے بعض عمدہ عمدہ فسانے میری نظر سے گذر چکے ہیں، لیکن "شاہین و دراج" کا جو ادبی مرتبہ میرے خیال میں اس وقت قائم ہوا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔

خوش قسمتی سے میرے پاس مولانا کے چند خطوط محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے میں یہاں صرف دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، کیونکہ مولانا کے علاوہ اخلاق، احساس، خودداری اور جذبہ خدمت کا ثبوت اس سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔

پہلی بات ان کے افسانوں کے مجموعے کے انتساب کے ذیل میں ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ڈیڈیکیشن کی کیفیت یہ ہے کہ میں اس کو مطلق پسند نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ میں نے آجتک کوئی کتاب ڈیڈیکیٹ نہیں کی "صبح زندگی" کے واسطے کوشش بھی ہوئی کہ بیگم بھوپال کے نام معنون ہو۔ مگر مجھے گوارا نہ ہوا۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوست کے نام آپ تجویز کریں تو بسر و چشم۔ لیکن اگر کسی بڑے آدمی کے نام آپ تجویز کریں تو مجھے تامل ہو گا۔

غالباً "تہدیہ" سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اسکی ضرورت سمجھوں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے....."

دوسری بات خدمت نسواں سے تعلق رکھتی ہے:-

"ہر طرف سے یہ اصرار ہے کہ میں حقوق نسواں سے ہاتھ اٹھاؤں۔ خیال فرمائیے کیسی غلط خواہش ہے۔ اکثر حضرات تو مجھے پردہ کا مخالف سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں اس معاملے میں کٹا مسلمان ہوں"۔

میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہ دو اقتباسات مولانا کے کردار کی بلندی و استقامت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مولانا راشد الخیری کے متعلق سب کچھ کہا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی خدمت زبان و ادب اور حمایت حقوق نسواں اتنی اہم اور ایسی گرانقدر ہیں کہ ان کو اگر ساری عمر بھی دہرایا جائے تو حق ادا نہ ہو سکے گا۔ مولانا نے اپنی انشا و ادب سے "بے میل" زبان کے جو جواہر پارے یادگار چھوڑے ہیں وہ امٹ ہیں۔ ان کی اکثر کتابوں کا سا قبول عام اردو ادب میں شاید ہی کسی دوسرے مصنف کی کتاب کو ملا ہو۔ مولانا کی صناعت ادب ان کے ابتدائی فسانوں میں جو مخزن اور تمدن میں شائع ہوئے پوری طرح رونما ہوئی ہے۔ اور **عصمت** کے ذریعے سے ہندوستان کے دور و دراز گوشوں میں ٹکسالی اردو کا مذاق پیدا کر کے مولانا نے ناقابل اندازہ خدمت کی ہے۔ **مولانا راشد الخیری کا عصمت** دراصل

ایک ادبی ادارہ تھا، اور اس ادارے کی تربیت یافتہ بیبیاں اُس تعلیم کو نسلوں کے اندر منتقل کر رہی ہیں۔

مرحوم نے تقریباً ساٹھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے مولانا کی دو زبردست خصوصیتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ملکی معاشرت سے متاثر یا اسلامی تعلیم سے منحرف ہو کر ہم نے اپنی عورتوں کے اسلامی یعنی فطری حقوق کو بیدردانہ پامال کیا ہے اور اس بدیعۂ فطرت پر اتنے مظالم توڑے ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے قدیم معاشرت کے جوہر خلوص و صداقت کو محسوس کئے بغیر رائگاں کر دیا ہے مولانا نے ساری عمر انہیں دو قومی حادثوں کا رونا رویا ہے۔ ہمارے طبقہ اناث میں آج جو کچھ بیداری پائی جاتی ہے۔ اور اپنی قدیم وضع و شرافت کے ضائع ہونے کا ہم جتنا بھی احساس کر رہے ہیں اس میں سب سے بڑا حصہ مولانا راشد الخیری کی جگر کاویوں اور دلخراشیوں کا ہے۔

مولانا کی انشا و ادبیت میرے خیال میں "تاثریت" کے ذیل میں آتی ہے جسے انگریزی میں Impressionism کہتے ہیں۔ مغربی اصول کے مطابق اس کے فنی محاسن و نقائص سے قطع نظر یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ان کی تحریر اپنا مقصود و غایت حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہتی۔ اور صناعت (آرٹ) میں یہ سب سے بڑی کامیابی ہے کہ صناع اپنا مقصود و غایت حاصل کر سکے!

مولانا راشد الخیری کے لئے "مصور غم" کا خطاب کس نے تجویز کیا؟ یہ تو میں نہ بتا سکوں گا۔ لیکن اس خطاب کا صحیح اور مناسب ترین ہونا اس کے قبول عام سے ثابت ہے۔ مولانا ایک زبردست حزنیہ نگار ادیب تھے! ان کی حزنیہ نگاری میں جو شدت ہے اُسکے ساتھ جب اُنکی مکالمہ نویسی کی قابلیت و کمال سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ڈرامانویس کیوں نہ ہوئے! میرا یقین ہے کہ وہ اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو ان کی قوم ان سے ڈراما ہی لکھواتی۔ ہمارا ملک اگر قدر ناشناس نہ ہوتا اور مولانا نے ڈراما کی طرف توجہ کی ہوتی تو وہ ہندوستان کے "اوریجنل" اور پہلے ڈرامانویس ہی نہ ہوتے بلکہ انہوں نے دنیا کے بڑے ڈراما نگاروں کی صف میں جگہ پائی ہوتی۔ ڈرامہ کے لئے جو عناصر ضروری ہیں وہ مولانا کی تحریر میں جمع تھے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مولانا کی ادبی صناعت ان کے دور اول کی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر ہوئی ہے اور انکے ناولوں میں پلاٹ کی کشاکش اور کردار کا تنوع بھی موجود ہے۔ ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مختصر فسانوں میں پلاٹ تشنہ اور کردار کا تنوع کمی کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ وہ افسانے اصلاحی ہیں، اور ایسے افسانوں میں تکمیل صناعت سے زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ موثر ثابت ہوں!

الحاصل مولانا راشد الخیری کی موت ایک قومی نقصان ہے۔ لیکن ان کی خصوصیات کے اعتبار سے میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ ان کی موت سے اردو زبان کو زیادہ نقصان پہنچا یا طبقہ نسوان کو! بلا ریب مولانا کی ذات میں ہم نے ایک بہت بڑا ادیب کھویا اور حقوق نسوان کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار گم ہو گیا! وہ اپنے عہد کے بڑے مصلحوں میں سے تھے اور

اگلی شرافت اور اسلامی خلوص کا کامل نمونہ۔

مولانا راشد الخیری اگر کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو معلوم نہیں کہ ان کا نام اور کام کن کن صورتوں اور عنوانوں سے زندہ و پائندہ رکھا جاتا۔ چونکہ میں اپنی قوم کے جذبہ عمل، احساس ملی کی طرف سے مایوس ہوں، اس لئے ان کی کوئی یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کرکے میں مرحوم کے احساس خودداری کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن اس لئے کہ انسان حواس کا پتلا ہے میں اپنی قوم کے مردوں سے یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اس بزرگ ہستی کی روح کو آسودہ رکھنے کے لئے جس نے اپنے آپ کو قوم کی زبوں حالی کی اصلاح کے لئے وقف کردیا تھا یہ نہایت ضروری ہے کہ خلع قانون پاس کرایا جائے۔ اور اس کام کے لئے میں ہر جہت سے سید آصف علی صاحب ایم ایل اے کو موزوں ترین ہستی سمجھتا ہوں بمتعدد وجوہ کی بنا پر یہ کام سید صاحب موصوف کا فرض ٹھیرتا ہے۔ دوسری طرف میں اپنی قوم کی عورتوں سے بھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بہیو تمھارا سچا وکیل تمھاری حمایت میں ختم ہوگیا۔ تم اس کا اعتراف صرف اس طرح کرسکتی ہو کہ اپنے تئیں ایسی بیبیاں بنانے میں لگی رہو جیسی کہ مرحوم تمھیں بنانا چاہتے تھے۔ یعنی قرن اولی کی مخدرات!

ل۔ احمد

علامہ راشد کے مزار پر

از شفیق قاضی بھیڑوی

آہ! اے درد کے عکاس! مصور غم کے — نہیں ملتی ترے ملنے کی ہیں کوئی سبیل
شور ہے چھوٹ گئی ہم سے جہاں والوں میں — ایک اردوئے معلی کی ترقی کی دلیل
ہائے اے گوہر نایاب نہ ہونے سے ترے — کس قدر آگئی اب رشتۂ تادیب میں ڈھیل
ہر زن و مرد کو دنیا میں مرقعہ تیرا — راہ تاریک عمل کو تھا منور قندیل
مرأت حق و صداقت و سراپا اخلاص — کتنی اچھی تری سیرت تھی تو کتنا تھا شکیل
ترے مضمون کے الفاظ ثریا بردوش — تری رفتار قلم جنبش بال جبریل
سارے فرزانے ہیں گل ریز ترقی سے تری — کامیابی سے تری ہیں ثمر انداز عقیل

ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے دل قاضی میں
کس لئے یوں طلبی میں ہوئی تری تعجیل؟

مُصَوّرِ غم کی خوش طبعی

از جناب ملّا محمد الواحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ

مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی تصنیفات پڑھنے کے بعد غالبًا اس کا یقین مشکل سے آسکتا ہے کہ مولانا خوش طبع بھی ہونگے اور جنہیں کبھی رواروی میں مولانا سے ایک آدھ مرتبہ ملاقات کا موقع ملا ہے وہ تو انہیں خوش طبع کیا شاید خوش اخلاق ماننے میں بھی تامل کرینگے۔ مولانا نے دو تین کتابیں مذاحیہ لکھی ہیں۔ مگر ان کا امتیاز خصوصی حزن نویسی تھا۔ تو جس کی ساری عمر اور دل کو رولانے میں گزری ہو وہ خود کیسے ہنس سکتا ہے اور جو ملنے جُلنے سے اتنا بیزار ہو کہ بڑے بڑے آدمیوں کو اس کی صحبت میں دو منٹ بیٹھنے کی آرزو ہی رہے اُسے مذاق کی کیا سوجھ سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا سے زیادہ زندہ دل، مولانا سے زیادہ شگفتہ مزاج اور مولانا سے زیادہ خوش طبع انسان کم از کم دہلی میں مجھے اب کوئی نظر نہیں آتا۔ ہاں کبھی تھے تو وہ مولانا ہی کے ہم عصر تھے یا مولانا سے پہلے کے لوگ۔

میں ایسے تین شخصوں کو جانتا ہوں جو مولانا کے لڑکپن سے بڑھاپے تک دوست رہے۔ ایک مرزا محمد اشرف صاحب گورگانی۔ بی۔اے۔ دوسرے مولوی اشرف حسین صاحب بی۔اے۔ تیسرے قاری سرفراز حسین صاحب عزمی تینوں مولانا کے سامنے ہی اللہ کے ہاں سدھار چکے۔ یہ ایک جماعت تھی جو علم و فضل اور ذہانت و طباعی کے اعتبار سے دہلی کی آخری شمع تھی اور زندہ دلی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ ان دوستوں میں کس حد تک مذاق ہوتا تھا اس کی دو درمیانی اور معتدل مثالیں سناتا ہوں۔

مولانا طرزِ تحریر میں شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب یعنی اپنے پھوپا کے پیرو تھے۔ میں نے ایک دفعہ مولانا کو جانشین مولوی نذیر احمد صاحبؒ لکھدیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے فرزند مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے اور عمر میں مولانا سے بڑے تھے۔ انہیں کسی نے جا لگایا کہ بیٹے کے ہوتے بھتیجے کو جانشین بتایا جا رہا ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ مگر قاری سرفراز حسین صاحب نے اس کا خاصا لطیفہ بنا دیا۔ کوئی شادی تھی جس میں ہم سب جمع تھے۔ مولانا نے ایک بہت ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے ذرا اونچی پرانی سی اونی شیروانی پہن رکھی تھی۔ قاری صاحب مولوی بشیر الدین صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "واحدی نے راشد کو جانشین مولوی نذیر احمد غلط نہیں لکھا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی، میں نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے مولوی نذیر احمد کے پاس یہ شیروانی دیکھی ہے۔ جو آج راشد کے جسم پر ہے"۔

ایک دفعہ اڈورڈ پارک میں یہی مجمع تھا کوئی بڈھا، سفید ڈاڑہی، خمیدہ کمر بھیک مانگتا اس مجمع کے اندر آ کھڑا ہوا۔ مولانا نے بے ساختہ کہا "آؤ میاں۔ قاری برکت اللہ! بڑی مدت میں دکھائی دئیے۔ تمھارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں"۔ قاری برکت اللہ صاحب قاری سرفراز حسین صاحب کے والد کا نام تھا۔ اور یہ گفتگو ان کے انتقال کے پچاس برس بعد کی ہے۔

دو پھبتیاں بھی یاد آگئیں۔ مولانا نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ آخر وقت میں سر، ڈاڑھی، اور بھویں بالکل بگلا تھیں۔ اور سر کے بال خوب بڑھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ ایک دن مولانا ننگے سر کھڑے تھے کہ قاری صاحب آ پہنچے۔ اور فرمایا "حضرت مولانا روئی کے بیچ میں کام شروع کر دیا ہے"۔ قاری صاحب خضاب استعمال کرتے تھے ایک روز ڈاٹا باندھے تھے۔ اور ڈھاٹے میں سے روئی زیادہ باہر نکل آئی تھی۔ مولانا نے کہا "واہ قاری صاحب صرف دُم کی کسر ہے"۔ یعنی دم لگا لو تو لنگور معلوم دو گے"۔

کبھی حضرت مولانا "اور قاری صاحب" سے خطاب ہوتا تھا اور کبھی ابے تبے پر اُتر آتے تھے۔ اور کبھی گالیوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی زندگی ہوتی کہ وہ ابے تبے اور ویسی گالیاں میں جمع کرسکتا تو ایک ادبی تبرک سمجھے جانے کے قابل کتاب بن جاتی۔

اٹھارہ بیس سال سے مولانا کی اکثر میرے ہاں نشست رہتی تھی۔ اور مولانا کے آخری دور کے ہم تین ساتھی تھے۔ میں۔ خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا اور مولانا عارف ہسوی۔ ہم چاروں قریباً روز ملتے تھے اور دن میں کئی کئی دفعہ ملتے تھے۔ مولانا عارف اور علامہ راشد کے تعلق کی بابت تو میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ دونوں نے مرنے میں بھی ساتھ دیدیا۔ دونوں کی موت میں پندرہ سولہ دن کا آگا پیچھا تھا۔ اور ہم دو یعنی میں اور خواجہ فضل احمد اب فقط مولانا عارف اور علامہ راشد کا نوحہ کرنے کے لئے دنیا میں باقی ہیں۔ ہم چاروں ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ ساتھ سیروں کو جاتے تھے۔ اور ہماری صحبت میں کوئی پانچواں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ہم میں سے ایک کے سوا کسی نے دوسروں کی تفریحوں میں شاید ایک آدھ بار ہی حصہ لیا ہوگا۔ شہر کی سیرگاہوں کا چپہ چپہ اس بات کا گواہ ہے۔ کہ جب تک چاروں زندہ تھے میں کم از کم کبھی کسی اور کے ہمراہ سیر کو نہیں گیا۔ میرے گھر کی ایک ایک چیز مجھے مولانا عارف اور مولانا راشد کی یاد دلاتی ہے۔ اس پر یہ طرہ ہے کہ مجھ سے عصمت کے ناظرین اور ناظرات کی فرمائش ہے کہ میں مولانا کی خوش طبعی پر لکھوں۔ میں اس مضمون کو کیونکر کامیاب بنا سکتا ہوں! مگر بہر حال تعمیل حکم کرنی ضروری ہے۔ اور مولانا کی زندگی کے اس پہلو کو بھی پیش کر دینا مولانا کی سوانحعمری کی تکمیل کے لئے لازمی معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے چاروں دوستوں کی جماعت میں نسبتاً مردہ دل تھا۔ اس واسطے بے تکلفی مولانا کی حقیقتاً خواجہ فضل احمد صاحب اور مولانا عارف سے تھی۔ خصوصاً خواجہ فضل احمد صاحب سے۔ لیکن مولانا چوکتے مجھ سے بھی نہیں تھے۔ مولانا عارف صاحب اور خواجہ فضل احمد صاحب کو تو کہتے تھے تو تم تک مجھے بھی کہہ لیتے تھے اور میں بھی اس قدر گستاخی کر لیتا تھا کہ شام زندگی لکھنے کا جب فیصلہ ہوا تو مولانا مہینوں اُڑان گھائیاں دیا کئے۔ مولانا نے بے شمار کتابیں تیار کر ڈالیں لیکن مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا کرتے تھے۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہو جائیں یا بچوں اور دوستوں کی خواہش سے دب جائیں بہر کیف لکھتے تھے زبردستی ہونے سے۔ اور لکھتے تھے تو دس منٹ سے گیارہواں منٹ لکھنے پر صرف نہیں کرتے تھے۔ دس منٹ لکھا اور باہر آ گئے۔ میرے ہاں تشریف لے آئے کسی تانگہ والے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کسی دوکاندار سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر جا کر لکھنا شروع کر دیا اور پھر دس منٹ بعد کرسی کاٹنے لگی یہی سلسلہ تمام دن جاری رہتا تھا۔ میں نے شام زندگی لکھنے کے فیصلہ میں جب رخنہ پڑتے

دیکھا۔ تو ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی بچھوا دی جس میں بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی۔ اور مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا اور مولانا جب آئے تو اُن سے کہا کہ "چلو اس کوٹھری میں" اور اُن کے کوٹھری میں گھستے ہی کنڈی لگا دی اور سنا دیا کہ چاہے لکھو چاہے نہ لکھو۔ دو گھنٹے سے پہلے کنڈی نہیں کھلے گی وہ کوٹھری اس وقت میرے سامنے ہے اور کیا عرض کروں کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے مولانا کو کتنی تکلیف دی تھی اور کتنا ستایا تھا اس کا خیال کر کے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ مولانا کی قبر پر جاؤں اور ان کی پائینتیوں سر جھکا کر معافی مانگوں۔ لیکن میں نے تنہا نہیں۔ ان کے بے تکلف مگر قدردان دوست مولانا عارف نے بھی سر جھکایا نہیں تھا بلکہ سر قدموں میں رکھ دیا تھا۔ جب مولانا دو گھنٹے لکھ کر پسینوں میں ڈوبے مسکراتے ہوئے کوٹھری سے نکلے اور شام زندگی کے ابتدائی صفحات ان کی زبان سے ہمارے کانوں میں پہنچے تو ایک صف ماتم بچھ گئی۔ مولانا عارف خود اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ مگر بے تکلفی اور اپنی لیڈری وغیرہ سب بھول گئے اور مولانا کے پاؤں میں لوٹنے لگے۔ بیس دن میں شام زندگی ختم ہوئی تھی۔ بیس دن برابر میرے ہاں یہی ڈراما ہوتا رہا۔

گرمی کا موسم تھا۔ اور کوٹھری میں پنکھا نہیں تھا۔ ہم ظالم روز اس کے اندر مولانا کو بند کر دیتے تھے اور دو گھنٹے کے حبس بیجا کے بعد مولانا خوش خوش ہمیں مسودہ سناتے اور ہم انہیں سجدے کرتے تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ عارف صاحب سے فرمایا تھا کہ "اب مجھے خدا نے کانگریس کی محبت اس لئے دی ہے کہ تو بار بار جیل جائے اور میرے حبس بے جا کا بدلہ اُترے۔ اچھا ہے ہمیں بھگت لے ورنہ خدا کے ہاں کی بید یں کھانی پڑتیں"۔

شام زندگی چھپنے پر اوکھلے نہر کے کنارے ایک دعوت ہوئی جس میں ہم کسی نوکر کو نہیں لے گئے تھے۔ یہ دعوت صبح سے شام تک رہی اور سب کام ہم سب اپنے آپ کرتے رہے۔ میری اور عارف صاحب کی عمر اس زمانہ میں پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔ اور خواجہ فضل احمد صاحب کی تینتیس چونتیس برس کی اور مولانا پچاس کے لگ بھگ تھے۔ مگر وہ بالکل ہماری طرح لطف لے رہے تھے۔

مولانا کے بڑے فرزند مسٹر رازق الخیری کی شادی تھی اور آگرہ جانا تھا۔ مولانا زیادہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا نے نہایت دلچسپ طریقہ سے ہمیں اور ہمارے پردہ میں اور اکثر صاحبوں کو روک دیا۔ یہ صاحبان ایسے تھے کہ مولانا کی اس حرکت کا اُنہوں نے لطف لیا۔ بگڑا کوئی نہیں۔ اس کارروائی میں مولانا کا فقط پندرہ روپے کا نقصان ہوا۔ مولانا نے ہم سے کہا کہ آپ لوگ ریل میں کیا چلیں گے۔ میں نے ایک نہایت عمدہ لاری کا انتظام کر دیا ہے دہ دو بجے آجائے گی اور یہ پندرہ روپے رکھئے۔ لاری والے کو پیشگی دیدیجئے گا۔ باقی میں ادا کر دوں گا۔ لاری والے براتی دو بجے اکٹھے ہوگئے اور لاری بھی سچ مچ کی آئی۔ مگر وہ اینٹیں ڈھونے کی لاری تھی۔ آدمی ڈھونے کی لاری نہیں تھی۔ خیر مولانا کا مذاق ہماری سمجھ میں آگیا اور وہ پندرہ روپے اسیوقت مال مفت دل بے رحم کے حکم کے مطابق بھر بھر کے اُڑا دیئے گئے۔

مولانا کو کھانا پکوانے اور غربا کو کھلانے کا بے حد شوق تھا۔ مہینہ میں ایک دو بار دیگیں نہ کھنکیں تو وہ پژمردہ ہوجاتے تھے مجھے بھی دیگ کا سالن بہت بھاتا ہے۔ لہذا جب دیگ چڑھتی تھی مولانا کہہ دیتے کہ "ملاجی شام کو پیالہ بھیجدینا" اور میں پیالہ بھیجتا

تھا۔ ایک دن اس خاص کھانے کی اطلاع کئے بغیر خواجہ فضل احمد صاحب کی مولانا نے دعوت کردی۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں (خواجہ فضل احمد صاحب کی زبان میں ہی عرض کردوں) کہ "بیسیوں حبسی ربّی اور ملّانے۔ پٹھان، بنگالی اور بخاری کھڑے ہیں اور سب کے ہاتھ میں پیالے ہیں۔ میرے آگ لگ گئی۔ لیکن مولانا نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کردیا کہ فضلو تیرا پیالہ کہاں ہے۔ ارے بے پیالہ ہی کے آگیا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ میں سالن بھی دوں اور پیالہ بھی دوں" پھر قریب پہنچ کر ہاتھ پکڑا اور چمکار کر فرمایا "نواب صاحب یہ کھانا انہیں لوگوں کے لئے پکوایا کرتا ہوں۔ آپ نے عقل سے کیوں کام نہیں لیا۔ میں حضور کی دعوت کرتا تو تنہا حضور کی نہ کرتا۔ اتنے میں عارف صاحب بھی آگئے۔ ان کی طرف اشارہ کرکے کہا) اس حرفو کی بھی تو کرتا۔ اور بھئی ان لوگوں کے ساتھ کھانا ہے تو کچھ ان میں سے اوپر کھا رہے ہیں۔ جاؤ تم دونوں بھی کھالو"

ایک دفعہ مولانا نے اور خواجہ فضل احمد صاحب نے اور میں نے ایک ساتھ شملہ کا سفر کیا۔ میں اور مولانا ایک درجہ میں تھے اور خواجہ فضل احمد صاحب دوسرے درجہ میں۔ مولانا کا بیٹھے بیٹھے چھیڑ کرنے کو جی چاہا۔ ہمارے درجہ کے آگے سے ایک بہت معقول سے آدمی گذر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ "حضرت معاف کیجئے گا۔ ذرا زحمت تو ہوگی یہ تیسرے سے چوتھا ڈبہ جو ہے اس میں ہمارا ملازم ہے۔ فضلو کہہ کر آواز دیدیجئے گا اور کہہ دیجئے گا کہ مولوی صاحب بلا رہے ہیں"۔ انہوں نے ایسا ہی کیا خیر انہیں تو "فضلو" کیا مل سکتے تھے۔ لیکن خواجہ فضل احمد صاحب نے تھوڑی دیر بعد آکر مولوی صاحب کو سینکڑوں صلواتیں سنا دیں۔

اسی سفر کا واقعہ ہے واپس دلّی آرہے تھے کہ انبالہ اسٹیشن پر خواجہ فضل احمد صاحب اترے "فضلو" والا تجربہ ہو جانے کے بعد خواجہ فضل احمد صاحب نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ ساتھ ایک درجہ میں بیٹھیں۔ خواجہ فضل احمد صاحب سودا بہت ہوشیاری سے خریدتے ہیں وہ اسٹیشن پر اترے اور کھانے پینے کی چیزیں خرید کر لانے لگے۔ ایک ایک چیز لے کر آتے ہیں اور درجہ میں رکھ جاتے ہیں اور مولانا اُسے پیٹ میں رکھ لیتے ہیں اور میں بھی ان کی تقلید کر رہا ہوں۔ یہاں تک کہ اپنے خیال میں جب خواجہ فضل احمد صاحب تینوں کے لائق پورا کھانا جمع کر چکے تو اطمینان سے درجہ میں داخل ہوئے۔ اور انجن نے بھی سیٹی دے دی۔ اب جو دیکھتے ہیں تو کھانا وانا کچھ نہیں ہے۔ صرف پتے ہیں۔ مولانا نے دلّی کے دوکانداروں کے طرز میں صدا لگائی "پتّے کو بھی چاٹ"! اور پھر کھڑکی سے منہ باہر کرلیا۔ اور دیر تک خواجہ فضل احمد صاحب کے بگڑنے کا مزا لیتے رہے مزے کے لفظ سے ایک اور قصہ تازہ ہو گیا خواجہ فضل احمد صاحب کا حافظہ غضب کا ہے۔ نثر کی عبارتیں کی عبارتیں انہیں طوطے کی طرح یاد ہیں لیکن شعر کبھی یاد نہیں رہتا۔ ایک مصرع غالب کا پڑھتے ہیں تو دوسرا مصرع اسی بحر اور قافیہ ردیف کا داغ کا اس کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اور پھر اس میں اتنی اصلاح کرتے ہیں کہ نظم نثر کی شکل اختیار کرلیتی ہے مولانا عارف اور مولانا راشد اس بات سے مزے لیا کرتے تھے۔ مولانا راشد الخیری صاحب کا کلام تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ مولانا عارف بھی شعر فہمی اور شعر گوئی میں یگانہ تھے۔ خیر جس واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اسکا تعلق مولانا راشد الخیری صاحب سے ہے۔ خواجہ فضل احمد صاحب نے داغ کا شعر پڑھا اور خاصہ صحیح پڑھا۔

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج　　　خدا کی قسم ہے مزا آگیا

مولانا نے فرمایا "ارے کم بخت" قسم ہے خدا کی" کہہ۔ داغ کی روح کو کیوں تڑپا رہا ہے" زبان کا بہت باریک فرق ہے۔ دلی والے بھی اب شاید اسے محسوس نہ کر سکیں گے" مولانا بالکل غلط اور بے جوڑ مصرعوں کو سُنکر بہت لُطف اُٹھاتے تھے۔ مگر "قسم ہے خدا کی" کی جگہ "خدا کی قسم ہے" سننا اُن سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے وہیں گرفت کی۔ خواجہ فضل احمد صاحب بھی دلی کے گنے چنے زباندانوں میں ہیں۔ دلی کی پُرانی باتیں۔ دلی کی پُرانی رسمیں، دلی کی پُرانی زبان خوب جانتے ہیں۔ مولانا کے کہنے سے غلطی کا احساس ہوا اور پھر مولانا بڑے لحن کے ساتھ مزے لیکر یہ شعر دوہراتے رہے۔

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج قسم ہے خدا کی مزا آ گیا

مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا۔ مزا آگیا جی مزا آگیا قسم ہے خدا کی مزا آگیا۔

یہ دل ہے جدہر آ گیا آ گیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو یہ دل ہے جدہر آگیا آ گیا

مولانا کے گلے میں ستر سال کی عمر تک کڑاکا تھا۔ مثنوی میرحسن ایسے موثر اور دردناک لہجہ میں پڑھتے تھے کہ ہمارے دل سوز و گداز سے بھر جاتے تھے۔ آج بھی ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور میں یہ شعر سُن رہا ہوں۔

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

اچھا خدا حافظ! باقی پھر کبھی سناؤں گا۔ خوش طبعی کے سینکڑوں واقعے ہیں کہاں تک سنیئے گا۔ مجھے ان کی دوستی کی بابت بھی کہنا ہے۔ غربا کے ساتھ جو اُن کا برتاؤ تھا اسپر لکھنا ہے مسلمان بچیوں سے وہ جتنی محبت کرتے تھے۔ یہ بھی ایک مستقل عنوان ہے۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ رواروی کے ملنے والے شاید انہیں خوش اخلاق نہ سمجھتے ہونگے۔ لیکن ان کے اعلیٰ اخلاق کا افسانہ بھی میرے پیش نظر ہے تکلف کا ملنا ان کے لئے ایسا تھا۔ جیسے انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ امرا رؤسا اور حکام کے درباروں سے دُور بھاگتے تھے۔ اور اپنے دربار میں بھی انہیں دیکھنے کے خواہشمند نہ تھے۔ نیا ہر آدمی ان کے لئے مصیبت ہوتا تھا۔ ہم ان کے ساتھ یہ شرارت کیا کرتے تھے۔ کہ جہاں کوئی ممتاز آدمی آیا اور ہم اُسے لے کر مولانا کے دولتخانے پر پہنچے۔ اور مولانا سے اُس کا تعارف کرایا اور مولانا کی جان پر بن گئی۔ ہائے اب وہ جان ہی نہیں رہی! ان کے دروازے کے آگے سے روز گزرتا ہوں اور "مولوی صاحب" کہکر پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پھر دھیان آجاتا ہے کہ مولوی صاحب اب کہاں! ہمارا اور مولوی صاحب کا تو تعلق ہی کچھ اور تھا معمولی تعلق رکھنے والے بھی مولوی صاحب کی یاد میں بے چین ہیں جن سے تکلف نہیں کرنا پڑتا تھا ان سے وہ اتنی بے تکلفی سے ملتے تھے کہ گویا انہیں اپنے بلند مرتبہ کی خبر ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ادنیٰ ادنیٰ شخصوں سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے ان کے برابر کے ہیں۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہدوں مولانا کو سخت سے سخت پریشانی میں ہم نے ہشاش بشاش پایا حتیٰ کہ جب سانس اکھڑ گیا اور

دنیا سے رخصت ہونے کا یقین ہوگیا۔ اس وقت بھی مولانا نے خواجہ فضل احمد صاحب سے مذاق کیا۔ عارف صاحب کے انتقال کی خبر مولانا کو نہیں ہونے دی تھی۔ عارف صاحب مولانا کو پوچھتے پوچھتے مر گئے اور مولانا عارف صاحب کو مرتے مرتے پوچھتے رہے۔ آخری دنوں میں کسی نے کہا کہ عارف صاحب اب اچھے ہیں تو مولانا نے فرمایا "کیوں مجھے بناتے ہو وہ بھلا چنگا والا تھا وہ جا چکا لیکن وہ ایک آدھ کو ساتھ لے کر ضرور جائے گا۔ اکیلے اس کا دل تھوڑا ہی لگ سکتا ہے"۔ انتقال سے چار روز پہلے شہنشاہ جارج کی رحلت کا ذکر کوئی صاحب کر رہے تھے ایک بزرگ بولے کیوں جی اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا مولانا کی نقاہت کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ یہ دلچسپ سوال سُنکر بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور زبان پر برجستہ یہ فقرہ آیا "نہیں جناب کے لئے وصیت کر گئے ہیں"۔

دلّی کی زبان ختم ہوگئی

از جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو

حضرت مولانا عبدالراشد الخیری مرحوم اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے فرد روزگار تھے۔ افسوس اب دلّی کی ٹھیٹ زبان لکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور شاید آیندہ بھی کوئی نہ نکلے۔ کیونکہ وہ تہذیب و تمدن، وہ رسم و رواج اور وہ آداب و اطوار ہی نہیں رہے۔ جو اُن کی آنکھوں نے دیکھے تھے۔ اس لئے وہ زبان جو ان چیزوں کو ادا کرنے والی تھی وہ بھی ہٹتی جاتی ہے۔ مرحوم نے پُرانا زمانہ بھی دیکھا تھا اور نیا بھی۔ انھوں نے پُرانی صحبتوں کا بھی لُطف اُٹھایا تھا۔ اور نئے رنگ ڈھنگ بھی دیکھے اور برتے تھے۔ ان دونوں کی اونچ نیچ اُن کی نظر میں تھی۔ اب ایسی جامعیت کا شخص ہمیں کہاں نصیب ہوگا

ان کا سب سے بڑا کام طبقۂ نسواں کی خدمت تھی۔ یہ بہت بڑی قومی خدمت ہے۔ اُن کے لئے انھوں نے کتابیں لکھیں۔ رسالے نکالے۔ مدرسے قائم کئے، اور عمر کا بہت بڑا حصّہ اسی خدمت میں صرف کر دیا۔ ہماری معاشرت اور خاصکر گھروں کی روزمرّہ زندگی سے جیسی اُنہیں آگاہی تھی، شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ بچوں، ماؤں، بڑی بوڑھیوں، ماماؤں، اناؤں، کھلائیوں کی بول چال، نشست و برخاست، ماندو بود، توہمات، جذبات و خیالات غرض کہ رتی رتی حال سے واقف تھے۔ ان کی تصانیف یوں تو عام طور پر مقبول تھیں لیکن عورتوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں کیونکہ اُن کی باتیں اور اُنکی روداد خود انہیں کی زبان میں لکھی تھی۔ ایسا لکھنے والا جس نے گھریلو زندگی کا ایسے غور سے مطالعہ کیا ہو۔ جو جگ بیتی کو آپ بیتی سمجھتا ہو، جو درد بھرے دل سے لکھتا ہو جس نے اپنے قلم اور دماغ کو اصلاح اور ہمدردی کے لئے وقف کر دیا ہو۔ اب ہم میں کوئی نہیں رہا۔ مرحوم اپنے پیچھے ایسی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جو اُردو زبان میں مدتوں زندہ رہیں گی۔

اُردو ادب میں مصورِ غم کا رتبہ

مولانا راشد الخیری نور اللہ مرقدہٗ اُردو ادب کے شہنشاہ تھے ان کو ہندوستان کے ایک نہایت علم دوست خاندان میں خداوند عالم نے پیدا کیا تھا کہ ہندوستان میں اس دین کے سنہرے اور پیارے اصولوں کی جو خاک یثرب میں جنم لینے والے مولا لائے تھے۔ تلقین کریں اور آپ کی پُر اثر تقریروں، جادو نگار تحریروں اور مبارک ہاتھوں سے عوام میں اس کی اشاعت ہو۔ کہلانے کو ہم مسلمان، توحید کے شاہد اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تھے۔ لیکن ہمارا ہر فعل و عمل ہمسایہ غیر قوموں کے زیر اثر بالکل جداگانہ تھا۔ توحید کے نام لیوا کفر شرک اور بت پرستی کی داد ادھام پرستی، قبر پرستی اور پیر پرستی میں دیتے تھے۔ اور رسول اللہ روحی فداک کی امت آہ وہی اُمت جس کی نسبت خالق نے اپنے کلام پاک میں خطاب فرمایا ہے "کنتم خیر اُمّۃ" خدا اور رسولؐ کے احکام کو پس پشت ڈال کر انتہائی ضلالت کے گڑھوں میں گر رہے تھے۔ فرعونیت اور جہالت کے زعم میں حق و باطل کے امتیاز کو مٹا کر۔ زبردست زیردستوں پر حکومت کر رہے تھے۔ حقوق نسواں جس میں عورتوں کو حدود شرع کی مقررہ آزادی۔ ترکہ پدری۔ حق مہر خلع وغیرہ وغیرہ قرآن کریم کی تعلیم کے بموجب عطا کئے گئے تھے۔ داستان ماضی ہو چکے تھے آپ کے درد مند دل نے عورتوں کی حق تلفی کا نہ صرف احساس ہی کیا بلکہ سینہ سپر ہو کر مخالفین اور غاصبوں سے مقابلہ آرائی میں قلمی جنگ کی ٹھانی۔ درد انگیز اور رقت خیز پیرایہ میں اس مصیبت کی داستان کو اپنی قوم اور سوسائٹی کے تمام ناگریز نقائص کو کھول کھول کر دکھا دیا تاکہ لوگ اپنی غلطیوں سے واقف ہو کر اپنی خامیوں پر متاثر ہوں۔ اور راہ حق کی طرف مائل ہو کر قوم کے اس عظیم الشان بیڑے کو جو ناحق شناسی اور مردوں کی خود غرضی کے متلاطم سمندر میں تھپیڑے کھا رہی تھی صحیح سالم پار لے جائیں۔ انشاپردازی میں آپ کا ثانی ممکن نہیں۔

حزن نگاری میں میر خلیق، میر انیس، میر درد، اور میر دبیر اگرچہ اپنے زمانے میں خدایان سخن مانے جاتے تھے۔ لیکن ان کی طبع آزمائیاں فقط واقعات کربلا۔ شب تنہائی۔ یا شب غم کی طوالت کے سمے باندھنے تک محدود ہوتی تھیں برخلاف اس کے مصورِ غم کی حزن نگاری روزمرہ کے مصیبت ناک واقعات پر مبنی ہوتی تھی جو زیادہ تر کمزور فرقہ اناث پر کہیں مظلوم بیوی کی صورت میں تو کہیں بے زبان بہو۔ منحوس ناخواندہ بیٹیوں۔ بیوہ اور یتیموں کی بیکسی میں موجود ہوتیں۔ نیز بوڑھی کمزور ماں اور غریب بے پناہ رشتہ داروں کی حمایت میں جن کی بدنصیبی سے فائدہ اُٹھا کر جابر اور ناعاقبت اندیش مرد مظالم توڑتے ہیں۔ آپ کے اشعار کی طرز نگارش اگرچہ خاص مراثی کے ردیف

قافیہ پر نہ تھی - لیکن طرزِ بیان کا مفہوم تمام نوحوں اور مرثیوں سے بڑھ کر الم انگیز اور دلنشیں تھا - ان کے ہیروئن کی نمایاں خصوصیت ایثار نفسی - ذاتی قربانیاں مذہبی اصول کی پابندی - اور راہِ حق میں ثابت قدمی دکھا کر اپنا تن من دھن سب قربان کرنا ہوتا - اس کے علاوہ والدین کی اطاعت شوہر کی فرمانبرداری - بچوں کی تربیت اور ابتدائی عمر سے اعلیٰ سیرت اور محاسن اخلاق کی تعلیم دینا ان کا خاص شعار قرار دیتے تھے -

صرف ایک نسیمہ کا کیرکٹر ہی آپ نے دنیائے اسلام اور دختران ہندوستان کے آگے ایسا پیش کیا ہے جسکی تمام اوصاف بیٹی، بیوی اور ماں اور ساس ہونے کی حیثیوں میں صدیوں تک ایک بے نظیر نمونہ ہے -

بے موقعہ لاڈ پیار سے اولاد کو سر چڑھانے پر آپ بیحد متنفر تھے اور قوم کے مفاد میں بیحد مضرت رساں خیال کرتے تھے - چنانچہ اس مقصد میں "سائرہ" کی خودسری سے بڑھ کر ہولناک تمثیل کوئی کہاں پا سکتا ہے -

اسی طرح "جوہر قدامت" "بنت الوقت" "سراب مغرب" اور دوسرے افسانوں میں موجودہ فیشن کی پرستار لڑکیوں کی حماقت کے بدترین نتائج دکھائے اور ساتھ ہی اس فضا پر اس قدر الم انگیز آنسو بہا کر مشرقی پرانی تہذیب کے مٹنے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بتا گئے کہ ہر ایک قدیمی رسم میں کون سے جوہر پنہاں تھے - اور آج ان کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد کوئی ہندوستانی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا - اور نہ ان جانسوز واقعات سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے - کہ وہ مبالغہ آمیزی یا فقط افسانوی رومان پر مبنی تھے - خلع کی حمایت میں اور رسوم پرست مولویوں کے غلط فتوے کے مطابق موجودہ اینگلو محمڈن لا کے خلاف آپنے بیحد جدوجہد کی - تاکہ تیرہ سو سال پیشتر کے عطا کردہ حقوق از سر نو قانون حکومت کے تعاون سے واپس مل جائیں اور فتنہ ارتداد کا جو شور اٹھا ہے وہ مٹ جائے - کیونکہ حق و باطل کا امتیاز مٹانے پر مسلمان اپنی بنیاد خود کھوکھلی کر چکے تھے - اور ان کی بہو بیٹیاں ان کے مظالم سے تنگ آکر کہیں تو غیر قوموں کے دامن تھام کر نجات حاصل کر رہی تھیں تو کہیں اپنے آباؤ اجداد کے ننگ و ناموس کو بھینٹ چڑھا رہی تھیں - مذہبی نقطہ نظر سے مولانا مرحوم کی تمام تصانیف ارفع و اعلیٰ ہوتی تھیں - بلکہ آپ کا زاویہ نگاہ مذہب کی توصیف ہوا کرتی تھی - یعنی ہر پہلو سے اسلام کی خوبیاں - حریت پسندی، مساوات حقوق شناسی اور ہمدردی دکھانا جانتے تھے - ان کی تصانیف میں "آمنہ کا لال" اور "سیدہ کا لال" یہ دو کتابیں اس قدر موثر ہیں کہ محتاج بیان نہیں - ان میں مطالب کی صحیح توضیح کچھ ایسے مدلل اور بسیط پیرایوں میں کی گئی ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر قومیں بھی ان سے ہمارے نبی کریم اور سید الشہدا علیہ السلام کی پاک زندگیوں کے سچے حالات سے محظوظ ہوتی اور نفع اٹھاتی ہیں - اور وہ بہ آسانی تمام حالات سے واقف ہو سکتے ہیں - گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا تھا - مجلس میلاد اور مجلس عزا میں ان سے بڑھ کر نثر میں عام فہم شستہ اور صحیح واقعات کی کتابیں ملنی محال ہیں - اور بالفرض محال اگر ملیں بھی تو میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی سنت جماعت ادیب ایسی دردانگیز اور رقت خیز جذبات سے پُر آج تک بلا کسی تعصب اور فرقہ پروری کے واقعات شہادت کے بیان پر قادر نہیں ہو سکا -

آمنہ کا لال" مولانا نے باوضو لکھا ہے۔ یہ اس قدر حقیقی جذبات سے معمور ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل پر اس عظیم ترین شخصیت کا سکّہ بیٹھ جاتا ہے اور مسلم غیر مسلم سب یکساں طور پر ہادی برحق سرور کائنات کی خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میلاد کی کتابوں میں الفاظ کی بندش اور شاعری کے ردیف وقافیہ پر نکتہ نوازی کرنے کے علاوہ ہر مصنف کا یہی زاویہ نگاہ رہا ہے کہ رسول اللہ کو نعوذ باللہ ایک حسین ترین نزاکت سے معمور اور فریب تخیّل معشوق قرار دیکر بالکل قدیمی یونانی اصنام پرستوں کے دیوتاؤں کی تمثیل میں پیش کریں۔ اور محیر العقول واقعات اور معجزات کے مظاہروں میں آسمان وزمین کے قلابے ملادیں چنانچہ آپ نے اس نئی طرز کے میلاد شریف میں ایسی نظیر قائم کی ہے جو آئندہ مصنفین کے لئے بھی مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔ آپ کے بیشمار مضامین جو مختلف رسائل وجرائد کے زیب وزینت ہوتے تھے۔ اگرچہ اوراق قرطاس میں منتشر ہوچکے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقی روح اور غیر فانی تاثیر تہذیب وتمدّن سکھانے والی بہترین اتالیق تھی جو دلوں پر مرتسم ہوچکی ہے۔ اور پشت ہا پشت اس کے اثرات دائم وقائم رہیں گے۔

بیشتر بزرگوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو پڑھنے میں تھوڑی شد بد ہوگئی کلام مجید ناظرہ پڑھادیا۔ پانچوں وقت نماز فریضہ کی ادائیگی سکھادی بس اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ چلو اللہ اللہ خیر سلّا۔ اب نماز کی پابند نہیں تو اس پر آوازے کستے ہیں۔ روزہ کی دلدادہ نہیں تو اس پر لعنتیں بھیجتے ہیں اور حقوق العباد کے رمزوں سے بے خبر ہیں تو سیدھا ناقص الدین کے خطاب سے ممتاز کررہے ہیں۔ مگر مصوّر غم کی تصانیف سے پیشتر کسی عالم دین، کسی مجتہد اور کسی شریعت پرست نے یہ خیال بھی کیا تھا کہ ان کو سارے حقوق وفرائض سے کس طرح روشناس کرانا چاہیئے؟ بے معنی قرآن مجید رٹ کر تو تمام احکام شریعت سے ان کے خیال کے مطابق آگاہی ہونے سے رہی اور نہ فقط یہ نجوقتہ ٹکریں لگانے سے مطالب کے مفہوم کا الہام ہوسکتا تھا۔ ماسوا اس کے شریعت کے متعلق جس قدر کتابیں زبان اُردو میں لکھی گئی تھیں کہ اصل مطلب کا سمجھنا بھی دشوار تھا۔ اور طرز بیان سے اس قدر الجھن پیدا ہونے لگتی تھی۔ کہ ایسی مذہبی کتابوں پر کاربند ہونا تو کجا پڑھنے سے جی بیزار ہوجاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم مدت العمر مذہبی معروضات سے کوری رہ گئیں۔ آپ کے دردمند دل نے یہ بخوبی محسوس کرلیا کہ جب تک اسلام کا بچّہ بچّہ اور خصوصیت سے عورتیں ابنیِ خالق برتر اور سردار مرسلین کے تمام احکام سے واقف نہ ہوں گی ہمارے مذہبی اقتدار اور جوش عقیدت میں ترقی نہ ہوگی۔ اور نہ دنیاوی کاموں میں مذہب سے روگردانی ہمارے بیڑے کو پار لگائے گی۔ لہذا عام فہم اور قصّوں کے پیرائے میں آپ نے ہماری مذہبی تعلیم کا جال پھیلایا۔ معاشرتی اور تمدّنی اصلاح میں اپنے قلم معجز رقم کو حرکت دی۔ اور طرز بیان میں کہیں مصائب کی دل ہلادینے والی داستانیں پیش کیں تو کہیں خانگی امورات اور معاشرتی نقائص پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ افسانے بیان کئے تاکہ ہم اپنے عیوب سے باخبر ہوجائیں اور افسانوں کے ہیرو ہیروئن ہمارے

لیئے قابل تقلید نمونہ ٹھہریں۔

انگلستان میں بیشمار مصلح قوم، ادیب، مورخ اور شاعر گزرے ہیں اور فی زمانہ بھی موجود ہیں لیکن چارلس ڈکنس Charles Dickens کی شخصیت تمام معاشرتی حلقوں میں اس لئے بیحد نمایاں ہے کہ اس کی سحر نگاری اور داستان گوئی میں عوام کی معاشرتی اصلاح اور سوسائٹی کی اخلاقی تعلیم مقصود تھی۔ اس کے زندہ جاوید افسانے آج بھی سینما کے زیب وزینت اور یونیورسٹی کے سرتاج ہیں۔

مردوں کا عورتوں پر بلاوجہ دوسری شادی کی آڑ میں "ستم" توڑنا آپ کے نزدیک بدترین جرم اور انتہائی بے ایمانی کی دلیل تھی باوجود اس کے سُنا گیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی کانفرنس میں جب عورتوں نے مردوں کے حقوق ثانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے یہ ریزدلیوشن پاس کرانا چاہا کہ سوکن پر بیٹی دینا یا ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی قانونی طور سے ناجائز قرار دی جائے تو آپ کا دل شریعت پر دست اندازی کے خیال سے کانپ اٹھا۔ اور اُس وقت آپ نے اس ریزولیوشن کی مخالفت اس لئے کی کہ قرآن مجید اور شریعت کے تمام احکام کسی حالتمیں یکساں اگر مناسب نہوں تو کبھی بالکل نااہل نہیں ٹھہر سکتے۔ پس جبکہ شریعت سے تمام آزادیاں حاصل ہیں تو پھر قانون کی بیڑیاں ڈالکر محکوم کیوں بن جاتے۔ اگر کسی شخص کو ایسی ناگزیر حالت کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اور قانون کی پابندی سے مجبور ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ مثلاً اگر کسی امیر کبیر شخص کے اولاد نہ ہوتی ہو۔ یا بیوی دائم المریض۔ مخبوط الحواس یا اور کسی علّت میں مبتلا ہو جائے تو ایسی حالتوں میں اس کا دوسرا نکاح بشرطیکہ حکم الٰہی کے مطابق دونوں میں انصاف قائم رکھ سکے تو ہرگز مناسب نہیں ہو سکتا۔ خواتین کی ایک کثیر تعداد نے اپنے سطحی نقطۂ نظر کے باعث اس کی بیحد مخالفت کی اور ناموزوں قرار دیا۔ مگر آپ اپنی حق گوئی پر قائم رہے۔

غریبوں بیکسوں کی دست گیری اور خصوصاً غریب رشتہ داروں کی امداد پھر وہ بھی حسن اسلوب سے رسم و رواج ننگ اور حق کے پردے میں خوشیوں کے موقعوں پر کس قدر کارآمد اور مقبول بارگاہ سبق بتلا گئے۔

اللہ جل شانہٗ تعالےٰ نے احسان کا افضل ترین مستحق والدین کے بعد اقربا کو ٹھیرایا ہے لہذا آپ کے زیادہ تر فسانوں کا ماحصل ہمیشہ ان کی دستگیری رہا۔ پھر ان کی کم مائیگی کی پردہ داری ملحوظ رکھنے کی ہمیشہ تاکید فرمائی۔ عام طور پر قاعدہ ہے کہ خواتین اپنے معزز اور امیر مہمانوں کی آؤ بھگت میں اس قدر منہمک ہو جاتی ہیں کہ ان کو غریبوں کی پروا بھی نہیں رہتی۔ اس کی صراحت میں آپ نے عورتوں کو اسلامی اخوت کی ایسی تعلیم دی ہے جو ہزاروں احادیث کے بے ربط صفحات الٹ کر بھی حاصل نہو سکے۔

دنیا کی تمام عورتیں اس وقت بام ترقی پر پہونچ چکی ہیں اس لیے کہ وہ اپنے مصلح و بہی خواہوں کی سچی قدردان اور پیرو ہیں۔ کاش کہ ہم بھی اپنے محسن اور حقیقی مصلح کے بتائے ہوئے سبق کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اپنی زندگی کا لائحہ عمل

اس کو قرار دیں۔

بچیوں کی تربیت اور انسداد ارتداد کے ضمن میں آپ نے مکتب بنات کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس میں بہت سی لاوارث بچیاں پناہ گزیں تھیں۔ گو کہ آپ کا مقصد اس سے بہت کچھ بلند تھا۔ لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ صحت کے انحطاط اور قوم کی ناقدرشناسی سے آپکی دلی آرزوئیں جو اس ننھے سے چمن کو سرسبز اور شاداب دیکھنے کی ساعی اور متمنی تھیں بہت جلد ناکام رہ گئی۔ اگرچہ آپ نے اس مکتب کی داغ بیل ڈالنے کے بعد اسکو معراج کمال پر پہونچانے کی غرض سے تمام ہندوستان کے دورے کئے۔ مسلمانوں کو اسلامی حمیت اور اخوت کا واسطہ دیکر یتیم بچیوں کی تائید پر آمادہ کیا۔ اور اس ضعیف العمری میں قوم کی بہبودی کی خاطر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیکر شہر در شہر اور گھر بہ گھر ناصیبہ فرسائی کی پر آہ زندگی نے وفا نہ کی۔ اور قوم نسواں کے اس سچے بہی خواہ کو خداوند کریم نے اپنی خدمت میں بلا لیا۔ آج ہم آپ کے غم میں۔ ہاں اس ناقابل تلافی نقصان عظیم کے صدمے میں ماتم کناں ہیں۔ لیکن آپ کی پاک روح بہشت بریں میں مقربین کا اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے اور اپنی کامیابی پر مسکرا رہی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعلم
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

جمیلہ بیگم کلکتہ
مصنفہ "فیروزہ"

صفحہ ۱۵ کا بقیہ

مگر اندھی تقلید کا ریشمی پھندا گلا گھونٹ رہا ہے۔

"مصور غم" نے اسی حالت زار کا احساس کیا اور اپنے مقدور بھر تمام عمر اسی درستی اور اصلاح کی تدبیر کرتا رہا۔ کوئی اس کو لکیر کا فقیر کہتا تھا اور کوئی باتیں بنانے والا مگر اس کا دل ایک مسلمان کا دل تھا اور اسکی زبان لال قلعہ کی زبان تھی۔ اب وہ زبان شمع کی طرح خاموش ہے، بے زبانوں کے حقوق کی حمایت کون کرے اب وہ دل گھڑی کی طرح بند ہے۔ بیچاریوں کے برے وقت پر کون کام آئے۔ اب اس کے مزار سے یہ پردرد آواز آتی ہے ؎

زمن بجرم طپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

"مصور غم" نے دردو الم کا جو البم تیار کیا ہے جب تاش بازی اور ہوا خوری سے فرصت ملے ایک نظر دیکھ لینا اور خالی آنسو بہا کر دکھ نہ دینا۔ وہ ہماری آنکھوں کی پتلیوں اور جگر کے ٹکڑوں کو جس خیر و خوبی کے ساتھ دنیا میں پھولا پھلا دیکھنا چاہتا تھا ویسا ہی علم عمل کر کے جذبہ عمل پیدا کرنا اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کرنا۔

راشد الخیری اب تو اُس عالم میں ہے جہاں نہ غم عشق ہے نہ غم روزگار لیکن اگر روح کو فنا نہیں (اور دل نہیں مانتا کہ یہ فنا ہو جائیگی!) تو تیری روح جو اس دارفانی میں ہماری حالت زار کی مصوری کرتی تھی اب آمنہ کے لال (روحی فداہ) کے حضور میں یوں عرض کرے۔

اے مدنی برقع ڈکی نقاب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

"مصوّرِ غم" کا غم

(از مولوی سید نواب علی صاحب ایم اے سابق پرنسپل دربار کالج جونا گڈھ)

ادبی دنیا کے خطابوں کی شان ہی نرالی ہے۔ ان کے حصول کے لئے نہ خداوندانِ مجازی کے سامنے سرنیاز خم کیا جاتا ہے نہ دربار میں نذر عقیدت گذرانی جاتی ہے وہ زبان خلق کا عطیہ ہیں اور قبول عام کی سند۔ خوش نصیب ہیں وہ جنکو ایسے خطاب ملتے ہیں۔ انہیں کا نام روشن ہے وہی زندہ جاوید ہیں۔

دیکھو "لسان الغیب" آجتک ہر کس وناکس کیلئے فال نیک ہیں "مولوی معنوی" آجتک اہل دل کو حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں۔ خیر یہ تو گذری ہوئی داستان ہے ہماری آنکھوں کے سامنے "لسان العصر" کا جسے خطاب ملا اُس نے زمانہ کی بوقلمونی کی کیسی ترجمانی کی اور ہنسی ہنسی میں زخم دردونی کا علاج کیا۔ اسی طرح "مصوّرِ غم" کا لقب پانے والا صنف نازک کی تصویر کھینچکر اہل دل کو تڑپا گیا ہے۔ اُس کی تصویر آنکھوں سے آہ اب نہاں ہوگئی لیکن کانوں میں ابتک یہ صدا گونج رہی ہے ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا   پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا (میرؔ)

لوگ کہتے ہیں کہ "مصوّرِ غم" تصویر درد کھینچنے میں حد سے گذر گیا لیکن ان بیدردوں کو کیا خبر کہ حالت کیا ہو رہی ہے وہ تو سینما میں ہنستے ہیں اور وہیں آنسو بھی بہاتے ہیں وہ کیا سمجھیں کہ ہماری صبح زندگی شام غریباں ہے اور شام زندگی صبح قیامت۔ ایسی ہی صورتوں کے لئے اقبال نے خوب کہا ہے۔

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم بینی

آسمان نے کتنے رنگ بدلے اور ہمارے عروج وزوال کے کتنے سین دکھائے سب سے ہولناک منظر وہ تھا جسے سیل تاتار کہتے ہیں۔ اُس نے قصر خلافت کو منہدم اور ہمارے تہذیب وتمدّن کو برباد کرکے مشرق ومغرب میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر روح اسلام میں وہی بالیدگی رہی جس سے تھوڑے عرصہ میں غالب مغلوب ہوکر خود ہی حامی دین بن گئے اور اگلے جاہ وجلال کا پھر وہی نقشہ کھنچ گیا۔ مگر یہ عروج ٹھہر دوپہر تک رہا۔ آہ پھر وہی زوال شروع ہوا لیکن اب جو زوال شروع ہوا اس کی نوعیت ہی دوسری ہے۔ جسم پر بظاہر ہلکا سا زخم مگر زہر اندر ہی اندر سرایت کر رہا ہے۔ بجلی کی روشنی ہے مگر نور رخصت ہو رہا ہے۔ امن وامان ہے مگر سکون قلب کہاں۔ صورت تو ایسی بدلی نظر نہیں آتی مگر ذہنیت مسخ ہو رہی ہے "حرم سرا کی حفاظت" کیلئے "اب تیغ" ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ رونا اس کا ہے کہ حرم سرا کلب گھر بن رہا ہے۔ کھانے کو سوکھا ٹکڑا نہیں مگر ڈنر ٹیبل ضرور خریدنا چاہیئے۔ کفن کو کوڑی نہیں مگر سوٹ کیس ہونا چاہیئے اوقات یگانہ کا کچھ خیال نہیں مگر رسٹ واچ ضرور رکھنا چاہیئے غرضکہ ترقی اور آزادی کی دُھن ہے۔

باقی صفحہ ۱۴۹ پر

روحانی معلّم

ہندوستان آج جس جلیل القدر ہستی کے غم میں ماتم کناں نظر آتا ہے ان کے احسانات اور خوبیوں کو ایک ایک کرکے بیان کیا جائے تو دفتر چاہئیں۔ اور پھر بھی ختم نہ ہوں۔ جتنا لکھا جائے تھوڑا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس محب قوم کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے اور کسی طرح کے ماتم سے بھی وہ ناسور جو قوم کے دلوں میں پڑ چکا مندمل نہیں ہوسکتا اور یہ بدستور رستا رہے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ مسلمان عورت اور ہندوستانی معاشرت وتمدن کا وجود ہے رحلت سے چار ماہ پیشتر مولانا محمد علی مرحوم کو یاد فرمایا تھا ان کے تذکرے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"محمد علی کی موت سے جو نقصان مسلمانوں کو ہوا وہ آسانی سے پورا نہ ہوگا وہ مسلمانوں کا عاشق جری بے لوث صادق اور ایسا مخلص مسلمان تھا کہ اسلام کی تمام خوبیاں اپنے ساتھ لے گیا"

علامہ محترم اپنی اس تحریر کے بالکل مصداق تھے۔ محمد علی مسلمانوں کے عاشق تھے تو آپ اسلام کے عاشق تھے۔ اس کے بانی اور اس پر پروانہ وار نثار ہوتے رہے جس کی زندہ مثال جسے خون جگر سے سینچا ہے **آمنہ کا لال** اور **سیدہ کا لال** کی صورت میں موجود ہے اور جو پڑھنے والوں کے جگر کے ٹکڑے اُڑا دیتی ہے۔ معلوم نہیں خدا نے آپ کے الفاظ میں ایسی کونسی زبردست قوت ودیعت کی تھی۔ جو زبان سے نکلتے ہی عوام الناس پر بجلی بنکر گرتی تھی اور سخت سے سخت دل بھی بغیر آنسو بہائے نہ پڑھ سکتا تھا۔ آپ کے احسانات ایسے نہیں جسے قوم فراموش کر سکے۔ آپ کے بیش بہا خزانہ سے آئندہ نسلیں بھی اسی قدر مستفیذ ہوں گی "صالحات" "منازل السائرہ" "شب زندگی" "جوہر قدامت" "طوفان حیات" کے مصنف کا نام ایسا نہیں کہ اس کے جسد خاکی کے مانند مردہ ہو جائے۔ مصور غم اپنے ان زندہ جاوید کارناموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی تمام تصانیف سوز و گداز سے بھری ہیں ایک ایک سطر پڑھنے والے کے جگر کے پار ہوتی ہیں اور ان میں کچھ ایسا درد ہے کہ بے اختیار طبیعت متاثر ہو جاتی ہے۔ بہت سے مصنفین کے دردناک افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا مگر جو درد آپ کے معمولی سے معمولی افسانہ میں ہوتا ہے وہ بات کسی میں نہ پائی۔ کیونکہ حضرت علامہ مغفور کی تحریر ایک دُکھے ہوئے دل کی ہوتی تھی اس لئے دل اس کا اثر قبول کرتا تھا۔ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو الفاظ سچے دل سے نکلے ہیں وہ ضرور دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان اس سے متاثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جو الفاظ بناوٹی ہوں جس میں حقیقی درد کا شائبہ بھی نہ ہو۔ وہ خواہ ظاہری طور پر کتنے ہی درد آمیز کیوں نہ ہوں دل اسکا اثر قبول نہیں کرتا۔ آپ کی تصانیف اس مبالغہ آمیزی سے بالکل مبرا ہوتی تھیں اور آپ کی یہ ہی خصوصیت آپکو تمام مصنفین سے بلند کرتی ہے آپ صرف مصنف ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست مصلح قوم تھے جن کے اصلاحی افسانے اس سلسلہ

میں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ آپ صرف تحریر ہی نہ فرماتے تھے بلکہ اس کی اصلاح کا سچا درد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ روحانی معلّم تھے جو اپنی بے بہا تصانیف کے ذریعہ اپنی قوم کے مظلوم طبقہ کو جوہر علم سے مالامال فرماتے تھے۔ اسمیں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جتنا طبقہ نسواں آپ کی تصنیفات سے مستفیذ ہوا اور جو روحانی تعلیم آپ کی تصنیفات سے ملیں۔ علی تعلیم سے اتنا مستفیذ نہ ہوا اور نہ اتنی تعلیم ملی۔ میرا خود بھی یہی حال ہے۔ آپ کی تصنیفات ایک معلّم کا کام دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ آپ اپنی ہیروئن کو بی۔اے۔ ایم۔اے پاس دکھانے کی بجائے سگھڑ سلیقہ شعار گھر والی کی صورت میں پیش کرتے تھے اور اسی کو تعلیم یافتہ سمجھتے تھے جس سے آپ کی تصانیف پڑھنے والے کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صرف بی۔اے۔ ایم اے کی اعلیٰ ڈگریاں پا لینا اعلیٰ تعلیم نہیں۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم اپنے کھوئے ہوئے نسوانی جوہر کو حاصل کرنا ہے جس کا تذکرہ آپ کے اس بے بہا ذخیرہ میں بھرا پڑا ہے۔ عام مصنفین کے نزدیک ایک بی۔اے پاس لڑکی جو کلب جاتی ہو اعلیٰ سوسائٹی سے رابطہ رکھتی ہو جو ڈنر پارٹیوں میں بلانے اور جانے کا سلیقہ رکھتی ہو باجہ بجاتی ہو۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت سائنٹیفک طریقہ پر کرتی نہیں بلکہ کراتی ہو۔ مہذب شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال ہے۔ برعکس اس کے آپ کا نظریہ بالکل اس سے مختلف تھا۔ آپ کے نزدیک تعلیم یافتہ اور مہذب و شائستہ وہ تھی جو حقوق اسلام اصول اسلام سے واقف اور اس کی حامل ہو چوٗلھے کے پاس بیٹھ کر کھانا پکاتی ہو اپنے بچوں کو خود کھلاتی ہو۔ گو سائنٹیفک طریقہ سے بچوں کی پرورش کراتی نہ ہو بلکہ خود سادے طریقے سے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں منہمک ہو۔ گو اس کا گھر اعلیٰ ساز و سامان سے اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ نہ ہو مگر سلیقہ اور کفایت شعاری سے مختصر سجا ہوا ہو اپنے بیش بہا جواہر اور انمول روایات کی حامل ہو۔ المختصر آپ اس دور کی ہندوستانی عورت کو اسی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے جس کا چربہ وہ صفحۂ قرطاس پر اُتارتے تھے۔

بلاشبہ آپ کے ان غیر فانی خیالات سے عورتیں بہت مستفیذ ہوئیں اور ہو رہی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ آپ صرف عورتوں کے ہی روحانی معلّم نہ تھے بلکہ بڑے بڑے مردوں نے بھی آپ سے استفادہ حاصل کیا۔ اور بہتوں نے آپ سے انشائے ادب سیکھا۔ آپ کی یہ عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات ایسی ہیں جنہیں ہماری بدنصیب قوم یاد کر کر کے سر دھنے گی اور کبھی ان احسانات سے سبکدوشی حاصل نہ کر سکے گی۔ افسوس موت ایسے باکمال مصنف کو دنیا سے اُٹھا کر لے گئی سچ ہے ؎

یہ بات یاد رہے ہر کسی کو اے تسکین
کہ آسمان مٹاتا ہے باکمالوں کو

خدا غریق رحمت کرے اور سدا اپنی رحمت کے پھول برساتا رہے اس فردوس آشیاں پر۔

ب۔ن۔ آلنسہ ابراہیم (مدراس)

علامہ راشد الخیری کی ٹریجڈی اور دیگر تصانیف کی خصوصیات

(از کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب میڈیکل انسٹیٹیوٹ)

ٹریجڈی کسے کہتے ہیں ارسطو نے حزنیہ نظم کی تعریف لکھتے ہوئے ٹریجڈی کو خوف و رحم کے جذبات تک محدود کر دیا ہے، جو واقعہ نظم کیا جائے یا نثر وہ پڑھنے والے پر اگر خوف یا رحم کا جذبہ نہ طاری کرے تو ارسطو کے خیال سے وہ ٹریجڈی نہیں کہا جا سکتا۔ گویا ارسطو خوف اور رحم ان دو جذبات کو ٹریجڈی کی خصوصیات تسلیم کرتا ہے۔ ٹریجڈی کی یہ تعریف جو یونانیوں کے لٹریچر میں پائی جاتی ہے جدید لٹریری محققین کے نزدیک بہت محدود ہے۔ پروفیسر مڈلٹن اور دیگر ماہرین ادبیات اپنے تازہ ترین علمی مباحث میں ٹریجڈی کے اس اثر کو جو بزدلانہ خوف پیدا کرے عیب شمار کرتے ہیں۔

ٹریجڈی کا پلاٹ کیسا ہو ٹریجڈی کے پلاٹ کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ سوائے خوف یا رحم کے جذبہ کے اور کسی تیسرے جذبہ کو نہ ابھارے۔ ٹریجڈی کے کردار کو ایک بہت نیک شخص دکھا کر اچھی حالت سے بری حالت میں پیش کرنا ٹریجڈی کا بہت بڑا عیب ہے کیونکہ اس سے رحم یا خوف کے بجائے بے انصافی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک بہت ہی خراب کردار کو بری حالت سے اچھی حالت میں دکھانا نفرت پیدا کر دیتا ہے اور ٹریجڈی کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، تیسری کیفیت جس میں ایک برے شخص کو اچھی حالت سے بری حالت میں دکھایا جائے ٹریجڈی نہیں کیونکہ یہ کیفیت ہی غیر معمولی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاص اثر نہیں رکھتی، اسکو یوں سمجھئے کہ بچہ سقہ افغانستان کا حکمراں ہو گیا اور چند ہی دن کے بعد وہ ذلیل و خوار ہو کر مصیبتوں میں گرفتار ہوا یہ واقعہ بظاہر ٹریجڈی معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ بچہ سقہ ابتدا ہی سے غاصب تسلیم کیا جا چکا تھا اس لئے اُسکا زوال کوئی خاص جذبۂ رحم ہمارے دلوں میں پیدا نہیں کرتا لہذا بچہ سقہ کے واقعہ کو اگر کوئی سخت سے سخت ہلا دینے والے الفاظ میں بھی نظم یا نثر کر دے تو وہ ٹریجڈی نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

ٹریجڈی کا نفسیاتی پہلو نفسیات کے ماہرین اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ ہر شخص جس طرح مسرت و انبساط کا خواہاں ہوتا ہے اسی طرح درد و الم کو بھی ڈھونڈتا رہتا ہے، روح انسانی مسرت کے ساتھ الم کی بھی ہمیشہ تشنہ پائی جاتی ہے، جسقدر لطف خوش کن اشیاء میں ملتا ہے اسیقدر بلکہ کبھی کبھی اُس سے بھی زیادہ دلچسپی المناک واقعات سے بھی ہو سکتی ہے اور اس خواہش کی تسکین کے لیے ٹریجڈی پیش کی جاتی ہے، پروفیسر مڈلٹن کہتا ہے کہ ٹریجڈی خوفناک و دردانگیز احساسات کا مرقع ہونا چاہیے۔

ٹریجڈی کے عیوب بعض کمزور طبیعتیں اور جذبۂ الم کو خبط کے درجہ تک پہنچا دینے والے مزاج اس فطری خواہش الم کی حد سے گذر کر روح فرسا رنج و الم کے جویاں ہو جاتے ہیں انکو خوف و ہراس، بزدلی اور سہم جانے کی بیجا کیفیت ہی سے تسکین ہو سکتی ہے، وہ المناک و دردانگیز لٹریچر جو اس مجنونانہ خواہش کی تسکین کے لیے پیش کیا جائے لٹریری حیثیت سے خواہ کتنا ہی نمایاں کیوں نہ ہو ٹریجڈی نہیں تسلیم کیا جانا چاہیے، اس قسم کے لٹریچر کی مثال میں ہمارے مرثیہ کے لٹریچر کا ایک بڑا حصہ پیش کیا جا سکتا ہے ہمارے

ذاکرین اور مرثیہ گو پبلک کی رنج والم کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کی تسکین کو مدِ نظر رکھکر ایک واقعہ کو جو اصل ٹریجڈی ہے ٹریجڈی سے گذار کر بزدلی، کمزوری، خوف وہراس کے درجہ تک پہنچا کر اپنے لٹریچر کو علمی ولٹریری حیثیت سے بیکار کر بیٹھے ہیں۔

ٹریجڈی لکھنا آسان نہیں

ٹریجڈی کے لئے درد انگیزی والمناکی کس درجہ تک پیش کی جائے ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسکا حل آسان نہیں، اسکا تعلق صرف مصنف سے نہیں بلکہ پڑھنے اور سُننے والے کے مزاج وطبیعت اور جذبات وکیفیات نواحی سے بھی ہے، ایک شخص کسی المناک واقعہ کی خبر سُنکر رُو دیتا ہے، دوسرا خموش ہوجاتا ہے اور کچھ زیادہ اثر پذیر نظر نہیں آتا، تیسرا بلبلا جاتا ہے، دھاڑتا ہے، روتا ہے، پیٹتا ہے اور ایک وارفتگی کی کیفیت پیدا کرلیتا ہے، ایک ٹریجڈی لکھنے والا اپنی طرزِ تحریر، بندشِ الفاظ ومحاورات میں کونسی حد مقرر کرے کہ جو اِن تینوں مختلف المزاج اشخاص کے لئے کسی حزنیہ واقعہ کی صحیح معنوں میں "ٹریجڈی" پیش کرسکے، یہ ہیں مشکلات کہ جو ایک ٹریجڈی لکھنے والے کو پیش آتی ہیں۔

ٹریجڈی کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے

ٹریجڈی اصل واقعہ کی نقل ہوتی ہے اور پڑھنے والا اس نقل سے متاثر ہوکر زندگی کے ایسے ہی واقعات کے موقعہ پر اس نقل کو اصل بنا دیتا ہے، یہ اسباق تحت الشعور کے خزانہ میں جمع رہتے ہیں اور وقتِ موقع پر اپنے معمول کے عمل وخیال پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے اُسوقت کے ہر فعل کو اپنی فطرت سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ کسی وقت کسی پڑھی ہوئی تحریروں یا سُنی ہوئی نظموں یا قصوں کا اثر ہوتا ہے، میں نے ایک خاتون کو اُنکے چھ سال کے بچہ کی موت کے بعد یہ کہتے سُنا کہ "میں خود اب چند دن کی مہمان ہوں"، کاش میرے بچے تو چند دن اور نہ مرتا، ہائے تم کو تو اکیلے سونیکا اسقدر شوق تھا کہ کبھی میرے پاس نہ سوئے، جاؤ اب قبر میں اکیلے سوتے رہو"، یہ کہکر وہ انتہائے رنج سے نیم بیہوش سی ہوگئیں اور غالب کا یہ مصرعہ اُسکے منہ سے نکلنے لگا "تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور" میں نے فوراً اس نفسیاتی کیفیت پر غور کیا آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اُس خاتون کی نوحہ خوانی غالب کے اس مصرعہ کی تفسیر کے سوا، اور کیا تھی؟ نیم بیہوشی کی حالت میں نوحہ خوانی کے بجائے اصل مصرعہ اُنکے مُنہ سے نکل رہا تھا، یہ ہے لٹریچر کا اثر جو ہمارے دل ودماغ پر پڑتا ہے اور خصوصاً ٹریجڈی کا۔

علاّمہ کی طرزِ نوحہ خوانی قابلِ اعتراض نہیں

اس نازک مسئلہ کا لحاظ رکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ راشد الخیریؒ کی طرزِ نوحہ خوانی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ علاّمہ نے "وداعِ ظفر" یا "نوبت پنجروزہ" میں شاہ ظفر کی زبانی جو نوحہ خوانی کی ہے وہ پروفیسر ہڈسن کے نظریہ کے مطابق ٹریجڈی کی اُن مستثنیات سے تعلق رکھتی ہے کہ جو واقعہ کے لحاظ سے کبھی بھی مبالغہ آمیز نہیں ہوسکتی۔

نوبت پنج روزہ ادبی لحاظ سے مکمل ٹریجڈی ہے

شاہ ظفر جنکی سلطنت غارت ہوئی، گھر لُٹ گیا، ایک قیدی کی حیثیت میں ہوں اور اُنکو اپنے دو جوان لڑکوں اور پوتے کے بے گناہ قتل کی خبر ملے تو وہ اگر دیواروں سے سر نہ پھوڑیں تو اور کیا کریں، اگر ایک محبوس بادشاہ یوں نوحہ خوانی کرے۔

> "زینت محل! میرے پہلو میں دل ہے، پتھر نہیں، بہادر شاہ انسان ہے جانور نہیں مجھکو سنبھالو، میرا دل نکلا، میری جان چلی، اچھا اچھا، پیارے بچوں، جاؤ، بڈھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمھارا صدمہ دیکھنا تھا، مجبور ہے"

تو کیا اسکو بزدلی کی تعلیم یا بے صبری کا سبق کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ٹریجڈی کو کس طرح جانچتے ہیں

پروفیسر ہڈسن کہتا ہے کہ کسی ٹریجڈی کو پڑھنے کے دوسرے دن سوچو کہ جس بات یا واقعہ پر مصنف نے تمہارے جذباتِ الم وخوف کو ابھار دیا تھا وہ واقعہ اس درجہ قابل تھا کہ جس

درجہ تمہارے جذباتِ الم اُبھرے تھے یا نہیں، اگر واقعہ اور جذبات کے اُبھار میں تناسب محسوس ہو تو وہ اصل ٹریجڈی ہے اور اگر نہیں تو وہ ناکارہ مبالغہ آمیزی ہے اور ایسی تصنیف ردی کی ٹوکری کے قابل، وداعِ ظفر میں جس سانحہ کا ذکر ہے اُس کی المناکی کو دیکھئے اور شاہ ظفر کی زبانی علامہ راشد الخیریؒ کے ماتم و نوحہ خوانی کا اندازہ کیجئے آپ کو نوبت پنج روزہ یا وداعِ ظفر میں مکمل ٹریجڈی نظر آئے گی۔

ٹریجڈی کی تمام ادبی خصوصیات نوبت پنج روزہ میں موجود ہیں

ٹریجڈی کے کردار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تباہی و بربادی کا خود ذمہ دار نہ ہو بلکہ معصوم ہونے پر تختۂ مشق ہو جائے، بہادر شاہ کی تباہی و بربادی دوسروں کے ذریعہ تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے، علامہ راشد الخیریؒ نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ظفر شاہ بے قصور تھے، معصوم تھے، لیکن جو اُنکے تھے انہوں نے غداری کر کے اُنکو ملک بدر کرایا اور اُنکے اہل و عیال پر ظلم و ستم تڑوائے۔ ٹریجڈی کا یہ بھی کمال مانا جاتا ہے کہ جو ظلم و ستم کا بانی ہو وہ مظلوم کا دشمن نہ ہو، بلکہ مظلوم کسی دوسرے کی بُرائی کا خمیازہ بھگتے، نوبت پنج روزہ میں علامہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انگریز بہادر شاہ کے ذاتی دشمن نہ تھے بلکہ مخبروں کی غلط خبروں اور کسی خاص سیاسی پالیسی کی وجہ سے ظفر کے بچوں کو موت کے گھاٹ اُترنا پڑا اور شاہ ظفر سے دہلی چھوٹی اور رنگون میں اُس مصیبت زدہ بادشاہ کو بے یار و مددگار بقید فرنگ رہنا پڑا۔ ٹریجڈی کی تمام علمی و ادبی خصوصیات کو یکجا کر کے نوبت پنج روزہ پر تنقید کرنے والا شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ گو علامہ راشد الخیریؒ نے نوبت پنج روزہ ایک تاریخی مجموعہ کے طور پر لکھا ہے لیکن اسکو ایک مکمل ٹریجڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

علامہ کی طرزِ نوحہ خوانی قدیم معاشرت کا نمونہ ہے قابلِ تقلید نہیں

دوسری کتابوں میں جہاں علامہ نے رنج و غم کا سماں پیش کیا ہے اور کسی ماں، بیوی، بیوہ یا یتیم بچوں سے نوحہ خوانی کرائی ہے وہ آجکل کی ذہنیت اور معاشرت کے لئے موزوں نہیں لیکن یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ علامہ اُسوقت اور اُس مقام کی تصویر کھینچتے ہیں کہ جہاں اور جب لوگوں کی ذہنیت اس طرز ہی کو پسند کرتی تھی، نوحہ و زاری، بیان کرنا، سر پھوڑنا، چھاتی پیٹنا، دہائی دینا، رنج و غم کے اظہار کے لیئے ضروری سمجھا جاتا تھا، اُس ذہنیت و معاشرت کی صحیح تصویر کھینچدینے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آجکل کی سمجھدار بچیاں اور عورتیں اُس معاشرت کی تقلید کریں اور اظہارِ رنج و غم کی ایسی مجنونانہ، بُزدلانہ اور غیر اسلامی طرز کو اپنے لئے تجویز کر لیں، یہ خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ علامہ کی نوحہ خوانی کی طرز آپ کی تقلید کے لیئے نہیں ہے بلکہ قدیم معاشرت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے، اِس نکتہ نظر سے دیکھنے کے بعد علامہ کی طرزِ نوحہ خوانی پر کوئی الزام باقی نہیں رہ جاتا۔

علامہ ایک سوشیل ریفارمر اور مصلحِ اعظم تھے

علامہ اپنی تصانیف کے تحت میں ہمیشہ کسی خاص مقصد و غرض کی اشاعت کو مدِ نظر رکھتے تھے، اس لئے اُنکی "ٹریجڈی" کو خالص ادبی نظر سے دیکھنا صحیح نہیں علامہ، ارسطو کی ٹریجڈی کی تعریف کی حدود میں رہ کر وہ کام کر ہی نہیں سکتے تھے کہ جو اُنکی زندگی کا مقصد اولیٰ تھا۔

علامہ ٹریجڈی کے غلام نہ تھے

علامہ کو کہیں اپنی معاشرت کی تباہی کا رونا تھا، تو کبھی کسی کے لئے پبلک کی ہمدردی حاصل کرنا، کہیں عورت کی حمایت کا راگ گانا تھا تو کبھی مرد کے ظلم و جبر کی تشہیر مدِ نظر، کہیں قدیم معاشرت کی نوحہ خوانی اور آیندہ معاشرت کی صحیح راہ کی رہبری مقصود تھی تو کہیں مغرب پرستی کی بُرائیوں سے بچانے کی کوشش حقیقت یہ ہے کہ وہ ٹریجڈی کو ٹریجڈی کے لیئے نہیں بلکہ اپنی مقصد برآری کے لیے کام میں لاتے تھے، اُنکی تصانیف کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے، اِس تشریح کے بعد میں علامہ کی تصانیف کی خصوصیات کا کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میری رائے کیوں قابل توجہ ہے

مجھے تمدن و عصمت کے ابتدائی دور سے علامہ کی تحریروں اور تصنیفوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، میں سنہ ۱۹۰۹ء سے سرسری طور پر اور سنہ ۱۹۱۱ء سے متواتر علامہ کی تصانیف و تحریرات کو غور سے پڑھتا رہا ہوں، میری موجودہ ذہنیت بھی ایک بڑی حد تک علامہ کے پروپگنڈے کی رہین منت ہے، مجھے علامہ کی پرائیوٹ زندگی سے بھی ایک حد تک واقفیت رہی ہے، مجھے نسوانی تحریکوں سے بھی ایک زمانہ دراز سے واسطہ پڑتا رہا ہے، ان صورتوں میں میری رائے اس قابل ضرور ہونا چاہیئے کہ جس پر غور کیا جائے اور جس پر اسوقت تک اعتراض نہ کیا جائے جب تک علامہ کی تصانیف اور جن حالات و ماحول میں وہ لکھی گئی ہیں اُنکا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کوئی دوسری رائے قایم کرنے کا موقع نہ ملے۔

مصور غم اور ٹریجڈی لکھنے والے کی تفریق

مجھے علامہ کی تصانیف کے متعلق مختلف اصحاب سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا اور مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ حضرات ”مصور غم“ اور ٹریجڈی لکھنے والے کے فرق کو نہیں سمجھتے، غم کی مصوری کرنے کے لئے ٹریجڈی لکھنا ضروری نہیں ایک مصور غم، اپنے زور قلم سے کسی کمیڈی کے بہت سے حصوں میں اس درجہ غم کی مصوری کرسکتا ہے کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ جائیں

شب زندگی ایک کمیڈی ہے

میں آپ کو شب زندگی حصۂ دوئیم کی سیر کرا کے اس نکتہ کو سمجھانے کی کوشش کرونگا۔ یہ تصنیف مجسم کمیڈی ہے، لیکن آپ اسکو شروع سے آخر تک پڑھیئے گی یا آپ کی آنکھیں تر ہوجائیں گی، فاطمہ ایک مالدار باپ کی بچی، اپنی ماں کی جہالت کا شکار رہی، فضول خرچیوں اور جہالت کی بدولت باپ کے مرنے کے بعد غربت نے آگھیرا۔ احسان چچازاد بھائی جس سے فاطمہ کا نکاح ہوچکا تھا، ظالم و سفاک اور اپنی سخت دل ماں کے اشاروں پر چلنے والا بیمار ہوا، ڈاکٹروں نے انسانی خون علاج میں بتایا، کوئی خون نہ دیتا تھا، موت سامنے تھی فاطمہ جسکا بھولکر بھی احسان نام نہ لیتا تھا اور جسکو طلاق دیکر دوسرا نکاح کرنا چاہتا تھا خفیہ طور پر رات کو آئی اور اپنا خون گردن کی رگ سے نکالکر رکھ گئی، فاطمہ کے زخم سے زہر چڑھا اور وہ بیمار ہوگئی، احسان اچھا ہوگیا، خود احسان اور فاطمہ کی دوسری چچی بلقیس نے فاطمہ کو خون دیتے وقت دیکھ لیا تھا، احسان نے اچھا ہوکر بھی فاطمہ کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ طلاق دیدی اور ثریا سے نکاح کرلیا، ثریا نے جو فاطمہ کی بظاہر گہری دوست تھی دھوکے سے فاطمہ کے نکاح کی نشانی یعنی انگوٹھی چرا کر احسان کو دیدیا اور اس طرح احسان کو موقع ملگیا کہ وہ فاطمہ کو بے وفا و دغاباز کہے اور طلاق دیدے، فاطمہ نے بلقیس کی مدد سے صحت پائی اور اپنی دستکاری کے ذریعہ مالدار ہوگئی، بلقیس نے اپنے بیٹے سے فاطمہ کی شادی کردی، احسان پھر بیمار ہوا، پھر خون کی ضرورت ہوئی، اُس کی بیوی ثریا نے خون دینے سے انکار کردیا، ثریا اپنے گھر چلی گئی اور وہاں جاکر فاطمہ کی متعدی بیماری میں مبتلا ہوگئی، احسان نے اپنی ماں کو مرتے دم فاطمہ سے قصور معاف کرانے بھیجا، فاطمہ نے قصور ہی معاف نہیں کیا بلکہ اپنے خاوند کی اجازت سے اپنے خون کا باقی ماندہ حصہ بھی دیا اور ثریا کے متعدی مرض کی دوا بھی دی، ایثار و وفاداری، عفو و درگذر، طلاق کے بعد دوسرا نکاح کرنے اور نیکی کا اچھا بدلہ ملنے کی مثال کا یہ قصہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے، ادبی لحاظ سے یہ تصنیف ”کمیڈی“ ہے لیکن اس کے ہر ہر صفحہ کا پڑھنے والا غم کی اعلیٰ مصوری کی ایسی مثالیں دیکھتا ہے کہ علامہ کو ”مصور غم“ لکھنے پر مجبور ہوجاتا ہے، اس مثال سے آپ پر یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ایک ٹریجڈی لکھنے والے اور مصور غم میں کیا فرق ہے۔ جو نقاد اس نکتہ کو نہ سمجھ لے گا اُسکو علامہ کی تصانیف پر علمی تنقید کرتے وقت بڑا زبردست مغالطہ ہوگا۔

علامہ کی تصانیف کے پلاٹ کی خصوصیات

علامہ کے پلاٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ ٹریجڈی لکھ رہے ہوں یا کمیڈی اپنے پلاٹ کو رنج و غم سے اسقدر لبریز کردیتے

ہیں کہ پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی ہے، جی بھر آتا ہے اور بے ساختہ آنسو نکل آتے ہیں" موٴدہٗ کے پلاٹ کو لیجئے یہ ایک مکمل "کمیڈی" ہے اس کے ۱۶ اباب ہیں ان میں سے ۴ اباب ایسے ہیں کہ جو ایک مسلم گھر میں معصوم بچی کی پیدایش پر ناخوشگوار فضا کی تصویر، کنوار پنے کے زمانہ میں لڑکی کی صحیح پرورش سے تغافل، باپ کی ناخوشی، نفرت اور اپنی لخت جگر کو وبال سمجھنے کی نفرت انگیز کہانی، لڑکی کے اپنے مال ومتاع سے محروم کر دینے کے لئے ظلم و عیاری کے شرمناک اور دل ہلا دینے والے کرشمے اور شادی کے بعد وراثت سے محروم عورت پر خاوند کی زیادتی، جبر وظلم جس کی نوبت طلاق تک پہنچی، ایک پانچ چھ لاکھ کی جائداد کی آمدنی لکھنے والے باپ کی لڑکی کی وراثت سے محروم ہونے کی وجہ سے یہ حالت کہ جب خاوند ہی اُس کے ذریعہ معیشہ حاصل کر سکا تو "موٴدہ سات مہینہ کا بچہ پیٹ میں لئے شوہر کے گھر سے (طلاق کے بعد) رخصت ہوئی" یہ مظلوم موٴدہ ماری ماری پھرتی ہے اور ایک شام جب "موٴدہ اپنے مردہ بچہ کو گود میں لیے قبرستان کے اندر داخل ہوئی، اُس نے ایک بڈھے شخص سے جو جھونپڑی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہا۔

"اس بچہ کو دفن کر دیجئے" **بڈھا** "اور ہمارا کام ہی کیا ہے۔"

موٴدہ :"مگر میرے پاس اِسکا معاوضہ کچھ نہیں، میں اس بچہ کو کفن بھی نہ دے سکی۔" **بڈھا** : "بس تو آگے بڑھ۔"

موٴدہ : "آپ مجھے زمین کھودنے کے اوزار دیدیجئے میں خود دفن کر دوں۔" **بڈھا** : "کدال پھاوڑے کا کرایہ، زمین کی قیمت دینی ہوگی، نہیں تو چل یہاں سے۔"

اب شام ہو چکی تھی، نماز کا وقت تھا، بچہ کی لاش ایک قبر پر رکھ کر موٴدہ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور مردے کو لے کر چلی، چاندنی رات تھی، دریا سامنے لہریں لے رہا تھا، کنارے پر پہنچی اور آسمان کی طرف دیکھکر کہا "کیا کروں کوئی دفن نہیں کرتا" اتنا کہہ کر موٴدہ نے بچہ کا منہ کھولکر پیار کیا، دریا میں پھینک دیا اور باآواز بلند "اللہ اکبر" کہہ کر آگے بڑھی۔"

کیا یہ سین کسی بچہ والی کی نظر کے سامنے پیش ہو جانے پر وہ ضبط کر کے اپنے آنسو روک سکے گی، اس غم کی مصوری، اس دردناک داستان، اس دل ہلا دینے والے سین اور عورت کی مظلومیت ونا چاری کا فوٹو کھینچنے کے بعد علامہ موٴدہ کو ایک جج کی مطمئن بیوی دکھا دیتے ہیں کہ جس کے قبضہ میں اپنے پہلے ظالم شوہر کی عزت وذلت ہوتی ہے اور جو اپنے باپ اور بھائیوں کے ظلم کے بدلے میں اچھے سلوک اور سعادتمندی کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ علامہ کے پلاٹ کی یہ نمایاں خصوصیت اس مثال سے صاف نمایاں ہے، ایک کمیڈی کے پلاٹ میں بھی "ٹریجیڈی" کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ میں لکھ چکا ہوں کہ علامہ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ اصلاح معاشرت، عورت کے حقوق کی حمایت، اسلام کے احکام کو چھوڑ کر رسوم قبیحہ کے پھندے میں گرفتاری اور اُس کے خراب نتائج کے احساس کو پبلک میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اپنی کسی تصنیف کو محض ادبی کمیڈی یا ٹریجڈی بنانے کی ہرگز کبھی کوشش نہیں کی، اُنکی طرز نگارش حزینہ ہے، کمیڈی، ٹریجڈی اور اصلاحی مضمون کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ہی طرز میں نہ لکھا گیا ہو۔ "فانی عشق" بلاشبہ ایک ایسی کوشش ہے کہ جو عام زندگی کے مطالعہ اور اُس کی صحیح ترجمانی کی قدرت کا پتہ دے رہی ہے۔

ٹریجڈی اور کمیڈی کا مقابلہ

اصلاح کے لئے یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ٹریجڈی کمیڈی سے بہتر ہوتی ہے، ٹریجڈی سریع الاثر ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُسکا نقش تا عمر نہیں مٹ سکتا۔ ٹریجڈی خوفِ خدا پیدا کرتی ہے اور خوف خدا انسانیت کی جان ہے، کمیڈی عموماً تفریح و دلچسپی کے لیے پیش کی جاتی ہے گو کمیڈی میں اصلاحی پہلو بھی نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

ٹریجڈی کی دو مختلف شاخیں

ٹریجڈی جذبۂ خوف یا رحم وکرم کو اُبھارتی ہے اس لئے اس کے دو نمایاں حصے ہو گئے ہیں جس کا اثر پڑھنے والے پر مختلف ہوتا ہے (الف) خوف ہراس پیدا کر کے بزدل بنادے یا (ب) ظلم و جبر سے نفرت دلا کر انصاف پسند بنادے اور رحم وکرم، ہمدردی اور مظلوموں کی امداد کے جذبے کو ابھار کر دلیر و قربانی کرنیوالا بنادے، علامہ کی طرزِ نگارش میں ٹریجڈی کی صفت (ب) بدرجہ اتم موجود ہے۔

علامہ کے پلاٹ عورتوں کیلئے نمونہ ہیں

علامہ کے پلاٹ انسانی صفات و کمزوریوں کو اس طریقہ سے نمایاں کرتے ہیں کہ پڑھنے والی ان صفات کو مناسب مواقع پر کام میں لانا سیکھ جاتی ہے اور اُسکو حق و باطل میں تمیز کرنا آجاتا ہے، علامہ کی تصانیف ادبی لحاظ سے کمیڈی ہوں یا ٹریجڈی ہماری عورتوں کی کامیاب عملی زندگی کے لیۓ مشعل ہدایت کا کام کرتی ہیں، اس صنف کی کتابوں میں مولانا کی تصنیف ”الزہرا“ ایک بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، علامہ کے پلاٹ میں غم نگاری کے علاوہ چند اور بھی ضروری چیزیں ہیں جو اُنکے تقریباً ہر پلاٹ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً مذہب کا رنگ، مشرقی معاشرت کی سچی تصویر، خانگی اور سماجی تعلقات کے خوشگوار بنانے کی تعلیم ”موؤدہ“ ہی کے پلاٹ میں دیکھیے، بچہ کی لاش گود میں ہے، بیکسی و بے بسی کا عالم ہے، دو گز کفن اور ایک گز زمین لخت جگر کے لئے میسر نہیں مگر شام ہوتی ہے، وقت نماز آتا ہے اور موؤدہ اپنے وارث برحق کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے، کیا کوئی واعظ، کوئی مولوی، کوئی ملاّ فریضہ نماز کی وقت پر ادائگی کی تعلیم اس سے بہتر اور مؤثر پیرائے میں پیش کرسکتا ہے؟ موؤدہ کا خود غرض لالچی شوہر جو صرف اس توقع پر شادی کرتا ہے کہ اُس کے باپ کے مال و متاع کے کچھ حصہ کا مالک بن بیٹھے گا جب یہ دیکھتا ہے کہ موؤدہ ایک ہزار روپیہ کے علاوہ جو وہ ساتھ لائی تھی اور کچھ پیش نہیں کرسکتی تو وہ موؤدہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ باپ اور بھائیوں کے خلاف مقدمہ چلائے لیکن جس باپ نے بھولے سے ہی کبھی ایک محبت کی نظر اس پر نہ ڈالی تھی اور جن بھائیوں نے اُس پر باپ کو زہر دینے کا الزام لگاکر اُسے اپنے گھر سے دھکے دیکر نکال دیا تھا موؤدہ اُن ہی باپ اور بھائیوں کے خلاف مقدمہ دائر کرنا انسانیت اور حقوق فرزندی کے خلاف سمجھکر طلاق کی مصیبتیں اٹھاتی ہے، کیا سعادتمندی کا اس سے بڑھکر کوئی اور سبق سکھایا جاسکتا ہے، یہی موؤدہ محنت و جفاکشی کرتی ہے، اپنی عصمت کی حفاظت کرتی اور اپنے باپ دادا کی لاج رکھتی ہوئی ایک دن اپنے خلوص و سچائی کا ثمرہ پاتی ہے، ایک ٹریجڈی کمیڈی ہو جاتی ہے اور لڑکیوں کو حق کی فتح اور بھلائی کے بدلے بھلائی کا مکمل سبق دیجاتی ہے، کیا پلاٹ کی یہ خصوصیات مصور غم کو مشرقی عورت کا رہبر کامل نہیں ثابت کر رہی ہیں۔

علامہ کی ہیروئن کی خصوصیات

علامہ کی ہیروئن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ ہے کہ اگر میں فرداً فرداً ہر تصنیف کی ہیروئن کی خصوصیت کا ذکر کرنے لگوں تو مصور غم نمبر کے لئے پھر کسی اور مضمون کی گنجایش نہ رہے، میں مثال کے طور پر علامہ کی تصنیف ”سات روحوں کے اعمالنامے“ کی ساتویں روح کو پیش کرتا ہوں، اس کی ہیروئن قیصر ہے جو ایک شریف سیدانی راجہ کمال پور کی بھانجی جس سے قیصر کا خاوند تھرتھر کانپتا تھا اپنے جہیز میں ایک محلسرا اور چار سو روپیہ کی آمدنی کی جائداد کے علاوہ اور بہت کچھ لائی تھی، اٹھائیس برس کی عمر میں پے درپے چار بچے ہو جانے اور نزلے کی وجہ سے نہ خوبصورت ہی رہی تھی اور نہ بناؤ سنگار میں اپنا وقت لگا سکتی تھی، ایک بچہ پیٹ میں تھا احمد جو اڑتالیس کے قریب تھا اس سے متنفر ہوکر اپنی نفسانی خواہش کا غلام ایک چالیس سالہ قحبہ کو گھر میں لے آیا قیصر اس قحبہ کے سامنے کنیز کی طرح کام کرنے پر مجبور کی گئی، ایک دن اس کے اغوا سے احمد نے قیصر کو محلسرا سے نکال صدر کے گھر میں بھیجدیا جہاں قیصر کو زیور بیچکر بچوں کا پیٹ بھرنا پڑا، قحبہ کو پھر بھی صبر نہ آیا احمد نے اپنے سات برس کے بڑے بچے کو حلوے میں زہر دیا، قیصر پر الزام رکھا جس نے کچھ روز قید میں گزارے لیکن خاوند کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جج نے چھوڑ دیا تو گھر پر آکر دوسرے بچہ کو مُردہ پایا، قیصر کی غیر حاضری میں بچوں کو تنہا فاقہ کی حالت میں رہنا پڑا اور احمد عیش کرتا رہا اور وہ بھی قیصر کے روپیہ سے، قیصر چاہتی تو اپنے رشتہ داروں کو خبر کر کے احمد کو درست کرادیتی لیکن اُس شریف زادی نے صبر و شکر کی حد کردی، وہ ایک روز گھبرا کر گھر سے باہر نکلی اور اپنے میکے جانا چاہتی تھی لیکن اپنے باپ دادا کی لاج اور اپنے خاوند کے فضیحتے کا خیال کر کے واپس آگئی اور جس دہلیز پر دُلہن بنکر قدم رکھا تھا وہاں سے مردہ ہوکر نکلنا ہی بہتر سمجھا، گھر واپس ہوئی تو تیسرا بچہ مرچکا تھا، ایک بچی پانچ برس کی اکرامی رہ گئی تھی اُسکو احمد نے اپنی قحبہ کی خدمت کے لیۓ طلب کیا، قیصر نے اس حکم کو بھی مانا اور اکرام کو بھیجدیا وہ کڑاکے کی سردی میں راتوں کام کرتے کرتے، بچہ تھی، بخار میں مبتلا ہوگئی تو قیصر کے پاس بھیجدی گئی، اکرامی نے بے دوا و دارو

دم توڑا، قیصر بیوہ نہ تھی، مطلقہ نہ تھی، چار سو روپیہ کی جائداد والی اور نواب کی بھانجی بیگمیں بھی نہ تھی لیکن اکرامی کے آخری وقت میں اُس کے پاس مٹکے میں ایک بوند پانی نہ تھا، اُس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور مشرقی عورت کے خدائے مجازی یعنی خاوند کے ظلم و ستم، قہر و غضب کا جواب اپنے چاروں بچوں کی قربانی اور اپنی جان نذر کر کے دیا، اپنے باپ دادا کی لاج رکھ لی اور نہ اپنے خاوند کی فرمانبرداری سے کبھی منہ موڑا اور نہ اُس کی شکایت اور بے عزتی گوارہ کی۔

"ظالم کا ظلم اور سنگدل کی جفا کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی، گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ اب اطاعت کی حد ہو گئی چچا اور ماموں دونوں زندہ بیٹھے ہیں چلی جاؤں مگر ساتھ ہی خیال آیا کیوں قیصر! سادات کے خون کا دھبہ قیامت کے دن تیری گردن پہ ہو گا، باپ دادا کی عزت تیرے ساتھ اور بڑوں کی لاج تیرے پاس ہے، دنیا فانی، کنواری کا عیش نہ رہا، بیاہی کی خوشیاں نہ رہیں، سوکن کا جلاپا رہنے والا نہیں، احمد مالک ہے، آقا ہے، مجازی خدا ہے، خوش ہے، آباد رہے، کنیز ہوں، لونڈی ہوں، جس طرح رکھا رہی اور جس طرح رکھے گا رہوں گی۔"

میں نے اپنے کانوں سے سُنا اور تحریریں آنکھوں سے دیکھی ہیں کہ بعض ناعاقبت اندیش لوگ **علامہ** پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے عورت کو آزادی کا سبق پڑھا کر مسلمانوں کے گھروں کی خوشی دامن کو غارت کر دیا ہے اور ہندوستانیوں کے گھر بگاڑ دیئے ہیں، ایسے لوگ خدارا **علامہ** کی تصانیف کا بغور مطالعہ کر کے بتائیں کہ کیا عورت کو فرمانبرداری کی تعلیم دینے میں فی زمانہ **علامہ** سے زیادہ کسی اور نے کوشش کی ہے، وہ ہندی عورت کو اپنے خاوند کی فرمانبرداری اور اپنے باپ دادا کی لاج رکھنے کی وہ مشرقی تعلیم دیتے ہیں کہ جسکو میں تو آج اُس ہی صورت میں دُرست سمجھتا ہوں کہ مرد بھی ایسی عورتوں کے قابل ہو جائیں ورنہ زمانہ کا یہ تقاضا ہے کہ احمد جیسے مردوں کا منہ کالا کر کے سر بازار جوتے لگائے جائیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ جو احمد نے کیا وہ قصہ کہانی یا مبالغہ ہے ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ایسی مثالیں آج بھی روزانہ زندگی میں ہمارے سامنے موجود ہیں، مرد پھر بھی عورت کی آزادی اور اُس کے نقائص کا رونا روئے جا رہا ہے وہ اپنی آنکھ کے شہتیر کو نہیں دیکھتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا اُسکو کھٹکتا ہے۔

دہلی کی زبان دہلی کی زبان لکھنؤ کے عروج کے بعد بھی ٹکسالی ہی رہی، علامہ اُس گروہ کے آخری شخص تھے جس پر دہلی کی زبان ناز کرتی رہے گی، جو زبان وہ لکھتے تھے آج اُسکا لکھنے والا دُنیا میں کوئی بھی باقی نہیں" **منظر طرابلس**" کے پہلے ہی صفحہ کو کھولو اور پڑھو۔

"سر پر بٹھاؤں، پلکوں سے اُٹھاؤں، سرمہ بناؤں، آنکھوں سے لگاؤں بحیرۂ روم کی ان لہروں کو جو اسوقت پیشِ نظر ہیں اور سرزمینِ طرابلس کی اس خاک کو جو آنکھ کے روبرو ہے۔ صبا! سلام پہنچا، شہدائے طرابلس کی ان مقدس روحوں کو جن کی موت حیاتِ ابدی اور جن کی حیات برکاتِ اسلام کا مخزن تھی، اچنبا ہے اور حیرت ہے، تعجب ہے اور کمال کہ یہ قوم جو آج ہر سمت در در بھیک مانگ رہی ہے کبھی اس قابل بھی تھی کہ ہر قوم اور ہر گروہ، ہر ملک اور ہر سلطنت نے اس کے آگے ناکیں رگڑیں تکلیف ہوتی ہے اور افسوس، رنج ہوتا ہے اور صدمہ کہ خلق و مروت، فلسفہ و حکمت، جرأت و شجاعت، خلوص و دیانت، سلطنت و حکومت، صداقت و روحانیت کو معراجِ کمال پر پہنچانے والے، اپنی گزشتہ عظمت اور جوہر انسانیت سے اتنے بیگانہ اور اس قدر دور ہو جائیں کہ حقیقت فسانہ اور واقعیت دھوکہ معلوم ہو۔"

وداعِ ظفر میں ملک کی تباہی اور اُس کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"معلوم ہے کس سرزمین پر کھڑے ہو؟ یہ وہ سرزمین ہے جس نے شاہجہاں اور اورنگ زیب کے قدم اپنی آنکھوں سے ملے، اکبر و جہانگیر پر اپنے کلیجے کے ٹکڑے قربان کیے، جس کی گود میں اب تک نور جہاں اور ممتاز محل کی ہڈیاں موجود ہیں، غور سے دیکھو یہی سرزمین اسوقت تک لاپرواہی سے دھبے بدل رہی ہے، شیر شاہ اور ہمایوں کے معاملات فنا ہوئے، شاہجہانی حکومت ختم ہوئی، اکبری دور دورے ہو چکے، جہانگیری ڈنکا بج گیا، اب وقت فیصلۂ زمانی

کی تفسیر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ قوموں کے اعمال کس طرح اپنی حالت بدلتے ہیں۔ "عیش خوردوں بہت ہنسے، ہنس چکے، ہنسا چکے، کان لگاؤ اور آسمان کا نغمہ سنو، کھیل کے رسیوں! بہت دن کھیلے، رات کھیلے، دن دن کھیلے، رات رات کھیلے، دنوں کھیلے، ہفتوں کھیلے، کھیل چکے، نظریں نیچی کرو اور زمین کے آنسو دیکھو، یہ کلیجے سے منہ پر آئے ہیں، اگر پہلو میں دل اور دل میں درد موجود ہے تو تڑپو، تڑپو اور پڑھو"

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا"

اگر زبان کوئی چیز ہے اور اُسکا اثر کچھ معنی رکھتا ہے تو آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ **علامہ** کے قبضہ میں کیسی قوت موجود تھی۔

مُصوّرِ غم اور اصلاحِ رُسوم ہماری رسوم بذاتِ خود ہزارہا ٹریجڈی کی بانی ہوتی رہی ہیں جو رسوم مجسم ٹریجڈی ہوں اور جن کے اثر سے ہمیشہ ٹریجڈی ہی پیدا ہوتی ہو اُن کو ٹریجڈی ہی میں پیش کیا جانا چاہئے کیبڈی سے اُنکو دُور کا بھی تعلق نہیں لہٰذا **علامہ** کا میلانِ طبع ٹریجڈی کی طرف نفسیاتی لحاظ سے بالکل صحیح تھا لیکن علامہ رسوم قبیحہ کے نتائج ہی پیش کرنا کافی نہیں سمجھتے تھے اُنکو اصلاحِ رسوم بھی مدِّ نظر تھی، اس ضرورت نے **علامہ** کے اُن مضامین کو جن میں انہوں نے اپنی غم کی مصوری کی قوت کو پوری طرح کام میں لاکر رسوم بد کے نتائج کو بڑی کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے مکمل ٹریجڈی نہ ہونے دیا، یہ میلانِ طبع ایک اعلیٰ ٹریجڈی لکھنے والا پیدا کر سکتی تھی لیکن ضرورتِ وقت کے لحاظ سے اس میلانِ طبع نے ایک ایسا **رہبر کامل اور مصلح اعظم** پیدا کر دیا کہ جس نے رسوم قبیحہ کی بُنیادیں ہلا دیں "طوفان اشک" اور "سیلابِ اشک" کے ہر ہر فسانہ کے ذریعہ وہ اصلاحی کام کیا گیا ہے کہ قوم **علامہ** کا جسقدر بھی احسان مانے کم ہے "محرومِ وراثت" (طوفان اشک) میں ایک باپ اپنی لڑکی کو اپنے مال سے محروم کرکے تمام لڑکے کو دیدیتا ہے، فالج کا دورہ ہوتا ہے، ڈاکٹر بجلی کا علاج بتاتے ہیں جسکا تخمینہ چار ہزار روپیہ ہوتا ہے، لڑکے کو بلایا جاتا ہے، صبح کا بلایا شام کو آتا ہے حال سُنکر بلا جواب دیئے چلا جاتا ہے، ماں پیچھے جاتی ہے تو جواب ملتا ہے۔

"تمہاری تو عقل جاتی رہی ہے، اول تو روپیہ ہی نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول، میں نے معلوم کر لیا ہے کہ موت یقینی ہے، اگر کچھ روز بچ گئے تو سوہانِ روح ہونگے۔"

اب لڑکی کو خبر ہوتی ہے وہ خط لکھتی ہے:-

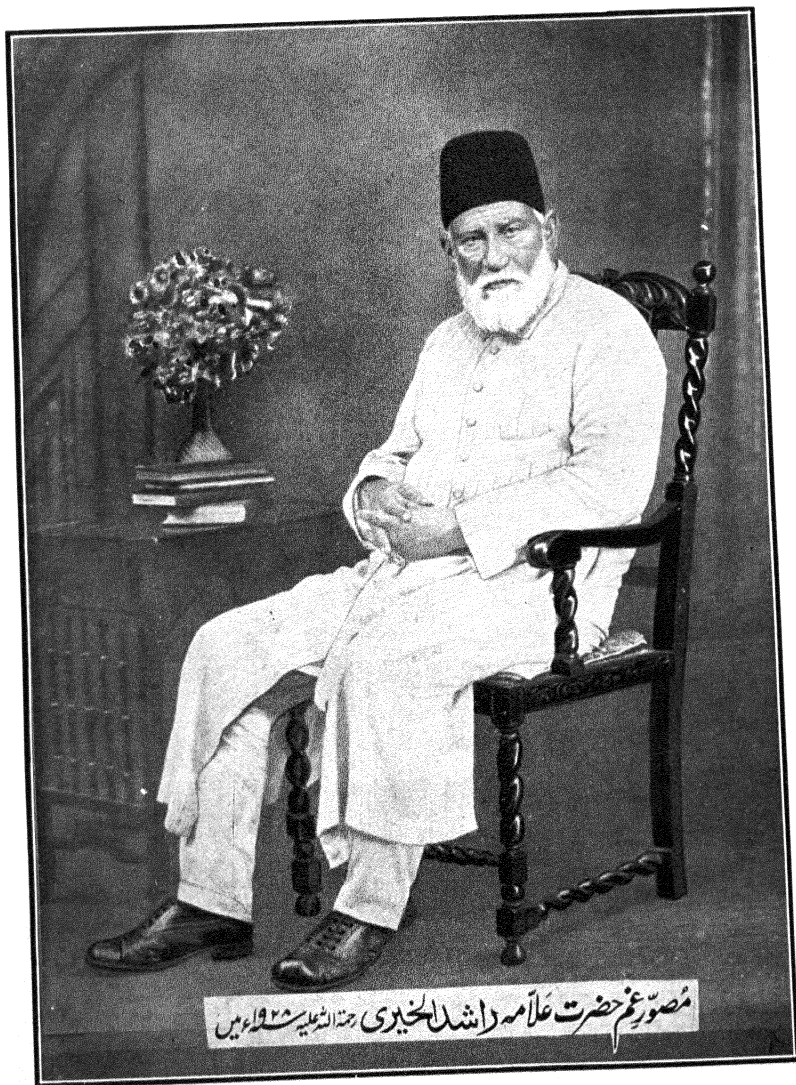
"ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں جس طرح ہوگا آج ہی رات کو بالکل فجر حاضر ہونگی، میرے آنے کا ذکر نہ کیجئے، خفا ہونگے میں سامنے نہ جاؤنگی، دُور ہی سے شکل دیکھ لونگی، اچھی اماں جان، علاج میں کمی نہ کرنا"

لڑکی صبح میکے آتی ہے روپیہ کی سُنکر اُلٹے پاؤں جاتی ہے، رات کو دس بجے روپیہ ماں کو لاکر دیدیتی ہے، ماں خوش خوش باپ سے کہتی ہے:-

"رضیہ یہ چار ہزار روپیہ لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے جو پانچ ہزار روپے اسکو نقد دیئے تھے اُس میں سے یہ لیجئے اور علاج کیجئے۔"

"**رواج کی بھینٹ**" میں زچگی کی خرابیوں کا نتیجہ اس طرح دکھایا گیا ہے:-

"صورت شکل، ہنر، سلیقہ، عطیہ ہر اعتبار سے بے مثل اور لاجواب، نہیں تو سو دو سو میں ایک لڑکی تھی خوش قسمتی سے شوہر بھی ایسا ملا..... کہ ذرا اس کے سر میں درد ہو جاتا تو مچھلی کی طرح تڑپتا اور گھنٹوں بےچین رہتا" ایک سال بعد "افسوس پہلونٹی کا بچہ پیدا ہوتے ہی دُنیا بھر کے امراض اور امراض کے ساتھ ہی شوہر کی بے اعتنائی شروع ہو گئی" ایک کٹر ظالم سوکن آپہنچی اور "مطالبۂ حقوق نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے" مُسلمانوں میں سے ایک نے دو بیویوں میں مساوات قائم رکھنے کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ "کڑکڑاتے جاڑوں میں بیمار عطیہ دودھ پیتے بچہ کو کلیجہ سے لگائے میاں اور سوکن کیلئے چائے بنائے اور انڈے تلے" اور جب اس غلامانہ فرض کو ادا کرنے میں "ہوا کے جھونکے تیر کی طرح کلیجے میں لگ رہے تھے گلے میں پُرانی روئی کی کُرتی سر پر معمولی چادر وہ پورہ ہو اُسنے ہڈیوں میں ادے بچھا دیئے



مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۲۳ء میں

اس غضب کا درد اٹھا کہ عطیہ بے قرار ہوگئی" اور جب اس درد کی وجہ سے تڑپ رہی تھی" دولہا دولہن اُٹھے چولہا ٹھنڈا پڑا تھا دونوں آگ بگولا ہوگئے اور نئی دولہن نے کہا، تم نے اپنے ساتھ میری بھی مٹی پلید کر رکھی ہے، بھلا یہ وقت ناشتہ کا ہے ابھی آگ بھی نہ سلگی۔۔۔ "انکو تو چکر آرہے ہونگے،" وہ حسن جو عطیہ کے سر میں اگر درد ہوجاتا تو مچھلی کی طرح تڑپتا عطیہ کو یہ کہتا ہوا مارنے چلا "اٹھ کھڑی ہو مکار، ابھی آگ سلگا، نہیں تو مارے تھپڑوں کے منہ پھیر دونگا۔" وقت پر عطیہ کا باپ جو شہر کا مشہور وکیل تھا آپہنچا، "حسن بیوی پر شیر تھا، لیکن خسر کے سامنے بھیگی بلی۔" عطیہ نے "باپ کو آتا دیکھکر دوپٹہ سے آنسو پونچھے، سنبھل کر بیٹھی، سلام کیا، ہر چند باپ نے پوچھا مگر اُس نے یہی کہا کہ خدا کا شکر ہے اچھی ہوں" حسن عطیہ کو باپ کے ہمراہ جانے کی اجازت دیدیتا ہے لیکن بچہ کو رکھ لیتا ہے، لونڈی کی طرح کام کرنیوالی کی غیر حاضری سے تکلیف ہوتی ہے اور حسن یہ لکھ بھیجتا ہے، "بچہ اپنی پھوپی کے پاس گاؤں میں ہے، لیکن تم ابھی آجاؤ اگر فوراً نہ آئیں تو صبح ہی زوجیت کا دعویٰ کردونگا اور عدالت کا حکم لے کے چوٹی پکڑ کر گھر میں سے گھسیٹ لاؤنگا۔" عطیہ کا باپ اپنی اور بیمار بیٹی کی عزت رکھنے کیلئے کہتا ہے "جا خدا کے سپرد" لیکن عطیہ سخت بیمار تھی بچہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی، بچہ کسی گاؤں میں تھا جس کے گھر جاکر بھی بچہ کو نہ دیکھ سکتی تھی، مایوسی خوف اور شدتِ مرض کی تاب نہ لاکر "ہائے میرا بچہ" کہہ کر دم توڑ دیتی ہے۔"

جی چاہتا ہے کہ وہ پُر اثر حربے جو **علامہ** نے عورتوں کی حمایت اور بیجا رسوم کے توڑنے کے لیے استعمال کیئے ہیں ایک ایک کرکے آپکے سامنے پیش کردوں لیکن مضمون طویل ہوتا جارہا ہے اس لیے مجبور ہوں۔

علامہ کی تصانیف اور جاہلانہ عقیدوں اور اوہام باطلہ کی بیخ کنی

علامہ نے گنڈے تعویذ، بھوت پلید، نظر د آسیب اور ایسے ہی دیگر جاہلانہ عقیدوں اور اوہام باطلہ کی گت بناکر جو تعلیم بچوں کو دی اور جو خدمت قوم کی اس طرح کی ہے وہ اکیلی ہی اُنکو **مصلح اعظم** کا خطاب دلانے کو کافی ہے۔ صبح زندگی اور شام زندگی میں جو جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ تعلیم ہی نہیں لڑکیوں کی تربیت کے لیے بھی بہت کار آمد ہیں، مثلاً شام زندگی میں بھونچال کی صحیح وجہ بتاکر اس خیال کی تردید کی ہے کہ زمین گائے کے سینگ پر کھڑی ہے۔ "ہسٹریا" کو سمجھانے میں جس تحقیق اور صحیح مطالعہ کا مظاہرہ **علامہ** نے کیا ہے وہ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں سے خراج تحسین حاصل کرسکتا ہے۔ شام زندگی میں لکھتے ہیں۔

"ایک انگریز کی لڑکی اس مرض میں گرفتار ہوئی اور حالتِ مرض میں جب وہ بیہوش تھی اُس نے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، بھلا خیال کرو ولایت میں ایک انگریز کی لڑکی کا کھلم کھلا قرآن شریف پڑھنا کیسے تعجب کی بات تھی، ہمارے ہاں تو جن کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا تھا۔۔۔ مگر ڈاکٹروں نے جب خوب تحقیقات کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لڑکی کا باپ مصر میں فوج کا کرنل تھا، اسوقت اس بچی کی عمر چار برس کی تھی اور صبح ہی خانساماں کے ہاں کھیلنے چلی جایا کرتی تھی، وہ اُسوقت قرآن شریف پڑھتا تھا اور یہ گھنٹے دو گھنٹہ وہیں کھیلتی رہا کرتی، وہی الفاظ اس کے دماغ میں بیٹھے ہوئے تھے جو اب بیہوشی کی حالت میں حافظے نے دماغ سے لیکر زبان سے ادا کروا دیئے۔"

علامہ کی تصانیف اور عورت کو سماجی تعلقات کی صحیح تعلیم

علامہ نے اپنی تصانیف شام زندگی، شب زندگی، بچہ کا کرتہ، ساتھ روحوں کے اعمالناموں وغیرہ میں ایک کنواری لڑکی، بیاہی عورت، بہو، ساس، سوتیلی ماں، بیوہ، طلاقن، غرض کونسی عورت ہے جسکو صحیح راہ نہ دکھائی ہو؟ اگر **علامہ** کی ہیروئن کو عورتیں اپنی زندگی کی مختلف حالتوں میں اپنے لئے نمونہ بنالیں تو ہمارے گھر حقیقتاً جنت بنجائیں، عورت کو فرمانبرداری، صبر، وشکر، وفاداری، عصمت شعاری، بچوں اور خاوند کیلئے قربانی، یتیموں اور بیکسوں سے ہمدردی، رشتہ داروں کے درجات کا لحاظ، عفو و درگذر، خدا ترسی و خدا پرستی، کونسی اچھائی کونسی خوبی اور کونسی مذہبی، اور معاشرتی صفت ایسی ہے کہ جس کی بہتر سے بہتر مثال مؤثر سے مؤثر پیرائے میں **علامہ** نے اپنی تصانیف میں پیش نہیں کی ہے۔ سماجی تعلقات کی جو تعلیم **علامہ** نے دی ہے اُسکے لئے مشرقی مرد کو ادھا نہیں دینا چاہئے بلکہ **علامہ** کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے عورت کے عروج و آزادی کے لئے خانگی و سماجی صفات کو لازم قرار دیکر گھر کی زندگی کو غلط آزادی

مسموم اثرات سے بچانے میں پوری قوت سے کام لیا ہے۔

علامہ کی تصانیف اور حبِّ وطن اور اخوتِ اسلامی کی تعلیم

"سیلاب اشک" میں "حج اکبر" پڑھیے اور انسانی ہمدردی اور ایثار و بے لوث معاونت کی تعلیم کی داد دیجئے، غم کی مصوری کے بہترین شاہکاروں کے ساتھ ساتھ اگر یہ دیکھنا ہے کہ اخوت اسلامی کی تعلیم کس طرح دیجاتی ہے، یہ احساس کہ تمام دنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں کس طرح پیدا کیا جاتا ہے اور اگر مغرب میں ایک مسلمان کے کانٹا چبھے تو مشرق میں ہر مسلمان کے کیوں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور کس طرح اُس کی تکلیف کا احساس پیدا کرا کے اُس کی مدد کے لئے تمام مسلمانوں کو طیار کیا جا سکتا ہے تو "شہید مغرب" کے افسانے اور خصوصاً "طرابلس سے ایک صدا" "ایک عرب بیدانی" "شہید طرابلس" اور "شہیدہ مغرب" پڑھیے، اگر آپ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں، اگر آپ دُنیا کے ہر مسلم مرد و عورت کو اپنے بھائی اور بہن سے زیادہ عزیز نہ شمار کرنے لگجائیں تو میرا ذمہ، سینے "شہید مغرب" میں ایک یہودن ایک مسلم ترک سے شادی کر لیتی ہے" جنگِ طرابلس کی ہولناک خبر پہنچتی ہے، نومسلم "مریم" اپنے خاوند سے طرابلس کے مسلمانوں کی امداد کی درخواست کرتی ہے، مریم کی ماں اُسکو واپس لیجانا چاہتی ہے، ترک اپنی بیوی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس ہی لئے طرابلس نہیں جاتا، ایک دن "مریم" گھر سے غائب ہو جاتی ہے، ترک رو پیٹ کر طرابلس کی جنگ پر چلا جاتا ہے، مریم مردانہ بھیس میں نائب کمانڈر ہو جاتی ہے، اُسکا خاوند ادھم اُس ہی کی فوج کا سپاہی زخمی ہو جاتا ہے تب مریم اپنا راز افشار کر دیتی ہے اور خود بھی زخمی ہو کر اپنے دیور کو خط لکھتی ہے:۔

"کاظم آفندی، تم لوگ سمجھے ہوگے کہ مکار بھاوج دغا دیگئی آخر یہودن تھی، دھوکے باز نکلی، مگر تمہیں تعجب ہوگا یہ سُنکر کہ بھاوج اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو کلمۂ توحید نے اُسپر اُسوقت مقرر کیا جب وہ خانۂ خدا میں اسلام لائی احمد کی موت کانوں سے سُنی، ادھم اور محمود آنکھوں کے سامنے شہید ہوئے۔۔۔ کاظم آفندی ایک یہودن کے دودھ سے پلنے والی عورت جسنے تمہارے اسلام پر اپنے لال نثار کیئے، شوہر کی قربانی چڑھائی با آواز بلند کہتی ہے کہ تمہارا کھانا تم کو حرام ہے جب تک تم اپنے دسترخوان سے ایک روٹی اُٹھا کر اُن خانماں بربادوں تک نہ پہنچاؤ جو اپنے کلیجوں کے ٹکڑے برابر کے بھائی، بڈھے ماں باپ گنوا کر صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"طرابلس سے ایک صدا" کی ایک دل ہلا دینے والی آواز سُنیئے:۔

"اپنے بچوں کو کلیجے سے لگانے والی ماؤں اور شفقت پدری کے جوش میں اپنے بچوں کو کلیجے سے لپٹانے والے باپ، میرے کلیجہ کے ناسوروں پر بھی نظر ڈالو، چار بچے خون میں نہلا کر تمہارے سامنے آئی ہوں ...... اس دل میں جو ماں سے تڑپ رہا ہے وہ خون بھی جوش کھا رہا ہے جو چار کیا ہزار بچے ہوتے تو وطن اور مذہب پر نثار کر دیتا، میری محنت ٹھکانے لگی، میرے ارمان پورے ہوئے، میں خوش نصیب ہوں کہ میری کمائی میرے پاک مذہب اور میرے وطن کے کام آئی، قریب آگیا ہے وہ وقت کہ میں بھی اِن ہی بچوں کے پہلو اور اس سرتاج کی پائینتی جا سوؤں۔ مگر میری موت وہ موت ہوگی کہ تمہاری زندگیاں ہزار اس پر قربان، مسلمان میرے نام پر جان دینگے اور میرے کام پر فخر کرینگے۔"

مضمون "روضۂ اطہر پر ایک عرب بیدانی" جسنے مجھے اور میرے عزیز و اقارب کو ۱۹۱۱ء میں زار و قطار رُلا دیا تھا اب بھی اتنا ہی مؤثر ہے جتنا اُسوقت تھا۔ چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ایک عرب بیدانی جو زخمی ہو کر جنگ سے واپس آئی ہے، مدینہ منورہ میں عید کا چاند دیکھنے کو کوٹھے پر چڑھی ہے، روضۂ اقدس سامنے ہے، دوسرے بچے کی شہادت کی خبر ملتی ہے اور وہ اس طرح روضۂ اطہر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر التجا کرتی ہے۔

"گنبد خاکی میں آرام کرنیوالے عرش نشین مجھ دُکھیاری کی التجا قبول کر۔۔۔ میری بپتا پر غور کر۔۔۔ کشتئ اسلام کے ناخدا عیسائیوں کی متفقہ طاقت اسلام پر حملہ آور ہے اور ترک اس لیئے کہ روضۂ اطہر کے محافظ ہیں اپنی جانیں لڑا رہے ہیں، اے وہ مقدس رسول جسنے الخلق عیال اللہ کی تلقین ڈنکے کی چوٹ دی، اے وہ پاک رسول جسنے بھرے مجمع میں حاتم طائی کی لڑکی کو اپنی چادر اُڑھا کر نامحرم نظروں سے بچایا،

آج تیری اُمت کی بیاہی عورتیں اور کنواری لڑکیاں برہنہ کی جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ترک، عرب اسلام کا حق ادا کر چکے، بھلا داسے لال خون میں نہائے اور اُف نہ کی۔ ۔ ۔ سر کے وارث تڑپ کر آنکھیں پھیر گئے، بنے بنائے گھر پل مارنے میں تاراج ہوئے اور جن خاندانوں میں کوڑیوں اور درجنوں انسان بستے تھے آج سنسان پڑے ہوئے ہیں، فخر امم! اُمت مرحومہ کی ایک نامراد و ناشاد خاتون ہوں جو خاک طیبہ سے اُٹھی اور حفاظتِ اسلام کی خاطر میدانِ جنگ میں پہنچی، ہادی برحق زندہ آئی ہے، گر زخمی آئی ہے۔ اکیلی آئی ہے مگر دو قربانیاں چڑھا کر۔ ۔ ۔ ۔ خوب جانتی ہوں کہ بچی تو میری زندگی مسلمان بہنوں کے لیئے قابلِ تقلید، مرگئی تو احکم الحاکمین کے حضور میں سرخرو حاضر ہونگی، شوہر کی قربانی کا تاج میرے سر پر اور بچوں کی شہادت کے سدا بہار پھول میری چھاتی پر ہونگے، مگر سرورِ کائنات حفاظتِ اسلام کا فرض یہیں تک محدود نہ تھا۔ ۔ مسلمان بہنوں! تمہارے لال تم کو مبارک، تمہارا سہاگ تم کو رہتی دنیا تک، عید کی خوشیاں تمہیں نصیب اور دُنیا کی بہاریں تمہارے لئے سلامت، اگر جس وقت اپنے بچوں کو کلیجہ سے لگاؤ، گود میں لو اور تمہاری محبت بھری نظریں ان پر پڑیں اس وقت ان ماتا کی ماری ماؤں کو بھی یاد کر لینا کہ جو اپنے پلے پلائے لال لٹا چکیں اور خود زخمی ہو کر ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئیں۔“

آج کوئی آئے اور مجھے بتائے کہ اِس ولگداز طرز اور اِس مؤثر اندازِ تحریر کا کیا کوئی جواب مِل سکتا ہے؟ **انیس کی نظم اور علامہ راشد الخیری** کی نثر ادبِ اُردو کے وہ جواہر پارے ہیں کہ جن پر ہم مشرقی جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

علامہ کی تصانیف اور ہندو مسلم اتحاد

علامہ نے جہاں اخوت اسلامی کی بے بہا تعلیم دی ہے وہاں ہندوستان کی سیاسی حالت اور ہندو مسلم نفاق کی اصل وجہ اور اتحاد کی کوشش پر بھی بڑے مؤثر پیرائے میں ایسے ایسے مضامین لکھے ہیں کہ جو ہندو مسلم دونوں فرقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

”یہ ذلیل کمینے ناپاک اپنی اصلیت کو بھول کر آج مادر وطن کے سامنے منہ کر کے ہو سکتے ہیں (یعنی ہندوستان کی آزادی طلب کرتے ہیں) اچھا ان سب کے ماتھے پر ایک سیاہ داغ لگا دو۔ ۔ ۔ یہ وہی ہیں جو کل تک ڈاکوؤں لٹیروں کا شکار تھے، یہ وہی ہیں جنکی گذر کل تک جنگل کی بناسپتی تھی، یہ وہی ہیں جنکو کل ہم اُٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات تھی، آج ہماری قید میں آکر انکے پنجرہ کی تیلیاں پھنسی ہیں، اور انواع و اقسام کے لذیذ و مرغن کھانے انکی غذا، بے فکر و آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں، اسکا بدلہ یہ، اسکا معاوضہ ایسا ذلیل“۔ ۔ ۔ ایک بڈھا وزیر اُٹھتا ہے اور اسکے جواب میں کہتا ہے ”کچھ شک نہیں کہ حکومت کی طاقت بہت زبردست ہے مگر مظالم حد سے گذر جانیکے بعد یہ حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب دشمن نے تیرے حواس باختہ کر دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ اُسوقت یہ ہی جانور تیرے کام آئے اور اپنے کلیجہ کے ٹکڑے تک تیرے لیے قربان کیئے۔ ۔ ۔ جنہوں نے فاقے بھگتے اور قربانیاں چڑھا کر تجھکو یہ دن دکھایا، وہ اِس سلوک کے مستحق نہیں۔“

دو بچے بائیکاٹ کی ترغیب دیتے ہوئے گرفتار ہوتے ہیں، اُنکی رہائی کیلئے شہر میں بلوہ ہوتا ہے اور ایک بیوہ کا جوان لڑکا جسکی شادی کی بہت سی رسمیں ادا ہو چکی تھیں حکومت کی گولی کی نذر ہوتا ہے تو موت کی خبر سُنکر بیوہ ماں کی زبان سے **علامہ** کہلواتے ہیں۔ ”خوش نصیب ہے وہ ماں جسکی محنت اِسطرح ٹھکانے لگی“ قوم و ملک کے لیئے عورت کو قربانی کی تعلیم صرف مسلم عورت ہی کو نہیں دیگئی ہے بلکہ **علامہ** اپنے زورِ قلم سے ہر ہندوستانی ماں کو ملک و قوم پر اپنے بچے نثار کر کے فخر کرنیکی تعلیم دیتے ہیں، ایسے ہی ہندو مسلمان ہیں جو نئی طرز کی شُدھی اور تبلیغ کی تحریکوں میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں، لیکن **علامہ راشد الخیری** نے اِن تحریکوں کی اصلیت کو سمجھکر اپنے مضمون ”افراط و تفریط“ میں مسلمان ہو کر موجودہ طرز کی تبلیغ کے خلاف لکھکر اپنی وطن و حق پرستی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے لکھتے ہیں کہ

”پنڈت جی بھرے جلسہ میں مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں اور ملکانے مسلمانوں کے شدھی کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔“

یہ مسلمان اور ہندوؤں میں فساد برپا کر دیتا ہے، اُجمن جو مسلمان ہے ہندوؤں کو ایذا پہنچانیکا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اپنی گائے ”رجو“ ہندوؤں کے سامنے ذبح کر ڈالتا ہے، **علامہ** فرماتے ہیں کہ ”گائے کی ہتیا کی ذمہ داری ہندوؤں پر ہے اور مسجد کی توہین کا بار مسلمانوں پر کیونکہ نہ وہ ایک دوسرے کی دل آزاری کا قصد کرتے اور نہ یہ فساد ہوتے“ لکھتے ہیں:۔ ”مسجد کی توہین اور الطاف کی موت کا بار مسلمانوں پر کِسقدر ہے ہم جانتے ہیں، مگر کیا کوئی اللہ کا بندہ ہندو دھرم کا پجاری ہمارے اِس سوال کا جواب دے سکتا ہے کہ (رجو گائے) کے ذبح ہونے کی ذمہ داری ہندوؤں پر کِسقدر ہے۔“

اسطرح **علامہ** نے اپنے مضمون کلو نتھیان میں شدھی اور تبلیغ کو مادرِ ہند کی دو ایسی نابکار لڑکیوں کے لباس میں پیش کیا ہے کہ اِن دونوں تحریکوں کی اصلیت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو، مادرِ ہند جو شہزادو کے نام سے پیش کی جاتی ہے، اپنی دونوں لڑکیوں شدھی اور تبلیغ سے یوں گویا ہے:۔

"جس سینہ پر لوٹ لوٹکر تم جوان ہوئیں جس گود میں پل پلکر کسی قابل ہوئیں، جن چھاتیوں سے دودھ پی کر سیانی ہوئیں، اسی کو تاراج کیا، چھلنی بنایا اور زخم ڈالے، تم نے دُنیا کی آنکھوں میں کلنگ کا ٹیکہ میری پیشانی پر لگوایا اور آج کائنات کا کوئی ذرہ اور دنیا کا کوئی متنفس ایسا جو تمہاری بیوقوفی اور میری بدنصیبی پر ہنسی اور رُو نہ رہا ہو، دنیا ان مبارک ہستیوں سے بھری رہی اور رہیگی، جنہوں نے بڑھیاؤں کی لاج رکھی اور انکو چار چاند لگا دیئے مگر میں وہ بدنصیب ماں ہوں جسکو تم دونوں کی بدولت اپنے سعید اور سپوت بچوں کی لاشیں اپنی آنکھوں سے دیکھنی پڑیں، تم نے میری گود میں خون کے نالے بہائے اور میرے گلے پر کُند چھری چلائی، تم نے جن چھاتیوں سے دودھ پیا، آج اس سے خون کے فوارے جاری ہیں . . . تم نے دنیا کو اپنا تماشہ دکھایا، جو دنیا کے کسی دھرم اور مذہب نے روا نہ رکھا وہ تم نے جائز کیا اور جس پر دنیا کے ہر کونہ سے لعنت برسی وہ تمہارا ایمان ٹھیرا، نامراد لڑکیوں تمہاری بدولت اور صرف تمہاری وجہ سے میرے کلیجے کے ٹکڑے شب و روز بھیک مانگ رہے ہیں اور اسکی ذمہ داری صرف تمہاری ذات پر ہے، تم نے جن کو اپنا سمجھا اور جن کے بہکانے میں آکر مجھ پر یہ ستم توڑے اُن کی سیدھی سادھی باتوں پر نہ جاؤ، وہ تمہارے اور میرے دونوں کے دشمن ہیں، مجھ مرتی ماں کو جلالو، . . . اپنے دودھ کا واسطہ دیکر اتنا کہتی ہوں "درگذر کا مادہ پیدا کرو" اور ان دوستوں کو پہچانو جن سے بڑھکر اسوقت کوئی دشمن نہیں"

علامہ نے ہماری سیاسی پستی کی وجہ ہندو مسلم نفاق اور اسکی تشخیص موجودہ شدھی اور تبلیغ کے نتائج، اور ان تحریکوں کے معاونین کو غدار اور مادرِ ہند کا دشمن ثابت کر دکھایا ہے، حق گوئی، حق پرستی اور محبتِ وطن کی یہ ایسی مثال ہے کہ علامہ کی ذات پر ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں،

علامہ کی تصانیف و آزادیٔ نسواں

علامہ کی تقریباً تمام تصانیف عورت کی حمایت میں ہیں، "بیچہ کا کرفتہ" اس کے حقوق کی حفاظت میں "سات روحوں کے اعمالنامے" میں بلا رضامندی کی شادی کے بُرے نتائج ہیں "بیقصور بچی" بے ماں کی بچی کی حمایت میں، "کلنگ کا ٹیکہ" عورت کو حقِ وراثت دلانے کی کوشش میں، "طلاق کا سفید بال" بھولے بھالے زمانہ سے ناواقف امارت و اقتدار کے سامنے سر جھکا دینے والے علماء کے ناکارہ اور سستے فتوے کے بُرے نتیجہ اور ایک چار بچے والے کی طلاق اور اُس کے نیک دل خاوند کی عاقبت اندیشی کا سبق آموز فسانہ ہے، چار بچوں والی عورت "عظمیٰ" ساس سے اجازت لیکر میکے جاتی ہے، ساس جو بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہے وقت پر انکار کرتی ہے کہ اجازت نہیں دی تھی، میکہ میں عورت بھائی کے ہمراہ سرکس چلی جاتی ہے، ان دو باتوں پر خسر صاحب جو خود مولوی ہیں اپنے دوست عالموں سے فتویٰ لیتے ہیں، "نکاح ٹوٹ گیا، طلاق جائز ہے" کا فتویٰ ملتا ہے، عظمیٰ کہتی ہے کہ اُسے طلاق نہ دیجائے وہ میکہ چلی جائے گی اور عمر بھر شکل نہ دکھائے گی، وہ دوسرے نکاح کو بھی بخوشی اجازت دیتی ہے لیکن جواب ملتا ہے "میں نے سب کچھ سُن لیا، علماء کا فتویٰ میرے سامنے ہے . . . اسکے علاوہ میں اپنے والدین کی رضامندی مقدم سمجھتا ہوں" طلاق ہوجاتی ہے، لیکن نیک مرد کا ضمیر مردہ نہ تھا اور ایمان موجود اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور اُسنے رجوع کیا اور کسی دوسرے شہر میں عظمیٰ اور بچوں کو لیکر چلا گیا، کچھ زمانہ بعد اُس نے اپنے والدین کو خط لکھا:۔

"عظمیٰ کو طلاق دیکر جو حقیقتاً چار روحوں کی بربادی تھی) آپکی جو مسرت مجھے حاصل کی، وہ اسقدر گراں سودا تھا اگر میں سنبھلتا اور رجوع نہ کرلیتا تو میری دنیا اور دین دونوں تاراج ہوچکے تھے، اگر اسلام اسکا نام ہے جو علمائے اسلام نے میرے سامنے پیش کیا تو میرا اُس اسلام کو دونوں ہاتھوں سے سلام، مگر نہیں میں مسلمان ہوں اور خود عالموں سے ہزار درجہ بہتر"

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی مظلوم و بے کس عورت کی حمایت میں یہ ایسی سعید کوشش ہے کہ جس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے، عورت کی آزادی کی ہندوستان میں کئی راہیں ہیں، بالکل مشرقی، بالکل مغربی اور مشرقی و مغربی کی بے اعتدال کھچڑی، علامہ نے اِن سب کے مطالعہ کے بعد ایک ایسی راہ پیش کی ہے کہ جو مغرب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مشرقی کی معاشرت کو برقرار رکھتی ہے، جو معیارِ زندگی علامہ نے ہندوستانی عورت کیلئے تجویز کیا ہے وہ خیالی و ناقابل عمل نہیں ہے، جاپان کی زندگی ایسے معیار کا زندہ نمونہ ہے، جاپان ترقی یافتہ ممالک میں ایک نمایاں درجہ پر ہے لیکن وہاں کی عورت معاشرت، مذہبی عقائد اور خانگی زندگی میں کسی مشرقی عورت سے کم نہیں، "جوہرِ قدامت" میں مولانا نے مشرقی معاشرت کی خوبیوں کو خوب واضح کیا ہے اور "سات روحوں کے اعمالنامے" میں ناقص تعلیم کی خرابی اور اعلیٰ تعلیم کی خرابی کو بھی خوب نمایاں کر دیا ہے "جوہرِ قدامت" میں تو علامہ نے آجکل کی فیشن ایبل ناقص تعلیم پائی ہوئی لڑکی اور اُس کی سطحی تعلیم کی قلعی کھولنے اور مشرقی اچھے رواجوں کی حمایت میں جس قابلیت سے کام لیا ہے وہ ہر طبقہ سے خراج تحسین حاصل کریگا، ایک نئی روشنی کی لڑکی قدیم اچھے رواجوں

پر اعتراض کرتے ہوئے مذہب اور قدیم طرز کی عورتوں کو بھی کچھ کہہ جاتی ہے اور اپنی اعلیٰ خیالی اور خدمت مذہب و قوم پر فخر کرتی ہے تو اُس کی ماں کہتی ہے :-

"یاد رکھو کہ اُن میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ خدا کو جتنی قدرت والا کہتی تھیں اتنا ہی سمجھتی تھیں۔ ... کہنے کو تم میں اور تم بھی دونوں ہی خدا کو قادر وقدیر سمجھتے ہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل سے، بات چیت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، ہم میں بہت سے نقص ہیں اور اُنکی اصلاح یقیناً ضروری ہے لیکن اس کیچڑ میں چند جو ہیرے ہیں جن کو تم ماند سمجھ رہی ہو اور درحقیقت وہ کلیجہ سے لگانے کے قابل ہیں۔ ... تمہارے ہاں ماما نہ آئے تو اللہ چاہے تو گھر میں کھیاں بھنکتی رہیں، میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے تم سے ایک ڈیڑھ ماما زیادہ ہی ہے مگر جب تک اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں مجھکو چین نہیں پڑتا، تم کو شاید مہینوں باورچی خانہ کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہوگا میں دونوں وقت تمہارے ابا کا سالن خود بگھارتی ہوں اور اُسکو اپنا فرض سمجھتی ہوں"

جہاں مشرقی تہذیب کی خرابیاں بیان کی ہیں وہاں علامہ نے خوبیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے، مغربی تہذیب کو بے عیب سمجھنے والے حضرات کے لئے "شہید مغرب" میں مغربی تہذیب کی اصلیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ دل ہل جاتا ہے اور تہذیب جدید اور مکمل انسانیت کے مدعیوں پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو،

"ہمارے مقدس نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدنام کرنیوالے اطالیہ والوں نے جو درحقیقت یزید کے پیرو نکلے ہم کو اور نہ صرف ہمکو بلکہ تمام دنیا کو یقین دلا دیا کہ یورپ میں آج بھی وہی وحشی لوگ بس رہے ہیں جو آج سے ہزاروں برس پہلے آباد تھے اور جو صفحہ تاریخ پر جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ... ننھے ننھے بچوں کے کلیجے سنگینوں سے چھید رہے ہیں، انکے آہ و نالہ سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں، مگر پڑوسی ان بچوں کی گریہ زاری پر ہنستے ہیں، عورتیں برہنہ کی جا رہی ہیں، بڈھے اور اندھے نشانہ بندوق بن رہے ہیں مگر مہذب لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں چلتی۔ ..... خود بانی اسلام صلعم کا طرزِ عمل دیکھو، کچھ قیدی حضور اقدسؐ کے روبرو پیش کیے گئے ان میں ایک لڑکی بھی تھی جو قبیلہ طے کے سردار حاتم طائی کی بیٹی تھی، آپنے اپنی چادر اسکو اڑھائی اور نامحرموں کی نگاہ سے بچایا، اسکے جواب میں مہذب دنیا کا سلوک طرابلس کی عورتوں کے ساتھ یہ ہے کہ نو سو سے زیادہ عورتیں ننگی مادر زاد کی گئیں اور بندوقوں کی باڑ نے انکی پردہ پوشی کی۔"

یہ تو سنہ ۱۹۱۱ء کا قصہ ہے لیکن جہاں مسلمانوں کے سپہ سالار اعظم خالدؓ ایک بڈھے پادری کی گالیاں سُنکر صرف اسلئے اسپر ہاتھ نہیں اُٹھاتے کہ وہ بڈھا تھا اور اسلام میں بڈھے پر ہاتھ اُٹھانا جائز نہیں۔

"شجاعت تیری ناہنجار یکتا ہے زمانہ میں　　تیری جرأت تری تلوار، اک دنیا نے ہے مانی"
وہ راہب پھونس جو اک پھونک میں خالد کی اُڑ جاتا　　کھڑا خاموش تھا ساکت، بنا تصویر حیرانی
کہ آئی مسکراہٹ دفعتاً خالد کے چہرے پر　　جواب اُسکو دیا اور کس طرح؟ باخندہ پیشانی
"ترا پہلی ہی گستاخی پہ قصہ پاک کر دیتا　　مگر مجبور ہوں ہاتھوں میں ہے زنجیر سلطانی
مرا سلطان مرا آقا، مرا مالک مرا مولا　　درود اُس نام اقدس پر، جو ہے اسلام کا بانی
ہمیں یوں حکم دیتا ہے۔ کرو تعظیم بڈھوں کی　　اُٹھانا ہاتھ مت ان پر۔ وہ مسلم ہوں کہ نصرانی

وہاں آج بھی مہذب یورپ جس کی تقلید و تہذیب کے ہم حامی ہیں گرجے گرا دیئے، پادریوں کو پھانسی دیدی، ہسپتالوں میں زخمیوں پر عمداً بم گرائے اور بڈھے، بچے اور عورتوں کو تہ تیغ کر دیا، یہ ظلم صلح کن مذہب عیسائیت کے پیرو اور تہذیب و تمدن کے دعویدار اپنے ہی بھائیوں پر ڈھاتے رہے اور ڈھا رہے ہیں لیکن دوسروں کو تہذیب سکھانے والے مجلس بین الاقوامی میں غور و فکر کرنے میں ابھی تک مشغول ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار۔ علامہ نے عورت کی حمایت، مشرقی تہذیب کے احیاء، رسوم قبیحہ کے قلع قمع کرنے، عورت کو حق وراثت اور خلع دلانے اور ہماری سماجی زندگی خوشگوار بنانے کے لیے اپنی تمام عمر جو کچھ کیا وہ ہندوستان کو اُنکے احسانات سے قیامت تک سبکدوش نہ ہونے دے گا۔

علامہ کی تصانیف عورتوں سے زیادہ مردوں کے لیے مفید ہیں

ہم جب تک عورت کی حسیات قلبی کا اندازہ لگانا نہ سیکھیں اور اپنے ظلم کی کہانیاں مؤثر پیرایہ میں خود نہ سن لیں اور اپنی مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور مدعیان تہذیب کی خودغرضانہ سطحی انسانیت کے دعوے کو صدق عمل کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں ہم میں وہ جذبات پیدا ہو ہی نہیں سکتے جو انسانیت کی جان اور ہماری صحیح ترقی و تربیت کا راز ہیں، ہندوستان کے ہر مرد کا فرض ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف منگا کر ایکدفعہ ضرور پڑھ جائے اسکے بعد اگر وہ دل سے حقوق نسواں کا حامی اور اپنی معاشرت کا دلدادہ اور اپنی سماجی زندگی کو خوشگوار اور پُرامن بنانے میں کامیاب ہو جائے تو مجھے لکھیے میں اپنی زندگی کا سب سے عجیب اور

ایسی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان!

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے

"رتی ہر رشتہ اور گاڑی بھر آشنائی" کی مثل کسی زمانہ میں صحیح ہو تو ہو۔ اب تو "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کی صورت ہی۔ ملتے رہے تو غیر بھی عزیزوں کے برابر ہو گئے۔ نہ ملے تو عزیز بھی غیر بن گئے۔ بھائی راشد الخیری مرحوم میرے عزیز تھے۔ لیکن دہلی میں نہ میں کبھی ان سے ملا اور نہ وہ مجھ سے۔ جب اُنہوں نے نام پیدا کیا۔ اُس وقت گھر کے بڑے بوڑھوں سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمارے رشتہ دار ہیں۔ اگر وہ نہ بڑھتے تو نہ ہم کسی سے ان کے متعلق دریافت کرتے اور نہ یہ رشتہ معلوم ہوتا۔ سچ ہے بڑے لوگوں کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر رشتہ دار بنا لینا انسانی فطرت ہے۔

میں اب ۲۹ سال سے حیدر آباد میں ہوں۔ اس سے پہلے دہلی میں رہا تو تعلیم کی مصیبت میں مبتلا رہا۔ بھلا بیسویں صدی کے طالبعلم کب کسی رشتہ دار سے ملتے ہیں ہاں ملتے ہیں تو ایسوں سے جہاں جاکر کچھ نہیں تو چاء اور کیک تو ضرور مل جائیں۔ بھلا بھائی راشد الخیری مرحوم کے ہاں اس زمانہ میں چاء اور کیک کہاں تھے۔ اس لئے اگر مرا ملنا ان سے نہیں ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ آجکل کے طالبعلموں کی عادت ہے۔

کوئی تین سال ہوئے جب وہ حیدر آباد آئے تھے۔ ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ۔ اور میرے مکان کے پاس ہی ٹھیرے۔ کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ایک آدھ مرتبہ میں بھی ان کے پاس گیا لیکن ہمیشہ سرسری ملاقات ہوئی۔ میرے والد صاحب قبلہ کو مرحوم کے مرنے کا جتنا رنج ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ کہا کرتے ہیں کہ ہائے بچارا راشد جب کبھی ملتا تھا۔ ماموں جان ماموں جان کہتے کہتے اس کا منہ خشک ہو جاتا تھا گھر بھر کی خیر سلا پوچھتا۔ سب کو دعا سلام کہتا اور گھنٹوں کھڑا رستہ میں باتیں کرتا"۔ اب ہماری سنئے کہ ہم مرحوم سے ملے دنیا بھر کی باتیں ہوئیں مگر یہ بھی نہ پوچھا کہ بھائی تمھارے کتنے بچے ہیں۔ خیریت سے تو ہیں۔ کیا پڑھتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ وہ پُرانے زمانہ کی تعلیم کا اثر تھا۔ اور یہ نئے زمانہ کی تعلیم کا رنگ ہے۔

مرحوم کی ہر کتاب کو دیکھ لو۔ ہر تقریر کو دیکھ لو۔ ہر گفتگو کا خیال کر لو۔ سب کی بنیاد صرف ایک اصول پر پاؤ گے۔ کہ پرانی تہذیب کو زندہ کیا جائے پرانے اخلاق کو تازہ کیا جائے۔ اور پُرانی روایات کو قائم کیا جائے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسلامی تعلیم کو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم زندہ لوگوں کی عزت نہیں کرتے تو بچارے مرے ہوئے لوگوں کا کیا احترام کریں گے۔ اور جب احترام نہ ہو گا تو اُن بزرگوں کے بتائے ہوئے رستوں پر کیا خاک چلیں گے۔ خواتین میں زندگی کی روح پھونکنا۔ ان میں فرائض کا احساس پیدا کرنا اور انکے رتبہ کی اہمیت کا مردوں کو جتانا مرحوم کا مقصد اولین تھا۔ اور اسی کی تکمیل کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اُن کی تحریروں نے اس اجڑے ہوئے محل کی بنیاد از سر نو رکھنے میں بے انتہا مدد کی۔ اگر کوئی اللہ کا

بندہ مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کو تیار ہوگیا تو عمارت مکمل ہو جائے گی۔ ورنہ جس طرح ہماری اسکیمیں ابتدا کرنے والے کے مرنے کے بعد ہی ختم ہو جاتی ہیں اسیطرح یہ بنیاد بھی تھوڑے ہی دنوں کے بعد زمین دوز ہو جائے گی۔ اور پھر کسی کو یاد بھی نہ رہے گا کہ مولانا راشد الخیری نے اپنی ساری زندگی اس بنیاد کے ڈالنے میں صرف کر دی تھی۔ میں اپنی تمام بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر واقعی انہیں مرحوم سے محبت ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ مرحوم نے ان کی بہتری کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ اب اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اُن کی ڈالی ہوئی ڈگر پر چلیں۔ اور دنیا کو بتا دیں کہ مولانا **راشد الخیری** کی موت ان کے "ارادہ" کی موت نہیں ہے۔ جب تک وہ زندہ تھے۔ اس ارادہ کی تکمیل میں وہ خود لگے رہے۔ اب وہ نہیں ہیں تو ان کی بہنیں تو موجود ہیں۔ اب وہ ان کے ارادہ کی تکمیل کرینگی۔ اور یہ سننے کی روادار نہ ہونگی کہ اُن کا ارادہ ان کے ساتھ گیا۔

مرحوم نے اپنے مقصد کے حصول اور ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ اپنی تحریروں کو بنایا تھا۔ اور دنیا پر ظاہر کیا تھا کہ بچاری پردہ نشین عورتوں پر کیا کیا ظلم ڈہائے جا سکتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ قصہ کو مصیبت کی ایک داستان بنا دیا جائے خوش مذاقی کے پہلو سے بھی یہ حملہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا اثر ایسا دیرپا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ قصہ غم کا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انکی داستانہائے غم نے ایسا اثر پیدا کیا کہ مسلم خواتین خواب غفلت سے چونک پڑیں اور ان کو معلوم ہوگیا کہ ہم کیا ہیں ہم سے مذہبًا کیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ اور رواجًا کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ غم کی آگ بہت جلد سلگتی ہے۔ اور بہت دیر تک جلتی ہے۔ اس کے برخلاف خوش مذاقی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہے کہ آیا اور نکل گیا۔ ہندوستان کے آدمیوں نے مرحوم کو "مصور غم" کا خطاب دیا ہے مگر مجھ سے پوچھو تو وہ آتش زن خرمن ظلم واستبداد" تھے۔ وہ اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا کر چلے گئے۔ اب ہم بھی دیکھیں کہ ہمارے بھائی اس کو کیونکر بجھاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اُن کی ہٹ خود ان کے حقوق کو بھی جلا کر خاک سیاہ کر دے۔

مرحوم کی طرز تحریر کے متعلق ایک ایسے شخص کا کچھ لکنا جو ۲۹ برس سے دہلی میں نہ ہو ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ بھلا میں کیا اور میری اُردو کیا۔ لیکن کسی قابل تعریف چیز کی تعریف نہ کرنا بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ میری رائے پوچھو تو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ دہلی میں مولانا **راشد الخیری** مرحوم سے بہتر اُردو لکھنے والا نہ اب کوئی ہے اور نہ مدت تک پیدا ہوگا۔ اُن کی اُردو دہلی کے شرفا کی اصلی زبان ہے۔ تک کہیں نام کو نہیں۔ ہر لفظ اپنی جگہ اس طرح بیٹھتا ہے جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ محاوروں اور خاص کر عورتوں کے محاوروں کے استعمال میں انہیں خاص ملکہ تھا۔ لیکن وہ" دانم چرا نگویم" پر عمل کرنے سے ہمیشہ بچتے تھے۔ محاروں کی ٹھونسم ٹھاس سے انہیں نفرت تھی۔ محاوروں کی تلاش سے دُور بھاگتے تھے۔ اور موقع و محل سے وہی محاورے استعمال کرتے تھے۔ جو بات چیت میں بلا ارادہ زبان پر آ جاتے ہیں اور بار خاطر نہیں ہوتے۔ تحریر کی روانی ان کا خاص جوہر تھا۔ ان کی کسی کتاب کو اس سرے سے لگا کر اس سرے تک پڑھ جاؤ۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی جگہ قلم روکا ہے یا کسی خاص لفظ کی تلاش کی ہے۔ وہ جو لکھتے تھے وہ بولتے تھے۔ اور جو بولتے تھے وہ لکھتے تھے۔ اُن کی کسی "داستان غم" میں قصہ کی بندش ڈھیلی نہیں ہے۔ اور جہاں قصہ میں غم کا پہلو آگیا ہے وہاں اُن کا قلم چھری کا کام

کرگیا ہے۔ اور ایسا زخم پہنچا پاگیا ہے کہ اس کا مندمل ہونا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصّہ کو کوئی بھول بھی جائے۔ مگر اُس کے سبب اور نتیجہ کو کوئی بھول نہیں سکتا۔ اور یہی ان کی تحریر کی غایت اصلی تھی۔ وہ دنیا کو جگانا چاہتے تھے۔ اور دنیا اُسی صورت میں جاگ سکتی ہے جب دل میں ایسا درد پیدا کر دیا جائے کہ کبھی چین سے سونے نہ دے۔ آنکھ لگ بھی جائے تو دل کی کسک پھر جگا دے اور قصّہ "داستان غم" کا سبب اور نتیجہ دماغ میں چکر کھانے لگے۔

میرے بعض احباب کا خیال ہے کہ مرحوم کے قصّے عورتوں کو کم ہمت بنا دیتے ہیں۔ اور ہندوستان کی عورتوں پر ان کا بُرا اثر پڑا ہے۔ کیونکہ اول تو یہاں کی آب وہوا ہی دل کو پژمردہ کر دیتی ہے دوسرے یہاں کی عورتیں خود "غم کی دیویاں" ہیں۔ ان غریبوں کو غم کی داستانیں سنانا گویا ان کے دلوں کو کمزور کرنا اور ان کی ہمتوں کو توڑنا ہے۔ اس کا جواب میرے ہندوستان کی رہنے والی بہنیں مجھ سے کہیں بہتر دے سکتی ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ غمگین ہونا ایک چیز ہے اور غم کا احساس ہونا دوسری چیز۔ پہلی صورت میں انسان رونی صورت سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ نہیں کرتا۔ اور اپنی حالت سے دوسروں کو بھی کم ہمت کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اس غم کی وجہ معلوم کرتا ہے۔ کچھ ہاتھ پاؤں چلاتا ہے مصیبتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اس "سبب غم" کو دفع کرکے آیندہ کے لئے غم کا سدباب کر دیتا ہے۔ شاید مرحوم کا بھی یہی نقطہ نظر تھا جو انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد "غم" پر رکھی۔ اور عورتوں میں "غم کا احساس" پیدا کر دیا۔ اور زمانے نے بتا دیا کہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ صحیح تھا۔ اور ہندوستان والیوں کو معلوم ہوگیا کہ ان کے حقوق کیا ہیں۔ ان کے فرائض کیا ہیں۔ گھرداری کیونکر ہوتی ہے۔ اور کنبہ کے ساتھ رکھ رکھاؤ کیونکر رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گھر کی ملکہ کا یہ کام نہیں ہے کہ گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی رہے۔ دن رات پان چبائے۔ نوکروں کو وجہ بلا وجہ پریشان کرے۔ بچوں کو نوکروں اور ماماؤں کا کھلونا بنائے۔ اور گھر کو کباڑئے کی دوکان کر دے۔ بلکہ اس کا یہ کام ہے کہ سلیقہ کو اپنا مشیر بنائے۔ بچوں کی تربیت اپنے ذمہ لے۔ گھر کا کام کرنے میں عار نہ کرے۔ نوکروں کو انسان سمجھے مگر حد سے نہ بڑھنے دے۔ گھر کو گھر بنائے کہ ہر آنے جانے والا کہے کہ "ماشاء اللہ کیا سلیقہ والی بیوی ہے"۔ اس نگاہ سے دیکھا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا **راشد الخیری** مرحوم سے زیادہ عورتوں کی اصلاح حال کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اگر ادبی نقطۂ نظر سے ان کی کتابوں کو دیکھا جائے تو یہ کہنے میں تامل نہیں ہو سکتا۔ کہ اُردو اس کو کہتے ہیں اور اُردو اس طرح لکھی جاتی ہے۔

عربی کی مثل ہے "موت العالِم موت العالَم"۔ لیکن ایسے عالم کا مرنا ایسے ہزاروں علماء بے عمل کے جینے سے بہتر ہے جو کہتے سب کچھ ہیں اور کرتے کچھ نہیں۔ بھائی **راشد** مرحوم کو جو کرنا تھا وہ کہا۔ اور جو کہا وہ کیا۔ اور جو کیا اس میں اپنی ذاتی غرض کو کبھی دخل نہ دیا۔ خدا ان نیک کاموں کا ان کو اجر دے۔ اور ان بہنوں کی دعا قبول فرمائے جو سچے دل سے اُن کے لئے دعائے مغفرت کر رہی ہیں۔ اور ہمیشہ کرتی رہیں گی +

علامہ راشد الخیریؒ کی شاعری

از جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید

علامہ راشد الخیری کے نام کے ساتھ "شاعر" کا لفظ کسی قدر نامانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب کی جس خاص صنف نے انہیں ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک مشہور کر دیا اور ان کی جن تحریروں نے ان کی قابلیت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھا دیا وہ ان کی نظم نہ تھی بلکہ ان کی وہ دلاویز اور دلچسپ کہانیاں تھیں جن کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا اور ایک ایک سطر ایک بولتی ہوئی تصویرِ غم تھی۔ ہم نے مختلف رسالوں اور کتابوں میں یہ کہانیاں پڑھیں اور پڑھتے گئے اور روتے گئے، تا آنکہ ہچکی بندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تک باقی نہ رہے اپنے دوستوں سے اس کتاب یا اس کہانی کا جب ہم نے ذکر کیا تو ہمیشہ یہی کہا کہ "ظالم نے غضب کیا ہے نسیمہ کی زندگی کے درد بھرے واقعات کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ اس سے بہتر ہو نہ سکتی تھی"۔ کبھی کسی نے انکی تعریف اس طرح نہ کی کہ "بھئی مولانا غضب کا شعر کہتے ہیں"۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص ان کی اس قدرت بیان کا معترف ہو گیا کہ وہ درد و غم کے واقعات کی بہتر سے بہتر تصویر کھینچدیا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کا لقب "مصور غم" ہو گیا "مصور غم" کا لقب شمس العلما یا خان بہادر کا خطاب نہ تھا جو ملک کی حکومت نے ان کی کسی مخصوص خدمت کے صلہ میں انہیں دیا ہو۔ یہ خطاب انہیں ان ہزاروں لاکھوں عوام الناس نے دیا تھا جو انکی تحریرات پڑھ پڑھ کر زار و قطار روئے تھے، اور جن میں سے اکثر کی بیویوں اور بیٹیوں کو ان کی کتابوں نے اچھی مائیں اور اچھی عورتیں بنا دیا تھا، اور کون نہیں جانتا کہ عوام الناس کے دئے ہوئے خطابات حکومت کے بخشیدہ خطابات کی طرح بے معنی نہیں ہوا کرتے "مصور غم" فی الحقیقت مصور غم ہی تھے۔!

انسان اگر بالطبع شاعر پیدا ہوا ہے تو اس کے یہ شاعرانہ جذبات سب سے زیادہ جوانی کی عمر میں زور کرتے ہیں اور علامہ مرحوم کی جوانی کا زمانہ وہ تھا کہ جب اردو شاعری کے چمن کی باغبانی امیر اور داغ جیسے جادو بیان شعرا کر رہے تھے۔ اور جب اس چمن میں "بلبل اور گل" کے افسانوں کے سوا سبزہ کا ذکر بھی بیگانہ خیال کیا جاتا تھا۔ مرحوم علامہ بھی انسان تھے، دلی کے رہنے والے تھے اور جوان تھے، ان کے پہلو میں بھی دل اور دل میں جذبۂ عشق و محبت موجود تھا۔ لیکن انہی جذبات محبت کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں قوم کے درد کا ایک کانٹا سا بھی کھٹکتا رہتا تھا، وہ بیکس اور مظلوم فرقہ نسواں کی طرف نگاہ کرتے تھے اور دل سے بے ساختہ آہ نکلتی تھی۔ جو شخص کہ درد و غم کی اتنی اچھی تصویر کھینچ سکتا ہو کہ لوگ دل پکڑ کر رہ جائیں اور اسے مصور غم کا خطاب دیدیں۔ وہ یقیناً

دنیائے شاعری میں بھی اسی قدر نام آور ہو سکتا تھا۔ اس کے جادو بھرے الفاظ ہی تو تھے جن سے صحیح موقعوں پر کام لیکر وہ غم کی تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ شعر میں بھی الفاظ کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ وزن اور قافیہ کی پابندی اس سے علامہ مرحوم عاری نہ تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ راشد الخیری اگر شعر و سخن کی جانب توجہ کرتے تو آج ان کا نام متاخرین شعرا کی فہرست میں ایک ممتاز جگہ پر ہوتا۔

علامہ نے کیوں اسے پسند نہ کیا، اور نثر کو نظم پر کیوں ترجیح دی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس دور میں شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنا اسی طرح ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ ساتھ رو میں بہے چلے جاتے اور اپنی فکر رسا سے رات دن زلف و شانہ، چشم و ابرو۔ دہن و ذقن، لب و رخسار، اور خال و خط کی تعریفوں میں بال کی کھال نکالا کرتے۔ لیکن درد قوم سے آشنا کوئی دل اس مشغلۂ بیکاری کو کبھی پسند نہ کر سکتا تھا۔ علامہ نے بھی اس طرف بالکل توجہ نہ کی، اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور میں تو یہی کہوں گا کہ بہت ہی اچھا ہوا، ورنہ ان کی یہ خداداد قابلیت اپنی فرضی موت کے نوحے سنانے اور غیر محسوس درد فراق کے نالے کھینچنے میں ضائع ہو جاتی۔

شعر و شاعری کی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ رہنے کے باوجود علامہ مرحوم نے شاعری کی ہے۔ اول تو اگر سچ پوچھا جائے تو ان کی نثر ہی تمام تر اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے لیکن اس سے قطع نظر انہوں نے بالکل باقاعدہ شاعری بھی کی ہے۔ ان کی ان نظموں میں جنہیں میں نے باقاعدہ شاعری کے نام سے یاد کیا ہے۔ عروضی قواعد کی بہت زیادہ پابندی کی گئی ہے، ان میں وزن بھی ہے اور قافیہ بھی، اور مروجہ اور مفرع بحروں کا بھی پورا پورا احترام کیا گیا ہے۔

ادب اردو کی دنیا میں غلط یا صحیح طور پر یہ خیالات قایم ہو گئے ہیں کہ شعر صرف ایک عبارت موزوں و مقفی کا نام ہے۔ شعر کی یہ تعریف کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں ہے۔ شعر کے لئے وزن ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم اسے نثر سے ممیز نہیں کر سکتے، لیکن یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ جس عبارت میں وزن موجود ہو وہ شعر ہے۔ شعر کے لئے قافیہ ایک زینت ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ قافیہ سے شعر کی خوبی دوچند ہو جاتی ہے لیکن اس کے بھی یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو عبارت مقفی ہو اسے شعر کہدینا جائز ہے۔

اب اس کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر پھر شعر ہے کیا چیز۔ شعر کی کوئی جامع اور مانع تعریف کرنا تقریباً نا ممکن ہے۔ پھر بھی یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہمارے دل پر گذر رہی ہے اگر اسے ہم وزن اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ اس طرح بیان کر سکیں کہ سننے والے کے دل پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جائے تو ہمارا یہ بیان یقیناً شعر ہے۔ قلب انسانی کے جذبات اور واردات مناسب الفاظ میں موزوں و مقفی ہو جائیں تو اس عبارت پر

شعر کا بالکل صحیح اطلاق ہوگا، لیکن اس قسم کے جذبات و واردات کے علاوہ اگر کچھ اور باتیں نظم کردیجائیں تو اگرچہ عروض تو اسے بھی شعر ہی کہے گی لیکن درحقیقت اسے شعر کہنا شعر کی توہین کرنا ہے،

علامہ راشدالخیری کی شاعری پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ فن کے لحاظ سے اس میں کچھ بہت سی خوبیاں نہیں ہیں۔ بنے تُلے الفاظ، ازل کے دن سے مقرر کی ہوئی تشبیہیں، کرڑوں درکرڑوں شاعروں کے استعمال کئے استعارات اور لاکھوں زبانوں سے بار بار بیان کی ہوئی عشق و محبت کی داستانیں یقیناً ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں اور وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ قوال اور طوائفیں اسے سر محفل سنا سنا کر اہل محفل پر وجد طاری کردیں۔ لیکن بنے تُلے الفاظ کی بجائے ایک درد بھرے دل کے ٹکڑے، اور داستان محبت کی بجائے قوم کی بربادی اور تباہی کا دکھ بھرا فسانہ اس میں ضرور موجود ہے جو ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اگر اس شخص نے اپنا وقت اور اپنی کوشش اپنی شاعری کی تہذیب پر صرف کی ہوتی تو ہماری زبان کی شاعری گنج معانی سے مالامال ہوگئی ہوتی، اور آج اغیار کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملتا کہ اردو شاعری میں تمام اصناف شعر میں سے غزل اور غزل کے اندر بھی عامیانہ اور سوقیانہ اظہار عشق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

علامہ موصوف کی بعض غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ جو نظمیں کہ میاں رازق سلمہٗ کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں وہ دو مجموعوں کی صورت میں ہیں۔ ایک مجموعہ کا نام "روداد قفس" ہے جو اس وقت تک چھ مرتبہ چھپ چکی ہے، اور دوسرا مجموعہ "نغمۂ گرفتار قفس" ہے جس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہماری جہالت، احکام مذہب سے ناواقفیت اور تنگدستی و افلاس نے ہمارے طبقہ نسواں کو جس ذلیل اور پست حالت کو پہنچا دیا ہے اور ہمارے بہت سے گھروں میں جیسے جیسے ناگفتہ بہ مظالم اس بے کس اور مظلوم انسانی آبادی پر توڑے جاتے ہیں، ان سے مولانا مرحوم اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ہمارے گھروں کے اندر ہماری عورتوں کی حالت کسی طرح بھی ان ننھے ننھے اور بے زر و بے طاقت پرندوں سے بہتر نہیں ہے جنہیں انسان محض اپنی تفریح طبع کی خاطر کھلی ہوا آزادانہ پرواز، اور مالوف وطن سے محروم کرکے ایک پنجرے کے اندر بند کر دیتا ہے، جہاں ان کا مقصد حیات بس صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قفس کی تیلیوں سے رات دن سر مارا کریں۔ وہ بجا طور پر فرقہ نسواں کو اسیران قفس سمجھا کرتے تھے اور اسی رعایت سے ان کی نظموں کے مجموعوں کے لئے یہ نام پسند کئے گئے۔ ان دونوں کتابوں کی مقبولیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ اتنی تھوڑی تھوڑی سی مدت میں ایک کے چھ ایڈیشن چھپ چکے اور ایک کے تین۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ میں علامہ موصوف کے کلام کے کچھ نمونے پیش کرکے اس مضمون کے ذریعے سے یہ بھی ظاہر کردوں کہ قبولیت عامہ جو علامہ کے کلام کو نصیب ہوئی وہ بالکل بجا تھی۔ اور یہ کلام درحقیقت قبول عام کا اسی حد تک مستحق تھا۔

"روداد قفس" میں علامہ کی کل ستر نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ان سب کو اس جگہ نقل کر دینا تو ناممکن ہے لیکن

میں کوشش کروں گا کہ ان میں تیر و نشتر چھانٹ چھانٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ ان اشعار کی خوبیوں کا اندازہ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مشاعروں میں سنانے اور داد حاصل کرنے کے لئے یہ غزلیں نہیں لکھی گئیں تھیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ملک اور قوم کی بچیوں کے نام ایک پیغام تھا جو علامہ مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

حمد باری تعالیٰ کے ضمن میں فرماتے ہیں

کافی ہے وہ اکیلا باقی ہے سب جھمیلا
حاکم ہے بحر و بر کا مالک ہے خشک و تر کا
فرش زمیں اسی کا عرش بریں اسی کا
از ماہ تا بماہی ہے اس کی بادشاہی
شاہنشہِ جہاں ہے معبود انس و جاں ہے
حاکم ہے دو جہاں کا مالک ہے این و آں کا

خدائے واحد کے صحیح تخیل سے بچیوں کے دماغ کو آشنا کرنے کے لئے میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے بہتر کوئی اور سلوب اختیار کیا جا سکتا تھا۔ کس قدر بے ساختگی کے ساتھ کہدیا کہ " کافی ہے وہ اکیلا۔ باقی ہے سب جھمیلا"۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اس سادگی پر ہزار تصنع قربان کے جا سکتے ہیں۔

" بچپن کی یاد" ایک نظم ہے جو سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں رسالہ عصمت میں شائع ہوئی تھی، ایک سہیلی اپنی ایک سہیلی کے خط کا جواب دیتی ہے۔ پرانی محبت یاد آ رہی ہے، بچپن کے کھیلوں اور معصومانہ حرکات کا خیال آ آ کر دل کو بے چین کر رہا ہے، اور پھر موجودہ " گرفتاری قفس" کا احساس بالآخر جذبات کے اس تلاطم کو دبا دیتا ہے

بچپن کی کھیلی صادقہ میری سہیلی صادقہ پیاری بھیلی صادقہ خط کا تمہارے شکریہ
میں دور تھی مجبور تھی رنجوں میں چکنا چور تھی ورنہ بگڑتیں لاکھ تم میں آپ ہی لیتی منا
تاروں بھری راتیں گئیں، طاقوں بھری گڑیاں چھپیں دن کھیل کے رخصت ہوئے، اب وقت ہے کچھ کام کا

" طاقوں بھری گڑیاں چھپیں" صرف علامہ راشد الخیری کا حصہ ہے۔

پیپل کی چھاؤں یاد ہے دن بھر ہوتا تھا جہاں مدت ہوئی دیکھا نہیں واں گھونسلا تھا چیل کا

کس قدر عمیق مطالعہ فطرت ہے! بلبل کے آشیانے کا ذکر تو آپ کو ہر دیوان کے صفحے پر ایک سے زیادہ اشعار میں مل جائیگا لیکن چیل کے گھونسلے پر اسی شاعر کی نگاہ جا سکتی ہے جو قدرت سے باریک بیں اور دقیقہ رس نگاہ لیکر آیا ہے۔

اماں کا غصہ اور میں خالا کی خفگی اور تم کیا وقت تھا! کیا بات تھی! مطلق اثر ہوتا نہ تھا۔

جو شعراء کہ ارباب فن کے نزدیک مستند شاعر ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں کہ جو یہ چیزیں اس خوبی کے ساتھ بیان کر دینے پر قادر ہیں ابھی اور دیکھئے۔

چھوٹے کھنڈر میں لیٹنا مٹی میں دھم دھم کودنا وہ لوٹنا اور پوٹنا اور آگے پیچھے دوڑنا

گارے کے گھر مٹی کے در لپٹے ہوئے تھے جن پہ پر اب پھر نہ آئیں گے نظر جو کچھ بھی دیکھا خواب تھا

جھولے کا گانا یاد ہے؟ سچ مچ ہی وہ دن آگئے جا پہنچیں پیاری صادقہ "لینے کو ساجن آگئے"

ارباب فن کہیں گے کہ "دن" کا قافیہ "ساجن" غلط ہے، میں بھی مانتا ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ایک غلطی پر ہزار صحتیں قربان ہیں۔

بیٹا بیٹی اللہ کی دین ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو کہ جس میں ایک بھی بیٹی نہ ہو۔ ان بیٹیوں کی ہمارے گھروں میں اکثر جو درگت بنتی ہے وہ علامہ راشد الخیری کی زبان سے سن لیجئے۔

کچھ عرض کرنے ماؤں سے آئی ہیں یہ دکھیاریاں صورت سے ظاہر بیکسی چہرے سے حسرت ہی عیاں

جو مل گیا وہ لے لیا، جو دے دیا وہ کھا لیا جب نیند آئی پڑ رہے، ہم نے جگہ پائی جہاں

شرم و حیا عادت رہی صبر و رضا شیوہ رہا منہ تک کے چپکے ہو گئے بے وجہ کھائیں گھرکیاں

"منہ تک کے چپکے ہو گئے" کس قیامت کا ٹکڑا ہے۔ اتنے سے جملے میں کس قدر معنی پنہاں ہیں۔

کنبے کی طاعت ہم نے کی گھر بھر کی خدمت ہم نے کی تم چین سے سوتیں اور ہم بہنوں کو دیتے لوریاں

بیٹے مبارک ہوں تمہیں! مہمان کو رخصت کرو لو وقت آخر ہو چکا اب ہم کہاں اور تم کہاں

اُف! کس قدر درد بھرے جملے ہیں۔ سنگدل سے سنگدل شخص بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ بیٹے مبارک ہوں کا طعنہ کس قدر لطیف مگر جگر خراش ہے۔ اسے کچھ وہی والدین خوب سمجھ سکتے ہیں جو بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دینے کے عادی ہیں تمام نظم اسی قسم کے دردناک جذبات سے بھری پڑی ہے، کہاں تک نقل کئے جاؤں بس آخری بند کے آخری دو شعر اور سن لیجئے۔

آ پہونچی در پر پالکی محنت ہے سولہ سال کی مل کر گلے رخصت کرو ہونے لگی ہے دوپہر

وہ میٹھے چاول اور کڑھی باتیں ہیں سب دل میں گڑی فریاد ہے دل میں بڑی آتی نہیں لب پر مگر

علامہ راشد الخیری کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں بچتی۔ وہ جزئیات کے استقصا میں کمال رکھتے ہیں اور اسی میں اس درد و اثر کا راز پنہاں ہے جس سے ان کا کلام نثر ہو یا نظم لبریز ہے۔

"ماں کا پیام" علامہ کی ایک اور پُر درد نظم ہے جس میں ایک ایسی ماں کے دل کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جس کا بچہ اس سے جدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

اس دلکی لگی نے کیا جوگن گھر بار چھٹا تیرے کارن
نیناں ترسیں دکھلا درشن چھتیاں لگ جا آجا اس من

دن رات ہوئے عمریں بیتیں کھل کھل کر پھول ہوئی کلیاں
پر دل کی کلی میری نہ کھلی جنگل دیکھے ڈھونڈیں گلیاں

چلتی ہے ہوا پھولوں میں بسی کہسار میں جب ان گاتا ہے
آتی نہیں بو تیری لیکن دل خون کے آنسو رلاتا ہے

اک دکھیاری ماں کے دل کے کیسے سچے جذبات ہیں۔ شاعرانہ خوبیاں اگر اس میں زیادہ نہیں ہیں تو نہ ہوں، دل کے سچے جذبات تو اس طرح بیان کر دئے ہیں کہ گویا کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھدیا ہے۔

"مظلوم حسینہ" علامہ مرحوم کی ایک اور نظم ہے۔ دیکھئے اس نظم میں کتنی برجستگی اور روانی ہے۔

دیار یثرب میں شام غربت سر حسینہ پر آرہی تھی
زمیں پہ ہلکا سا تھا ترشح فلک پہ بدلی سی چھا رہی تھی

ہوا کے جھونکوں سے کپکپاتی قدم بڑھائے چلی بہن
کہ پہنچوں منزل پہ جلد جا کر کروں سوائی کے اپنے درشن

کئے تھے کانٹوں نے پاؤں زخمی پھٹی ہوئی سر پہ اک ردا تھی
مگر جمال نبی کی شیدا خیال محبوب میں فنا تھی

میں نے طوالت کے خوف سے کوئی نظم پوری نقل نہیں کی ہے اور صرف دو چار نظموں میں سے دو دو چار چار شعر نمونے کے طور پر لے لئے ہیں۔ قدرت نے علامہ مرحوم کو شاعر بنایا تھا۔ وہ ایک شاعر کا دل لیکر پیدا ہوئے تھے اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر وہ اپنی اس استعداد کو اچھی طرح کام میں لاتے تو ایک بہت ہی کامیاب شاعر بن سکتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ شاعر بنکر کیا وہ اس سے زیادہ کچھ کام کر سکتے تھے جو ایک نثار کی حیثیت سے انہوں نے کیا ہے، کیا انکی نثر شاعری کا ایک لازوال دفتر نہیں ہے؟ اور کیا اس نثر پر سینکڑوں اور ہزاروں دیوان جن میں عشقیہ غزلیں اور مدحیہ قصیدے بھرے پڑے ہوں خوشی سے قربان نہیں کئے جا سکتے؟ میں کہنا ... یہ چاہتا تھا کہ علامہ راشد الخیری اک اچھے شاعر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کے کلام کے ان نمونوں کو دیکھنے کے بعد ... کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرا یہ خیال عقیدتمندی پر ہرگز مبنی نہیں ہے۔

براہ کرم نوٹ کر لیجئے کہ یہ خاص نمبر جولائی اور اگست دو ماہ کا یکجائی پرچہ ہے۔ اب اگست میں رسالہ کا انتظار نہ کیجئے اس کے بعد ستمبر کا پرچہ ۳۰ اگست کو شائع ہوگا۔ منیجر

قطعہ تاریخ وفات حضرت علامہ راشد الخیری غفر اللہ ابدًا

۵۴ ۱۳ھ

از حکیم محمد اسمٰعیل صاحب ذبیحؔ دہلوی -

افسوس ہے کہ راشدِ خیری فدائے قوم　　وہ جس نے روحِ قالبِ اُردو میں پھونک دی

علامۂ زمانہ ادیبِ جہاں فصیح　　جس کی زباں میں چاشنئ درد تھی بھری

مضموں وہ دلگداز وہ دل کش کہ آنکھ سے　　سنتے ہی ایک بزم کی لگ جاتی تھی جھڑی

کچھ شک نہیں "مصورِ غم" تھا وہ بے مثال　　ہر واقعہ کی بولتی تصویر کھینچ دی

یہ عزم یہ ارادہ یہ ہمت تو دیکھئے　　کی صرف دستگیریٔ نسواں میں زندگی

یہ صنفِ نازک اور یہ مظلومیاں پناہ　　غمخوار تھا جہاں میں نہ فریاد رس کوئی

آخر اُٹھایا بیڑا حمایت کے واسطے　　پروانہ کی مخالفتِ اہلِ عصر کی

کیا جوش دل میں تھا کہ مسخر ہوا جہاں　　کیا زور تھا قلم میں کہ دنیا پلٹ گئی

لیکن ہزار حیف کہ امید کے خلاف　　ذی قعدہ کی نویں نے عجب دستبرد کی

روزِ دوشنبہ لے گئی اُن کو اُٹھا کے آہ　　خاموش دیکھتے رہے سب، کچھ نہ چل سکی

تھی فروری کی تیسری بھی اُسی کے ساتھ ساتھ　　دونوں نے آج "امید کی دنیا" بھی لوٹ لی

کیا تھی وہاں بھی فرقۂ نسواں کو احتیاج　　کیا تھی ضرورت آپ کی ملکِ عدم میں بھی

کہرام ہے زمانہ میں ماتم ہے آپ کے　　ہے عصمتی بنات کی ہچکی بندھی ہوئی

ایسا رفیق آہ کہاں دستیاب ہو　　ایسا شفیق اب نہ ملے گا کوئی کبھی

اللہ رکھے رازق و صادق کو برقرار　　بیڑا کریں گے پار غریبوں کا اب وہی

شمس و قمر ہیں دونوں اسی غم میں سوگوار　　تاریخ کس سے پوچھئے آخر وفات کی

ہیں ایک مادہ سے عیاں دونوں سن ذبیحؔ

"واللہ سال تیرہ سو چون تھی ہجری"

---

۶ ۱۹　　　　۳ ۶

مرسلہ

مسز حافظ عبد النعیم

مولانا راشد الخیری کی اُردُو

از مولوی مشتاق احمد صاحب زاہدی دہلوی سابق پرنسپل صادق ایجرٹن کالج بھاولپور

میرے محترم دوست مولانا راشد الخیری مرحوم کے انتقال پُر ملال سے ایک ایسی زبردست شخصیت مگر گوشہ نشین ہستی اُٹھ گئی جس نے نہ صرف اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی بلکہ ٹھیٹ دلی کی زبان کو محفوظ کر کے دلی کی ناک رکھ لی تھی۔ مولانا مرحوم انگریزی سے نابلد تھے لیکن ان کی تحریریں اس سرے سے اس سرے تک کہیں کوئی محاورہ ایسا نہ ہوگا جو مستند نہ ہو۔ یہ مانا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اور اس میں بھاشا ترکی عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ و محاورات بکثرت موجود ہیں۔ مگر جب سے انگریزی تعلیم کا زور ہوا ایک نئی قسم کی اردو پیدا ہوگئی۔ جس میں انگریزی محاورات اور امثال کا اس بری طرح سے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ اور یہی طرز تحریر اگر جاری رہی تو خدا جانے اس زبان کا کیا حشر ہوگا مولانا راشد الخیری مرحوم نے اپنی تصانیف کی زبان کے اعتبار سے ایک ایسی مثال پبلک کے سامنے پیش کردی ہے کہ اگر ان کی تقلید کیجائے تو اصلی اردو زبان رطب و یابس سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ مولانا مرحوم کی قابلیت اور خداداد ذہانت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ باوجود اس دولت خداداد سے مالا مال ہونیکے ساری عمر انہوں نے غالب مرحوم کی طرح گذار دی اور ان کی طبیعت اس قدر مستغنی تھی کہ باوجود اس شہرت کے جو ان کی زبردست ولاتعداد تصانیف سے ان کو حاصل ہوئی تھی، ان کی ساری زندگی گوشہ نشینی میں گذری۔ اور گو کہ انہوں نے ایک مدرسہ نسواں بھی جاری کیا لیکن خود کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا پسند نہ کیا۔ خدا نے ہمیشہ ان کی امداد کی، امید ہے کہ ان کے جاری کئے ہوئے رسالے دن بدن ترقی کرتے رہیں گے، اب ان کے احباب اور قدردانوں کا فرض ہے کہ ان کی یادگاریں قائم رکھیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۸۹) الفاظ تلاش کئے ہوں اور الفاظ کیلئے مناسب جگہیں پیدا کی ہوں اگر اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ علامہ راشد الخیری اپنے وقت کے ایک بہت بڑے ادیب تھے ہماری زبان کے سینکڑوں قیمتی الفاظ جنہیں ہمارے ادیبوں نے قلم انداز کر دیا تھا اور زمانہ جنہیں بھولتا جا رہا تھا علامہ راشد الخیری کی ٹکسالی ادبیت نے اپنے زور قلم سے انہیں سکۂ رائج الوقت بنا دیا ایک بااندان کی حیثیت سے ہماری زبان میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا جو درجہ ہے اسکا فیصلہ زمانہ کریگا آج نہیں تو کل جبکہ چند صدیاں گذر جائینگی بعد انکی تصنیفات آئندہ نسلوں کیلئے لغت کا کام دینگی۔

مصورِ غم کی ظرافت نگاری

حزن و مزاح اور الم و نشاط حیاتِ انسانی کے عناصر غیر اجتنابی ہیں اور جذبات نگار مصنفین ان ہی میں سے ایک کو اپنے اسپِ قلم کیلئے جولانگاہ بنا کر کامیاب ہوتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر زبان میں حزن نگار انشا پرداز بھی نظر آئیں گے اور مزاح نگار مصنف بھی۔ مجھے یہاں اُردو ادب کے عنصرِ ثانی یعنی میدانِ ظرافت کے ایک جلیل القدر شہسوار کے متعلق ناقدانہ خیالات کا اظہار کرنا ہے مگر اس سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیداً ظرافت کی تشریح کردوں تاکہ آپ کو میرا معیارِ تنقید معلوم ہو جائے۔

ظرافت کا مفہوم میں تو یہ سمجھ سکا ہوں کہ ایسا دلاویز اظہارِ بیان ہو جو طبیعت میں شگفتگی پیدا کر دے لیکن ساتھ ہی مذاقِ سلیم پر گراں بھی نہ گزرے۔ جس وقت طبیعت متاثر اور سکون سے بیزار ہو تو کوئی کوشش مائل بہ سکون کرکے مسکراہٹ پیدا کر دے نہ یہ کہ قہقہے لگائے جائیں۔ خوش مذاقی جس کی مثال حسین تبسم کی ہے۔ ہر شخص پسند کرتا ہے لیکن بھونڈا مذاق جو بدنما قہقہوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے کوئی معقول آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب دل میں تفکر اور دماغ میں انتشار ہو تو خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ہنسی کی باتیں کرے۔ چونکہ مسرت زندگی کے عناصر ضروری میں سے ہے اس لئے انسان فطرتاً مزاح و ظرافت کی طرف سے قطعی متنفر نہیں ہو سکتا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ ہاں اسمیں لطافت کا ہونا لازمی ہے سنجیدہ اور متین طبائع کو عریاں مذاق، پھکڑپن اور تہذیب و وقار سے گری ہوئی باتیں ناگوار گذرتی ہیں البتہ وہ اس مذاق اور ظرافت کی دلدادہ ہوتی ہیں جو اوباشوں کی گالیوں، دھول دھپّا اور خرافات وغیرہ پر محمول نہ ہو۔ . . . لیکن چند منچلے حضرات کی بدولت ظرافت کا مفہوم اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ ہر قسم کی ہرزہ سرائی کو بھی ظرافت کہہ کر اس کی توہین کیجاتی ہے۔ پھکڑپن وغیرہ کا رکیک عنصر آجکل بہت سے مزاح نگاروں میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ اُن کی ذہنی پستی، اخلاق سے معرّا ماحول اور بلندی سے بالکل عاری خیالات ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُن کا رجحانِ طبعی ایسی لایعنی طرف ہوتا ہے جسے ظرافت نہیں کہا جا سکتا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزاح نگاری کا واحد مقصد قارئین کو ہنسا دینا ہے اور بس۔

ایسے حضرات کے نام جو حقیقی معنوں میں ظرافت نگار کہے جا سکیں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ان ہی چند ہستیوں میں ہندوستان کے مایۂ ناز مصنف "مصورِ غم" حضرت علامہ راشد الخیری کا نام ہے جو اس لئے اور بھی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں کہ اُردو زبان کے سب سے بڑے حزن نگار ہونیکے ساتھ ساتھ مزاح نگاری میں بھی اُن کا بہت بڑا رتبہ ہے۔ یہاں اُنکی مزاح نگاری پر کسی قدر تفصیل سے لکھونگا۔

"نانی عشّو" اور "ولایتی نخمی" تو خیر ان کی مستقل اور مشہور تصانیف ہیں ان کے علاوہ بہت سی کتابوں میں شکسپیر کے ڈراموں کی طرح حُزنیہ طربیہ (Tragedy Comedy) ملتی ہیں یعنی ایک المناک داستان کے ساتھ ساتھ ایک خندہ ریز قصہ بھی شریک ہے۔ اسی لئے بہت سے ادیب لکھتے ہیں کہ یہ کمال "مصورِ غم" ہی میں ہے کہ ہنستوں کو رُلاتے اور روتوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ایک طرف نسیمہ اور صالحہ منور اور ساجدہ کے عیرفانی اور تمیزاً اور بہادر شاہ ظفر کے عبرتناک کردار پڑھ جایئے کیسی ہی خوشی کی حالت میں آپ نے کتاب شروع کی ہو ناممکن ہے جو آپ کے دل پر اثر نہ ہو۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نہ نکل پڑیں۔ دوسری طرف نانی عشّو اور ولایتی نخمی کے پرلطف قصے عبدل اور ملّاجی کی دلچسپ کہانیاں پڑھیئے کتنے ہی سنجیدہ کیوں نہ

اور کتنا ہی دماغ متفکر کیوں نہ ہو بہت مشکل ہے کہ آپ کی طبیعت میں شگفتگی نہ پیدا ہو جائے۔ بعض لوگ موصوف میں یہ متضاد خوبیاں دیکھکر تعجب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُزن اور مزاح کا منبع ایک ہی ہے۔ جو شخص ایک کو نہ سمجھ سکے وہ دوسرے کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ نفسیاتی رُو سے حزنیہ کا ماہر وہی ہو سکتا ہے جس نے طربیہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہو۔ غرض حزنیہ اور طربیہ کو بے تعلق اور متغائر خیال کرنا غلطی ہے۔ سچ پوچھیے تو لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بہترین ظرافت اور دیرپا شوخی اُن ہی مصنفوں میں پائی جاتی ہے جو بالطبع متشائم اور قنوطی واقع ہوئے ہیں۔ "ولایتی ننھی" کے خانم کے قریب بی ننھی نے جنکی عمر پچپن سال ہو گی لیکن اپنے آپ کو نو عمر سمجھا کرتی تھیں (اور یہ عورت کی فطرت ہے کہ اپنی عمر ہمیشہ بجید کم ظاہر کرتی ہے) اور جنہوں نے صمد نامی ایک اچھے خاصے جوان کو اپنے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نکاح کے بعد اپنی تقریر میں کہتی ہیں :-

"مجھے آپ سب کے تشریف لانے سے بہت ہی سخت صدمہ ہوا کہ ڈوڈو چھواروں کو آپ لوگ ترس رہے ہیں بھائی مولویوں آپ کی عزت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مگر لعنت خدا کی تم سب پر کہ تم نے بہکا بہکا کر مسلمانوں کا یہ ہڈرا کر دیا اور سوا اس کے کہ تمکو قورمے کھلا دیں جیبیں بھر دیں اور کسی کام کے نہ رہے۔ جنت دوزخ کی تمام عمر وہ پٹی دی کہ خاصے بھلے چنگے کامی بندوں کو احدی اور نکام چوپٹ بنا دیا۔ لعنت مردوں پر لعنت عورتوں پر اُچکّوں پر اور تقدیروں پر ہم سب پر! بدنصیبوں! تھوک دو اُن کے چہروں پر جو تمکو قسمت کا راگ دیں۔ یاد رکھو توکل سے بڑھ کر ذلیل، قسمت سے زیادہ فضول زندگی کی کوئی چیز نہیں۔ مُردوں! مجھکو دیکھو اور سبق لو، میری طرف آؤ اور کچھ سیکھو! تمہارے ہی جیسے ہاتھ پاؤں میرے ہیں۔ دادی قسمت ہی رٹتی رہیں اور میں نے اپنے ہاتھ پاؤں چلائے وہ ہاریں اور میں جیتی ان کے ساتھ اُن کی تقدیر تھی اور میرے ساتھ میری کوشش اُن سے پوچھو قسمت کہاں ہے؟ اور مجھکو دیکھو کوشش کا پھل یہ ہے۔"

بظاہر یہ باتیں ہر شخص کو ہنساتی ہیں اور وہ ننھی خانم کے عیارانہ طرزِ عمل سے لطف اُٹھاتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو اس مسکراہٹ کے پیچھے اُداسی، مذاق میں طنز اور ظرافت میں سبق اخلاق پوشیدہ ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مولویوں کے چکّر نے مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ اُن کی جہالت کے باعث لوگ قسمت ہی قسمت پر بھروسہ کر کے گمراہ ہو گئے۔ ایک طالب علم محض یہ سمجھ کر کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا محنت ہی نہ کرے تو بھلا اس کی کامیابی کیسے ممکن ہے۔ "ولایتی ننھی" میں دادی تقدیر اور توکل ہی کو پیٹتی رہیں لیکن ننھی خانم نے قسمت کو بالائے طاق رکھ کر ایسے نت نئے طریقے اختیار کئے کہ مقصد کو حل ہوتے ہی بنا۔ حضرت علامہ راشد الخیری قارئین کو صرف ہنسانا ہی نہیں چاہتے بلکہ ہنسی ہنسی میں اخلاق کا درس دینا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش تفنن مسلسل ہی نہیں بلکہ وہ آپ کو کہیں کہیں لمحہ فکریہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ جہاں ظرافت سے آپ شگفتگی حاصل کریں وہاں ذہن بھی تفکر کا عادی بنے۔ اسی کتاب میں ایک ٹکڑا یہ ہے :-

"یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کر دے . . . . جقیقی دلہن کی تباہی کی تمام ذمہ داری اُس کے والدین یا ورثا پر ہے۔ اگر اُس کو تعلیم دیجاتی، دنیا کے نشیب و فراز سمجھائے جاتے، جنوں اور بھوتوں کی حقیقت سمجھائی جاتی تو وہ صرف ان چیزوں کو لغو سمجھتی بلکہ ننھی کا ایسا کچومر نکالتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ اب جو کچھ ہوا یہ وہی رتعا کا مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ننھی کی کامیابی کا راز ہر متنفس جانتا ہے مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہالت کس طرح لڑکیوں کا شکار کر رہی ہے۔ طاقت حق رکھتی ہے کہ کمزور کو مسمار کر دے۔"

مصورِ غم کے پیش نظر ہمیشہ "عورت" رہی ہے۔ حزن نگاری میں تو اس معاملے میں دنیا کے بہت کم مصنف اس

پائے کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ظرافت نگاری میں بھی عورت کو جس طرح اُنہوں نے ہمیشہ سامنے رکھا کم از کم اُردو میں اس کی مثال مشکل سے ملیگی۔ ہوسکتا تھا کہ اُن کا مزاحیہ لٹریچر مردانہ کرداروں پر ہی منحصر ہوتا لیکن نہیں یہاں بھی عورت کو فردِ خصوصی ٹھیرا کر ظرافت نگاری کو کمال تک پہنچا دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصورِ غم کی مزاح نگاری خالی خولی باتیں ہی نہیں سطحِ ذہن پر نقش دوام ہے کیونکہ اس کا پہلو اصلاحی ہوتا ہے۔ مذکور کتاب قطعی سنجیدہ بنکر پڑھنی ناممکن ہے۔ آپ خوش ہوتے ہیں اور ہنستے ہیں لیکن جب مندرجہ بالا الفاظ پر نظر پڑتی ہے تو ایک ساعت کے لئے ذہن ظرافت سے ہٹ کر عورت کی جہالت پر غور کرنے لگتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جن بھوتوں کا اثر عورتوں میں جہالت کیوجہ سے ہوتا ہے؟ اس جہالت کی وجہ سے جن بھوتوں پر اعتقاد کرکے اُنہوں نے اپنی زندگی تباہ کرلی۔ ابتدا میں یہ فقرا "یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کردے" کس قدر موثر اور جامع ہے۔ انہی جیسے فلسفیانہ فقروں سے مصورِ غم کی ظرافت آپ اکثر مقامات پر مرصع پائیں گے۔

"نانی عشو" میں ایک جگہ نانی کی زبانی فرماتے ہیں:۔

"میں ہمیشہ قرآنی بات کہا کرتی ہوں، ورے پرے کا تو ذکر ہی نہیں کرتی جس طرح شادی غمی کے موقعوں پر ہم اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیلیوں پر بٹھا دیتے ہیں کہ وہ کھانے کا انتظام کریں اسی طرح اللہ پاک قیامت کے دن جنت دوزخ کا انتظام نیکوں کے سپرد کردیگا۔ ایک آدمی بیچارہ اللہ اتنی بڑی دنیا کا حساب کتاب اکیلا کیونکر کرسکتا ہے۔ وہاں کا سارا کام کاج ہم ہی لوگ کریں گے۔ گیارہویں والے دادا ہونگے، اجمیری بڑے ابا ہونگے، دلی والے نانا ہونگے، خالہ رابعہ ہونگی، میں ہونگی۔ ہم ہی سب مل جل کر تیا پانچا کردیں گے مگر تم جوتی خوریوں کی ایسی آنکھیں پھوٹی ہیں کہ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تم سب کو معلوم ہے کہ اللہ پاک آم کے اتنے عاشق ہیں کہ آم کا سیپارہ تک بنا دیا ہے لیکن تم نامرادیں روز آم کھاتی ہو۔ بچوں کو کھلاتی ہو مگر میرے لئے ایک دن لانے نصیب نہ ہوئے کہ اللہ کو پہنچ جاتے۔ مُردو جب قبر میں پیٹ پھوٹے گا تو خون کی ایسی نہریں بہیں گی کہ ابابیلیں تیریں گی۔ تم نے کیا سُنا نہ ہوگا "طیرن ابابیل" پھر کیوں اللہ سے فرنٹ ہوتی ہو؟"

یہ اس تصنیف کا ٹکڑا ہے جو اُردو ظرافت میں معرکۃ الآرا تسلیم کیجاتی ہے۔ یوں آپ اس کے ہر ہر فقرے کو پڑھکر خوش اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اسمیں ایک جوہر مستور ہے جس سے آشنا ہونے پر دل پر تیر چلتے ہیں۔ مذہب مقدس اسی جہالت کی بدولت بدنام ہورہا ہے اور مطلبی وعیار لوگ اس کی آڑ میں اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ بظاہر عشو کی باتوں سے آپ محظوظ ہوتے ہیں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس قسم کی مولویانہ باتوں اور واعظوں سے اکثر جاہل عورتوں کا اعتقاد کمزور ہوجاتا ہے؟ کوئی تعجب نہیں اگر کوئی عورت جو بالکل جاہل ہے اس قسم کی باتوں سے مرعوب ہوکر یقین کرے کہ عمہ کے پارے کی نسبت آموں ہی سے ہے۔ اور یہ کہ قبروں میں پیٹ پھٹ جاتے ہیں اور ابابیلیں خون میں تیرتی ہیں کیونکہ "طیرن ابابیل" کی تاویل اس کے سامنے ایسی ہی پیش کی گئی ہو اسمیں سب سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت علامہ راشد الخیری نے گو تمام عمر عورتوں کے حقوق کا تحفظ کیا لیکن انہوں نے عورتوں کی ناجائز حمایت کبھی نہیں کی۔ کیا اس موقع پر ایسے الفاظ بجائے عشو کے کسی مرد کے منہ سے کہلوا دینا مصنف کے لئے مشکل تھا؟ نہیں بلکہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی زبوں حالی کا سبب محض ہمارے پیر، مولوی، مُلا اور واعظ ہی نہیں بلکہ مذہب مقدس سے قطعی نادانف، احکام اسلام سے بالکل انجان اور ضعیف الاعتقاد جاہل عورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ "نانی عشو" میں اس کہانی کے علاوہ تین اور سنجیدہ پُرلطف افسانے "رفاعی" "سجدۂ ندامت" اور "عرب اور گلشن" بھی شامل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر

ظریفانہ لیکن نتیجہ خیز، سبق آموز اور نہایت موثر ہیں۔تینوں افسانے حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیریں ہیں۔یہ افسانے تفنن طبع اور دل لگی کے لئے نہیں لکھے گئے (اور نہ یہ کبھی مصور غم کا مقصد تھا) جو پڑھنے کے بعد دل سے محو ہو جائیں بلکہ قہقہوں کی گونج ختم ہونے کے بعد آپ کے دل میں کوئی نشتر کافی عرصہ کے لئے چُبھتا رہتا ہے۔ہر مضمون کے اختتام پر آپ اپنی خواتین سے سوال کرسکتے ہیں" اس سے کیا سبق ملا؟" مطمئن رہیئے آپ کو صرف یہ جواب نہیں ملیگا "خوش وقتی"! بلکہ مسرت کی تہہ میں خلاق اور نصیحت کا بحر بے پناہ پوشیدہ معلوم ہوگا۔عورتیں ہنسی ہنسی میں ان فسانوں سے بڑے کام کی باتیں سیکھ لیتی ہیں" سجدۂ ندامت" میں ایک جگہ ظرافت کے پھول اس طرح کھلے ہیں :-

"تائی اندر کے دالان میں تھیں۔قالین کا فرش تھا۔اندر جانیکا ارادہ کرتی ہے تو پاؤں میں ڈاسن کا بوٹ، اُترے کیونکر اور اُتارے کون؟ بیویوں نے ٹھٹھے لگانے شروع کئے۔تائی نے آواز دی" بیٹی یہاں آؤ" تو جوتی سمیت لگی چلنے۔برابر میں کھڑی تھیں چچی۔اُنہوں نے ٹوک دیا" بوا نمازی قالین ہیں مُنڈے اتار لو" چلی ٹھٹکی اور کہا "ٹائی صاحب! مجھکو افسوس ہے ٹاپا صاحب کی موٹ کا۔"

اتنے ہی میں چچی بول اُٹھیں" بیٹی تایا کیا؟ زبان کیوں موٹی ہوگئی؟"

سمیعاً:- "ڈیل چچی صاحب! آپ ٹہذیب سے بولیئے۔"

چچی:- "ٹہذیب؟ اچھی بیٹی پھر کہیو! ٹہذیب اور ٹائی؟"

سمیعاً میں اب تاب کہاں تھی، بیویوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گھیرے ہنس رہے تھے جلکر لگی اُول جلول بکنے اور چلی دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی:- "اَن ایجوکیٹڈ لوگ ملنے کے لائق نہیں۔" چچی: ٹیٹر؟

"اب تو بیویوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ گئے جو ہے وہ لوٹی جارہی ہے۔جل تو رہی تھی غضب یہ ہوا کہ لڑکوں نے تالی بجادی اور سمیعاً جلتی بھلستی اپنی گاڑی میں آ کوٹھی روانہ ہوئی۔"

سیرت و کردار کا اظہار حرکات کے علاوہ الفاظ سے ہوتا ہے۔مزاحیہ عنصر زیادہ نمایاں کرنے کے لئے دونوں کا برابر حصہ ہے اور بعض جگہ حرکات کی بجائے مکالمہ کے الفاظ دل میں گدگدی پیدا کردیتے ہیں۔اس جگہ الفاظ کے رد و بدل اور انکی ہیئت کی تبدیلی سے جو اُن میں جان پڑگئی ہے وہ ہنسنے پر مجبور کردیتی ہے۔"ٹہذیب؟ اچھی بیٹی پھر کہیو! ٹہذیب اور ٹائی؟" میں کتنی حقیقت پر مبنی ظرافت بھری ہے اور محض الفاظ کی خاطر! اس کے علاوہ ملاحظہ فرمایئے انگریزی زدہ عورت کا مضحکہ کتنی لطیف طنز کے ساتھ اڑایا ہے کہ پرانے زمانے کی چچی (جسے ضرور تائی کہا ہے) "ٹہذیب اور ٹائی" سے خیال کرتی ہے کہ بچاری بھتیجی کی زبان موٹی ہوگئی ہے۔جہاں ایسے موقعوں سے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑجاتے ہیں وہاں یہ تازیانے کا کام بھی کرتے ہیں کیونکہ انگریزی زدہ لڑکیاں اس مضمون اور اس کے انجام کو پڑھنے کے بعد اُردو کے انگریزی لہجہ کا کبھی ارادہ نہ کریں گی۔اس قسم کی صحیح ترجمانی آپکو مصور غم کے اکثر مزاحیہ افسانوں میں ملیگی کہ ظاہری وضع قطع ظرافت آمیز ہونے کے باوجود بعض الفاظ دل میں تیر و نشتر کی طرح چبھتے ہیں" رضاعی" میں ایک ایک مسلمان کا کردار مزاحیہ پیرائے میں نہایت کامیاب عبرتناک مرقع ہے۔یہ صاحب خیر سے حافظ بھی تھے۔اب جو پیرس گئے اور ایک حسینہ پر نظریں پڑیں تو ریجھ گئے اور اس کے پیچھے جو اُن کی درگت بنی وہ ظاہری طور پر اپنی ظرافت میں آپ کو جذب کرکے دنیا سے قطعی غافل کردے گی مگر درحقیقت جس حُسن وخوبی سے مصور غم نے بقول اکبرالہ آبادی "ان موم بتیوں" کی دلربائی سے احتراز کرنیکا سبق دیا ہے اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے اسی طرح "عرب اور گلشن"

میں جہاں آپ گلشن نامی ڈرپوک اور جفا کار ماما کا قصہ پڑھ کر ہنسی کو ضبط نہ کر سکیں گے وہاں عرب گھوڑے کا کردار آپ کو کتاب کی اس آخری سطر سے اتفاق کرنے پر مجبور کرے گی "آج مجھے معلوم ہوا کہ جانور آدمی سے بہتر ہے"۔

مستقل مزاحیہ تصانیف کے علاوہ بہت سی ایسی حزنیہ داستانیں (ٹریجڈیز) بھی ہیں جن کے ساتھ ساتھ ظریفانہ فسانے بھی شامل ہیں یعنی یہ مزاحیہ افسانے حزنیہ داستانوں سے قطعی علیحدہ ہیں اور اگر آپ چاہیں تو خواہ حزنیہ پڑھیئے یا طربیہ ایک کا دوسرے پر اثر نہیں پڑیگا۔ اس کا اصول تھیٹر کا سا سمجھئے جہیں اصلی (Main) ڈرامے کے ساتھ کومک (Comic) بھی ہوتا ہے علاوہ ازیں بعض تصانیف ایسی ہیں کہ حزنیہ داستان کے ہی کسی کردار کو مضحک صورت میں پیش کر دیا ہے کہ متشائم ہونے کے ساتھ طبیعت ظرافت کو بھی قبول کر لیتی ہے۔ اول الذکر کی مثالیں آپکو "تفسیر عصمت" "نمونہ شیطانی" "خدائی راج" وغیرہ میں ملیں گی کہ جہیں حزن والم کے ساتھ ساتھ "عبدل" "ناک کٹے والی بہری" "خانصاحب" "لڈیا" کے ظریفانہ کردار آپکو متبسم کئے بغیر نہ رہیں گے۔ آخرالذکر مثالیں "اندلس کی شہزادی" "تین بہنیں" "سات روحوں کے اعمالنامے" "انگوٹھی کا راز" وغیرہ میں ملیں گی جن میں "سیلوس" "اسلامی کی ماں" "مولانا" "مرقان" وغیرہ کے کردار ان سے ملحقہ دردانگیز داستانوں کو پڑھ کر آنکھ سے آنسو نکلوانے سے پیشتر آپ کے دلمیں مزاح و طرب کی لہریں دوڑا دیں گے۔ مثلاً "سات روحوں کے اعمالنامے" میں "مرقان" کو لیجئے۔ یہ رب الارباب کے دربار سے دھتکاری ہوئی ایک (مردانہ) روح ہے جس کی تقصیر گناہ اس طرح مشروط کی گئی ہے کہ وہ انسانی دنیا کا بہترین تحفہ پیش کرے چنانچہ مرقان پیکر انسانی میں دنیا میں آتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک عورت کی روح حاصل کرے لیکن اُس کے لئے ملک الموت کے کہنے پر اُسے سنکھیا کی تلاش ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی آبادی سے قطعی ناواقف ہے اس لئے سنکھیا لینے بجائے سنکھیا فروش کے جوتے والے کی دوکان پر پہنچ جاتا ہے۔

جوتے والے کی دوکان پر شام کے وقت بیسیوں آدمی بوٹ شوز گرگابی پمپ، یہ وہ، بیس قسم کا سامان دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا۔ "آپ کے ہاں سنکھیا ہے؟"

جوتے والا: "کیا چیز جناب؟" **مرقان**: "سنکھیا"۔

جوتے والا: "منوں! کتنی لیجئے گا؟" **مرقان**: "ایک روح کے قابل"۔

جوتے والا: "تشریف رکھئے۔ پہرے والے ادھر آئیو۔ دیکھ آپ کیا مانگ رہے ہیں"۔

کانسٹبل: "کیا چاہیئے تمکو؟" **مرقان**: "سنکھیا"۔

جوتے والا: "فرماتے ہیں فقط ایک آدمی کے لائق"۔ **کانسٹبل**: "کیوں صاحب؟"

مرقان: "ہاں بس ایک روح کی"۔

"کانسٹبل نے ہاتھ تھاما اور کوتوالی میں جا کر پیش کیا۔ تھانیدار موجود نہ تھے محرر نے لکھا پڑھی کر کے حوالات میں داخل کیا"۔

مرقان: "بھائی یہ کیا کرتے ہو اسمیں کیا ہے؟" **کانسٹبل**: "اندر چل نہیں ایک لات دیتا ہوں"۔

مرقان کانسٹبل کی صورت دیکھ رہے تھے کہ اس نے ایک لات رسید کی اور کہا چل اندر۔ ارے دوسروں کی روح کی فکر میں ہے پہلے تیری روح قبض ہوگی"۔

مرقان: "آپ ہی تو ملک الموت ہیں؟" **کانسٹبل** (قفل لگا کر) "اب دیکھ لیجو"۔

مرقان:۔ ایک جگہ مصیبت آئی تو یہ نتیجہ ہوا۔ یہاں کیا ہوتا ہے مگر سنکھیا کسی) دوکاندار سے پوچھنا یا مول لینا نافرمانی ہے۔ واہ چچا ملک الموت اچھا مروایا۔"

" تھانیدار نے آتے ہی آسامی کو باہر نکلوایا اور پوچھا" کیا نام ہے تیرا؟" مرقان خاموش تھے کہ کیا نام بتائیں ۔ مرقان کو صرف چند روحوں کی پرواز سے معاملہ پڑا تھا اور صرف بیماریوں کے نام جانتے تھے، کہنے لگے میرا نام بخار!"

تھانیدار:۔ بخار! بغیر پٹے باز نہ آئے گا؟ ٹھیک نام بتا ۔ دفعہ دار ذرا اس سے نام تو پوچھو۔"

" دفعدار نے میاں مرقان کے ایک تو تھپڑ دیا اور دو گھونسے پھر پوچھا بتا کیا اصلی نام ہے؟"

مرقان . . . . کھانسی لکھ لیجئے ۔"

" اب تو تھانیدار کو بھی غصہ آگیا اور مارے ہنٹروں کے مرقان کی کھال اڑا دی۔"

مرقان:۔ اوہ! آہ! ہے۔ ہو۔ میرا نام سنکھیا! ابچھر! دوزخ! آدمی!"

" تھانیدار تھک گیا اور پھر حوالات میں بند کر دیا۔"

" ملک الموت اپنے دوست کو چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ یہاں آکر دیکھتے ہیں تو مرقان حوالات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ زور سے قہقہہ مار کر کہا "پیارے مرقان یہاں اڑے ہوئے ہو"!

اس کتاب میں" سات روحوں کے اعمالنامے" اس قدر عبرتناک اور درد انگیز پیرائے میں لکھے گئے ہیں کہ ضابط سے ضابط شخص بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض مواقع مرقان کو اس طرح پیش آتے ہیں کہ پڑھنے والا اسکی بجا رگی پر ضبط نہیں کر سکتا اور یہ کمال آپکو مصور غم کی تصانیف ہی میں ملیگا۔ کہ وہ کہیں آپکو تڑپائیں گی اور کہیں گدگدائیں گی لا ریب وہ اس فن کے موجد تھے۔ میں شاید کسی جگہ لکھ چکا ہوں کہ ظرافت میں لفاظ کو بھی خاص اہمیت ہے اور جب یہ مسلسل مکالمے کی صورت اختیار کریں اس وقت تو ان کا اثر کہیں زیادہ ہوتا ہے ۔ متذکرہ بالا حصے میں مکالمہ کے ہی ذریعے ظرافت پیدا کی گئی ہے جو نہایت کامیاب ہے ۔

" تحفہ شیطانی" میں ناکڑے والی بہری اپنے مکار پیر کا پروپگنڈا ایک جگہ ان الفاظ میں کرتی ہے :۔

" ولیوں کا نام تو بہت سنا تھا اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کل شام کو بیٹھے بیٹھے آنکھیں سرخ ہوگئیں سر کے بال کھڑے ہوگئے منہ سے اتنے کف جاری ہوئے کہ میں ڈر گئی خلیفہ جی نے کہا سب ہٹ جاؤ وحی آرہی ہے۔ جب حالت ٹھیک ہوئی تو (پیر جی) فرمانے لگے" بھائی نصرو! موسیٰ بھی بہت ڈرپوک تھا بیہوش ہوگیا۔ ہم تو اللہ سے اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے برابر کا یار (نعوذ باللہ) پہلے تو ہماری بات پوچھی نہیں اب پریشان ہوئے تو زلفی شاہ سوجھے ملکن الموت کے سوا ایک فرشتہ آسمان پر زندہ نہیں ہے ۔ سارے کام یوں ہی کے یونہی پڑے ہیں ۔ دیکھتے نہیں گرمی کے تین مہینے صاف نکل گئے ایک بوند نہیں پڑی کل کام اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں' اب میں کیا ہاتھ بٹاؤں جیسا کیا ویسا بھرو ۔ اس وقت یہ کہہ ہی رہے تھے کہ بھائی زلفی جس طرح ہو تھوڑے سے فرشتے بھیجو ۔ آسمان صفا چٹ پڑا ہے ۔"

مصنف نے (نعوذ باللہ) لکھنے کے بعد ان الفاظ کو تحریر کیا ہے لیکن کیا اسے بعید از قیاس کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں آئے دن زرپرست صوفی اور مکار پیر جن کی جہالت اس سے ظاہر ہے کہ فرشتہ موت کا نام بھی صحیح نہیں لے سکتے اپنا پروپگنڈا

اسی طرح کراتے ہیں اور نعوذ باللہ خدا سے ہمسری کا دعوی کرتے ہیں جہاں یہ الفاظ پڑھ کر ہنسی آتی ہے وہاں انہیں تنبیہ بھی ہے اور ان ایمان فروش شیطانوں سے محفوظ رہنے کی تاکید بھی۔ ایسی کتابوں کے علاوہ بعض افسانے اور بھی ایسے ہیں جو ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ لیکن بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے۔

اکتوبر ۳۳ء کے عصمت میں ایک افسانہ "مچھرن کا جھولا" شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر کونسا دل ہوگا جو نہ رویا ہو کونسی آنکھ ہوگی جو پرنم نہ ہوئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی "ملا جی" کا ہتھیل ظریفانہ کیرکٹر آپ کو داد دینے پر مجبور کرے گا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

چچی:- "اے بی حمیرہ رونا دھونا تو ہو چکا اب میاں کو رخصت کرو گی یا نہیں۔ ملا جی کبھی اتنی دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں روپیہ دو تو کپڑا منگاؤں۔"

حمیرہ:- "کس قدر روپے کی ضرورت ہوگی جو فرمائیں حاضر کروں؟"

چچی:- "جوان کا مردہ ہے بڈھے ٹھڈے کا نہیں۔ ڈاکٹروں کو تو سینکڑوں روپے لئے دئے اب اللہ کا سودا یہاں کی تو خبر بری بھلی جیسی تھی گذر گئی میں تو کہتی ہوں کہ وہاں کی اچھی بنے۔ لاؤ سو روپے دیدو ملا جی حساب دیدیں گے کل پیر ہے پھول بھی کل ہی کردوں گی اُس کا روپیہ شام کو دیدینا۔"

حمیرہ:- "پھولوں کی تو ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور میں اسے پسند بھی نہیں کرتی۔"

چچی:- بیٹی تم پسند کرنے والی کون ہو۔ ہوئی کرو ان ہوئی نہ کرو۔ مرنیوالا تو پیچھے وارث چھوڑ گیا ہے کیا اسی لئے کمانا تھا کہ نام لیوا نہ پانی دیوا۔ مرگئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود" لو بھئی ملا جی اور بھی سُنا!!

ملا جی:- "یہ بچاری اسلام کی باتوں کو کیا جانیں۔ ان کو نہ حکموں کی خبر نہ حدیث پاک سے واقف۔ اسلام پر یہ وقت آگیا مسلمانوں کو یہ تک خبر نہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ سُنیئے مردہ قبر میں اوندھا کر دیا جاتا ہے جب پھول ہو جاتے ہیں اُس کے بعد فرشتے سیدھا کرتے ہیں۔"

چچی:- "سبحان اللہ سبحان اللہ حق ہے ملا جی حق ہے۔" **ملا جی**:- "میں سامان لایا۔"

ملا جی تھوڑی دیر کے بعد میت کو تختے پر لٹا کر اس طرح ڈر کر بھاگے جیسے بچہ بچا سے بھاگتا ہے اور فرمانے لگے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ یہ مسلمان کی میت ہے جس کے منہ پر داڑھی نہ مونچھ! نہلانے والا بھی کافر اور کندھا دینے والا بھی گنہگار۔ پہلے تو داڑھی کا انتظام کرو۔ پھر چار گواہ لاؤ جنہوں نے اسکو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہو۔"

چچی:- "ملا جی یہ تو غضب ہوگیا۔ داڑھی کا کیا انتظام ہوسکتا ہے۔ اور میرے ہاں تو یہ بیماری میں آیا تھا ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھی۔"

ملا جی:- "بس تو اس کی بخشش بھی مشکل ہے اور کفن دفن بھی۔ یوں کہو یہ کافر مرا ہے۔ جب بیماری میں بھی اللہ سے نہ ڈرا تو یہ کافر اس کا باپ کافر۔ ان شانئك هو الابتر۔"

چچی:- "اے ہے ملا جی ایسا غضب تو نہ کرو یہ میرا سگا بھتیجا ہے اس کو تو اول منزل کرنا ہی پڑے گا۔"

ملا جی:- "آپ بہت پریشان کرتی ہیں آپ کو کیا معلوم نہیں، آپ نے پڑھا ہوگا کہ فرشتے جب حساب کتاب کو آتے ہیں اور بے داڑھی کا مردہ دیکھتے ہیں تو لعنت بھیجکر اور تھوک کر چلے جاتے ہیں۔ خیر اب ایک ترکیب ہوسکتی ہے سو گیارہ روپے لاؤ میرے پاس ایک داڑھی رکھی ہوئی ہے وہ عرب شریف کی ہے ڈپٹی صاحب کے لئے رکھی تھی

آپ لے لیجئے"۔

حمیرہ نے ملّاجی سے کہا" اپنے شوہر کو میں خود نہلاؤں گی"۔

ملّاجی:۔ لاحول ولا قوۃ - استغفر اللہ - اس عورت کو یہ تک معلوم نہیں کہ شوہر کے مرتے ہی نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اُس پر پردہ واجب ہے۔ ہٹاؤ اس کو یہاں سے ملک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین سب کو گنہگار کرتی ہے"۔

" ملّاجی نے میت کے کپڑے اُتارنے شروع کئے۔ قمیص میں سونے کے بٹن دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ حکم دیا قمیص اللہ کے نام جائے گی۔ یہ کہہ کر سلک کی قمیص بٹنوں سمیت جیب میں رکھی۔ ہوا بند تھی اس لئے کیوڑے اور گلاب کی جو بوتلیں ساتھ تھیں ایک گلاس میں نکالکر نوش فرمائی اور ایک پھریری لیکر اور کچھ سوچ کر حمیرا صاحبہ کو آواز دی اور کہا" میں نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ سنسنیاں آرہی ہیں، کچھ کھانے کو دیدو تو دھڑ میں ڈال لوں۔ مرُن جیوں تمہارا کام تو کر دوں۔ پھر زوال کا وقت قریب ہے۔ میت کو نہلانے کا بھی حکم نہیں ہے مگر گھر میں میرے سوا کوئی اور کچھ نہ کھائے کیونکہ تحقیقی مسئلہ ہے۔ اگر گھر میں کچھ تیار نہ ہو تو برسات کے دن ہیں بازار سے ہلکی سی غذا منگوا دو۔ دودھ پھینیاں۔ اندرسے کی گولیاں اور دس بارہ آم سرولی کے۔ میں نیاز دیدوں گا"۔

حمیرہ کے عاشقِ زار شوہر کی بے بس موت سے دل پر جو اثر ہوتا ہے اسکے زائل ہونے سے پیشتر ملّاجی کے احمقانہ فتوے قارئین کو بظاہر ہنساتے ہیں لیکن دُور بین نظریں ان پر ماتم کرتی ہیں! اسلام جیسا سچّا اور پاک مذہب ان ہی جیسے جاہل مطلق ملّاؤں اور پیروں کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ شوہر کی پرستار بیوی کا دل خون ہوئے جارہا ہے اور ملّاجی خود غرضی کی خاطر اسلام کو الٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ بتائیے کفر کا ان شانٹ ھوالا بتر سے تعلق کیا اور نکاح ٹوٹنے کا ملک یوم الدین سے واسطہ کیا؟ انہی بے سروپا مولویانہ باتوں سے اسلام کو مشکل اور سنگدل بنایا جا رہا ہے۔ ملّاجی کا یہ فرمانا کہ مرنیکے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور پردہ واجب ہو جاتا ہے مصنف کا مبالغہ نہیں بلکہ اُس کے آنسو ہیں اس ایک بڑے گروہ پر جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ اور ملّاجی جنکی نمائندگی کر رہے ہیں پھولوں کے متعلق ملّاجی کا مضحکہ خیز ارشاد ہنسانے کے لئے نہیں بلکہ ان لوگوں کی ذہنی پستی کی دلیل ہے۔ داڑھی وغیرہ کا مسئلہ متنازع فیہ ضرور ہے لیکن جو کچھ ملّاجی نے کہا وہ یقیناً جہالت اور حماقت کا ثبوت ہے مصنوعی داڑھی کے متعلق البتہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خلاف مشاہدہ ہے لیکن ایسا مبالغہ مزاح نگار کا جائز حق ہے کیونکہ احمق مولوی جب داڑھی نہ ہونے کی یقینی وجہ لعنت اور پھٹکار بتاتے ہیں تو یہ ناممکن نہیں کہ وہ اس قسم کی مضحکہ خیز اور ناممکن العمل باتیں کہنے پر بھی آمادہ ہو جائیں۔ غرض بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آپکو ہنسانا چاہتا ہے لیکن درحقیقت ان نام نہاد مذہبی آدمیوں کی جہالت کا مضحکہ اڑاکر مسلمانوں کے تنزل پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا خط یاد آیا جنکا نام ذہن میں محفوظ نہیں ہے چند سال ہوئے اُنہوں نے ایک خط حضرت علامہ راشد الخیری کو لکھا تھا۔ اتفاق سے مجھے بھی اس خط کو پڑھنے کا موقعہ ملا اور اسکے چند فقرے ابتک یاد ہیں"... مولانا آپکی ٹریجیڈیز کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جس کسی کو اپنے اندر دق کے جراثیم داخل کرانے ہوں وہ آپکے خزینہ لٹریچر کا مطالعہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ آپنے مزاحیہ مضامین لکھکر ڈاکٹروں کیطرح اس مرض کا تریاق خود ہی تجویز کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ "صبح زندگی" "شام زندگی" کے پڑھنے والوں کیلئے "نانی عشو" "ولایتی تتھی" وغیرہ پڑھنا ازبس ضروری ہے" یہ تو ایک ڈاکٹر کی رائے تھی لیکن اسکے علاوہ اور لوگ بھی جو ادب کے نباض ہیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس طرح حزنیہ تصانیف میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے اسی طرح نسوانی کردار اور سبق اخلاق و اصلاح معاشرت کے پہلو کو مدنظر رکھکر ظرافت نگاری میں بھی کوئی دوسرا مزاح نگار اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اُن کی ظرافت کے مطالعہ سے بھی صرف انکا اعلیٰ درجہ کا مزاح نگار ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا معلم اخلاق اور مصلح نسواں ہونا بھی مستند پایا جاتا ہے۔

صادق الخیری

(ساقی)

آمنہ کا لال

اس کتاب کی تصنیف نے مسلمانوں اور خصوصاً مسلمانان ہند کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی جس کا ذکر ضروری ہے۔

میلاد شریف کی کتابوں میں ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو رسولؐ خدا کی زندگی اور اخلاق پر پوری طرح سے روشنی ڈالے۔ میلاد شریف کی اکثر کتابوں میں غلط عقیدت نے ایسا رنگ جمایا کہ اصلیت پس پردہ ہوگئی اور ان کو بزم میلاد میں پڑھنے سے میلاد کا اصلی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

بزم میلاد اس لئے منعقد کیجاتی ہے کہ ہم اپنے سچے رہبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرکے ان کی مبارک زندگی کے حالات سنیں۔ حضورؐ کے اخلاق وعادات کو بار بار دھرائیں، درود بھیجکر ان کے ہر ہر قول وفعل پر پوری طرح سے عمل کرنے کی کوشش کریں، اور اس پاک زندگی کو یاد رکھیں جو ہمارے لئے نمونہ تھی برخلاف اس کے اکثر صاحب میلاد اس مکمل انسان! فخر کائنات!! کا ذکر دنیاوی معشوق کی طرح زلف، رنگ قد وقامت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ خوش عقیدگی ایسی بڑھی اور اس نے اصلیت کو اپنے رنگ میں ایسا رنگا کہ حقیقت بمشکل نظر آتی ہے۔ حالانکہ ذکر کرنا چاہئے تھا ان صفات کا ان خصلات کا جس کی وجہ سے رسول خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل انسان کہلائے، اور یہ شعر حضورؐ کے حسب حال ہوا۔

حسن یوسف دم عیسےٰ ید بیضا داری　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

"یہ قیس کی لیلےٰ نہیں رحمۃ للعالمین ہے" ہماری اکثر میلاد کی کتابوں نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ غلط عقیدے کے جوش میں بعض ایسی باتیں لکھ گئے جن پر غیر اقوام کو حرف گیری کا موقع ملا۔ ایک صاحب میلاد اپنی میلاد کی کتاب میں رسول خدا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

سیہ کاریوں سے نہ گھبراؤ یارو　　　کہ حامی ہے ایک کملی والا تمہارا

اگر اس شعر کے لفظی معنے لئے جائیں تو شاعر کے خیال سے نیک عمل کرنے اور اپنے گناہوں سے ڈرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ان ہی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم اپنی کتاب "آمنہ کا لال" میں لکھتے ہیں۔

"حضور اکرمؐ کے خلاف جو مغرب نے زہر اُگلا اس کا بڑا حصہ مولود شریف کی کتابوں اور مولود خواں حضرات کی عنایات کا ممنون ہے۔ ادر ولیم میور کی تصنیف" لائف آف محمد"

ایسا آئینہ ہے جس میں ہر مسلمان اپنا چہرہ باآسانی دیکھ سکتا ہے۔"

ایک بڑا نقص ہماری میلاد کی کتابوں کا سلسلہ ترتیب ہے۔ ان میں نور محمدی کا ذکر سلسلہ وار حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عبداللہؓ اور پھر پیدائش رسول کریمؐ تک کر کے معراج اور عشق محمدیؐ اور اس کے صلے کے بیان کے بعد میلاد کی کتابوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس سے رسول خدا کی زندگی پر خاص روشنی نہیں پڑتی۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش پر کسریٰ کے ایوان کے چالیس کنگورے گر پڑے۔ راستہ چلتے تھے تو شجر و حجر سلام کرتے اور پتھر آپ کے پیروں کے نیچے موم ہو جاتا تھا۔ مگر آپ کی زندگی پر روشنی نہیں پڑتی جس کی کہ ضرورت تھی، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم نے "آمنہ کے لال" کے عنوان سے یہ کتاب لکھی اور حتی الوسع ان تمام نقائص کو پورا کیا۔ اس کتاب میں عقیدت کے پردے سے اصلیت کا رنگ صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، پیدائش رسول کریمؐ سے لیکر ہجرت تک کے واقعات اس طریقے سے لکھے ہیں کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اخلاق نبویؐ کو دکھانے میں ایک حد تک بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں عشق محمدی اور رسول خدا کی تعریف ان لوگوں سے کروائی ہے جو برائیاں تلاش کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے۔ اور بتایا کہ آپ کے اچھے اور پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے سب آپ کو ایام جہالت میں عزیز رکھتے تھے اور اس ہی وجہ سے آپ نے نبوت سے پہلے گناہوں کے گھر عرب میں امین کا لقب حاصل کر لیا تھا۔

یہ تسلسل کلام اور اس پر مولانا کا طرز بیان۔ کتاب کے اندر روح پڑ گئی۔

ہر واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اور ہر واقعہ کو نہایت اچھی طرح سے بیان کیا ہے حضرت ام سلمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایک بے وارث عورت بچہ کو ساتھ لئے حبشہ کی سڑک پر بھوکی پیاسی چلی جا رہی ہے۔ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور دل کی آہیں زبان تک پہونچکر خاموش ہو جاتی ہیں۔ کلیجہ کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں ... چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہے کہ شاید بچھڑی ہوئی صورت دکھائی دے جائے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی تسکین ہو۔ اور بھولی ہوئی آنکھیں چھوٹے ہوئے شوہر کے دیدار سے منور ہو جائیں حسرت و یاس سے حبشہ کو الوداع کہا۔ اور شوہر کی لاش کو دور ہی سے خدا حافظ کہکر آگے بڑھی۔ دل تڑپ رہا ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا ہے دنیا اجاڑ اور زندگی پہاڑ ہے۔"

غرضکہ اس طرح ہر موقعہ پر منظر کشی میں کامیاب ہوئے جواب و سوال کر کے اس کتاب میں ڈرامہ کی شان بھی پیدا کر دی ہے۔ مثلاً حضرت حلیمہ حضرت رسول اللہ کو جب پہلی مرتبہ حضرت آمنہ کو دینے آئیں تو اپنی محبت اور

اور اس جدائی کو ظاہر کرتے ہوئے اس طرح کہتی ہیں

"بیوی! پال کی آگ پیٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ آمنہ! جدائی کا پتھر بڑی مشکل سے دل پر رکھا۔ جانتی ہوں کہ یہ پھول سا مکھڑا ایک نہ ایک دن مجھ سے بچھڑنے والا ہے۔ تیرا لال تجھے نصیب ہو۔ بیوی جس آگ کے شعلے کلیجہ بھون رہے ہیں.... یہ جانتی ہوں کہ جب تک جان میں جان ہے محمد کی یاد دل سے نہ جائیگی۔ ... میری بچی شما آئے جو تیرے سامنے کھڑی ہے بیتر سے بچہ کی جدائی پر کہرام مچا یا..... بیوی آمنہ خدا تجھکو بچہ مبارک کرے

ایک جگہ اور لکھتے ہیں،

"حلیمہ! میرا بچہ ملا؟ ...... لے آمنہ تیرا بچہ تجھکو مبارک ہو"!

"آمنہ کے لال" میں میلاد شریف کی دوسری کتابوں کی پیروی نہیں کی گئی۔ مثلاً دعا۔ میلاد کی تقریباً سب کتابوں میں دعا کتاب کے آخر میں مانگی گئی ہے۔ مگر اس کتاب کے اندر دلی دعائیں اسوقت مانگی ہیں جبکہ خلیل اللہ کی دعا قبول ہو کر عالم وجود میں آنے کو ہے۔ گو اس بات سے کوئی خاص فوقیت اس کتاب کو نہیں دیجا سکتی۔ مگر ایسا کرنے سے ایک خوبصورتی پیدا ہو گئی۔ جو کہ ذوق سلیم کی محتاج ہے۔

نظمیں میلاد کی سب کتابوں میں نظمیں جا بجا دیجاتی ہیں جس سے بزم میلاد میں زور پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ "آمنہ کے لال" میں بھی جا بجا نظمیں دی گئی ہیں۔ مگر فرق اور قابل قدر فرق اتنا ہے جتنا کہ دونوں کی نثر میں۔ یعنی یہ کہ ان میں بھی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً رسول خدا کی آمد پر جو اشعار ہیں ان میں ایک یہ ہے ؎

مٹا اشرار انسانی ہٹا اوہام روحانی		وردو ہے تجھپہ اے آقا محمد مصطفےٰ آجا

دوسری خاص بات ان نظموں میں یہ ہے کہ اگر کوئی نثر کا بیان بیچ میں چھوڑ کر اس کے بعد کی نظم پڑھکر آگے پڑھنے لگیں تو سلسلہ کلام نہیں ٹوٹتا۔ مطلب یہ کہ نظم زیادہ تر ان ہی جذبات کو کیا ہے جس کا اظہار نثر میں پہلے کر دیا تھا۔ اس سے کتاب میں ایک طرح کی خوبصورتی پیدا ہو گئی۔ ادب کی خوبی اور زبان کی سلاست تو مولانا مرحوم کے قلم میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ خوبی بھی اس کتاب میں درجہ کمال تک پہنچ گئی ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اس طرح بیان کو ادا کیا ہے کہ خود نثر زبان سے بول اٹھی ہے۔

نمرود نے حضرت ابراہیم کے لئے آگ جلوائی۔ اس خیال کو مولانا مرحوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"فضائے حیات میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ زمین رو رو کر آگ کے شعلے بلند کر رہی تھی۔ اور آسمان بلک بلک کر آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا مگر قدرت کا رخ روشن آگ کی روشنی پر مسکرا رہا تھا اور معبود حقیقی کی لازوال طاقت نمرودی انگاروں میں چمک رہی تھی۔"

حضرت حلیمہ کی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
"آفتاب سے خطاب کیا درختوں سے باتیں کیں۔ پرندوں سے دریافت کیا چرندوں سے پوچھا اور دیوانہ وار ہر سمت آوازیں دے دے کر دوڑنے لگی، آفتاب اس کی دیوانگی پر ہنسا۔ زمین اس کی عقلمندی پر مسکرائی ہوا نے قہقہے لگائے، دھوپ نے ٹھٹھے مارے مگر اس کی کیفیت میں تغیر اور حالت میں فرق نہ ہوا۔"
ممکن ہے کہ لوگ اس کو شاعری میں داخل کر کے کہیں کہ اصلیت سے دور ہے۔ مگر اس سے قبل کہ کتاب پر یہ اعتراض کیا جائے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے یہاں کے ادب اور اسمیں استعارے اور تشبیہات کا رنگ دیکھیں۔ خود ہماری گفتگو میں بیشمار تشبیہات اور استعارے آجاتے ہیں جنکا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک خاص حالت کو بتا کر اس میں زور پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ مثلاً روزمرہ کی گفتگو میں کہا جاتا ہے "یہ سنکر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی" اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ درحقیقت جسم سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں، بلکہ کہنے والا اور سننے والا دونوں یہی مطلب لیتے ہیں کہ بہت غصہ آیا اس ہی طرح پریشانی دکھانے کے لئے آفتاب درختوں اور پرندوں کو مخاطب کرنے سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان بیجان چیزوں کو مخاطب کیا گیا بلکہ اس طرح سے پریشانی اور بےچینی کی زیادتی دکھائی جاتی ہے اور اس صفت کو علم ادب کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ کوئی بات صرف خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں لکھی گئی جب تک کہ اس میں اصلیت شامل نہ ہوئی اور اس اصلیت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ واقعہ سمجھ میں آ گیا مثلاً جبرئیل کو فرشتہ مان کر اسکو ایک جسم دینا ممکن تھا کہ غیر جانب دار حضرات کی نظر میں کھٹکتا مگر اس کو مولانا مرحوم نے "نور یا نورانی فرشتہ" کہکر تمام اعتراضات کو ختم کر دیا۔ اس سے جہاں مولانا کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے، عقیدت سچائی کو ہمراہ لئے ہوئے ہے انسانی جذبات اور قدرت کی منظر کشی میں تو مولانا مرحوم کو ید طولیٰ حاصل تھا حضرت حلیمہ کی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مایوس نظریں تھک کر گریں اور ناامید دل ڈھونڈ کر ہارا۔"
ایسی ایسی تمثیلوں نے اس کتاب کے اندر روح پھونکدی۔ نئی نئی تشبیہیں لاکر اس کتاب کو ادبی دنیا میں ایک مخصوص جگہ دلوائی۔ وقت کی تیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔ "معصومیت کا خاموش طائر اپنے پروں سے شباب کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا، اور وقت کی مہ جبین حسینہ اپنی پوری رفتار سے اچھلتی کودتی قدم بڑھا رہی تھی۔"
غرضکہ پوری کتاب یعنی "آمنہ کا لال" مصنف کی بہترین کتابوں میں اور میلاد شریف کی تمام کتابوں میں اپنے لئے ایک مخصوص درجہ رکھتی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب لکھکر علم ادب اور اردو پر ہی نہیں بلکہ مسلمانان ہند پر ایک احسان عظیم کیا۔ ایسی کتاب لکھی جس میں رسول خدا صلعم کے اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے میلاد شریف کے مقصد کو پورا کر دیا۔ وقت اپنی احسان مندی کے پھول مرحوم کے ادبی کارناموں کی نذر کرتے ہوئے ہمیشہ اس احسان کو یاد رکھے گا۔

سُلطانہ بیگم

امامِ ادب

از پروفیسر محمد طاہر صاحب رضوی ایم اے کلکتہ

بہت کم لوگ اس طرح کے کامل نظر آتے ہیں جو اگر ایک اچھے مقرر ہیں تو ان کی تحریریں بھی فنی اصول کے ماتحت پختہ اور پُر مغز ہوں۔ اگر ایک اچھے اور بلند پایہ مصنف ہیں تو ان کی زبان بھی ایسی ہو کہ آیندہ نسلیں اپنے لئے اسے نمونہ قرار دیں۔ علامہ راشد الخیری مرحوم کی بزرگی کے متعلق اس سے بڑھ کر اور کیا چیز پیش کیجا سکتی ہے کہ ان کے علم و فضل کا کمال ایک طرف ان کی تقریر و تحریر کی فصاحت و بلاغت اور ان کی اعلیٰ خیالی اور بلند پروازی دوسری طرف، ان سب کے علاوہ اردو زبان اور ادب کی بڑی خدمت جو کچھ اُن کے زورِ قلم اور زورِ زبان کی بدولت ہوئی وہ مشکل ہے کہ کسی دوسرے سے بیک وقت ظہور میں آسکے، علامہ کی وفات سے جو جگہ اردو کی ادبی دنیا میں خالی ہو گئی ہے شاید صدیوں تک خالی رہے گی، بہت مشکل ہے کہ ہماری زبان مستقبل قریب میں ان کے مخصوص طرزِ نگارش کا جواب پیدا کر سکے۔ کونسا ایسا دل ہے جو عورت کے آنسوؤں سے متاثر نہو، مگر ہماری دنیا میں کتنے جوہری ایسے ہیں جو ان موتیوں کی حقیقت کو پرکھ سکیں اور انہیں سلیقہ سے گوندہ کر اہلِ نظر کے سامنے پیش کر سکیں

علامہ راشد الخیری کا قلم جذبات کے متلاطم سمندر کا ایک نہ تھکنے والا پیراک تھا۔ عورت کے جذبات کی ترجمانی جیسی انہوں نے کی ہے اس کی دوسری نظیر ہمیں سخنورانِ اردو کے مجموعہ ہائے نظم و نثر میں شاید ہی مل سکے۔ اگر ادیب کا کام دل کی اتھاہ گہرائیوں تک پہونچنا اور پہونچکر نفسِ انسانی کی نامعلوم حقیقتوں کا سراغ لگانا ہے تو میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ راشد الخیری مرحوم ائمہ ادب کے گروہ میں اپنے طرز خاص کے امام تھے۔ اپنے فن کے مجتہد اور سالک تھے، ایک ایسے سالک جن کے نقوش قدم نے ہمارے ادب کی دنیا میں ہمارے لئے ایک نئی راہ پیدا کر دی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ علامہ مرحوم کے افسانے فنی معیار پر پورے نہیں اترتے، لیکن یہ اعتراض خود معترضین ہی کی ایک اصولی غلطی کی پیداوار ہے۔ مغرب کے خود ساختہ معیار سے مشرق کے ادبیات کو جانچنا صد درجہ کی بنیادی غلطی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ملک کی ضرورتیں اور ہر قوم کے خصائل جداگانہ ہوتے ہیں اور ہر ماحول اپنے ادب کے لئے ایک نیا معیار بناتا ہے۔ ہمارے نقاد یورپ کے اندھے مقلد ہیں ان سے یہ توقع کہ وہ اپنے قومی لٹریچر کے ساتھ انصاف کر سکیں گے سراسر حماقت ہے، کہا جاتا ہے کہ کامیاب ادیب وہ ہے جس نے اپنی زبان کے زیادہ سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی کے ساتھ استعمال کئے ہوں، خیالات کیلئے

محبت کے پھول

از جناب خان احمد حسین خان صاحب سب جج ریٹائرڈ چیف اڈیٹر شباب اردو

غم فراق میں علامہ راشد الخیری — اُداس آپ کے احباب و یار بیٹھے ہیں،

گئے جو آپ تو سونی ہماری محفل ہے — اگرچہ مرثیہ خواں دلفگار بیٹھے ہیں

الٰہی تو یہ عجب تیز رو ہیں تیر فراق — گذر کے دل سے کلیجہ کے پار بیٹھے ہیں

جگر میں۔ سینے میں۔ پہلو میں درد ہے اُنکے — اور ان کو تھام کے اب غمگسار بیٹھے ہیں

"جناب رحمت باری تھے عورتوں کے لئے" — یہ کہہ رہے ہیں جواب سوگوار بیٹھے ہیں

دلوں میں داغ ہیں آنکھوں سے خون جاری ہے — ہم آج رُو کش صد لالہ زار بیٹھے ہیں

اجڑ گیا ہے چمن مثل بلبل تصویر — نہیں ہے اڑنے کی طاقت ہزار بیٹھے ہیں

بتائیں گے تمہیں اب رہروان ملک عدم — کہ کس عذاب میں ہم بردبار بیٹھے ہیں

تمہاری ہستی کمالات کا خزانہ تھا — وہ ہم سے چھن گیا ہم بے قرار بیٹھے ہیں

تمہارے چاہنے والے ہیں یا کوئی منصور — کہ سرنگوں وہ سر نخل دار بیٹھے ہیں

غضب تو یہ ہے مصوّر نظر سے اوجھل ہے — اور اسکے آنکھوں میں نقش و نگار بیٹھے ہیں

تو اے مصور غم رشک مانی و بہزاد — کہاں چھپا ہے ہم آئینہ دار بیٹھے ہیں

جو تمکو دیکھتا بے اختیار کہتا تھا — "جو بیکسوں کے ہیں مطلب برار بیٹھے ہیں"

غم مربی میں کرتی ہیں بین مستورات — یتیم روتے ہوئے زار زار بیٹھے ہیں

نذیر و حالی و آزاد ہم سے بچھڑے تھے — تسلی اتنی تو تھی "یادگار بیٹھے ہیں"

چراغ ایک جو باقی تھا گل ہوا وہ بھی — اور ہم جفا کش شب ہائے تار بیٹھے ہیں

ستائے جتنا بھی ہو سکتا ہے تیری زد میں — ہم اب تو گردش لیل و نہار بیٹھے ہیں

خدا نے چاہا تو محشر میں ہو گا اب دیدار — اسی امید پہ امیدوار بیٹھے ہیں

الٰہی تربت علامہ عنبریں کردے — کہ اب دعا کے لئے جاں نثار بیٹھے ہیں

بنادے اس کو بقائے دوام کا سہرا
لئے جو حضرت احمل یہ ہار بیٹھے ہیں

ہمارا رہنمائے اعظم

موت یوں تو ہر شخص کی باعث حزن و ملال ہوتی اور اپنے اندر تھوڑا بہت اثر رکھتی ہے لیکن مصور غم علیہ الرحمۃ کی رحلت ایسا زخم ہے جس کا اندمال نہ ہوسکیگا۔ یہ ملک اور قوم کا ایسا عظیم نقصان ہے جس کی تلافی تا قیامت ہونی مشکل بلکہ ناممکن ہے اس عظیم المرتبت ہستی کی جدائی سے عروس اردو بیوہ اور مسند علم و ادب ہی خالی نہیں ہوئی بلکہ طبقہ نسواں بھی اپنے شفیق باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگیا اس کی بیفکری اور اطمینان کا افسانہ ختم ہوگیا، کیونکہ اس کے حقوق کا محافظ اس کی آزادی کا علمبردار اس دنیا میں نہیں رہا، ۳ فروری کے طوفان بادنے گلشن اردو ہی کو تاخت و تاراج نہیں کیا ہماری شمع ہدایت بھی ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی، کیسی شمع جس نے زندان جہالت میں ہماری رہنمائی کی، ہمارے حقوق سے ہمیں باخبر اور فرائض سے آگاہ کیا۔ دنیا کے نشیب و فراز دکھائے منزل مقصود کا صحیح راستہ بتایا۔ آہ ہماری بدنصیبی کہ بادسموم کے ناہموار جھونکوں نے اور اجل ستم شعار کے بے پناہ ہاتھ نے اس شمع تاباں کو خاموش کرکے ہم سے ہمارا خضر چھین لیا۔ ؎

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات طبقہ نسواں پر اس قدر ہیں کہ ان کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ آج عورتوں میں جو بیداری اور روشن خیالی پائی جاتی ہے وہ آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اب سے پچاس سال قبل حقوق نسواں اور تعلیم نسواں ہندوستان میں بے معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کلام ربانی اور ارشاد رسول مردوں کے صفحہ دماغ سے مٹ چکے تھے عورت پر جہالت و ادبار کی گھٹا چھائی ہوئی تھی نہ اسکو اپنے حقوق کی خبر تھی نہ فرائض کا احساس۔ مرد کے ہر جائز و ناجائز حکم پر سر تسلیم خم کرنا۔ چولہا جھونکنا۔ چکی پیسنا اس کی زندگی کا نصب العین سمجھا جاتا تھا اور ہر ظلم و ستم پر خاموشی و صبر ذریعہ نجات۔ والدین کی جائداد کی حقدار تھی نہ مہر کی مستحق۔ شوہر کے مال میں حصہ اس کو نہ ملتا تھا اور خلع کا حق اس سے چھن چکا تھا وہ یہ سب مظالم سہتی اور اُف نہ کرسکتی تھی۔ یہ حق تلفیاں دیکھتی اور خاموش رہتی، اس کی مجال نہ تھی کہ ان زیادتیوں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے، ظالم مارے اور رونے نہ دے کی مثال اس پر صادق آتی تھی۔ ہندوستان میں علامہ محترم پہلے انسان تھے جن کا دل عورتوں کی حالت پر تڑپ اٹھا اور ہندوستانی مسلمان مردوں کے مظالم کے خلاف چالیس سال تک صدا بلند کرتے رہے، انہی نے اصلاح کی بنیاد ڈالی۔ شب و روز کی کوششوں اور اپنے زور قلم سے مردوں کی ذہنیت میں انقلاب اور عورتوں میں زندگی کی روح پھونکدی۔ آپ نے نوحہ

زندگی، نسوانی زندگی، موؤدہ اور صالحات کے صفحات پر ہماری بربادی کا نوحہ کیا تمغہ شیطانی۔ طوفان اشک۔ تفسیر عصمت کے اوراق پر ہماری حق تلفیوں کی داستان دنیا کو سنائی۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ شب زندگی میں کامیاب زندگی بسر کرنیکا راز بتایا۔ جوہر قدامت کی جھلک دکھا کر ہمیں مشرقی جواہرات کا دلدادہ اور مشرقی روایات کا پرستار بنایا بنت الوقت، اور سراب مغرب میں فرخندہ اکرم کی زندگی کے عبرتناک انجام دکھا کر مغرب کی تباہ کن تقلید سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اور یتیم۔ لاوارث بچیوں کی تعلیم و تربیت کے واسطے مدرسہ بنات قائم کیا مخالفت کی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں اور زور شور سے برسیں مولوی سد راہ بنے اور حقوق نسواں کے غاصب مردوں نے روڑے اٹکائے۔ لیکن آپ کے پائے استقلال کو لغزش ہوئی اور نہ تیوری پر بل آیا اور ایک دو نہیں دس پانچ نہیں اکٹھے چالیس سال عورتوں کی حمایت میں سینہ سپر اور مردوں کی متفقہ طاقت سے تن تنہا لڑتے رہے۔ لڑکیوں کو ترکہ پدری دلوایا اور عورت کو مہر خلع وغیرہ حقوق کی واپسی پر مردوں کو متوجہ فرماتے رہے۔ اور رواجی پردہ کے خلاف جد وجہد فرمائی۔ عورت کو فرائض نسواں کا اور مرد کو انسانیت اور عزت نسواں کا بھولا ہوا سبق پڑھایا۔ الغرض جب تک مرد سے شارع علیہ السلام کے عطا کردہ حقوق نہ اگلوائے اور عورت کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت واپس نہ دلادی۔ آپ بے چین و مضطرب رہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کے متعلق مولانا شوکت علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میرا بھائی ایک بہادر سپاہی تھا جو لڑتا ہوا میدان جنگ میں مارا گیا۔ میرا ایمان ہے کہ علامہ راشد الخیری خلد آشیاں ایک "فرشتہ رحمت" اور سچے ہمدرد نسواں بزرگ تھے جنہوں نے اپنی زور تقریر اور قوت تحریر سے اس مظلوم طبقہ کی مصیبتوں کا خاتمہ اور دنیا میں اس کا وقار قائم کردیا!

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی سینکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحب اعجاز بھی

لیکن حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کا بدل ملنا ناممکن ہے، آپ کا ثانی اس صدی میں تو کیا آئندہ صدی میں بھی مادر گیتی پیدا نہیں کرسکتی۔ علم و ادب کی جو خدمات آپ نے انجام دی ہیں اور اردو لٹریچر میں جو قابل قدر اضافہ آپ کی بے بہا تصانیف سے ہوا وہ محتاج بیان نہیں، آپ کی نادر تصانیف نے بگڑے ہوئے افراد کو سدھارا اور سوئی ہوئی قوم کو جگا دیا۔ قدرت نے آپ کو تصویر غم کھینچنے کی ایسی قابلیت دی فرمائی تھی کہ سنگدل سے سنگدل انسان آپ کی تحریر پڑھکر متاثر ہوجاتا تھا اور مخالفین بھی آپ کے زور قلم کا لوہا مان گئے اور یہ آپ کی تحریر کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو آپ کو دنیا کے نامور مصنفین میں ممتاز بنائے ہوئے ہے۔ افسوس ہم اس رہنمائے اعظم کے بابرکت سائے اور تازہ شیریں پیغامات سننے سے ہمیشہ کے

کے واسطے محروم ہو گئے، آپ نے متواتر ۳۰ سال جو بے بہا خدمات ہمارے فرقے کی انجام دیں اور جو روحانی تکلیفیں برداشت کی ہیں ان کا تصور بھی کسی دوسرے شخص کیلئے مشکل ہے۔ بلا مبالغہ آپ نے ملک و قوم کی بچیوں کو اپنی بچیاں خیال فرمایا اور ان کی فلاح و بہتری کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انکی بڑھی ہوئی آزادی اور بدعنوانیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جس طرح آپ حقوق نسواں اور ترقی نسواں کے واسطے کوشاں رہے اسی طرح اصلاح نسواں کے ساعی عورتوں کی صرف حمایت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو غلطیوں پر بھی متنبہ فرماتے تھے۔ بیشک آپ محافظ حقوق نسواں بھی تھے اور راشد نسواں بھی۔ حامی نسواں بھی تھے اور ہادی نسواں بھی تھے، تاحیات ہماری فلاح و بہبود کے متمنی رہے اور مرنیکے بعد بھی بیش بہا مضامین اور انمول تصانیف کے علاوہ رازق اور صادق جیسے ہمدرد نسواں فرزند ہماری رہبری کے واسطے چھوڑ گئے

اے رب مجیب الدعوات تو ان کی پاکیزہ روح کو ان کی خدمات جلیلہ کے صلہ میں راحت ابدی اور سکون دائمی عطا فرما۔ اور جو آنکھ زندگی میں دیار مصطفےٰ صلعم کی زیارت کو ترسی اب اس آنکھ کو دیدار مصطفےٰ صلعم دکھا کر روشن کردے آمین۔

ہمیں توفیق عنایت کر کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہو کر تیری اور تیرے محبوب کی رضا جوئی حاصل کریں۔

اے آر ہمشیرہ ضیاءالدین

واردات جگر خراش

۶　۱۹　۳　۶

حلقہ نسواں میں برپا ہے قیامت ہائے ہائے
عام اثر اس حادثے کا ہے ریاض حسن میں
کیوں نہو معجز بیانی کا زمانہ معترف
صنف نازک کی ترقی کے بتا کر راستے
خار حسرت کے سوا گلشن میں اب کیا رہ گیا
محفلیں تو ہیں مگر وہ رونق محفل کہاں
بزم نسواں جس کے دم سے تھی کمال حسن پر
کچھ نہیں دار فنا میں زندگی کا اعتبار

راشد الخیری نے کی دنیا سے رحلت ہائے ہائے
داغ بر دل لالہ و گلہائے عصمت ہائے ہائے
ماہر فن تھا مدیر ذی کرامت ہائے ہائے
چھپ گیا آنکھوں سے وہ خضر طریقت ہائے ہائے
مٹ گئی جب شاہد رعنا کی صورت ہائے ہائے
جل بجھی شمع فروزان محبت ہائے ہائے
آج ہے وہ زینت آغوش تربت ہائے ہائے
اک فسانہ ہو گیا شیدائے ملت ہائے ہائے

رقیہ خاتون
(حضرت ثاقب لکھنوی کی پوتی)

علامہ مغفور کے چند اوصاف

از مولوی محمد لیاقت اللہ صاحب ایچ سی ایس

حضرت علامہ راشد الخیری صاحب کے دنیا سے اُٹھ جانے کا جس درجہ رنج و ملال مجھے ہوا اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ میری خوش قسمتی سے علامہ مغفور کے زمانہ سیاحت حیدر آباد میں مجھے ان سے ملاقات کے مواقع ملے۔ مجھ جیسے ہیچ مایہ شخص سے علامہ مرحوم جس محبت و انکسار سے ملتے تھے اسکے سبب ان کی عظمت و بزرگی کا نقش میرے دل پر بہت گہرا ہے۔

مجھے مرحوم کی ایک ادا بڑی دل پسند تھی۔ مدرسہ بنات کی امداد کے سلسلہ میں حیدر آباد کے سربر آوردہ اصحاب کے پاس (جن کے ہاں ان کا رسالہ عصمت جاتا تھا) مجھے ان کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ دیکھا کہ اشارۃً یا کنایۃً بھی امداد مدرسہ سے متعلق گفتگو کرنے میں ایک خاص قسم کا حجاب محسوس فرماتے تھے اور جس وقت وہ تنہا ہوتے اور میں چھیڑتا کہ آپ بھی عجیب قسم کے انسان ہیں کہ اپنے مدرسہ کی امداد کے متعلق کچھ نہیں فرماتے تو مسکرا کر فرماتے "اے میاں لیاقت اللہ مجھے لوگوں سے امداد مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ حقوق نسواں کے متعلق چاہو مجھ سے تقریر کرالو مگر چندہ مانگنے کے معاملہ میں میری زبان نہیں کھلتی"۔ مولانا کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ کبھی اپنے مخاطب کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ مولانا علم و فضل اور رتبہ میں اس سے بالاتر ہیں اور یہ بھی ان کی عظمت کی دلیل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی بڑی ہستیوں میں سے ایک بہت بڑی ہستی علامہ مرحوم کی تھی جس کا بدل اب مشکل ہی سے مل سکے خدا مرحوم کو غریق رحمت فرمائے۔

مرگِ راشد سے بنی ہے بزمِ عصمت سوگوار

لہلہاتے باغ سے نکلی ہے کیوں رونق بہار
ہر نفس جس کا کہ تھا اصلاح میں نذر ان کی
اس کے مٹتے ہی خزاں کی دوڑ۔ پوری رہ گئی
لعل و گوہر ہیں تصانیف اسکی، پڑھیں گے حشر تک
اس کی فکر خاص کا بڑھتا چلا تھا ہمکو ذوق
تا رد پود اپنا کسی صورت سے بُن سکتے نہیں
اے جمال اس نیک طینت کو خدا دے افتخار

مرگ راشد سے بنی ہے بزم عصمت سوگوار
دوسروں کے واسطے جو رات دن تھا بے قرار
صنف نازک کی ترقی بھی ادھوری رہ گئی
جو سبق وہ دیگیا وہ تو رہیں گے حشر تک
ہائے اسکی موت لیکن لیگئی ہم سب پہ فوق
کو زور کر ہم ہوگئے اب کچھ بھی سن سکتے نہیں
انکو جنت کا چمن بخشے خدائے کردگار۔

آنسہ جمال

علامہ راشد الخیری کی ایک جھلک

۱۹۲۹ء میں جب میں بھوپال میں ملازم تھا۔ ایک روز جس وقت میں دفتر پہونچا تو مسٹر محمود صدیقی بی اے مدیر "ظل السلطان" کے بھائی ایوب رضا میری میز پر آئے اور کہنے لگے "صدیقی صاحب علامہ راشد الخیری تشریف لائے ہیں۔ رازق میاں بھی ساتھ ہیں اور دفتر میں قیام فرما ہیں" اسی وقت طے ہو گیا کہ شام کو دفتر سے اٹھ کر سیدھے شاہجہاں آباد چلیں گے۔

میرا یہ حال کہ اشتیاق ملاقات میں دن کاٹنا محال ہو گیا، خدا خدا کر کے پانچ بجے۔ اور ہم دیوانہ وار روانہ ہوئے۔ سڑک کی طرف سے راستہ دور پڑتا تھا۔ اس لئے عیدگاہ کوٹھی سے رستہ کاٹ کر نکل گئے، جوں ہی دفتر کے دروازہ میں قدم رکھا۔ میری نظر ایک بزرگ پر پڑی۔ طویل قامت۔ سفید ریش۔ پُر وقار۔ مگر متبسم چہرہ۔ بھویں کسی قدر گھنی۔ رعب دار اور نہایت روشن آنکھیں مضبوط کاٹھی۔ پیشانی سے مذہبیت کا نور برس رہا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ لمبی سی گرم شیروانی پہنے چہل قدمی میں مصروف ہیں۔ پاؤں کی آہٹ پر نگاہیں ہماری طرف تھیں ایوب رضا نے آہستہ سے کہا "یہی ہیں علامہ"! میں نے سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لئے بڑھا، آپ نے خندہ پیشانی سے "وعلیکم السلام" کہتے ہوئے مصافحہ فرمایا۔ آواز میں خاصی گرج تھی۔ اتنے ہی میں ایک نوجوان خوش پوشاک خندہ رُو، مگر نگاہیں ادب سے جھکی ہوئیں۔ بظاہر کسی کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ برآمدہ سے برآمد ہوئے ایوب رضا نے پھر چپکے سے کہا "یہ رازق میاں ہیں"۔

ابھی تعارف اور کسی گفتگو تک نوبت نہ پہونچی تھی کہ مولانا نے فرمایا "میاں جلدی کرو، وقت کافی ہو گیا ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کے تکلفات! خدا کی پناہ!

محمود صاحب بھی یہ سن کر کوٹ کے بٹن لگاتے اور بغل میں ٹوپی دبائے نکل آئے مجھے دیکھتے ہی فرمایا "آخر آپ تک بو پہونچ گئی۔ لیکن بھئی دیر سے پہونچے۔ اسوقت مولانا ہوا محل تشریف لے جا رہے ہیں"۔ مولانا یہ معلوم کر کے کہ میں حصول نیاز کے لئے حاضر ہوا ہوں فوراً متوجہ ہوئے۔ ایک مصافحہ ہو چکا تھا، دوبارہ آپ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے محمود صاحب سے پوچھا۔ "آپ کی تعریف!" اور ایک غور کی نظر ڈالتے ہوئے فرمایا "مگر شاید میں نے آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے"۔ ابھی محمود صاحب با میں کچھ عرض کرنے نہ پائے تھے کہ پھر خود ہی بول اُٹھے، "ہاں میاں تم نے کبھی الجمعیتہ کے دفتر میں بھی کام کیا ہے۔ ضیاء الدین کے زمانہ میں"!

دینے کو جواب تو میں نے دے ہی دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی اس غیر معمولی یادداشت پر میں حیران

رہ گیا۔ تین سال کی بات، یوں ہی کبھی دفتر میں نظر پڑ گئی ہوگی۔ سچ پوچھئے تو مجھے یاد بھی نہیں کہ مولانا نے مجھے کب اور کہاں دیکھا۔" بلا کی یادداشت ہے آپ کی! محمود صاحب نے فرمایا۔ اب ہم سب باہر آچکے تھے۔ مولانا آگے آگے تھے۔ ایک طرف محمود صاحب، ان کے پیچھے "رازق میاں" سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اور رازق صاحب سے ذرا پیچھے میں اور ایوب رضا، مگر میں نے سڑک پر پہونچکر پیچھے دیکھا اور مجھ سے فرمایا "میاں آگے آؤ تم سے تو ابھی باتیں ہوئی ہی نہیں" میں نے تعمیل ارشاد کی اور بڑھ کر آپ کے بائیں ہاتھ پر ہوگیا۔ فرمایا غالباً میں نے اس وقت تمہیں دیکھا تھا۔ جب جمعیۃ علماء کا وفد "موتمر اسلامی" کی شرکت کے لئے مجاز روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد موتمر کے سلسلہ میں وفد جمعیۃ کی خدمات کا بالتفصیل ذکر فرمایا۔ پھر دریافت کیا کہ "ایک ایڈیٹر کے دوست ہو، کبھی کچھ لکھا بھی کرتے ہو، یا بس لکیریں ہی کھینچتے جانتے ہو" (میں عرض کرچکا تھا کہ آج کل سروے میں ملازم ہوں) محمود صاحب نے میری طرف سے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا "میاں میرا مقصد یہ ہے کہ اس بے زبان مخلوق کے لئے لکھنے والے کم ہیں جن کی خدمت عصمت انجام دے رہا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان اہل قلم زیادہ سے زیادہ توجہ کے ساتھ زنانہ لٹریچر میں اضافہ کریں" اس کے بعد اس ضرورت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو فرماتے رہے اور امامی دروازہ تک پہونچتے پہونچتے گویا آپ نے تحریک نسواں کی پوری تاریخ بیان کرچکے تھے۔ امامی دروازہ کے اندر پہونچکر مولانا کو صدر منزل کی طرف جانا تھا اور مجھے ہوا محل کی جانب۔

میں نے رخصت چاہی تو فرمایا کہ میں مدرسہ بنات کے سلسلہ میں دورہ کر رہا ہوں، جہانتک ہوسکے اپنے عزیزوں اور دوستوں تک میری آواز پہونچاؤ، میں نے وعدہ کیا اور سلام عرض کرکے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ ایسی پیچیدگیوں میں مبتلا رہا کہ دوبارہ حاضر نہ ہوسکا، چند روز بعد ایوب رضا نے بتایا کہ مولانا تشریف لیگئے میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ یار زندہ صحبت باقی۔

آہ! کیا خبر تھی کہ یہی پہلی ملاقات میری آخری ملاقات ہوجائے گی۔ پچھلے دو مہینہ سے ہندوستان میں عموماً اور ہندوستان کے نسوانی حلقوں میں خصوصاً اسی "مصور غم" کا غم منایا جا رہا ہے۔ ہر طرف صف ماتم بچھی ہے اگلے دن عزیزہ افتخار بیگم نے عصمت کا ماتمی نمبر دیکھنے کو بھیجا تو آٹھ سال پہلے کا یہ نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا مرحوم کی حیات میں تو حوادث روزگار نے کچھ لکھنے کے متعلق حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل نہ ہونے دی، سوچا کہ لاؤ "راشد الخیری نمبر" میں یہ چند سطور لکھ کر ہی سعادت حاصل کرلوں۔

سوگوار

خلیق صدیقی (مدیر مشورہ)

قطعاتِ تاریخ انتقالِ پُرملال ادیبِ بے مثال علّامہ راشد الخیریؒ مرحوم و مغفور

از جناب سید راحت حسین صاحب فلسفی بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی ساداتِ ایجما

(۱)

نظر آتے ہیں سرنگوں اہلِ فن
پڑی آج ویراں ہے بزمِ سخن

ہوا شور ماتم، تری موت پر
کھڑے رو رہے ہیں ہر اک مرد و زن

مچا ایک کہرام، خاک اُڑ گئی
کیا زیب تن تو نے جس دم کفن

انوکھا تھا تُو اک فسانہ نگار
تری ذات سے تھا فروغِ سخن

وہ افسانے غم کے تری یادگار
"شبِ زندگی" کا وہ رنج و محن

رسومات کی تونے اصلاح کی
جتاتا رہا خوب تو حق زن

وہ صورت تری خاک میں مل گئی
پریشاں ہیں اجزائے کام و دہن

گیا چھوڑ کر اپنا کُل مال و زر
کھلے ہاتھ ہیں، بر میں ہے اک کفن

جو دریافت کی آہ! تاریخ مرگ
نظر جا پڑی، سوئے چرخِ کہن

ندا دی قضا نے کہ اے فلسفی
تو کہدے "وہ بجھا یا چراغِ سخن"

۱۹ ۳۶ء

(۲)

شور و شیون ہے، گریہ و ماتم
بزمِ عالم ہے درہم و برہم

آہ علّامہ راشد الخیری
ترے ماتم میں چشم ہے پُرنم

فکر تاریخ فلسفی نے کی
اک ندا آئی دُور سے اُس دم

دیکھ جانا دبا کے پائے ادب
"واں یہ سوتا ہے اک مصورِ غم"
۱۹ ۳۶ء ۱۹ ۳۶

بڑھ کے پھر دی ندا یہ کوثر نے
"لے تو ایک جام مے مصورِ غم"

۱۹ ۳۶ء

(۳)

موت جانکاہ کی خبر آئی — سرد آہوں کی اک گھٹا چھائی
شور ماتم ہے بحر میں، بر میں — ایک کہرام مچ گیا گھر میں
دل پُر درد میں فسردوں پہ ملال — دیکھ احباب کا بُرا ہے حال
موت پر تیری روتے ہیں سب ہی — آہ! **مولانا راشد الخیری**
تجھ کو تقدیر ہم میں سے لے آئی — غم کے افسانوں نے جلا پائی
جذب دل سوز کا تو ماہر تھا — ترجمانی پہ اُس کی قادر تھا
غم کی تصویریں زندہ ہوتی ہیں — سر کو دُھنتی ہیں جان کھوتی ہیں
کیا ماتم "بیان" نے تیرا — سوگ رکھا "زبان" نے تیرا
دُور تو نے بُرے رسوم کئے — ذوق تعلیم لڑکیوں کو دیئے
کی حمایت حقوق نسواں کی — شرم و عزت کی، مال اور جان کی
آج خاموش تیری ہستی ہے — تجھ کو تیری بنات روتی ہے
چل بسا چھوڑ کر تو گھر اپنا — پیاری اولاد مال و زر اپنا
تیرا ملنا نہیں ہے اب ممکن — سُونی دِلّی پڑی ہے تیرے بن
فلسفی نے پتہ نہ جب پایا — رو دیا، دل جو اُس کا بھر آیا
ساعت مرگ کو خیال کیا — پئے تاریخ اک سوال کیا
خُلد ہے تیرا گھر کہ باغ ارم؟ — "تو بسا ہے کہاں مصوّرِ غم"

۱۹۳۶ء

(۴)

عالم فانی! نہیں تجھ کو ثبات — مر گیا، مر جائے گا ہر ذی حیات
ہائے یہ قانون قدرت ہے اٹل — ہو سکی اس سے نہ جانبر تری ذات
تیرے مرنے کا ہے ماتم مُلک میں — یادِ تیری، غم کی ہے اک کائنات
مرنے والے آہ جلدی تو نے کی — نام میں تیرے تھا اک رازِ ممات
سال ہجری میں ہیں گو دُشواریاں — فلسفی نے اُس کے سمجھائے نکات

سرنگوں بام فلک نے دی ندا
"**راشد الخیری**" ہے تاریخ وفات

۱۳۵۴ھ

مولانا راشد الخیری

تمام ہندوستان کو اس اندوہناک حادثہ کی خبر ہے کہ دہلی کے مشہور بلکہ مشہور تر ادیب علامہ راشد الخیری خدا کو پیارے ہوئے اور اس دنیا سے اس دنیا میں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے اور جہاں سے جانے کے بعد کوئی الٹا پھر کر نہیں آیا کرتا. خدا ان کو کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے ان میں اصلی دلّی والوں کی ادائیں تھیں۔ اور اب کوئی بھی ایسی اداؤں والا دلّی میں باقی نہیں رہا۔

میری مولانا سے ۱۹۰۹ء میں ملاقات ہوئی جبکہ وہ زینت محل کے کمرہ کی ایک اسلامی انجمن میں کبھی کبھی تقریر کرنے جایا کرتے تھے اسوقت وہ ڈاک خانہ کے محکمہ حساب میں نوکر تھے، اس کے بعد سر شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اکرام کے دفتر رسالہ مخزن میں ان سے ملاقاتیں شروع ہوئیں اسوقت تک انکی ادبی شہرت کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر ان کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۰۹ء سے لیکر رحلت کے وقت تک ان کی ملت یکساں رہی کبھی اس میں جھول نہیں پڑا۔ ورنہ آجکل کے زمانہ میں جب کسی کا کوئی کام پڑتا ہے تو تعلق بڑھالیا جاتا ہے اور جب کام ختم ہوجاتا ہے تو تعلق بھی ختم ہوجاتا ہے یا کم ہوجاتا ہے۔

مرحوم اخباری جھگڑوں اور اخبار والوں کے اختلافات سے ہمیشہ الگ رہتے تھے جلسوں اور پارٹیوں میں بھی کبھی ان کی صورت نظر آتی تھی مگر وضع داری اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ ۱۶ نومبر ۱۹۲۴ء کو وہ واحدی صاحب کے ہاں آئے اور مجھ سے پریشان ہوکر کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ہمدرد میں آپ کے خلاف آج لکھنا شروع کردیا۔ میں نے ہنس کر کہا مولانا آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں میں تو بمبئی جارہا ہوں۔ ۲۰ نومبر کو واپس آکر اس حملہ کا تدارک کرلوں گا۔ مولانا نے کہا کہ آپ مولانا محمد علی کے اثر اور رسوخ سے واقف نہیں معلوم ہوتے ان سے لڑنے میں آپ کو نقصان پہونچ جائیگا بھئی میں تو ان لڑائی جھگڑوں کو برا سمجھتا ہوں ہوسکے تو صبر کر جاؤ اور جواب نہ دو، میں نے کہا ہر شخص کی طبیعت جدا ہوتی ہے. چنانچہ میری آپ کی طبیعت میں بھی یہی فرق ہے کہ آپ صبر و سکون کے حامی ہیں اور میں جنگ و حرکت و جدوجہد و مقابلہ کا طرف دار ہوں،

۲۰ نومبر سے میں نے روزانہ غریبوں کے اخبار کے ذریعہ ہمدرد کا مقابلہ شروع کیا میرے سب رفیق اور دوست واحدی صاحب کے ہاں روزانہ صبح کے وقت جمع ہوتے تھے اور دس بجے تک اخبار کے مضامین سب کے مشورہ سے مرتب ہوکر پریس میں جاتے تھے، اسوقت کبھی کبھی مولانا مرحوم بھی واحدی صاحب سے ملنے آجاتے اور ہم سب کو ترتیب مضامین کے مسئلہ پر بحث کرتا دیکھتے تو کھڑے کھڑے مسکراتے پھر واحدی صاحب سے کہتے، میاں بناؤ بھی کہاں کا جھگڑا نکالا ہے، آخر یہ لڑائی ختم بھی ہوگی، میں ہنسی سے کہتا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ہمدرد کے ہمدرد ہیں، آج آپ کے خلاف بھی ایک مضمون لکھا جائیگا. مولانا جواب دیتے ایک نہیں ہزار مضمون لکھو میں کبھی جواب نہیں دوں گا اور یہ کہتے ہی چلے جاتے. ہم سب ہر چند روکتے. نہ ٹھیرتے. اس لڑائی کے زمانہ میں ہمدرد کی بابت چند خطوط میرے قبضہ میں آئے اور مولانا مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں ان خطوط کو غریبوں کے اخبار میں شائع کردوں گا تو مجھ سے کہا میں نے ایسا سنا ہے کہ آپ مولانا محمد علی کی نسبت کچھ خانگی خطوط شائع کرنے والے ہیں ایسا نہ کیجئے گا۔ یہ بات شرافت کے خلاف ہے میں نے مولانا محمد علی کے بھانجے محمد عثمان صاحب کو بلاکر وہ خطوط دیدئے ہیں۔ یہ سنکر مرحوم نے میری پیٹھ پر ہاتھ مارا اور ہنسکر کہا ہمیں یہی توقع تھی۔

پنجاب کی ایک عورت نے مولانا کی نسبت مجھ سے کہا کہ اس کے شوہر کے مقدمہ میں مولانا نے باوجود وعدہ کے اس کی مدد نہیں کی

اس بولنے والی عورت نے ایسا سماں باندھا کہ میں اس کو مظلوم سمجھنے لگا اور میں نے مولانا پر زور ڈالا کہ عورت مظلوم ہے، اور آپ نے اس کی امداد میں کوتاہی کی ہے۔ مولانا نے میرے کہتے ہی تلافی کردی۔ مگر جب بعد میں معلوم ہوا کہ عورت مذکور بناوٹی باتیں بنانے میں بہت مشتاق ہے اور اس نے بہت سی باتیں فرضی بنائی ہیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور ہمیشہ میری نظریں مولانا کے سامنے جھکی رہیں کہ میں نے مولانا پر بے انصافی کا الزام لگانے میں غلطی کی تھی۔

مولانا کا مکان واحدی صاحب کے گھر کے راستہ میں تھا اور مولانا اکثر اپنے مکان کے باہر آن کھڑے ہوتے تھے اور واحدی صاحب کے ہاں آتے جاتے ان سے صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ کوئی باہر کا آدمی ہوتا تو میں مولانا کو ستانے کے لئے کہتا کہ ملو یہ علامہ راشد الخیری صاحب ہیں تو مولانا کا چہرہ غصہ سے تمتما جاتا اور وہ اجنبی آدمی سے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کرکے بات چیت کئے بغیر گھر میں چلے جاتے، اور پھر کبھی اکیلے میں ملتے تو کہتے کہ مہربانی کرکے مجھ سے لوگوں کو ملانے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ آپ جانتے ہیں میں ہر اجنبی سے ملنے جلنے سے گھبراتا ہوں۔ میں کہتا اسی گھبراہٹ کو دیکھنے کے لئے تو میں ملاقات کرایا کرتا ہوں۔

مولانا ہر سردی کے موسم میں ایک دفعہ دوستوں کو نہاری کھلایا کرتے تھے اور مجھے بھی بلاتے تھے اسوقت ان کی ادائیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں کہ کھلاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

آخری وقت

میں برما کے سفر میں تھا جب وہ بیمار ہوئے واپس آیا تو درگاہ کے عرس میں مصروف رہا۔ آخر عرس کے بعد مولانا کی وفات سے شاید دو چار دن پہلے میں ملنے گیا تو وہ پلنگ پر لیٹے تھے اور ان کے بڑے فرزند رازق الخیری صاحب ان کے پہلو میں بیٹھے ان کی خدمت کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ خواجہ صاحب آئے ہیں مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل سے لگالیا اور ایسی محبت ہاتھ کو دل سے لگانے میں ظاہر کی کہ مجھے پرانے زمانہ والوں کی دوستیاں یاد آگئیں جن کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہے۔ اسوقت مولانا کو روحانیت کی طرف بہت ہی توجہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ان کا دل خدا کی طرف پوری طرح راغب تھا۔ جو ان کی گفتگو سے ظاہر ہوا۔ جو اسوقت انہوں نے کی تھی۔

ان کے انتقال کی خبر آئی تو میں فوراً ان کے گھر پر گیا۔ جہاں تمام دلی کے اکابر اور ادیب جمع تھے۔ میں نے اسی حالت میں ان کی کتابوں اور علمی کارناموں کی ایک فہرست دریافت کرکے مرتب کی۔ اور دہلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن میں لے گیا اور ان کے انتقال کی خبر تبصرہ اور تصنیفات کے تذکرہ کے ساتھ نشر کرائی، جس کے سبب اسی شام کو تمام ہندوستان ان کی وفات سے واقف ہو گیا اور جگہ جگہ ماتمی جلسے ہونے لگے۔ چنانچہ دوسرے دن جلسوں کی اطلاعیں بھی آگئیں۔

اس کوشش کی مصروفیت کے سبب میں مولانا کی تدفین میں شرکت نہ کرسکا۔ مگر یہ خدمت بھی میرے خیال میں شرکت تدفین ہی کے برابر تھی جو میں نے اپنے شہر کے ایک بڑے ادیب اور اپنی ذات کے ایک مخلص دوست اور عورتوں کے سب سے بڑے خدمت گذار مددگار کی انجام دی

مرحوم اپنی اولاد سے بہت خوش تھے۔ اور اولاد بھی ایسی ہی لائق اور خدمت گذار ہے کہ وہ اس سے جس قدر بھی خوش ہوتے کم تھا۔ کیونکہ میں نے تو نئی روشنی کے لڑکوں میں ایسے سعادت مند لڑکے کہیں دیکھے نہیں جیسے مولانا مرحوم کے لڑکے ہیں۔

حسن نظامی

عکس تحریر حضرت علامہ مغفور (مخدومہ خاتون اکرم مرحومہ کے نام ایک مکتوب کی چند آخری سطریں)

نور چشمی اکبری بیگم سلمہا کو تملے یہ کہکر خط کا جواب نہ لکھنے دیا کہ میں زبانی کہہ دونگی - میری طرف سے انکو بہت بہت دعا اور والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں سلام علیک کے بعد کہہ دینا میں سب کا دعا گو اور نماز مند ہوں -

بچیونکے مستقبل کا فکر مسلمان والدین اور بالخصوص ما کے واسطے نہائت جگر خراش ہوتا ہے ہماری بیٹی رازق دلہن یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی والدہ محترمہ کے فکر کو مسرت سے بدل دو اور انکو یقین دلا دو کہ میں جس گھر میں گئی ہوں اسکا ہر کونا میرے احترام کو تیار ہے -

اچھا بیٹی خدا حافظ ! سبکو ماوجب کہہ دینا - دعا گو راشد الخیری

10 - 2 - 23

علّامہ راشد الخیری کے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر

مولوی شاھد احمد صاحب بی۔اے آنرز ایڈیٹر رسالہ "ساقی"

انیسویں صدی کے آخیر اور بیسویں صدی کے آغاز میں آسمانِ ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا جو منازلِ فلک تیزی سے قطع کرتا ہوا اوجِ کمال پر جا پہونچا۔ اُردو کے لئے یہ نیک شگون تھا۔ اہلِ نظر نے اسے دیکھا اور کہا کہ یہ ستارہ ایک نہ ایک دن آفتاب بنکر رہے گا۔ ان کی یہ پیشین گوئی وقت نے پوری ہوتی دیکھی۔ وہ ستارہ جو مولوی عبدالراشد کی صورت میں چمکا تھا بالآخر سورج بنکر علامہ راشد الخیری کی ہستی میں جلوہ گستر ہوا اور مرجھائے ہوئے چمن اُردو میں ایک ایسی رُوح پھونک گیا کہ اس کا چپہ چپہ دامنِ باغباں اور گوشہ گوشہ کفِ گلفروش بن گیا۔

علامہ راشد الخیری کی حیاتِ ادبی کا آغاز اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ نذیر احمد کا طوطی بول رہا تھا۔ "مراۃ العروس" "بنات النعش" اور "توبۃ النصوح" جیسی کتابیں دائرہ وجود میں آچکی تھیں اور اُن کا مصنف ادب سے مُنہ موڑ کر مذہب کیطرف متوجہ ہوچکا تھا۔ پبلک یہ چاہتی تھی کہ اسی نوع کا اور لٹریچر پیش کیا جائے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ ادب و انشا کے ایسے شہ پارے پیش کئے جائیں جن سے اسلامی تہذیب و معاشرت کی اصلاح ہو اور مسلمان عورتوں میں خصوصاً بیداری احساس پیدا ہو۔ علامہ نذیر احمد کی ضعیفی تھی اور آخری عمر میں یوں بھی انسان اپنے معبود سے دھیان لگاتا ہے تاکہ توشۂ آخرت جمع ہو اور عاقبت بخیر ہو۔ ادب کی طرف آخری دم تک علامہ مرحوم پھر متوجہ نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے کارخانہ میں جب کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ چنانچہ علامہ راشد الخیری مُنصۂ شہود پر آئے اور ایک دُکھ بھرا دل اپنے ساتھ لائے۔ انہیں ضرورت تھی ایک ایسے رہبرِ کامل کی جو انہیں ادب کے سیدھے راستے پر ڈال دے۔ ان کی نظرِ انتخاب اپنے ہی کُنبے میں اپنے پھوپا علامہ نذیر احمد پر پڑی جن کی شفقت سے مولانا کی فطری صلاحیت قوت سے فعل میں آئی اور علامہ کی نظرِ کیمیا اثر نے انہیں بھی کُندن بنا دیا۔

شروع شروع میں مولانا راشد الخیری نے اپنے اُستاد کی پیروی میں اُنہی کا اسلوبِ بیان اختیار کیا تھا لیکن ان کی فطرت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ جو کچھ یہ کہنا چاہتے تھے اس کے لئے ایک جدید اسلوب کی ضرورت تھی۔ مولانا کی رنگین انشا پردازی علامہ کی سادگی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے انہیں اپنے مناسبِ حال ایک جدید و دلنشیں اسٹائل وضع کرنا پڑا اور یہ اس قدر منفرد و دلکش ثابت ہوا کہ کسی اور انشا پرداز کو میسر نہ آسکا۔ اس اسٹائل کے وہ جب تک زندہ رہے بلا شرکتِ غیرے مالک رہے اور ان کے انتقال کے ساتھ ساتھ یہ اسٹائل بھی فنا ہوا ع

ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔

مولانا کے اسٹائل میں یہ خوبی تھی کہ مشکل سے مشکل خیال بہت آسانی سے انہیں ادا ہوجاتا تھا اور پھر نہایت سلاست و شگفتگی کے ساتھ۔ مگر جس طرح کارلائیل کے متعلق مشہور ہے کہ اسکا اسٹائیل لائق رشک ہے۔ لیکن اس کی نقل اُتارنے والا بُری طرح ٹھوکر کھاتا ہے۔ بالکل یہی ہم مولانا کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سانچے

میں صرف ایک اسلوب ڈھلا تھا اور پھر سانچہ توڑ دیا گیا۔ افسوس کہ طرز نگارش میرے موضوع مضمون سے خارج ہے اور یوں بھی مولانا کے اسٹائیل میں اتنی خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں کہ انہیں واضح کرنے کے لئے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔

مولانا راشد الخیری کی وہ تصانیف جو اُن کے سامنے شائع ہوئی تھیں اور مضامین کے وہ مجموعے جو زیر ترتیب ہیں سب ملا کر اسّی کتابیں ہوتی ہیں جو مولانا نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور ان میں اس درجہ متلون و متنوع لٹریچر پیش کیا ہے کہ اُردو کے کسی اور مصنف کے ہاں ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا ہے۔ مولانا کی ساری عمر جرنلزم میں گزری۔ جب تک اپنے پرچے نہیں نکالے تھے تو اُردو کے اور پرچوں میں لکھتے تھے اور جب "مخزن" دہلی آگیا تو سر عبدالقادر نے ان کی مستقل خدمات حاصل کر لی تھیں، یہاں تک کہ جب شیخ صاحب ولایت گئے تو ڈھائی تین سال تک مولانا ہی نے "مخزن" کے ادارتی فرائض انجام دیئے۔ پھر اپنا ذاتی پرچہ "عصمت" عورتوں کے لئے جاری کر دیا اور اس کے چند سال بعد مردوں کے لئے "تمدن" جاری کیا تھا۔ آخیر میں لڑکیوں کیلئے "بنات" جاری کیا جو ابتک ان کی یادگار میں "عصمت" کے ساتھ ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ملا واحدی صاحب سے خلوص کے تعلقات ہونے کی وجہ سے "خطیب" "نظام المشائخ" وغیرہ کی قریب قریب ہر اشاعت میں ان کا ایک مضمون موت تک شائع ہوتا رہا جب تک کہ بچیوں کا مدرسہ قائم کیا۔ اسی کے پہلو بہ پہلو تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ غرض مولانا ئے مرحوم نے اس قدر وافر سرمایۂ ادب چھوڑا ہے کہ لٹریچر کا شاید ہی کوئی پہلو بچا رہا ہو۔ کہیں نثر ہے کہیں نظم۔ کہیں ناول ہیں کہیں افسانے۔ کہیں علم ہے کہیں ادب۔ کہیں تاریخ ہے کہیں سیرت۔ کہیں تہذیب ہے کہیں اخلاق۔ کہیں واقعات ہیں کہیں حکایات۔ کہیں چٹکلے ہیں کہیں چٹکیاں۔ کہیں غم ہے کہیں خوشی۔ کہیں آنسو ہیں کہیں قہقہے۔ کہیں مردوں کا ظلم ہے کہیں عورتوں کی بپتا۔ کہیں پرانی تہذیب کا نوحہ سنایا ہے کہیں ترقی جدید پر آنسو بہائے ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی پہلو علامہ مرحوم کی نظر سے بچا نہیں رہا۔

ایک سمندر ہے کہ پڑا لہریں لے رہا ہے اس کے ساحل پر جو چند چمکدار کنکریاں پڑی ہیں اُن میں سے آج چند میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے اُن آبدار موتیوں کا کچھ اندازہ ہوسکے گا جو اس سمندر کی تہہ میں مستور ہیں مجھے اس کا افسوسناک اعتراف ہے کہ ان چمکیلے سنگریزوں سے جو میں پیش کر رہا ہوں مولانا کی ادبی خدمت اور ان کی عظمت پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ تاہم ان کی حیات ابدی کا ایک پہلو ان سے اُجاگر ضرور ہوتا ہے اور یہ پہلو ہے:۔

علامہ راشد الخیری کے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر

علامہ راشد الخیری کی تحریروں میں نازک خیالی و رنگین بیانی کا عنصر بہت نمایاں ہے شاعرانہ نثر (یا جسے نثر شاعری بھی کہہ سکتے ہیں) کے نمونے علامہ مرحوم کے ہر مضمون میں نظر آتے ہیں۔ خوبصورت الفاظ چچے تُلے جملے ان پر دلّی کی ستھری سُتھری زبان مُستزاد۔ جو بات کہتے ہیں ایسے ڈھنگ سے کہتے ہیں کہ دل میں کُھب جاتی ہے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایک نوع کی موسیقی ہوتی ہے جو پڑھنے والے کی توجہ کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مولانا شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اُسے کلام موزوں کی صورت میں نہیں بلکہ موزوں ترین الفاظ میں ادا

کر دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہی لطف آتا ہے جو کسی اچھے شعر کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔
بعض مضامین میں یہ شعریت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ نظم و نثر کی سرحدیں ملجاتی ہیں اور پڑھنے والے پر وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

"منازل السائرہ" میں مولانا نے تمثیلی پیرایہ بیان میں حیات انسانی کی چار قلمی تصویریں پیش کی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی چابکدست مصوّر اپنے مُوقلم سے یہی تصویریں بنانے بیٹھتا تو اتنا کامیاب نہ ہوتا جتنا کہ مولانا کامیاب نظر آتے ہیں "عالم شیر خوارگی" کی ایک جھلک دیکھ لیجئے:-

"یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں باد بہاری کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمین چمن کو بوقلموں کر رکھا تھا شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیئے تھے۔ باد صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھرتی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہنستے بولتے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُمیدوں نے اُن کے چہرے مالا مال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ ارمانوں کے قدرتی چشمے کشتِ اُمید کو تر و تازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حد خیال تک چپّہ چپّہ اور ذرّہ ذرّہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسط چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ ایک بے فکری کا زمانہ تھا۔ مسافر وہی چھوٹے چھوٹے بچے' بھوک لگی کنارے پر آئے منہ جھکایا اور سیر ہو گئے"

بچپن کی بے فکری کی اس سے بہتر تصویر الفاظ میں کھینچنی مشکل ہے۔ ہر زبان کی شاعری میں بچپن کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ ورڈز ورتھ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ "بچپن میں ہمارے چاروں طرف جنّت ہوتی ہے" مولانا نے بھی جو نقشہ کھینچا ہے اسے ہم جنت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں ع

یہی نقشہ ہے دلے اس قدر آباد نہیں

اب ان بچوں کے محافظ یعنی ان کے والدین کی کیفیت بھی دیکھ لیجئے:-

"کیسے اچھے لوگ تھے کہ سو جان سے نثار۔ ذرا سا فرکے پھانس لگی اور بے چین ہوئے۔ ان لوگوں کی پیشانیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں اور ان کے دل برکت کے نور سے معمور۔ محبت کا سُرمہ ان کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا اور خدمت گزاری کی روشنی ان کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا۔ ریا کا کام نہ تھا۔ خالص محبت تھی اور سچّی خدمت۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک سے دریغ نہ کرتے تھے"

باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کی کیسی مُنہ بولتی تصویر ہے! شیر خوارگی کا زمانہ گذر گیا اور بچپن کا زمانہ آ گیا۔ یہ بھی بے فکری کا دور حیات ہوتا ہے۔ اسے مولانا نے "سرائے طفولیت" موسوم کیا ہے اور اس منزل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ایک مختصر اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"بغض و حسد کا گذر نہ تھا۔ فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عُسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی وہ رفع اور جو خواہش ہوئی وہ پوری۔ اُن کی بھولی بھالی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمان سے انصاف کے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغبان خوشی و خورّمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے۔ کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چُنے ہوئے۔ آرام و آسائش کی جھلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی

غرض ہر قطعہ گلزارِ ارم بنا ہوا تھا۔"

بچپن اور لڑکپن ختم ہوتا ہے اور ہستی کا مسافر سرزمین شباب پر قدم رکھتا ہے۔ شباب انسانی زندگی کا دورِ نشاط ہوتا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان اس عمر میں بے پیئے مست رہتا ہے۔ ہر چیز میں زندگی، ہر چیز میں جوانی نظر آتی ہے۔ بُرے بھلے میں تمیز کرنے کی صلاحیت تو پیدا ہو جاتی ہے مگر انسان حقیقت سے آنکھیں چُراتا ہے اور واقعات سے نظریں بچاتا ہے۔ مزاج میں ایک فاتحانہ انداز ہوتا ہے۔ ایک ترنگ ہوتی ہے کہ ہر چیز پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حوصلے بڑھے ہوئے، ارادے اونچے، اُمیدیں اور آرزوئیں آگ کی طرح دہکتی ہوئی۔ آنکھوں پر بے پروائی کا پردہ پڑا ہوا۔ انجام سے بے خبر۔ اپنی دُھن میں مست اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے۔ ایسی جوانی کو مولانا نے زندگی کی تیسری منزل قرار دیا ہے اور اسے "چمنستان شباب" موسوم کیا ہے۔ اس کی پوری بہار تو آپ کو اُسی وقت نظر آئے گی جب آپ اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھیں گے۔ میں تو ذیل میں باغ جوانی کی صرف چند شگفتہ کلیاں پیش کر سکوں گا :-

"غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے پھولوں میں شہد کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں۔ بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف مگر پینے میں زہر ہلاہل۔ چور قزاق گرہ کٹ اٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور اپنے فن کے ایسے کامل و ہشیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو بات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بیخود و سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں مگر ہر تصویر ایک دام تزویر تھی۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ اور برتنے میں کچھ اور۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیّت ملی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاک کا جنگل کوسوں دور چلا گیا تھا صحرائی جانور ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں کی خوفناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیے بسا اوقات اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے مُنہ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا ادھر سے جاتا تھا۔"

مولانا اسی طرح اس خطرناک منزل کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ یہ منزل جس قدر دلکش ہے اسی قدر پُرخطر بھی ہے۔ ذرا چُوکے، اور مارے گئے۔ قدم قدم پر ٹھوکر ہے اور خطرہ ہر لحہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور ہوائے نفسانی نے غلبہ پا لیا۔ مولانا نے "چمنستان شباب" کی سیر کچھ اس طرح سے کرائی ہے کہ اس پر مفتوں ہو جانے کے بجائے جی ڈرنے لگتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک ناصحِ مشفق کی طرح مولانا آپ کے ساتھ ساتھ اس خوشنما گلزار میں سے گزر رہے ہیں اور اس کی ہر خوبصورت چیز جو دھوکا دینے والی ہے اُس سے آپ کو آگاہ کرتے جاتے ہیں۔ دیکھنے والا کسی خوش رنگ پھول کو دیکھکر اس پر ریجھ جاتا ہے مگر مولانا اُس زہریلے کیڑے کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں جو اس میں چُھپا بیٹھا ہے۔ لذائذ دنیا اور ہوائے نفس کے خوفناک ردِعمل کو مولانا نے تمثیلی پیرایہ بیان میں اُجاگر کیا ہے تاکہ زندگی کے صراطِ مستقیم سے نوجوان آگاہ ہو جائیں۔

ورڈز ورتھ کہتا ہے کہ "بڑھتے ہوئے بچے پر قید خانے کے سائے پڑنے لگتے ہیں"۔ لڑکپن کی حدود سے قدم باہر نکلا اور سرزمین شباب میں داخل ہوتے ہی انسان مکروہات دنیا میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے آزوقہ کی تلاش

ہوتی ہے ۔ماں باپ نے پال پوس کر پروان چڑھایا ۔ اب اپنا پیٹ خود پالنے کی فکر ہوتی ہے اور اپنے ساتھ لوحقین کی روزی کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے ۔ مختصر یہ کہ فکر معیشت دامنگیر ہوتی ہے مولانا کے الفاظ میں اس منزل کا حال سُن لیجئے :۔

"چمنستانِ شباب سے ملاہی ہوا ایک شہر معیشت آباد بسا ہوا تھا ۔ زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز رنج و فکر میں ڈوبی ہوئی ۔ مرد مغموم عورتیں متفکر ۔ غرض جو تھا بڈھا ہو یا جوان حیران و پریشان ...... آبادی بے شمار تھی مگر ہر ایک اپنے دُکھ درد میں گرفتار تھا ۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا عنایت ایزدی شامل حال تھی ۔ صاحب اولاد تھے فارغ البال تھے ، مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے غفلت و مسالمت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھسی ہوئی اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے ۔"

مولانا کی ساری زندگی طبقہ اُناث کی فلاح و بہبود کی تدبیریں سوچنے میں گزری اور جب تک زندہ رہے مسلمان عورتوں کے جائز حقوق دلوانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے ۔ مولانا ہندوستانی صنف نازک کے ایڈوکیٹ تھے اور جس شفقت و محبت سے مولانا نے اس بے زبان طبقہ کی خدمات انجام دیں اس کی مثال دیگر اقطاع عالم میں بھی ملنی مشکل ہے ۔ مسلم خواتین میں آج جو آپ بیداریٔ احساس دیکھ رہے ہیں اس میں سب سے زیادہ حصّہ مولانا ہی کا ہے ۔ مسلمان عورتوں کی زبوں حالی و مظلومیت پر مولانا کے دُکھ بھرے دل نے ایک دو سال نہیں پورے چالیس سال تک مسلسل خون کے آنسو بہائے مگر یہ خونین آنسو صرف دامن میں جذب ہوکر نہیں رہ گئے بلکہ ان کے جلو میں ایک ایسی بہار رنگین آئی کہ عورتوں کا خزاں زدہ ریاضِ زندگی پھل پھول کر مہک اٹھا ۔

"معیشت آباد" میں مولانا نے ایک محلّہ سسرال پور دکھایا ہے جس میں عورت کی ہستی بحیثیت بہو کے پیش کی گئی ہے اس محلہ میں انہیں دو گلیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ ایک کا نام "مظلوموں کی گلی" ہے اور دوسرے کا نام "زباں درازوں کا کوچہ"۔ "مظلوموں کی گلی" کی تھوڑی سی کیفیت سُن لیجئے اس میں :۔

"سب کی سب بیچاریاں دُکھیاریاں آفت کی ماریاں بھری ہوئی تھیں ...... رحم کی آنکھیں اُن کی حالت پر آنسو بہاتی تھیں ۔ اور ہمدردی کا کلیجہ اُن کی داستان مصیبت پر پاش پاش ہوتا تھا ۔ ساس نندوں نے انکے کلیجے چھلنی کر ڈالے نا اُمیدی نے اُن کی عمروں کا خاتمہ کر دیا ۔"

مگر یہ شریف زادیاں تھیں جنکا مقولہ ہوتا ہے "مرنا بھرنا" صبر و شکر کرتیں اور ہر وقت سر تسلیم خم رہتا ۔ سینکڑوں ظلم ان غریبوں پر توڑے جاتے مگر حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ آتا ۔ ان کے جابر و خدا ناترس شوہروں کا یہ حال کہ :۔

"ظلم کا پیشہ کرتے تھے ، قزاقی کی دُکان کھولے تھے ۔ دل آزاری اُن کا طرز عمل تھا ۔ لوٹ مار اُن کا اصول ہر ایا مال تاکنا اور آنکھ بچتے ہی لے بھاگنا ہُنر سمجھتے تھے .... گھر کی نعمتیں چھوڑ کر بازاروں میں بھیک مانگتے .... ان مظلوم بے زبانوں کو اُلٹی چھری سے حلال کرتے ۔"

اب "زباں درازوں کے کوچہ" کی تصویر بھی دیکھ لیجئے ۔ یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے ۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ مولانا عورتوں کی بیجا حمایت نہیں کرتے تھے ۔ جہاں شفقت سے ان کی طرفداری کرتے تھے وہاں اُن پر بسا اوقات سختی سے نکتہ چینی بھی کرتے تھے ملاحظہ ہو :۔

"زندگی کے غرور نے ان کے مزاج آسمان پر چڑھادئے تھے ۔ شرم وحیا کا پانی اُن کی آنکھوں سے ڈھل گیا تھا ۔ غیرت وحمیت کوسوں دور بھاگ گئی تھی ۔ خاندان کی لاج ان کے پاس آتے ہوئے ڈرتی تھی ۔ ہنر وسلیقہ اُن کی صورت سے خوف کھاتا تھا ۔ ان عقل کی دشمنوں نے اپنے کوتکوں سے اپنی اور اپنے ساتھ والوں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی ۔"

جوانی ڈھل گئی اور زندگی کا پچھلا پہر آ پہونچا ۔ کاروانِ حیات آخری منزل طے کرنے لگا ۔ عہدِ شباب ختم ہوا اور دورِ کہولت شروع ہوا ۔ سیاہ بھونرا سے بال دُھنکی ہوئی روئی کے سفید گالے بن گئے ۔ سر نے ہل ہل کر کہنا شروع کیا کہ یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ۔ چہرے کی سُرخی کی جگہ زردی کھنڈ گئی ۔ جھریوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ جامۂ ہستی چُنا گیا ۔ سرو سا قد بیدِ مجنوں کی طرح جھک گیا ۔ ساری عمر کا بوجھ سر پر رکھا گیا ۔ پاپوں کی گٹھری اتنی بھاری نکلی کہ کمر دوہری ہوگئی اور اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے قبر کی تلاش ہونے لگی ۔

اس منزل کو مولانا کی نظر سے دیکھئے :۔

"چمنستانِ شباب کے اُس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا ضعیفی کی کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر لوگ پار اُترنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ موجوں کے تھپیڑے ۔ پانی کے گرداب ۔ پہاڑوں کی چٹانیں ۔ بادِ مخالف کے جھوکے دھارے کے سامنے مشکل سے آنے دیتے تھے ۔ غفلت ولاپروائی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ۔ مسافروں کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھولکر نہ آتا تھا ۔"

اڈیسن نے "مرزا کا خواب" اس طرح لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دنیا کی بے ثباتی آنکھوں کے آگے آجاتی ہے زندگی کی تمثیل اس طرح پیش کی گئی ہے کہ ایک پُل ہے جس کے دونوں سرے کُہر میں چھُپے ہوتے ہیں یہ گویا ہستی کا پُل ہے جس پر سے جمِ غفیر گذر رہا ہے ۔ اس کے نیچے نیستی کا سمندر لہریں لے رہا ہے ۔ پُل میں چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے رخنے ہیں جن میں سے رہرو گرتے جاتے ہیں یا ان سے بچکر گزر جاتے ہیں ۔ پُل پر خوفناک پرندے تاک لگائے بیٹھے ہیں ۔ ذرا کسی رہرو کے قدم ڈگمگائے اور ان پرندوں نے جھپٹ کر انہیں شکار کیا وہ جو ان تمام مصائب وآلام سے بچکر پُل پر سے زندہ سلامت گزر گئے اُن کا حشر بھی معلوم نہوا کہ جو گیا پھر نہیں لوٹا ۔ آنے سے پہلے کیا تھا اور جانے کے بعد کیا گزری کچھ معلوم نہیں ۔

سُنی حکایت ہستی تو بیچ میں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اسی خواب سے کچھ ملتا جُلتا "سفرِ حیات" ڈاکٹر جانسن نے بھی لکھا ہے جس میں زندگی کو ایک دریا سے تشبیہ دی ہے اس دریا میں کشتیاں پڑی ہوئی ہیں اور ان کشتیوں میں ہر قسم کے لوگ سوار ہیں ۔ دریا میں تہ آب چٹانیں ہیں جن سے ٹکرانا گویا موت کے مُنہ میں جانا ہے ۔ مہیب ناک بھنور ہیں جن میں پھنس جانا ہلاکت کی آغوش میں جذب ہو جانا ہے ۔ غرض یہ سفرِ حیات بھی انسانی زندگی کا ایک طویل استعارہ ہے اور سچ یہ ہے کہ بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے ۔ مگر علامہ راشد الخیری نے ان دونوں مغربی انشا پردازوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور زندگی کی لامتناہی وسعت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے ایک چھوٹی سی تصویر ہی میں محدود نہ کر دیا جائے بلکہ کم ازکم اس کے ہر نمایاں پہلو کی ایک

جداگانہ تصویر بنائی جائے اور بمصداق ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

علامہ راشد الخیری نے اس اہم ترین موضوع پر قلم اُٹھایا اور اپنی انشا پردازی کا پورا زور اس پر صرف کر دیا۔ زندگی کی تمام منزلوں کو انہوں نے شاعر کی نگاہ سے دیکھا اور مصوّر کے موقلم سے رنگا ہے۔ ثبوت کے لئے آپ دُور نہ جائیں۔ صرف اُن اقتباسات ہی کو دیکھ لیں جو بطور مشتے نمونہ از خروارے گذشتہ اوراق میں پیش کئے گئے ہیں اور ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"حیات ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے، ہوس و ارمان کے میٹھے ترانے سُنتے چلے جاتے تھے۔ اختتام سفر کا کوئی وقت معیّن نہ تھا۔ زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے۔ اور دنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا۔ انجام پر نظر نہ تھی۔ غرور کا سودا دماغوں میں سمایا تھا۔ طمع زردست شفقت پھیر رہی تھی۔ ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے کہرے نے کوسوں تک تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ناپائیداری دنیا کا ابر تُلا ہوا سروں پر کھڑا تھا مگر ہٹ دھرمی اور خود پسندی کی خوبصورت دیبیاں آنکھ اٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔ مکروفریب کے گھڑیال مُنہ کھولے بیٹھے تھے۔ اتلافِ حقوق کے بھنور جا بجا پڑ رہے تھے۔ مگر یہ اُمید کے بندے ہمچو من دیگرے نیست کے نعرے مار رہے تھے۔"

حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور خوفناک نتائج سے مُنہ پھیر لینا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ خود فریبی اور جھوٹی تسلّی دیکر انسان اپنے قلب کو مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؏ 　　مردِ آخر بیں مبارک بندہ است

مگر کتنے ہیں جو نتائج پر غور کرتے ہیں، کتنے ہیں جو عواقب پر نظر رکھتے ہیں، ہوش اُس وقت آتا ہے جب کوئی ٹھوکر لگتی ہے اور آنکھیں اُس وقت کھلتی ہیں جب پانی سر سے گزر چکتا ہے:۔

"ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جو ڈوبا وہ اس نتیجہ کا سزاوار تھا۔ مجھکو کوئی کھٹکا نہیں۔ دوسری کشتیوں کی تباہی دیکھکر ہنستے تھے اور جب اپنے اُوپر آ کر پڑتی تھی تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔"

خود کردہ را علاجے نیست۔ مکافات کا عمل دنیا میں جاری ہے۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ بدی کی سزا ملکر رہتی ہے۔ انسان گویا اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارتا ہے اور پھر سوائے تاسف و ندامت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت؟:۔

"دریائے اختلاط میں ایک جزیرۂ ندامت نظر آیا۔ چند نیک صورت بزرگ پھونس کی جھونپڑیاں ڈالے سرنگوں بیٹھے تھے۔ اُن کی سپید ڈاڑھیاں اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہوئے تھے مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں اور گٹّے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنگ کا ٹیکا

چمک رہا تھا۔ افعال گذشتہ کا تأسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ از فرق تا پا عرقِ خجالت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔"

یہ وہ ہستیاں تھیں جو زہد و اتقار کے لباس میں مکر و فریب کی تجارت کرتی تھیں۔ ان کے مقدس چہرے گمراہ کرنے والے اور ان کی نورانی ڈاڑھیاں دہوکہ کی ٹٹیاں تھیں۔ یہ بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے بھیڑیے تھے۔ یہیں عورتوں کی ایک بھیڑ بھی نظر آتی ہے اور یا یں ہئیت کہ :۔

"بغض و حسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا۔ نخوت و غیبت کے تیل سے سر گندھے ہوتے۔ کذب و افترا کا زیور پہنے ہوئے۔ نافرمانی کا جھومر لٹکا ہوا۔ شرک و بدعت کے پھول بھرے ہوئے۔ مکر و فریب کا تکیہ لگائے ہوئے۔ حیاتِ ابدی کا پٹا لکھائے ہوئے۔ تن تن کر اپنے حسن و صورت کو دیکھ رہی تھیں۔"

جاہل و کم عقیدہ عورتوں کی تصویر ہے۔ جس کی جیتی جاگتی مثالیں آج بھی آپ کو اکثر مسلمان گھرانوں میں مل سکتی ہیں مولانا نے اسی جہالت پر چالیس سال تک اپنے آنسو بہائے ہیں۔ اس زبوں حالی پر خود روئے ہیں' اوروں کو رلایا ہے۔ کہیں محبت سے سمجھایا ہے' کہیں سختی سے ٹوکا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا کے ہاتھوں بہت کچھ اصلاح ہوگئی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

بڑھاپے کے بعد وہ منزل آتی ہے جس کے آگے کسی کو نہیں معلوم کہ کیا ہونا ہے۔ موت آنکھیں بند کرتی ہے منزلِ عدم دکھائی دیتی ہے :۔

"اس سے ملی ہوئی سرحدِ عدم آباد تھی جس کی پختہ و سنگین فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ بلندی کا یہ حال تھا کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ وسعت و رفعت کی یہ کیفیت کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی۔ مسافروں کو لوگ پھاٹک تک پہونچا سکتے تھے آگے کا حال کچھ معلوم نہ ہوسکتا تھا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات مولانا کی صرف ایک کتاب "منازل السائرہ" میں سے پیش کئے گئے ہیں۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ ساری منزلوں کے صرف اقتباسات جب اس قدر دلکش ہیں تو پوری کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ اور ایک اسی کتاب پر کیا منحصر ہے' مولانا کی ہر کتاب میں جراحتِ دل کے لئے سینکڑوں نشتر پنہاں ہیں۔ یہ زندگی کی ایک دلچسپ کہانی تھی اس لئے میں نے بھی اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے ع لطیف بُود حکایت دراز تر گفتم۔ لیکن پھر بھی ع
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آجکل ایک نئی وضع کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں اور انہیں عُرفِ عام میں "ادبِ لطیف" کہا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ سارا مضمون پڑھ لینے کے بعد اگر یہ غور کریں کہ لکھنے والے نے کہا کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ کچھ بھی نہیں۔ چند بے معنی جملے ہوں گے جنہیں کسی پر جان دیدینے کی دہمکی ہوئی۔ کچھ جدائی کا رونا ہوگا اور کچھ ملاقات کی آرزو۔ چند سوالیہ نشان ہوں گے۔ چند حیرت و استعجاب کی علامات۔ چند دادین اور بے شمار نقطے اور طویل خطوط۔ ان سب کے مجموعے کو ادبِ لطیف کہا جاتا ہے اور جسے کچھ لکھنا نہیں آتا وہ ادبِ لطیف لکھتا ہے اور اُردو کا ستیاناس کرتا ہے۔ علامہ راشد الخیری اس قسم کے مضامین کو "عیاشی کا اشتہار" کہا کرتے تھے واقعہ بھی یہ ہے کہ جتنے حیا سوز مخربِ اخلاق

نقرے ایسے مضامین میں لکھے جائیں اُتنے ہی یہ مضامین کامیاب کہلاتے ہیں۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ اس ادبِ لطیف کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کا موجد کون تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ اُس رنگین نثر کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے مبشر و شرر تھے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری نے ایک نئے ادب کو فروغ دیا جسے ہم نثرِ شاعری کہہ سکتے ہیں۔ خلیقی دہلوی اور لطیف احمد اکبر آبادی بھی اسی اسکول کے نمائندے بنے۔ اس اسکول کے لکھنے والوں کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی اچھوتے خیال کو حسین پیرایۂ بیان میں پیش کرتے ہیں۔ کم فہم اس کی روح کو فراموش کر بیٹھے اور اس کے ظاہر پر مرمٹے اور اس کی صورت مسخ کر کے اپنا ادبِ لطیف بنا لیا۔

علامہ راشد الخیری کے پہلو میں ایک شاعرانہ دل دھڑکتا تھا۔ "روداد قفس" ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہی شعریت ان کے ہر مضمون میں جھلکتی ہے۔ مولانا نے وقتاً فوقتاً مختصر ادبی مضامین بھی لکھے ہیں اور انہیں ہم صحیح معنوں میں ادبِ لطیف یا نظم منثور کہہ سکتے ہیں۔ ان میں لغویت کا شائبہ تک آنے نہیں پایا ہے "قلبِ حزیں" ان مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے "بہارِ شب" کا ایک منظر دیکھئے:۔

"گرمیوں کے دنوں میں، جب کائنات نے رات کا خاموش لباس پہن لیا تو پہاڑ کی چوٹی سے چاند نے جھانکنا شروع کیا۔ چاندی کے ورق ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ ہوا اِدھر اُدھر اچھلتی پھرتی تھی۔ مگر بلبل کی خاموشی اور وداعِ آفتاب نے فضاءِ عالم میں ایک سناٹا پیدا کر دیا تھا۔ آبشار کی سنہری بانسری جو چمن سے دُور بج رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنی میٹھی تانوں سے درختوں کو چونکا دیتی تھی اور پھر دنیا سنسان ہو جاتی تھی۔ رات قدرت کے آبِ رواں میں غسل کر رہی تھی۔ یاسمین و گلاب پھریریاں لے لیکر پانی کے قطرے موتیوں کی صورت میں کائنات دہر پر نثار کر رہے تھے۔"

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کا تعلق دُنیا سے رہتا ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مولانا نے کسی شکستہ اور بوسیدہ قبر پر ایک پھول کھلا دیکھا اور ان کی شاعرانہ آنکھ نے کچھ اس سے بھی زیادہ دیکھا:۔

ایک سفید قبر پر جو نافرمانی کی بیلوں سے چھپی ہوئی تھی اور صنوبر کے درخت چاروں طرف حلقہ کئے ہوئے تھے، آدھی رات کے وقت گلاب کی ایک کلی پھول بنی۔ یہ پھول اس مہ جبین کا عکس تھا جو اس خانقاہ کے اندر ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔"

بعض دفعہ انسان سے نادانستہ طور پر ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جس کا اثر دوسروں پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اس خیال کو مولانا نے ایک لطیف تمثیل میں بیان کیا ہے:۔

"جب بانسری کا نغمہ ہوا میں فنا ہو رہا تھا تو سرسرانے والے پتوں نے دیکھا کہ کالی ناگن پان کی بیل سے لہراتی ہوئی نکلی۔"

"یہ ستارۂ موسیقی سیاہ ناگن نغمہ پر وجد کر رہی تھی۔ چاروں طرف دیکھتی تھی مگر اسکی نگاہ منزلِ مقصود سے بہت دُور تھی۔ گڈریئے کی بانسری کا نغمہ ہوا میں تیر رہا تھا۔ اُس نے کائنات کا تبصرہ کیا اور ہوا کی گود میں دم توڑ دیا۔

ناگن آگے بڑھی مگر اب جنگل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے محبوب کو چاروں طرف ڈھونڈھ رہی تھیں۔
مگر سنگدل گڈریا اس سے بے خبر ہو کر کہ اُس نے ناگن کے سمندر حیات میں کیا تلاطم پیدا کر دیا ایک ٹوٹی سی قبر پر
بیٹھا اپنے مویشیوں کا انتظار کر رہا تھا۔"

زندگی و موت کا مسئلہ ہمیشہ سے زیر غور رہا ہے مگر یہ اُلجھی ہوئی گتھی کسی کے سُلجھائے نہ سُلجھی موت کے متعلق طرح طرح سے قیاس
آرائیاں کیجا چکی ہیں۔ مولانا نے بھی ایک جگہ شاعرانہ توضیح کی ہے۔ پہلے وہ فضا اور ماحول پیدا کیا ہے جو موت کے گرد ہوتا ہے مصور غم
سے بہتر اس کی تصویر اور کون اُتار سکتا ہے۔ اس کے بعد میت اور پس ماندگان کی کیفیت بیان کی ہے:۔

"ہوا کی موسیقی بند ہو گئی۔ پتوں کی رفتار رُکی اور پرندوں کا نغمہ تھا۔ ایک متفقہ آواز گونجی۔ آنسوؤں کے چند نطرے بعض
رخساروں نے اپنی گود لئے۔ نیلگوں آسمان نے آفتاب کا جنازہ شفق کی آغوش میں رکھا اور موت کی خطرناک تصویر ہر سمت
نظر آنے لگی۔

اب وہ وقت آیا کہ وہ شخص جو آج تک زندہ تھا اس کے واسطے زندگی کا ہر قانون بے کار ہو جائے۔
کچھ الفاظ کے ساتھ جو آواز بلند پڑھے گئے' ایک جسم قبر میں اُتار دیا گیا۔ خاموشی کا لمحہ ابھی چھایا ہوا تھا کہ رونے والوں کے قہقہے
نے فلسفۂ موت کو حل کر دیا۔"

"وداع خاتون" میں مولانا نے ایک جگہ رازق دُلہن جنت مکانی کی زندگی کو ایک پودے سے تشبیہ دی ہے اور چند جملوں
میں مرحومہ کی زندگی اور موت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ "کسے خبر تھی کہ اس پودے کا پہلا پھول زینت عروس بنے گا اور آخری
پھول آرائش قبر۔"

"پودا ہوا میں تیر رہا تھا۔ عالم سنسان میں جب چمن پھولوں کے ٹھنڈے سانسوں سے گونجتا ہے۔ آبشار تھک کر خاموش
ہو جاتے ہیں تو ایک متحیر بلبل سرو سے اُڑ کر آتی ہے مطالعۂ گل میں محو ہوتی ہے اور چیخ مار کر اُڑ جاتی ہے۔ پودا فرض اولین ادا کر چکا اس کے
پہلے پھول نے انسانی پودے کو دُلہن بنا دیا۔ پھول مرجھا گیا کسی نے نہیں دیکھا۔ پتیاں فنا ہو کر ہوا میں مل گئیں۔ کسی کو خبر نہیں۔ مگر
ابھی آخری پھول کو بھی کچھ کرنا ہے۔ وہ اس دُلہن کے کفن کو معطر کریگا۔ اس لئے پودا پل رہا ہے بڑھ رہا ہے سنبھل سنبھل کر جھل جھل"

محبت دنیا کا سب سے بڑا جذبہ اپنے اظہار کے لئے طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتا ہے ہر صورت نرالی ہوتی ہے۔ کہیں ایک خلش
مسلسل کی صورت اختیار کرتا ہے اور کہیں آگ بن کر خرمن ہستی کو پھونکے ڈالتا ہے۔ شیفتہ نے اسے "ایک آگ سی ہے سینے
کے اندر لگی ہوئی" سے تعبیر کیا اور غالب نے اس آگ کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے" غرض یہ
عالمگیر جذبہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے کارفرما ہے اور رہتی دنیا تک دائم و قائم رہے گا۔ مولانا راشد الخیری نے "سودائے نقد" میں
ایک کنواری لڑکی کی ذہنی کیفیت پیش کی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے فطرت انسانی کو کھنگال ڈالا تھا اور
ماہر نفسیات تھے۔ بے زبان طبقہ اناث کی حمایت مولانا کی زندگی کا فرض اولین تھا۔ اس مظلوم و مجبور جزو اعظم کی مظلومیت کی
داستان مولانا نے ساری عمر سُنائی یہاں تک کہ سنگدل مرد کا دل پسیج گیا۔ عورتوں کو اُن کے جائز حقوق بہت کچھ مولانا نے
دلوائے۔ اس لحاظ سے اگر انہیں عورتوں کا محسن اعظم کہا جائے تو بجا و درست ہے۔ دیکھئے کس سلیقے سے عورتوں کی حمایت میں
لب کشائی کرتے ہیں اور "تفسیر عصمت" میں ایک عیسائی خاتون کی زبانی کس عمدگی سے مسلمان مرد کے مظالم بیان کرتے ہیں:۔

"اگر میرے کان دھوکہ نہیں دیتے تو میں آج بھی بندھیاچل کی خاموشی اور ہمالیہ کے سکوت میں اس مرثیہ کے الفاظ سُن رہی

جو پتھروں سے ٹکرا کر ننا ہو رہے ہیں۔ اگر میری آنکھ صحیح ہے تو مجھے اسوقت بھی گنگا کی روانی اور جمنا کے بہاؤ میں اُن بدبخت عورتوں کی تصویر نظر آرہی ہے جو مردوں کے مظالم سے زندہ درگور ہوئیں۔ آگرہ کا تاج محل تمہاری نگاہ میں محبت کا ایک لازوال خزانہ ہے اور ایسے جواہرات سے جگمگا رہا ہے جن کی روشنی کائنات کو مزین کر رہی ہے مگر میری نگاہ میں دریا کی ان لہروں کے آئینہ میں جو ہر روز بلکہ ہر لمحہ تاج محل کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں بادشاہ کی اُن بیویوں کی صورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں جو محبت کے شاہی انعام سے محروم رہیں۔"

غم کی تصویر کشی تو علامہ راشد الخیری کی ودیعتِ خاص ہی تھی اور لٹریچر میں اس میدان میں اُن سے بازی کوئی نہ لیجا سکا مگر مولانا کے ہاں مزاح لطیف کی کمی بھی نہیں ہے۔ ان کے بعض مضامین میں کہیں کہیں ایسے پُرلطف جملے آجاتے ہیں جن سے پڑھنے والے کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار لب آشنائے خندہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا کی تحریر کی آفرین اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب چاہتے ہیں رُلا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ہنسا دیتے ہیں۔ فطرتاً مولانا بہت ہی بذلہ سنج اور طبعاً نہایت خوش مزاج تھے۔ ان کی ہستی میں تو متضاد صفات جمع ہو گئی تھیں۔ تقریر میں چھوٹے چھوٹے چٹکلے ایسے سناتے جاتے تھے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تعجب سے ان کی طرف دیکھنا پڑتا تھا کہ کیا یہی وہ علامہ راشد الخیری ہیں جن کی جنبشِ قلم سنگدل سے سنگدل انسان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا خراج لے لیتی ہے۔ اور کثرت سے کثرت آدمی کی بھی ہچکی بندھوا دیتی ہے۔ مولانا کی یہی طبعی ظرافت ان کے بعض مضامین میں بطورِ خاص نمایاں ہو گئی ہے ورنہ انہوں نے بالقصد کبھی کوئی ہنسانے والی کہانی نہیں لکھی۔ اس کے باوجود مولانا کی دوکتابیں "نانی عشو" اور "ولایتی ننھی" ظرافت وخوش مذاقی کے دو نادر نمونے ہیں۔ ان میں ذہنی انبساط کا وافر سرمایہ ہے۔ بعض جگہ قہقہے بھی ہیں۔ مگر بیشتر مواقع تبسم کے ہیں اور یہی سنجیدہ ظرافت اور ظرافت نگاری کا کمال ہے کہ ہنسی کی بات غیر محسوس طریقے سے پڑھنے والے کے پہلو کو گدگدانے لگے۔ ظرافت ومزاح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پڑھنے والوں کو مار مار کر ہنسنے پر مجبور کیا جائے۔ ایسی بھونڈی ظرافت پر ہنسی آنے کی بجائے ظرافت نگار کی حماقت وبیچارگی پر ہنسی آتی ہے۔ مولانا کی تحریریں شاہد ہیں کہ وہ ایک ماہر نفسیات تھے، اس لئے تصویرِ غم جس عمدگی سے پیش کرتے تھے اُسی خوبی سے تصویرِ ظرافت بھی اتارتے تھے۔ شادی کے رقعے آپ نے بہت دیکھے ہوں گے مگر ذرا ننھی خانم کی شادی کا رقعہ بھی دیکھ لیجئے اس میں مزاح لطیف کے ساتھ ساتھ طنزِ ملیح کی بھی جھلک ہے۔ عجیب وغریب چیز ہے جو براہِ راست عضلاتِ خندہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

"عاجزہ بے بدل ننھی خانم بنتِ میاں آدم کا عقدِ نکاح بطفیل تنبیہہ اعظم ساتھ مولوی صمد ولد ولم یولد کے کل دن جمعہ بیچ عصر مغرب کے بھائی زلفو کے خیڈ وخانہ میں مقرر ہوا ہے۔ دعوتِ ولیمہ نکاح سے گھنٹہ بھر پہلے، ٹھیک تین بجے دن کے مسجد میں بیچی کھیلوں اور چھلے ہوئے چنوں پر ہو گی۔ عاشقانِ قرآن وحدیث سے اُمید ہے کہ اس قومی خدمت میں جان لڑا دیں گے اور اسلام کی عزت رکھ لیں گے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے ہمراہ دولہا دلہن کا منہ میٹھا کرنے کے واسطے تھوڑی تھوڑی مٹھائی عنداللہ اپنے ہمراہ لا کر جنت میں محل بنوائیں اور سُنتِ رسول کو ایسی رونق دیں کہ فرنگی بھی دنگ رہ جائیں۔ اُمّتِ مرحومہ اور خواہرانِ ملت کو علم ہے کہ اس کنیز کی تمام عمر قوم کی خدمت میں بسر ہوئی۔ اس لئے عاجزہ کا جہیز جو سنتِ نبوی ہے قوم پر فرض ہے۔ ہر بہن اور بھائی طلائی زیور اور ریشمین لباس سے اعانت فرمائیں۔ عاجزہ بے بدل چونکہ اپنا نکاح خود ہی پڑھائے گی اور بعد نکاح بھتنوں کے فضائل پر وعظ بھی ارشاد کرے گی

اسواسطے حاضرینِ شہر شیرینی کا انتظام ضرور فرمائیں۔" ننھی خانم ۔ بنتِ آدم جنتی ثم سرا ندیپ ۔

جب لال قلعہ آباد تھا اور اس لال حویلی میں مغلیہ خاندان کی آخری شمع جھلملا رہی تھی تو شاہی خاندان کی کیا کیفیت تھی؟ اُس انتہائی دورِ انحطاط میں تیمور یہ چمنستان میں کیسی بہار تھی؟ بہادر شاہ ظفر کے کیا طور طریق تھے؟ شاہی جشن کیسے منائے جاتے تھے؟ دربار کا کیا منظر ہوتا تھا؟ شہزادیوں اور بیگمات کا وقت کس طرح گزرتا تھا؟ اب سے ستر سال پہلے دلّی کی کیا حالت تھی؟ یہاں کے میلے ٹھیلے کیا تھے؟ کون کون سے سیر تماشے ہوتے تھے؟ بادشاہ کی سالگرہ کس طرح منائی جاتی تھی؟ سلونوں اور پھول والوں کی سیر میں کیا کیا ہوتا تھا؟ پھر جب غدر پڑا تو اس شاہی خاندان کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ اور اسکے پروانوں کا کیا حشر ہوا؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا راشد الخیری کی شاعرانہ آنکھ نے یہ سب منظر دیکھے ہیں اور مولانا کا یہ احسان کبھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ انہوں نے اُن سب تاثرات کو "وداعِ ظفر" کی صورت میں قلمبند کر دیا۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور اپنے طرزِ بیان کے اعتبار سے نہایت شاعرانہ چیز ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ موتی اور ایک ایک سطر سلکِ مروارید ہے۔ چراغاں کا سین دیکھئے:۔

" درختوں میں قندیلیں اور قمقمے روشن ہوئے۔ مٹی کے چراغ ڈال ڈال اور پات پات نمودار ہوئے۔ قلعہ کی زمین دلّی کا آسمان بنی ہوئی تھی۔ اُدھر ستاروں کی انشاں تھی اور اِدھر چراغوں کی۔ جدھر نظر ڈالو روشنی ہی روشنی تھی۔ کہیں ابرک کے چوکھٹے تھے کسی جگہ سبز سُرخ کاغذوں کے قمقمے۔ موتی مسجد میں جھاڑ فانوس، دیوانِ خاص میں جھنڈیاں، دیواروں پر قندیلیں، منڈیروں پر دیوے، موم بتیاں، دیواروں میں کنول صحن اور میدان، محل اور دیوان، ہر چیز بقعہ نور تھی۔ روشنی موتیا کی گود میں، لالہ کے گھونگھٹ میں، چنبیلی کے دامن پر، گلاب کے رخساروں پر۔ غرض چمن روشنی کی آگ سے دہک جاتا تھا۔ جھروکے جنہوں نے شاہانِ مغلیہ کے مُنہ چومے خاص انداز سے روشن ہوتے تھے۔ پہلی قطار جھاڑوں کی، اس کے بعد ہنڈیاں طرح طرح کی اور رنگ برنگ کی۔ اس کے آگے کنول۔ اس کے بعد پنج رنگی قلمیں۔ چھجوں پر ننھے ننھے چراغ، چھتوں پر سینیاں۔ غرض چپہ چپہ اور کونہ کونہ روشن ہوتا تھا۔"

اب مینا بازار کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے جو لال قلعہ کی بہار کے ساتھ فنا ہوا:۔

" یہ زنانہ بازار ہے جہاں ہر دکاندار عورت ہے۔ بسنتی دوپٹہ سر پر۔ سواری کی خبر سنتے ہی دکاندارنیوں نے اپنے اپنے دوپٹے سنبھالے۔ رنگ برنگ کے جھنڈے اور جھنڈیاں اُڑ رہے اور لہرا رہی ہیں۔ دو رویہ دکانوں میں گہما گہمی ہو رہی ہے۔ اُجلے اُجلے سفید بابل نیٹ کے پردے دکانوں کے اندرونی حصہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ باہر کیکری کٹاؤ کے گاؤ تکیے، ماہی پُشت کی سوزنیاں۔ رنگ برنگ شے کے گولے، پٹاپٹی کے پردے، مقیش کی جھالریں، گوکھرو کی لڑیاں، غرض مینا بازار کی ہر دکان دُلہن بنی ہوئی ہے۔"

بادشاہ پر فردِ جرم لگائی گئی اور مجرم بنا کر عدالت میں پیش کیا گیا۔ نمکخوار نمک حرام ثابت ہوئے۔ جن پر اعتماد کیا انہوں نے دھوکہ دیا۔ اپنے پرائے ہوئے اور ساری مصیبت اس بوڑھے بادشاہ کی جان پر پڑ گئی۔ جھوٹے الزام لگائے گئے، جھوٹی شہادتیں گزریں۔ بے گناہ بادشاہ ملزم ٹھہرا۔ باغیوں کی کرنی کا پھل اس فقیر بادشاہ کو بھگتنا پڑا۔ اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے سے پہلے آخری تاجدارِ دہلی نے جو تقریر کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے سیاہی سے نہیں بلکہ آنسوؤں سے لکھی ہے۔

اسے پڑھ کر دل خون ہوتا ہے اور کلیجہ کٹتا ہے۔ اسکا آخری حصہ سُن لیجئے:۔

"میں وہ شخص ہوں جسکی بدنصیبی پر تقدیر بھی رونے کا حق رکھتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گزرا۔ جوانی اور بڑھاپا دونوں دُکھ بیٹنے بیٹنے اور رنج سہتے سہتے بسر ہوئے۔ چند روز باقی ہیں وہ بھی نہ معلوم کیا کیا دکھائیں گے۔ جن آنکھوں کی ایک گردش دنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خشک ہوگئے۔ جن ہاتھ امورِ سلطنت کو ایک اشارہ میں زیر و زبر کر دیتے انہوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے ڈھوئے، اور اتنے ڈھوئے کہ اب سکت باقی نہ رہی۔ خاندان شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی۔ مجھ پر اور میرے بچوں پر کڑاکے کے فاقے گزرے۔ کلیجے کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہائے۔ اگر اس کے بعد بھی میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے اور میں اسکے واسطے تیار ہوں"

اور اس ضعیف و نحیف بادشاہ کو پھر بھی مجرم قرار دیا گیا اور اسے جلا وطن کیا گیا۔ دلّی سے کالے کوسوں رنگون بھیجا گیا جہاں آخری وقت تک وہ مقید رہا اور جب مرا تو صرف تین آدمی ایک بیوی اور دو بچے اس کے دم واپسیں میں ساتھ تھے۔ جب بادشاہ کی یہ دُرگت ہوئی تو بھلا شہزادے اور شہزادیاں کس شمار و قطار میں تھیں۔ کتنے ہی قتل ہوئے اور کتنے ہی پھانسیوں پر لٹکے۔ مرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا جو زندہ بچے وہ درحقیقت مرے کہ کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو اُن پر نہ پڑی ہو اور کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو اُن پر نہ توڑا ہو:۔

"بساطِ آسمانی کے سیّاروں زحل و مشتری نے عروسِ فلک کے نوشہ قمر چہار دہم نے، مشرقی شہسوار آفتاب عالمتاب نے، انسانی دنیا کے بہت سے انقلاب دیکھے اور خود شاہجہاں آباد کا خون جو بار ہا گرا آجتک دامنِ تاریخ سے خشک نہیں ہوا۔ مگر عقل سلیم دیوانی ہوگئی، قلبِ صحیح کے پرخچے اڑیں گے اور چشم بینا اندھی ہوجائے گی۔ جب یہ سُنے گی کہ جن دہلیزوں پر پرندہ پر نہ مار سکتا تھا اس کی رہنے بسنے والی خواتین کی قیمت چند روٹیاں یا سیر دو سیر آٹا تھا۔ دل نہیں چاہتا کہ کہوں اور قلم کی زبان پر وہ الفاظ آنے دوں جو قلب کے ٹکڑے اڑا دیں۔ لیکن کہتا ہوں اور رو کر کہتا ہوں کتنا نازک وقت ہے اور متواتر فاقے یہ کیا رنگ دکھلاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے۔ ع تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو"

بہادر شاہ کی بیٹی اس ہڈّے کو پہونچیں۔ کس کس چوچلے سے انہیں پالا گیا ہوگا۔ قدم قدم پر ہاتھوں چھاؤں ہوتی ہوگی اور بات بات اللہ آمیں۔ جنہوں نے عیش و عشرت میں آنکھ کھولی ہو اور شاہی محلوں میں ہوش سنبھالا ہوا نہیں یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔ اور شہزادیوں پر کیا گزری؟ ان کی داستانیں بھی مولانا نے ایک جلد میں جمع کردی ہیں۔ "بیلہ میں ایک میلہ لگا ہے جسمیں "غدر کی ماری شہزادیاں" اپنی اپنی بپتا سُناتی ہیں اور سُننے والوں کو رُلاتی ہیں۔ یہ غمناک داستانیں دل میں چھریاں بن کر اُتر جاتی ہیں۔ غم سے مولانا کو خاص لگاؤ تھا۔ اس کی مصوّری میں مولانا اُستاد تھے۔ بس اب سمجھ لیجئے کہ مولانا نے شہزادیوں کی دُکھ بھری کہانیاں کس طرح سُنائی ہوں گی۔ پتھر کا کلیجہ بھی اگر ہو تو انہیں پڑھ کر پگھل جائے اور ایک آنکھ ساون اور ایک بھادوں بن جائے۔ شہزادی مظفر سلطان بیگم جنہیں فرشِ مخمل پر بھی چلنا دُوبھر تھا، جب غدر پڑا اور یہ نکل کر بھاگیں تو حالت یہ تھی کہ:۔

"بچے بھوک کے مارے بلبلا رہے تھے۔ میں تو خیر دن بھر کی پیاسی اعمال کو بھگت اور تقدیر کو رو رہی تھی، معصوم بچے نہ معلوم کس گناہ میں پکڑے گئے تھے کہ تن کو چیتھڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ پاؤں کے چھالوں میں سے پانی اور ہاتھ کی کھرچوں سے خون بہ رہا تھا مگر دھجّی تک میسر نہ تھی کہ پٹی باندھ دیتی۔ رات جس نے اپنی زندگی میرے بچوں کی رہنمائی کو وقف کردی تھی دم توڑ چکی اور دن ہم خانماں بربادوں کے استقبال کو آگے بڑھا مگر رات کی دیوی کا سایہ ہمارے واسطے نعمت تھا جس نے

اپنا سیاہ لباس دن کو اُڑھا کر کرّہ دنیا پر دھکیلا اس کے خوفناک چہرے میں آفتاب کا کچھ ایسا ذخیرہ چھپا ہوا تھا کہ ننھے ننھے دل دہل گئے۔ یتیم بخار میں لوٹتا ہوا اور فرخ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔"

علامہ راشد الخیری کی مذہبی خدمات کچھ کم نہیں ہیں۔ مذہب کا رنگ ان کی طبیعت پر بہت گہرا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو کہ اپنی اسلامی خدمات کی وجہ سے دلی میں نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود علامہ راشد الخیری ابتداءً ایک واعظ خوش بیان تھے اور آخیر وقت تک خطیب شیریں مقال رہے۔ ان کے اکثر افسانوں اور مضامین میں مذہبی پہلو نمایاں ہے۔ خصوصاً اُن مضامین میں جنہیں انہوں نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ خلع اور وراثت کے حق کے لئے تو وہ ساری عمر خود غرض مسلمان مردوں اور نام نہاد پیشوایانِ دین سے لڑتے رہے۔ قرآن، فقہ اور حدیث کے اچھے عالم تھے اور اسلامی تاریخ پر پورا پورا عبور انہیں حاصل تھا۔ اکثر تاریخی افسانوں اور ناولوں میں مسلمانوں کی عظمت کے کارنامے اُبھار کر دکھائے ہیں۔ افسوس کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں ان کی مذہبی اور تاریخی تصانیف پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ میں یہاں مولانا کی صرف دو کتابوں کا ذکر کروں گا جنہیں سیرت و تاریخ کے بہترین نمونے سمجھنا چاہیئے۔ ایک "آمنہ کا لال" اور دوسری کتاب "سیدہ کا لال" ہے۔

"آمنہ کا لال" مولود شریف کی کتاب ہے اور اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی جسے غیر مذہب والے سُن کر یہ کہیں کہ "واہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے"۔ عام طور سے میلاد شریف کی مجلسوں میں ایسی ایسی خلافِ عقل اور اہانت آمیز باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں سنجیدہ طبیعتیں ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ ایسی مجلسیں جدید تعلیم یافتہ حضرات اور آجکل کی پڑھی لکھی خواتین سے خالی نظر آتی ہیں۔ غلط روایات، جھوٹی اور لغو باتیں، زمین آسمان کے قلابے ملانا، جو منہ میں آیا بے تُکے پن سے کہہ دینا آجکل کے مولود خوانوں کی بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ذرا مولانا کے الفاظ میں ان لوگوں کا حلیہ بھی سُن لیجئے:—

"جیب میں دیا سلائی، ہاتھ میں بیڑی، منہ میں زردہ، . . . کیا خدا کا رسول جس پر کتاب اللہ فخر کر رہی ہے اسی لائق ہے کہ ایسے نکمے ذاکر کی گندی زبان بار بار اس کا نام دہرائے؛ حالانکہ سرور دو جہاں کے مرتبہ کا تقاضا یہ ہے کہ ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب — ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

مولانا نے اس کمی کو محسوس کیا بلکہ اس بدنما داغ کو اسلام کے دامن سے مٹانا چاہا چنانچہ اکثر علماء کو اس طرف متوجہ کیا مگر اُن بزرگوں نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ آخر کار خود مولانا ہی نے اس پاک موضوع پر قلم اُٹھایا اور وہ وہ گل کھلائے کہ پڑھنے والے کا مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ مولانا عاشقِ رسولؐ تھے اور یہ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے یہ مولود نامہ خاص اہتمام سے لکھا ہے۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد خوشبو لگا کر، اگربتیاں جلا کر، پھول قریب رکھ کر مصلے پر بیٹھے بیٹھے روزانہ اس کتاب کا کچھ نہ کچھ حصہ لکھتے تھے۔ یہ معمول اُن کا سال بھر تک رہا اور جب کتاب ختم ہوئی تو بہت خوش ہوئے کہ اُن کے ہاتھوں اتنی بڑی خدمت بحسن و خوبی انجام پائی۔ مولانا اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ "میں نے اپنی سب کتابیں تمہارے لئے لکھی ہیں۔ مگر "آمنہ کا لال" میں نے اپنے لئے لکھی ہے" اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی کتاب اُن کے لئے توشۂ آخرت اور ان کی بخشش کا وسیلہ بنی ہوگی۔ مولانا کا حُسنِ عقیدت کتاب کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے اور اسمیں اُن کی انشا پردازی کا کمال نظر آتا ہے۔

حضورؐ کی تشریف آوری کو مولانا نے اس طرح بیان کیا ہے:—

"رات کا دورہ ختم ہو چکا۔ آسمان نے کروٹ بدلی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ریگستان عرب کو سرد کر دیا طائرانِ

خوش الحان یتیم عبداللہ کی تشریف آوری کا مژدہ چہک چہک کر گانے لگے۔ صبح صادق نے رات کی سیاہی دور کی اور نور کی چادر ہر سمت پھیلادی۔ روشنی اندھیرے پر غالب آئی۔ صبا اٹکھیلیوں میں مصروف ہوئی اور سرسبز درختوں کی ہری بھری شاخیں فرطِ مسرت سے جھوم جھوم کر آپس میں گلے ملنے لگیں۔ آمنہ کے لال پر بنی کائنات نثار ہونے کو آگے بڑھی۔ سبزہ اور شاخوں نے ارضِ حجاز کو بوسہ دیا۔ نسیم نے ہزار جان سے قربان ہوکر بساطِ ارضی کو چوما۔ ہوا نے اسی مقدس نام کی تسبیح پڑھی۔ خوش رنگ پھولوں نے مکہ کی خاک اپنی آنکھوں سے ملی اور ملک کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ اس مسرت میں لہلہاتی ہوئی کونپلوں کا ہم آہنگ ہوا۔ آسمان عرب نے عبدالمطلب کے گھر دار ابن یوسف کے درو دیوار پر روشنی کی بارش کی۔ چمکدار تارے عبداللہ کے لختِ جگر پر قربان ہوئے اور مخلوقِ فلکی نے شادمانی کا غلغلہ بلند کیا۔ آتشِ نمرود کے ذرات پھولوں کا لباس پہن کر زرد جواہر کی کشتی میں دعائے ابراہیمی کو سر پر رکھے عبدالمطلب کے گھر پر نمودار ہوئے۔ دار ابن یوسف کی دیواریں تعظیم کو جھکیں۔ فرحت کی جھڑیاں برسیں۔ ہوا معطر ہوئی اور زمین و آسمان مبارکبادوں کے نعروں میں سرگرم ہوئے۔"

مولانا کی دوسری کتاب "سیدہ کا لال" ہے جو تاریخ دانش دونوں لحاظ سے لائق قدر چیز ہے۔ اس کتاب کی شانِ نزول یہ ہے کہ مولانا نے :-

"دو چار دفعہ نہیں متواتر پندرہ سال علماء اسلام سے تحریری بھی اور زبانی بھی، شیعوں سے بھی اور سنیوں سے بھی یہ التجا کی کہ مولود شریف اور شہادت نامہ ایسا لکھدیں جسکی بنیاد تاریخ پر ہو اور جس کے واقعات پر فلسفہ قہقہے نہ لگائے اور سائنس مضحکہ نہ اڑائے۔ مگر سنیوں نے توجہ فرمائی نہ شیعوں نے۔ مولود شریف تیار ہوا نہ شہادت نامہ"۔

چنانچہ مولانا ہی نے تاریخ اسلام کے اس سب سے اہم واقعہ کو قلمبند کرنیکی خدمت اپنے ذمہ لی اور بطریق احسن اسے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ شہادت ناموں میں عام طور سے صرف کربلا کا تذکرہ اور ذکرِ شہادت ہوتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ واقعہ کربلا سے پہلے آخر کیا وجوہ تھیں کہ یہ خوفناک خونین واقعہ عمل میں آیا۔ اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ قاتلان حسینؑ کا اس واقعہ کے بعد کیا حشر ہوا۔ غرض کوئی ایسی جامع تصنیف اُردو میں موجود نہیں تھی جو ان سب پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس غمناک داستان کو لکھنے کے لئے مولانا کی علم دوست طبیعت سے زیادہ اور کسی کو مناسبت نہیں ہوسکتی تھی۔ مولانا کا بے پناہ قلم اپنی پوری زہرہ گدازی کے ساتھ چلا ہے اور اس طرح کہ ذکر شہادت کی ہر سطر آنسوؤں کی ایک لڑی معلوم ہوتی ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور اپنے آنسو ضبط کرسکے۔ کربلا کا میدان بلا کی گرمی آسمان آگ برسا رہا تھا۔ زمین شعلے اُگل رہی تھی اور لُو کے تھپیڑے جھلس رہے تھے اس بھیانک ماحول میں :-

"اٹھارہ مہینے کا معصوم بچہ عبداللہ علی اصغر پیاس سے تڑپ تڑپ کر اور بلک بلک کر ماں کی گود میں نڈھال ہوچکا۔ مامتا کی ماری اسکی صورت تک رہی ہے اور چاہتی ہے کہ آنسوؤں کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکاؤں۔ بچہ ہوش میں آکر آنکھ کھولتا ہے اور ماں کی طرف دیکھ کر زبان باہر نکال دیتا ہے۔ نقاہت زبان کو ہونٹوں تک آنیکی اجازت نہیں دیتی۔ آہستہ سے منہ کھولکر زبان اور حلق کے کانٹے ماں کو دکھاتا ہے تو بیتاب ہوکر کہتی ہے "قربان جاؤں ان ہونٹوں کے اور اس زبان کے"۔

حضرت علی اکبر کی لاش آتی ہے۔ بی بی زینب ہندوستان کی کمزور دل عورت نہیں تھیں کہ اپنے بچے کی لاش دیکھکر بیہوش ہوجاتیں انہوں نے تو خود اپنے جگر گوشہ کو دشمنوں سے لڑنے اور ناموس رسولؐ کی حمایت میں لڑتے لڑتے مرجانیکے لئے بھیجا تھا۔ مائیں اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھکر دیکھیں کہ کتنی ہیں جو اپنے پیٹ کی اولاد کو یوں سینے پر صبر کی سِل رکھ کر موت کی آغوش میں دیدینے کیلئے تیار ہیں۔ یہ عرب ہی کی عورت کا دل گردہ تھا کہ اپنی ننگ و ناموس اور خاندان کی لاج رکھنے کیلئے اپنے آنکھوں کے نور اور دل کے ٹکڑے کو واری کردیتی تھیں۔

مگر عورت پھر عورت ہے خواہ ہندوستان کی ہو خواہ عرب کی۔ صابر و ضابط خواہ کتنی ہی ہو مگر پہلو میں تو حساس دل رکھتی ہے اور دل میں امتا کا جوش :۔

"امام حسینؑ اُن کی لاش خیمہ میں لائے تو پیشانی سے جیتا جیتا خون نکل رہا تھا۔ بی بی زینب دروازے میں کھڑی تھیں۔ چہرے پر خون کی تلیاں بہتی دیکھ کر کہا "بھائی لاؤ میرے دولہا کو میری گود میں دو۔ جوان ہو گئے تو پیار کرتے شرم آتی تھی۔ اس وقت جی بھر کے لپٹوں گی۔ عمر و سعد سے کہہ دیجئے کہ قیامت کے روز اسی طرح علی اکبر کو ساتھ لیکر نانا جان کو دکھاؤں گی کہ یزید اور ابن زیاد کے حکم سے عمر و سعد نے میرے بچے کے خون کا سہرا باندھا ہے۔ یہ لہو کی دھاریں اکبر میاں کے سہرے کی لڑیاں ہیں۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ اس چاند کو میدانِ کربلا کے لئے جوان کر رہی ہوں"۔

"سیدہ کا لال" اس قدر درد انگیز کتاب ہے کہ اسکا کوئی اور اقتباس دینا میرے بس کی بات نہیں۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں اُس مضمون کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جو مولانا نے اپنے استاد علامہ نذیر احمد کے انتقال پر اب سے پچیس سال پہلے لکھا تھا۔ یہ مضمون کیا ہے ایک مرثیہ ہے جو نثر میں لکھا گیا ہے جسکا ایک ایک لفظ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے یا یوں سمجھئے کہ اُن رنگین آنسوؤں کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اُستاد مرحوم کے غم میں بہائے ہیں۔ اس مرثیہ میں ایک بات جو خاص طور سے قابلِ غور ہے یہ ہے کہ مولانا نے علامہ مرحوم کے لئے اُس وقت جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ خود مولانا ئے مرحوم پر اس وقت صادق آتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہی مرثیہ رُبع صدی بعد مولانا ہی کا خود نوشتہ نوحہ بن جائے گا :۔

"بے نظیر تھیں اور لاجواب۔ بے مثل تھیں اور نایاب وہ پاک اور صاف روحیں جو عالمِ حیات میں ہشاش بشاش آئیں۔ شاداں و فرحاں رہیں اور شگفتہ و خنداں رخصت ہوئیں۔ دنیا اُن کے فراقِ ابدی پر خون روئی آسمان و زمین اُن کی موت پر بیتاب ہوئے۔ زندوں نے اُن کا ماتم اور مردوں نے اُن کا غم کیا۔ اپنوں نے سر پیٹے غیروں نے آہ اور سُننے والوں نے واہ کی۔

اُن کی رخصت عزیزوں کی بربادی اُن کا کوچ دوستوں کی بدنصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی۔

یہ متبرک صورتیں کیا تھیں، کیا ہو گئیں اور کیا کر گئیں؟ یہ وہ لوگ تھے جنکے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقہ نسواں تا دمِ بقا ان کے نام سر آنکھوں پر رکھیگا۔ جنکی تقریریں بیہوشوں کو ہشیار جنکی تحریریں بیخبروں کو خبردار کر گئیں۔ ہنستوں کو رُلانے اور سوتوں کو جگانے والے آج خود منہ لپیٹے جنگل بیابان میں پڑے ہیں . . . . جسد خاکی سے رخصت ہونے والی رُوح! اپنے خادم کا آخری سلام قبول کر۔ کیسی کیسی مقدس روحیں تیرے استقبال کو آئی ہیں۔ محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور اصلی گھر سدھار جا . . . . .

عالمِ خیال اُستاد مرحوم کے طفیل آج اُن مقدس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اہل قلم کی یہ بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالمِ ارواح سے چل کر اُس پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی قومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے۔ بقاء دوام کے مہکتے ہوئے پھول اُن کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملاءِ اعلیٰ کے بسنے والے آوازِ بلند قومی موت کے نعرے لگا رہے ہیں"۔

مولانا راشد الخیری جیسا بے مثل ادیب و انشا پرداز اور شریف النفس انسان زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔ آہ! اُن آنکھوں کو جنہوں نے کم و بیش نصف صدی تک مسلمانوں کی ابتری اور عورتوں کی پستی پر خون کے آنسو بہائے موت نے ہمیشہ کے لئے اُنہیں خشک کر دیا۔ وہ دل جو اوروں کی مصیبت پر کُڑھتا اور دوسروں کی پریشانی پر تڑپتا تھا اجل کے سرد ہاتھ نے اب اس کی دھڑکن چھین لی۔ وہ قلم جو موتی بکھیرتا اور پھول برساتا تھا فنا کے بے رحم چنگل نے اس کی جنبش سلب کر لی۔ آنسوؤں کا خزانہ لُٹ چکا۔ دل کی تڑپ سلب ہو چکی اور رنگین جنبشِ قلم آئندہ کے لئے منقطع ہو گئی۔ اب مولانا وہاں ہیں جہاں ہماری آرزوئیں رہتی ہیں "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت" دنیا کا اٹل قانون ہے۔ مولانا نے بھی اس دنیا سے منہ موڑا مگر اُن کے کارنامے رہتی دنیا تک اُنہیں زندہ رکھیں گے۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ اب ہم میں نہیں۔

مولانا کی تبلیغ

(از مولوی محمد ظفر صاحب ایم - اے - ایل ایل بی)

مولانا راشد الخیری اس دنیا میں نہیں وہ دائمی نیند میں، دنیاوی تگ و دو سے محفوظ ہیں، وہ یتیموں اور بیکس عورتوں کے متعلق ہمیشہ لکھتے اور اُن کی خستہ حالت کا مرثیہ پڑھ پڑھ کے رُلاتے رہے۔ کھیلتے مالتے بچوں کی موت، لہلہاتی نوجوانی کے شاداب پھولوں کی مرگ مفاجات کی بادسموم سے پژمردگی، ان کا ایک خاص مضمون تھا۔ اسی پر وہ مصورِ غم کہلائے لیکن وقت کی خوبی دیکھئے کہ آپ نے جس مقام پر جا کے ہمیشہ کے لئے کمر ٹیکی وہاں بھی برابر ہی ہیں ایک ۲۲، ۲۳ سالہ نوجوان پڑا ہے جس کی قبر پر میں نے دیکھا کہ اس کی سوگوار ماں دھوپ کی تیزی میں کلیجہ پکڑے صبر کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پاس مرحوم کی خوردسالہ بہن حسرت و اندوہ سے قبر کو دیکھ رہی تھی اور ایک عزیز نوجوان قبر پر سفیدی پوت رہا تھا۔ ماں اپنے سامنے قبر کی اس آخری زیبائش میں محو تھی۔ مولوی صاحب قبر میں اس درد و الم کے بت کو خاموشی سے دیکھ رہے ہوں گے وہاں بھی ان کے زورِ قلم کا عنوان موجود ہے۔ شہرِ خموشاں میں بھی شاید وہ وہاں کے ساکنوں کو اس منظر سے متاثر ہو کے رُلاتے ہوں گے۔

غم کی تصویر کھینچنا اُن کی خاص خوبی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ صریح بے انصافی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اُن کے متعدد پہلو ہیں جن پر اُنہوں نے کمالِ فن دکھایا ہے۔ **نعمت خان عالی** کے وقائع دیکھئے۔ جہاں جس رنگ میں مضمون باندھا ہے اسی میں صفحے کے صفحے بھر دئے ہیں اور پڑھنے والا اس شخص کے کمال علم سے دنگ رہ جاتا ہے مثلاً کسی جگہ باورچی خانہ کی اصطلاحات لی ہیں تو انہی میں کئی صفحوں پر مضمون بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اقلیدس کی شکلوں کا ذکر کرا گیا ہے تو اس کی متعدد کتب اُس کی نوک زبان ہیں۔ اور جنگ کے واقعات انہی میں بیان کر کے رکھ دیا ہے مولانا کو دیکھئے۔ درزی بنے ہیں تو **صبح زندگی** میں کپڑوں کی تراش خراش اور اصطلاحات بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ مولوی بنے ہیں تو صفحے کے صفحے وعظ میں بھر دئے ہیں۔ ایک اصلی ریڈیو ہے جس کے سُننے میں فائدہ ہی فائدہ ہے کوئی ہزل نہیں، کوئی شہرت طلبی نہیں، کوئی چھچھورپن نہیں! مولانا زندہ ہوتے تو ریڈیو والے ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ مولانا کی خوبیوں کے بیان کرنے کے لئے دفتر اور عمیق مطالعہ درکار ہے۔ اُن کی علمی خدمت سرسری طور سے بیان کرنا اُن کی اہانت تو کیا اپنی کم بضاعتی کا اعلان ہے۔ ضرورت ہے کہ کاوش سے، دلسوزی سے، اُن کی کتابوں پر، اُن کی تقریروں پر، اُن کی بذلہ سنجیوں پر نظر ڈالی جائے۔ یقین ہے کہ مستقبل میں یہ ضرورتیں تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔

ہمیں اُن کے علمی معرکوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا میدان تبلیغ کے زبردست شہسوار تھے انصاف

یہ ہے کہ آپ کی کتابوں نے زنانہ طبقہ میں وہ مذہبی کام کیا ہے کہ منہ سے بیاختہ آفریں نکلتی ہے۔ دل کہتا تھا کہ ایک یہی کام اُن کے لئے جنت کا پروانہ ہے۔ وہ آسانی سے بڑے لطف سے جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

مولانا نے خاموش تبلیغ کی۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ کام کچھ نہ کریں۔ بہانگ دہل خود اپنی خوبیاں گنوائیں اپنی خدارسی کے دعوے کریں جو پیغمبروں نے بھی نہیں کئے۔ انہوں نے کبھی اپنی نسل پر اپنے خاندان پر فخر نہیں کیا کیونکہ یہی عین اسلام ہے۔ اُنہوں نے قصے لکھے اور بڑے نتیجہ خیز مضمون پیدا کئے۔ جو مذہبی کام کرتے ہیں دھوم دھڑکا پسند نہیں کرتے وہ مولانا کی کتابیں پڑھ کے اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مرحبا! مولانا نے نہایت عمدہ کام کیا۔ انجمنیں، واعظوں کے گروہ اور مبلغوں کے دستے وہ کام اس زمانہ میں بھی کرکے نہ دکھا سکے جبکہ ارتداد کا زور شور تھا جو مولانا نے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھ کر انجام دیا۔

مولانا کی کتابیں دس دس بیس بیس صفحے کے رسالے نہیں کہ آسانی سے گن کر کہدیا جائے کہ انہوں نے سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ البتہ اُن کے مضامین کو الگ الگ چھاپا جائے جن میں سے بہت سے غالباً ابتک ایک جگہ نہیں تو ہزار تک نوبت پہنچ جائے۔ انہوں نے جو ضخیم کتابیں لکھی ہیں اُن سب کو ایک خاص ترتیب دی جائے تو مولانا کی عمر اور اُن کے کام پر مختلف پہلوؤں سے بخوبی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے مصنفوں کے متعلق اسی قسم کا اجتہاد کیا جاتا ہے اور وہ ادبی کوششیں بجائے خود علمی کارنامے ہیں۔

مولانا نے جو کام زنانہ طبقہ میں انجام دیا ہے آنیوالی نسلیں اس کی بائستہ و شائستہ قدر کریں گی۔ اگر ہماری بیبیاں مذہب کی پابند ہوجائیں تو یقیناً ہماری آئندہ نسل مذہب سے روگرداں نہ ہوگی۔ مذہبی احکام کی پابندی کرنے سے وہ دنیا میں ترقی کرے گی اور جس پستی میں ہم مبتلا ہیں اس میں سے نکل کے کامیابی و کامرانی کو اپنے قدم چومنے پر مجبور کرے گی۔

شرک سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بخشش نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہی اس میں زیادہ مبتلا ہیں۔ اسلام نے توحید بہترین صورت میں پیش کی۔ مخالف تک اس کے قائل ہیں مگر ہم اپنی مذہبی تعلیم سے بیگانہ ہونیکی وجہ سے مشرکوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ہماری تربیت ہے۔ جن گودوں میں ہم پلتے ہیں وہاں ہمیں پہلا سبق اسی کا ملتا ہے۔ مستقبل میں ہونے والی ماں کی کیا صورت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

" آثار حمل کے نمودار ہوتے ہی دونوں وقت مسجدوں میں گھی کے چراغ جلنے لگے ایک مہینہ اسی طرح جوں توں کٹا دوسرے مہینے کا شروع ہونا تھا کہ نہ گلے میں گھنٹی رہی نہ پاؤں میں بل سارے بدن پر تعویذوں کی حائل پڑی تھی جدھر دیکھو نقش اور جس طرف نظر ڈالو تعویذ۔ اسیر ستم پڑھا ہوا کاجل تھا دن میں تین تین مرتبہ لگتا اور چار چار

دفعہ تھپتا...... آنکھوں میں ڈھیر سا کاجل ماتھے پر نظر کا ٹیکہ سُرخ قمیص سیاہ تعویذ کروٹ میں خریطے سامنے نظلیتے۔"　　　　(طوفان حیات صفحہ ۶)

اولاد کے لیۓ مائیں کیا کچھ کرتی ہیں مولانا کی زبان سے اس کا مجمل ذکر سنیئے:۔

"ایسی عورتیں بہت کم ہوں گی جن کے بچے ٹوٹنے ٹوٹکے یا گنڈے تعویذوں سے بچے ہوں عام طور پر بچوں کی موت کا سبب مسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہایت ہی مہمل خیال ہے کہ مسان بچوں پر عاشق ہے' وہ بچوں کو لے جاتا ہے...... نعوذ باللہ مسلمان ہو کر ایسا خیال کرنا کیسی شرم کی بات ہے.... جہاں بچہ بیمار ہوا اور پیر جی کی سوجھی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آدھ سپید مرغ دو ایک بکرے کچھ نقدان کی نذر کرنا پڑا...... ایک نام تم نے مرت بیا ہی سُنا ہوگا۔ یہ اُس کمبخت بچے کو کہتے ہیں جس کے اُوپر کے چار پانچ مر چکے ہوں گویا اس کی ضد صرف اس لئے ہوتی ہے کہ پوری نہ ہو تو لوٹتا ہوا مر جائے اس لئے اس کی نازبرداری بہت کی جاتی ہے اور ایسا ناس ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! بیوقوفی کے علاوہ اس قسم کا عقیدہ کیسا زبردست شرک ہے گویا ایسے بچے کو بچانے کی خدا میں کوئی قدرت نہیں۔ اس کو مارنے اور جلانے والا صرف مسان ہے...... اس ممتا کے کارن یہ بیوقوف مائیں سب کچھ کرتی ہیں۔ چوراہے پر کلیجیاں اور سریاں تک رکھ کر پوری مشرک بن جاتی ہیں"

(شام زندگی صفحہ ۳۳-۳۴)

مولانا نے مسلمانوں کی تباہی کا باعث یہ قرار دیا:۔

"اس تناور درخت کی طرح جس کو دیمک اندر ہی اندر غارت کرتی ہے رسوم کی پابندی نے ان کو کھوکھلا کر دیا۔"
(طوفان حیات صفحہ ۴۸)

رسوم کی مذمت اور ان کے علاج کے متعلق آپ "طوفان حیات" پڑھ جائیں آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ ایک اصلی مبلغ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس قصہ کے ممدوح انعام کی تباہی شرک اور رسوم کی بدولت ہوئی۔ اس کی لڑکی ناصرہ جس کا نام مولانا نے خدا جانے کیوں مشرکہ رکھدیا۔ اس قصہ کی تاریکی میں ایک روشنی ہے جو ہدایت کا ذریعہ ہے۔ قصہ کا انجام اچھا ہے اور غرض وغایت باحسن الوجوہ مکمل ہے۔

عورتوں کو شرک کا انجام دکھایا جاتا ہے:۔

"بیہوش ہوتے ہی ایک دوسرا منظر آنکھ کے سامنے تھا.... باپ جس کو مرے ۱۲ برس سے زیادہ ہو چکے۔ نئے سفید کپڑے پہنے خاموش کھڑا ہے...... چاہتی تھی کہ قدموں پر گرے مگر باپ نے جھٹک دیا اور کہا ہٹ جا اپنے ناپاک ہاتھوں سے میرے جسم کو گندہ نہ کر۔ تیری زندگی کا جو دن گذرا وہ بد' اور جو رات گذری وہ بدتر' ایک مشرک عورت ایک نافرمان لڑکی ایک گنہگار مخلوق ہرگز اس قابل نہیں کہ میرے جنتی لباس اور پاک

جسم کو ہاتھ لگائے تیری آجتک کی زندگی کا بڑا کارنامہ عزیز سرمایہ گرانمایہ جائداد اور سب سے بڑا اثاثہ قادر ذوالجلال سے روگردانی ہے دوزخ کے شعلے اور آگ کی لپٹیں تیری منتظر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رسمیں اور منتیں پیر فقیر کہاں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو ہے اور تیرے اعمال بھگت جو کیا کاٹ جو بویا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیری زندگی کا مقصد اپاہجوں کی خدمت یتیموں پر شفقت، غریبوں پر عنایت، بیکسوں کی حمایت اور مظلوموں کی اعانت تھا دُکھے ہوئے دل جوڑتی ٹوٹے ہوئے دل تسکین اور زخمی دل تیرے ہاتھوں آرام پاتے ۔" (طوفان حیات صفحہ ۶۳)

اسلامی زندگی کے اسی مقصد کو یتیم کے ذکر میں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے ۔

" اس سے بڑھ کر مظلوم اور اس سے زیادہ معصوم کون ہوگا ۔ جس کو آنکھ کھولکر ماں کی صورت اور باپ کا چہرہ دونوں دیکھنے نصیب نہ ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ ہر ماں اس کی ماں اور ہر باپ اُس کا باپ ہو۔ مائیں جب مامتا کے جوش میں کلیجہ کے ٹکڑوں کو لپٹ لپٹ کر دودھ پلاتیں ۔ باپ جب محبت بھری نظروں اور شفقت بھری آنکھوں سے اپنے بچوں کو دیکھتے تو بھولا بسرا خیال اُچٹتی ہوئی نگاہ اس پر بھی پڑجاتی ۔ عزیز اس کو چھاتی سے مائیں اس کو کلیجہ سے اور باپ اس کو گلے سے لگاتے ۔ یہ ایک ماں کے بدلے سینکڑوں اور ایک باپ کھو کر بیسیوں باپ پاتا ۔ ماں کی صدا اس کے کان میں ہر گھر سے اور باپ کی آواز چپہ چپہ سے آتی ۔"

(طوفان حیات صفحہ ۵۰)

غریب ہمسایہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے :۔

" خدا کے حاجتمندوں کی خدمت خدا ہی کی خدمت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آٹھ پہر صاف نکل گئے اور معصوم بچوں کے مُنہ میں کھیل کا دانہ تک نہیں گیا ۔ بچہ گھر میں پڑا ہے اور کسی سے یہ نہ ہوسکا کہ جھوٹ موٹ آکر خیر صلاح پوچھ لیتا، صد آفریں پھوپی جان کو، مردے کو کلیجہ سے لگائے پڑی ہیں چاند سے چہرے مٹھی بھر چنوں کو ترس رہے ہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتیں ۔ شاباش ہے اس محلہ پر کہ مسلمان پڑوسی پر یہ کچھ گذر جائے اور خبر تک نہ ہو مسٹنڈے بھک منگے پیر فقیر نقدیاں اڑائیں اور معصوم فاقہ سے دن تیر کریں ۔

(طوفان حیات صفحہ ۹۱)

جس گھر میں موت ہوجاتی ہے اُس پر ایک تو اس غم کا پہاڑ ہی کافی ہوتا ہے ۔ اُوپر سے عزیز قریب لدلد کے اس پر جا ٹوٹتے ہیں اور اُسے اپنے غم کے ساتھ ساتھ اُن کی خاطر تواضع کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے ۔ مولانا نے "طوفان حیات" میں اس طرف نہایت موزوں طریقہ سے توجہ کی ہے :۔

" اس سے بہتر شادی کی محفل اس سے زیادہ چہل پہل کا منظر اس سے زیادہ پُر لطف مجمع اور کیا ہوسکتا ہے جہاں ہر عورت نے نہایت اطمینان اور بے فکری سے اس لئے ایک گھر میں کھانا کھایا کہ وہاں موت ہوگئی

مدّتوں کی بچھڑی بہنیں اس بہانہ سے مل گئیں اور برسوں کی روٹھی ہوئی سہیلیاں اس سلسلے میں من گئیں۔ اعلیٰ قسم کے کھانے یہاں موجود تھے چائے اور کافی یہاں تیار تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں۔ ۔ ۔ ۔ یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ اُن کے یہاں تشریف لانے کی وجہ کیا تھی۔ اگر ہمدردی تھی تو وہ جب جی چاہتا تشریف لاتیں آج ہی کے دن کیا خصوصیت تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ جس گھر میں موت ہو وہاں ہمدردی کے لئے آؤ اور دنیا بھر کے مسئلے طے کرو۔ کیا مسلمانوں کا اب یہ شیوہ رہ گیا ہے کہ وہ گدھوں کی طرح جو زخمی اور بیمار جانور دُور سے بیٹھے اس اُمید پر تاکتے ہیں کہ کب اس کا دم نکلے اور چٹ کریں۔ عزیزوں کی موت کے منتظر ہیں اور جب یہ خوشخبری ان کو پہنچے تو سب کام چھوڑ چھاڑ ہاتھ دھو دھلا موجود ہوں اور انواع واقسام کے کھانے اُڑائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بچہ مرتا ہے ماباپوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان بدنصیبوں سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو ہمدردی کیا ہے۔ بریانی کھلوائیے متنجن دلوائیے قورمے اڑوائیے فیرنی پکوائیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتی ہوں کہ ذرا ان دلونکو دیکھوں وہ کون سے دل ہیں جو ان کھانوں کو کھا سکتے ہیں۔ ان آنکھوں کو دیکھوں جو یہ کھانے دیکھ سکتی ہیں ان حلقوں کو دیکھوں جن سے یہ نوالے اُتر سکتے ہیں ان صورتوں کو دیکھوں جو یہ حصّے تقسیم کرسکتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ایک مسلمان عورت وہ ہوسکتی ہے جو موت کا کھانا بآسانی کھا سکے ''

(صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۸)

بڑے میاں کا لکچر جو انہوں نے ناصرہ کو دیا اور طوفان حیات کے صفحہ ۹۷ سے ۱۰۴ تک پھیلا ہوا ہے اس کتاب کی جان ہے۔ کس کس طرح اُنہوں نے اسے شرک سے بچنے اور رسوم سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی ہے۔ پتھر بھی ہو تو اُس پر نقش ہوجائے۔ ایک بیوی کا ذکر ہے جس کا بیٹا عین نکاح کے وقت مرجاتا ہے۔ وہ صبروشکر کرتی ہے۔ پھر شوہر بھی بیمار ہوکے قریب المرگ ہوتا ہے۔ بہکانے والیاں اُسے راہ راست سے ڈگمگانا چاہتی ہیں مگر وہ ہر ایسی رسم سے ہر ایسے تعویذ ٹوٹکے سے بچتی ہے جس سے شرک کی چھینٹ اُس پر نہ آپڑے۔

ناصرہ کو جب سسرال میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انعام اس کا باپ دم توڑ رہا ہے اور اُسے ملنے کی اجازت نہیں اس حالت میں وہ گر پڑکے ایک خط اُسے لکھتا ہے جس میں اُسے تلقین صبر کرتا ہے :۔

'' ناصرہ! ظلم کی فریاد ستم کا شکوہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زبان تک نہ آئے عقیدۂ توحید اپنی جگہ سے نہ سرکے ایوبؑ کی مصیبت پیش نظر رہے اور اس خدا کا بھروسہ جس نے مدّتوں کے بچھڑ یوسفؑ کو یعقوبؑ سے ملوایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شوہر کی اطاعت بزرگوں کی عظمت مسلمان کا شیوہ اور بیوی کا فرض ہے یہ جوہر آبدار ماند نہ ہو ''

(طوفان حیات صفحہ ۱۳۰)

رسم پرستی کا انجام میاں بیوی انعام اور ہاجرہ دونوں کی زبان سے سنئے۔ ہاجرہ کہتی ہے :۔

میرا یہ پیام میری بہنوں تک پہونچا دینا کہ جس چیز نے دنیا اور دین دونوں میں برباد کیا وہ شادی اور موت

کی رسمیں تھیں شرک اور قبر پرستی سونے پر سہاگہ جس نے عمر بھر ذلیل و رسوا کیا میں وہ کمبخت عورت ہوں جس کے معزز و متمول شوہر نے محض میری بدولت در در بھیک مانگی وہ نابکار بیوی ہوں جس نے سو روپے کے تنخواہ دار شوہر کی تمام عزت و آبرو اپنی خواہشوں اور جہالت کی رسموں پر قربان کر دی وہ ننگ خاندان بیٹی جو ۵ ہزار کا جہیز لے کر میکے سے آئی وہ منحوس و ناہنجار بہو جس کو سسرال نے ۲۵ ہزار کی جائداد عطا کی لیکن میکے کا اثاثہ اور سسرال کا مال چلّے اور چالوں عقیقہ اور پھولوں پر لٹا دیا جن الفتوں نے بریانیاں اُڑائیں جن شُہدوں نے متنجن چکھے جن مکاروں نے بہاریں دیکھیں جن دغابازوں نے نقدیاں اینٹھیں آج اُن میں سے ایک بھی موجود نہیں . . . . جس گھر میں چار بلکہ پانچ پشتوں سے ایک ہی خاندان کے نال گڑتے چلے آئے تھے جس مکان کے چپہ چپہ اور کونے کونے پر صدائے توحید بلند ہوتی تھی آج اُس تمام سرزمین پر غیروں کا راج ہے اور سنکھ کی آواز گونج رہی ہے۔"

(صفحہ ۷۸)

میاں انعام بیوی سے کہتے ہیں :۔

"خدا مجھ جیسی موت کافر کو اور تم جیسی زندگی دشمن کو بھی نہ دے . . . . . کیسی ذلیل زندگی تھی ایک دن خوشی کا اور ایک گھڑی چین کی نہ گذری یہ صرف رسموں کے ہاتھوں اور شرک کی بدولت روپیہ اور عزت روزگار اور حکومت کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر کبھی برکت نہ ہوئی۔ کہتے ہیں مشرک کے گھر میں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ مشرک کے گھر میں در و دیوار تک لعنت برساتے ہیں . . . . . اس شرک نے دنیا تو برباد کی ہی تھی دنیا کے ساتھ دین بھی غارت کیا۔" (صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

اسی کتاب کے صفحات ۱۴ تا ۱۶ پر ایک دعا کا نمونہ کیا عمدہ مولانا نے پیش کیا ہے جس کے آخری الفاظ اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان انہیں اپنی دعاؤں میں ورد بنائے :۔

" مولا بے اولادوں کو اولاد، نامرادوں کو مراد، مریضوں کو صحت، ناتوانوں کو طاقت، بیکار کو کمائی، مقروض کو رہائی، بیٹیوں کو بر، پردیسیوں کو گھر، بیکسوں پر رحمت، کاروبار میں برکت، اچھے بُرے دوست دشمن عزیز غیر الہ العالمین سب کی خیر!"

آمنہ کا انتقال ہوتا ہے۔ گھر کا انتظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سید کاظم کو نکاح ثانی کے مشورے دیئے جاتے ہیں۔ بڑی بیٹی صالحہ ماں کے غم میں ہر وقت منہ لپیٹے پڑی رہتی ہے۔ آخر باپ مجبور ہو کے اُسے تلقین صبر کرتا ہے یہ مضمون بڑا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ گہر آبدار ہے۔ قرآن پاک کی آیات سُنا سُنا کے وہ اُس کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ خلاصہ ملاحظہ ہو :۔

" اس چھوٹی سی عمر میں تمہارے اُوپر وہ مصیبت پڑی جس کی تلافی اب تمام عمر نہ ہو سکے گی مگر یہ کوئی نئی بات

نہیں ہے۔ انسان اسی غرض سے دنیا میں پیدا ہوا ہے کہ وہ ہر قسم کے رنج و آفات میں گرفتار رہ کر درجہ صبر کو ہاتھ سے نہ دے جو نیک بندے ہیں وہ ہر مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اس چند روزہ زندگی پر لعنت بھیجتے ہیں اور خدا کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں برداشت کرتے اور شکر کرتے ہیں مصیبت ایک کسوٹی سمجھو جو عبد و معبود کے باہمی تعلقات کا کھرا کھوٹا ہونا ظاہر کر دیتی ہے۔ دیکھو بڑے بڑے پیغمبر کیسے پیارے اور نیک بندے تھے اُن پر کیسی کیسی مصیبتیں آئیں کیسی کیسی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مگر ہر حال میں صابر و شاکر اور ہر موقع پر راضی برضا رہے وہ مصیبتیں بھی ختم ہو گئیں اور وہ زمانہ بھی گزر گیا مگر اُن کے نام باقی رہ گئے۔ درجۂ اعلیٰ حاصل کئے۔۔۔۔ مصیبت پر صابر رہنا گویا بخشش کا ایک ثبوت ہے کہ انسان ایمان کے امتحان میں کامیاب ہوا اسی کا نام صبر ہے۔۔۔ مصیبت اور انسان لازم و ملزوم ہیں۔۔۔ جو خدا کے نیک بندے ہیں وہ اس مصیبت ناپائیدار سے راحت ابدی حاصل کرتے ہیں صبر کرتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔۔۔ جتنا تم نے اپنی ماں کا رنج کیا اگر اتنا ہی تم پڑھ کر اُن کو پہنچاتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔۔۔ تم کو بھی ثواب ہوتا تمہاری ماں کی روح بھی خوش ہوتی۔۔۔ تمہاری اس پریشان حالی سے تمہاری ماں کی روح کو کس قدر صدمہ ہوتا ہوگا۔ مجھکو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ تم اپنی دنیا کے واسطے دین کو بھی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھو۔" (حیات صالحہ صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۸)

سید کاظم آخری خواب دیکھتا ہے جسمیں اسے جنت اور دوزخ دکھایا جاتا ہے۔ مولانا نے دونوں کی تصویر مختصر لیکن مکمل عبارت میں ایسی دی ہے کہ آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے:۔

"ایک عالیشان محل ہے جابجا نہریں جاری ہیں فوارے اُچھل رہے ہیں چاروں طرف ایک خوشنما باغ ہر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے ہیں شاخیں میوؤں سے لدی ہوئی جھوم رہی ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ طائران خوش الحان ڈالیوں پر بیٹھے تسبیح و تحلیل کر رہے ہیں کیسی کیسی حسین عورتیں جو آجتک نگاہ سے نہ گزری تھیں آراستہ پیراستہ اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ یہاں کے رہنے والے عجیب آزاد و بے فکر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کسی قسم کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کا فکر۔ کھانے کی تلاش ہے نہ کپڑے کی فکر ہر قسم کی نعمت آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ شربت اور دودھ کی نہریں لہریں لے رہی ہیں۔ جس چیز کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا خود بخود منہ میں آ پڑی محل کے دروازے پر۔۔۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لکھا تھا "تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون" سوچنے لگا کہ الٰہی یہ کیا مقام ہے اور یہ کون لوگ ہیں اگر یہ جنت ہے تو میں بے مرے جنت میں کہاں سے آگیا بلا سے مجھکو موت منظور مگر یہاں سے جانا منظور نہیں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا محل سے باہر لایا اور پہاڑ کی دوسری جانب پہنچا گیا۔۔۔ اور ہی سماں نظر آیا۔ یہ ایک چٹیل میدان تھا۔ ہر طرف ٹیلے تھے اور جابجا نشیب و فراز بیچ میں ایک کنواں تھا جو کوسوں دور چلا گیا تھا اس پر لکھا تھا "ھذہ جہنم التی کنتم توعدون" آگ بھری ہوئی تھی اور شعلے نکل رہے تھے۔ آدمیوں کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ بڑے بڑے اژدھے اور دو دو تین تین گز کے بچھو ہر طرف پھر رہے تھے یہاں کے رہنے والوں پر سخت عذاب ہو رہا تھا موگریوں سے سر کوٹے جاتے تھے۔ قینچیوں سے زبانیں کتری جاتی تھیں۔ کھانے کو آگ، پینے کو آگ، اوڑھنے کو آگ، بچھانے کو آگ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ پیاس لگتی تھی تو اُنہی کے جسموں کا خون اور اُنہی کے زخموں کی پیپ پلادی جاتی تھی"۔ (حیات صالحہ صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

مردوں کی جو مذہبی حالت ہے تعلیم نے اُس کی اصلاح نہیں کی۔ حالت بد سے بدتر ہی ہے۔ البتہ عورتوں کی حالت یہ کتابیں پڑھنے سے بہت کچھ سنبھلی ہوئی ہے۔ مولانا راشد الخیری صاحب مرحوم نے مذہبی پہلو کو اپنی کسی کتاب میں نہیں چھوڑا خود انگریزی داں تھے اور آجکل کے انگریزی دانوں سے کہیں زیادہ قابل تھے۔ مگر سینے میں مسلمان دل تھا۔ اس کی چمک دمک اُن کی ہر کتاب ہر مضمون اور ہر تقریر میں موجود ہے۔ اُنہی کے الفاظ میں "اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے" ہماری دلی دعا ہے۔

مہاپُرش راشد الخیری

(از کماری شکنتلا سوری - بی - اے کلاس بنارس یونیورسٹی)

علامہ راشد الخیری کے نام سے آج اُردو لٹریچر کے جاننے والے ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے پڑھے لکھے لوگ اور فاضل عورتیں خوب واقف ہیں - ایک سنسکرت شاعر کے کہنے کے مطابق جس طرح ندیاں اپنا جل خود نہیں پتیں - زمین ہری بھری کھیتیاں اپنے لئے نہیں پیدا کرتی اور درخت اپنی چھاؤں میں خود نہیں بیٹھتے - بلکہ ان سب کا جیون پروپکار کیلئے ہوتا ہے - اُسی طرح سجنوں کی زندگی دوسروں کی خدمت میں گزرتی ہے - علامہ راشد الخیری بھی انہی نیک سیرت انسانوں میں سے تھے - اس مہاپُرش کا سارا جیون ہندوستان کی ماتاؤں، بہنوں اور معصوم بچیوں کی بھلائی کے خیال میں گذرا - اُن کی زندگی کا مقصد ہی عورت ذات کو اُونچا اُٹھانا تھا - انہوں نے مرتے دم تک اسی پوتر کام میں اپنی سب طاقتیں لگا دیں - آج وہ جسمانی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہیں مگر اُن کے لگائے ہوئے پودے رسالہ عصمت، جوہر نسواں اور بنات کی شکل میں لہلہا رہے اور ان کی کتابیں ہمارا حوصلہ بڑھا رہی ہیں - پروپکاری لوگ اپنے اپکاروں کے ذریعہ ہی امر ہو جاتے ہیں - ان رسالوں اور کتابوں کی ہر ایک لائن میں ہم علامہ کی آتما کی موجودگی کا احساس کرتے ہیں - وہ عورتوں کے خیالات اونچے کرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں دستکاری کا بھی شوق پیدا کرنا چاہتے تھے بیشمار مضمونوں اور عمدہ کتابوں کے ذریعہ اُنہوں نے عورت کو گھر کی رانی بننے کیلئے شکشا دی اور ایک خوشی سے بھرپور گرہستھ چلانے کے لائق بنانیکی کوشش کی - اس نیک کام میں وہ کامیاب ہوئے - وہ ایک بہت اونچے درجے کے لیکھک تھے اور سنتر کے قریب کتابیں انہوں نے عورتوں کے لئے لکھکر بیحد احسان کیا اُن کی بھاشا کی خاص خوبی اُس کی سادگی اور بے میل پن ہے - اسی وجہ سے وہ عورتوں پر اتنا اثر ڈال سکے - اُن کی زندگی عملی زندگی تھی - ایسے ہی بھارت ماں کے لالوں کے بل پر آج ہندوستان فخر سے سنسار میں سر اونچا کر سکتا ہے - پرماتما اُن کی آتما کو شانتی دے اور اُن کے گھر والوں کو اُن کے چلائے ہوئے کام جاری رکھنے کی طاقت دے -

گئے راشد الخیری آہ اس جہاں سے

قطعہ تاریخ رحلت

(از نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل حیدر آباد دکن)

گئے راشد الخیری آہ اس جہاں سے — جو مشہور قائد تھے ہندوستاں میں
مقرر تھے - قابل تھے - جادو رقم تھے — اثر تھا زباں میں فسوں تھا بیاں میں
وہ تعلیم نسواں کے شیدا و حامی — وہ اس وصف میں فرد سارے جہاں میں
کھلا کے رہے پھول علم و عمل کے — صبا کا کیا کام ہر بوستاں میں
جلیل ان کی تاریخ رحلت یہ لکھو — مقیم آج ہیں خیر سے وہ جناں میں

۴ ۵ ۳ ۱ ہجری

مصورِ غم کی تصنیفات پر ایک سرسری نظر

(پروفیسر علی عباس صاحب حسینی ام۔اے لکھنو)

"کہتے ہیں انسان مردہ پسند ہے، بدتر سے بدتر آدمی جس کی زندگی ہر اعتبار سے قابل ملامت ہو، موت اس کو بھی اچھا بنا دیتی ہے، کیوں کہتے ہیں اس لئے کہ تعلقات ختم ہوئے، تو فعات فنا ہوئیں، حکایت بے سود شکایت لاحاصل"۔

(راشد الخیری)

لیکن اگر کوئی بہتر سے بہتر سیرت کا مالک ہو، اور کسی کی زندگی ہر اعتبار سے قابل تعریف ہو، تو پھر آنکھیں روئیں گی، لب فغاں کریں گے اور ہاتھ سینہ زنی!

مولانا راشد الخیری کی موت اسی طرح کی موت ہے! ان کی صُلح کُل طبیعت، ان کی غیر فانی ادبی خدمت، اور ان کی طبقۂ نسواں کی پُرزور حمایت، نہ تو آسانی سے بھلائی جا سکتی ہے۔ اور نہ اس کا اثر دلوں سے جلدی مٹے گا عزیزوں، دوستوں اور ہموطنوں کی جو بھی حالت ہو عجب نہیں۔ ہم دور کے رہنے والے، جن سے صرف ہم مشربی کا رشتہ ہے، وہ بھی اس حادثہ جانگزا سے بےچین ہیں۔ ہمارے لئے دلی سے مراد محض دو ذاتیں تھیں ایک جنت آشیاں مولانا **راشد الخیری** اور دوسرے سلمہ المنان حضرت خواجہ حسن نظامی۔ اور اب ہمارے نزدیک آدھی دلی اجڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل کے زمانے میں جب کہ ہم معلّمین پر کاموں کی یورش اور مشاغل کی یلغار ہوتی ہے، مولانائے مرحوم پر ایک تنقیدی مقالہ لکھنے بیٹھا ہوں، ظاہر ہے کہ اس غیر معمولی عدیم الفرصتی کے عالم میں یہ مقالہ ایک ادائے فرض سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ دل چاہتا تھا کہ مولانا مرحوم کی تمام تصانیف پر بالتفصیل نظر ڈالی جائے اور ان کے تمام کمالات سے سیر حاصل بحث کر کے دوسرے انشا پردازوں کے مقابلہ میں ان کا ادبی پایہ معین کیا جائے لیکن اس کام کے لئے ایسے موقع کی ضرورت ہے جب اطمینان ہو۔ اور یہاں یہ نصیب نہیں۔ اس لئے فی الحال سرسری طور پر کچھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا راشد الخیری کی تصانیف کی تعداد بہت بڑی ہے ان میں سے "سیدہ کا لال" "جوہر قدامت" "حیات صالحہ" "نوبت پنج روزہ" "سیلاب اشک" "جوہر عصمت" "تمغۂ شیطانی" "بنت الوقت" "تفسیر عصمت" "نانی عشو" "بیلہ میں میلہ" "وداع خاتون" "نوحہ زندگی" "عروس کربلا" "صبح زندگی" "شام زندگی" "شب زندگی" "ماہ عجم" اور متعدد عصمتی فسانے میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ ان تصانیف کے مطالعہ سے مولانا کے قلم کی مندرجہ ذیل خصوصیات خاص طور سے واضح ہوتی ہیں:۔

(۱) محاسن بیان (۲) سیرت نگاری
(۳) اور یجنیلٹی یا ندرت (۴) حمایت نسواں
(۵) تعلیم اخلاق (۶) محبت وطن (۷) زندہ دلی

میں یہاں پر مرحوم کی تصانیف کی مندرجۂ بالا خصوصیات پر بالترتیب کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

محاسن بیان

واقعات کی تفصیلات - علامہ راشد الخیری اُردو زبان کے ماہر ہیں - انہیں اُردو کے الفاظ و محاورات پر قابو حاصل ہے وہ واقعات اور ان کی تفصیلات بیان کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں - ان کے بیان میں دلکشی اور لطافت ہوتی ہے اور تھکا دینے والے جزئیات بھی ان کی سحر طرازیوں سے اتنے پر لطف ہو جاتے ہیں کہ پڑھنے والے انہیں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتا ہی جاتا ہے۔

دیکھئے "عروس کربلا" میں مولانا نے عیش پرست یزید کے دربار اور اس کے خوشامدی درباریوں کا کتنا کامیاب خاکہ کھینچا ہے لکھتے ہیں :-

" دربار یزید گرم ہے - گل اندام لڑکیاں آراستہ و پیراستہ حسن عرب کے انواع و اقسام کے نمونے دکھا رہی ہیں - شراب کا دور چل رہا ہے اور چاروں طرف امراء دربار ہشاش بشاش قہقہے لگا رہے ہیں - مغیرہ دمشق کی مشہور مغنیہ اپنا سرود ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھی تھی کہ یزید نے گردن سے اشارہ کیا مغیرہ نے ساز درست کیا - غلام نے جام پیش کئے اور دور چلا - مغیرہ نے یزید کی تعریف میں چند اشعار گائے اور خاموش ہوگئی - عمر بن اسد ندیم خاص نے بادشاہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے - حسین لونڈیوں نے حسن کی شعرائے کرم کی شجاعان میدان نے سپہگری کی تعریفیں شروع کیں "

" دوسرا دور شروع ہوا اور غلام کے اشارے سے ایک اور لونڈی نے اپنا ساز چھیڑا - دیر تک یہ محفل گرم رہی - رقص و سرود اور شراب کے جلسے جمے رہے - جب نشہ زور شور کا ہوگیا اور تمام اراکین دربار مزے میں آگئے تو عمیر اٹھا یزید کے قدموں کو بوسہ دیا اور کہا "

" خلیفہ کے اقبال سے اس وقت رعیت کو وہ اطمینان اور خوشی نصیب ہے جو عہد اول اور دوئم میں بھی نہیں ہوئی - یہ محض خدا کی برکت ہے کہ خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں اور ہر طرف سے اطاعت کے نعرے کانوں میں آرہے ہیں "۔

ایک افسر " خوشنودی کی تو یہ کیفیت ہے کہ خلافت یزیدی میں جو محبت مسلمانوں کو خلیفہ سے ہے وہ صدیقی اور فاروقی میں نہ تھی "

دوسرا " آخر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی کا ذکر ہے ! برسوں نہیں گزرے صدیاں نہیں گزریں یہ بات کس کو

نصیب ہوئی کہ رعیت پروانہ کی طرح قربان ہے "۔

یزید:۔ "میں چونکہ حق پر ہوں اس لئے خدا میرے ساتھ ہے "۔

متفقہ آواز:۔ "لاریب لاریب "۔

عمیر:۔ "بات اصل یہ ہے کہ چاروں خلفا محض زہد و عبادت کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے ضرورت یہ تھی کہ کائنات کی ہر چیز کا مطالعہ کرتے، اللہ جمیل ویحب الجمال انکا دربار سدا حُسن سے محروم رہا یہ تو کچھ حضور ہی نے اچھی طرح اسلام کو سمجھا "۔

دوسرا امیر:۔ "حُسن ہی پر کیا منحصر ہے۔ شراب کے معاملہ میں بھی خلفاء نے زیادتی کی۔ قرآن نے اجتناب کہا ہے حرام قطعی نہیں کہا "۔

متفقہ آواز:۔ "بیشک بیشک "۔

شرارتوں کیلئے اتنا موافق ماحول پیدا کرنے کے بعد مولانا مرحوم عمیر کی زبانی یہ کہلواتے ہیں :۔

عمیر:۔ "حسینؑ کو دیکھئے کیا سوجھی ہے۔ بیعت سے انکار ہے "!

یزید:۔ "ابھی میری قوت کا اندازہ نہیں ہوا۔ یہ خیال ہوگا کہ والد بزرگوار کی طرح میں بھی صلح پسند ہونگا۔ میں وہ ہوں کہ چشم زدن میں ایک حسینؑ کیا تمام اہلبیت کا صفایا کر دوں "۔

عمیر:۔ "سنا ہے حسینؑ مدینہ سے مکہ گئے اور اب مکہ سے کوفہ پہنچے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کوفیوں کا ایک کثیر گروہ انکے ساتھ ہو گیا ہے اور ان کی بیعت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر کی ہے اور وہ خود پہنچ گئے یا صبح شام پہنچنے والے ہیں "۔

یزید:۔ "اچھا یہ رنگ ہے بصرے کا عامل کون ہے "؟

یزید کی زبانی یہ سوال بہت ہی معنی خیز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یزید اپنی سلطنت کے انتظامات سے اتنا بے خبر تھا کہ اُسے یہ بھی علم نہ تھا کہ بصرے کا عامل کون ہے۔ اس کے علاوہ اس سوال کے تیور سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ غرور و تکبر کے نشہ میں چور ہو کر امام کے خلاف اقدامات کرنے پر کس طرح آمادہ ہو گیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں عمیر کوئی طویل جملہ نہیں کہتا اس لئے کہ کہیں یزید کا وقتی جذبہ فرو نہ ہو جائے وہ چپکے سے کہدیتا ہے "عبید اللہ ابن زیاد"

یزید:۔ "حکم لکھو" **عمیر**: "حضور"

یزید:۔ "ہم نے آج کی تاریخ سے نعمان بن بشیر حاکم کوفہ کو معزول کیا۔ تم بصرہ کا ضروری انتظام کر کے کوفہ پہنچو اور جس قدر جلد ممکن ہو مسلم بن عقیل کو قتل کر کے ان کے تمام ہمراہی و معاونین کو نہ تیغ کرو۔ کوفیوں سے ہماری بیعت لو اور جس کو ذرہ بھر بھی تامل ہو اس کو قتل و غارت تاراج و برباد کرو۔ نیز جس قدر جلد ممکن ہو امام حسینؑ سے ہماری بیعت لو "۔

مولانا مرحوم نے مندرجہ بالا سطروں میں مخالفت امامؑ کی اس ابتدائی کاروائی کی تفصیلات جس خوبصورتی اور کامیابی سے بیان کر دی ہیں اس سے بہتر طور پر نہیں بیان کی جا سکتیں۔

منظر نگاری

مولانا مرحوم کی تصانیف میں تقریباً تمام محاسن بیان پائے جاتے ہیں۔ منظر نگاری کو لیجئے مرحوم نے اپنی تصانیف میں ایسے گوناگوں مناظر قلمبند فرمائے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر چشم تماشا متحیر رہ جاتی ہے مثلاً "بنت الوقت" میں طوفان کا سماں ملاحظہ ہو:۔

"پانی کی یہ آفت تھی کہ گھروں میں اور سڑکوں پر ٹخنے ٹخنے اور کمر کمر پانی ہی پانی تھا۔ ہماری آنکھیں وہ جھڑیاں جنکو اب آنکھیں ترستی ہیں "پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل" دیکھ چکی ہیں مگر یہ دہونتال پانی ایسا پڑا کہ خلقت چیخ اٹھی۔ عصر کے وقت خاصا اچھا صاف آسمان تھا۔ ابر کا ٹکڑا نہ بادل کا پتہ کہ قبلہ کی طرف سے گھٹا اُٹھی۔ دن بیشک برسات کے تھے آدھا اساڑھ اور آدھے سے زیادہ ساون اس طرح نکل گیا کہ پانی کی بوند تک نہ پڑی۔ . . . گھٹا کی صورت عید کا چاند ہو گئی۔ مسجدوں میں نمازی، دکانوں پر کاروباری، سڑک پر راستہ چلنے، دفتروں میں مرد، گھروں میں عورتیں اور انگنائی میں بچے ابر کو دیکھتے ہی اُچھل پڑے۔ مغرب کے وقت بارش شروع ہوئی۔ رات بھر مینھ پڑتا رہا۔ دوسرا دن، چوتھا دن اور پانچواں دن۔ دس روز وہ لگاتار مینھ پڑا ہے کہ خدا کی پناہ محسن پور اور سعادت گنج کا شہر تھا ویسی ہی عمارتیں کچی بھی پکی بھی۔ مٹی کی بھی چونے کی بھی۔ کاغذی محل تھے نہ سنگین قلعے۔ مینھ کا یہ حال کہ دو گھنٹہ جم کر پڑا ذرا ہلکا ہوا۔ ابھی تھمانہ تھا کہ پھر اندھیری دے آیا اور دھائیں دھائیں پڑنے لگا۔ مینھ سے زیادہ ہوا تھی کہ کسی طرح کم ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ جھکڑ تھے کہ الامان الحفیظ۔ ساتویں روز آدھی رات کے وقت اس زور کا پانی پڑا ہے کہ دیکھا نہ سُنا۔ مکان بول اٹھے اور خلقت چیخ اٹھی۔ ہر طرف سے دھواں دھوں کی آواز تھی مکانوں کا ستھراؤ ہو گیا۔ کچے اور پکے محلسرا اور حویلی سب کا اللہ بیلی تھا۔ ٹپکا تو کبھی کا لگ چکا تھا مگر اس سے صرف بے آرامی تھی یا اب جان کے لالے پڑ گئے تو جس کے جہاں سینگ سمائے گھس گیا کہ کسی طرح جان تو بچے۔ تین دن اور تین رات یہی حالت رہی اس حساب سے چوتھے اور اُس حساب سے کہیں گیارہویں روز جاکر مطلع صاف ہوا تو لوگوں کی جان میں جان آئی۔ مگر کوئی گلی کوئی جگہ کوئی کوچہ اور کوئی بازار ایسا نہ تھا جہاں اینٹوں کے انبار اور مٹیوں کے پہاڑ نہ چنے ہوئے ہوں۔ قحط نے پہلے ہی مصیبت ڈھا رکھی تھی۔ طوفان نے اور بھی رہا سہا خاتمہ کر دیا۔ مرمت یا از سر نو تعمیر تو درکنار اتنا تک پاس نہ تھا کہ ملبہ اُٹھوا کر رستے صاف کر دیتے۔"

مولانا مرحوم نے اشیاء اور مناظر کی مرقع کشی کی طرح انسانوں کے حلیے بھی خوب ہی بیان کئے ہیں" بنت الوقت میں ایک بوڑھے مغل کا حلیہ دیکھئے:۔

"تھے تو بڈھے اور بڈھے بھی کھوسٹ مگر مرزائی کس بل موجود تھا۔ داڑھی چڑھی ہوئی، موچھیں مڑی ہوئی خضاب لگا ہوا، کمر پٹیا بندھا ہوا . . . . اس کینڈے کے انسان اور بگڑے دل آدمی تھے کہ تقریر اور گفتگو کو چھوڑ کر باوجودیکہ بدن میں رعشہ اور کمر جھک گئی تھی ہاتھ پاؤں سے بھی وحید جیسے دو کو بہت تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔"

ایک بڑے میاں کے تیور آپ دیکھ چکے اب نانی عشو میں ایک بڑی بی کی ہیئت کذائی ملاحظہ فرمائیے:۔

بی عشو کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر سُرخ لباس ان کا جزو بدن تھا۔ مسّی کی دھڑی۔ پانوں کا لاکھا، پور پور مہندی

الغاروں تیل اور دنبالہ دار کا جل اُن کا ایمان - اس پر جھانجن اور پازیب کی جھنکار ان کی رفتار کا ڈھنڈورا ۔"

نثر میں شاعری مولانا کا قلم گوناگوں قوتوں کا مالک ہے کبھی وہ سادے سادے لفظوں میں حقائق وواقعات کی مرقع کشی کرتے ہیں تو کبھی ان حقائق وواقعات کو ایک شاعر کی طرح رنگین بیانی کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ یہ رنگین بیانی اپنے اندر زور واثر رکھتی ہے کہ اس کے مطالعے سے ناظر پر بالکل ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی بہترین شعر کے سُننے سے پیدا ہوسکتی ہے۔ "وداع خاتون" کے چند پراگراف ملاحظہ ہوں :-

" باغبان کی ہزار ہا توقعات کے سایہ میں ننھا سا پودا لہلہا لہلہاکر پروان چڑھ رہا تھا - سبز پتیاں دن بھر تمازت آفتاب کی آغوش میں پھولتیں، اور رات کو جب متحرک ذرات خاموش ہوجاتے تو پودہ سرسرا سرسرا کر ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتا، شبنم کے آبدار موتی اس کا منہ چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمہ شب پر صبا ٹھنڈے جھونکوں کا غسل دیتی ۔"

" پودہ بڑھ رہا تھا ـــــ سرسرا سرسرا کر، لہلہا لہلہاکر کس کو خبر تھی کہ یہ پودہ کیسے کیسے گل کھلائے گا - اس کا پہلا پھول بہار حُسن کو معطر کریگا اور شرگیں نگہ عروس اس کی خوشبو سے ہمکنار ہوتی ہوئی بلند ہوگی - اس کی نازک پنکھڑیاں شب عروس کی گود میں کھیلیں گی اور سُرخ آویزے ان کی بہار پر قربان ہوں گے ۔"

" پودا پروان چڑھ رہا تھا - پھول پھول کر اور جھوم جھوم کر ۔"

بہار کا نقشہ آپ نے دیکھ لیا اب خزاں کا وہ مرقع عبرت ملاحظہ فرمایئے جسے جناب مرحوم نے اسکے بعد ہی پیش فرمایا ہے :-

" جب بہار خزاں سے بدلیگی اور لُو کے تند وگرم جھونکے شاداب وسبز پتوں کو جھلسیں گے - ہری ہری کونپلیں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کا دامن بھر دینگی، اُس وقت یہ نازک پودہ اپنی پوری طاقت سے خزاں کے مقابلہ کو آگے بڑھے گا - ایک دردانگیز کشمکش ہوگی اور نظام عالم کا ایک پر لطف قہقہہ جو بجلی بن کر گرے گا فتح کا سہرا خزاں کے سر باندھتا ہوا اس ہونہار پودے کو تاراج وبرباد کردے گا - لیکن اس سے کچھ پہلے جب بلبل آخری مرتبہ شاخ گل پر جھولیگی یہ آخری پھول مرجھانے سے قبل ہوا کو بدستور معطر کریگا! کون جانتا تھا جس کا پہلا پھول زینت عروس تھا اس کا آخری پھول آرائش قبر ہوگا! جس کے پہلے پھول نے دلہن بنایا اسی کو آخری پھول قبر میں دیکھے گا - انسانی پودا بھی قبر بسانے کو دلہن بن رہا ہے، جس کے ساتھ ارمانوں کا ڈھیر ہوگا - یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور اس لئے پودہ چاروں طرف جھار رہا ہے ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر ۔"

مندرجہ بالا عبارت میں جس حکیمانہ وشاعرانہ انداز میں تشبیہات واستعارات سے کام لیا گیا ہے اور محاکات وتخیل کا جو نظر افروز گلدستہ سجایا گیا ہے اس کے لئے مولانا راشد الخیری ہی کے سے چابکدست صاحب کمال کی ضرورت تھی - انہیں مقامات پر نثر نظم کی ہم پلہ نظر آتی ہے - مولانائے مرحوم کے اس کمال کی مثالیں ان کی تصانیف میں اتنی زیادہ ہیں کہ دل نہیں چاہتا کہ ایک ہی مثال پر اکتفا کی جائے - لیکن وہی کمی فرصت وضرورت اختصار کی مجبوری ؎

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار　　گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

پھر بھی ایک مثال اور ملاحظہ ہو۔ مصنف مرحوم تحفۂ شیطانی میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جس وقت افواجِ خداوندی کا سپہ سالار میکائیل یہ واقعات بیان کر رہا تھا تو اس کی آنکھ سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور جسم کا کوئی حصّہ ایسا نہ تھا جہاں سے آگ کی چنگاریاں نہ نکل رہی ہوں۔ ملائے اعلیٰ کی ہر شے اس وقت ساکت تھی حتیٰ کہ دودھ اور شہد کی نہریں بھی خاموشی سے اس کا منہ تک رہی تھیں۔ طیور اپنی راگنیاں بھول چکے تھے۔ ہوا اپنی موسیقی ختم کر چکی تھی اور فلک چہارم سے لیکر جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا عرش معلےٰ تک سناٹا طاری تھا صرف ایک موقع پر جب میکائیل جلال عزازیلی کی تصویر الفاظ میں اُتار رہا تھا حوروں کے ایک دستے نے "لعنت، لعنت" کے نعرے بلند کئے۔"

زور بیان علامہ مرحوم کی انشا پردازی کے محاسن کے ضمن میں آپکا زور بیان خاص طور سے قابلِ تذکرہ ہے۔ آپ کی تصانیف میں خطیبانہ انداز بالعموم پایا جاتا ہے خاص کر جب آپ کسی کردار کی زبانی کوئی تقریر قلمبند کرتے ہیں تو اس کے زور کی انتہا نہیں رہتی۔ ذیل میں "عروس کربلا" سے اسی قبیل کی ایک تقریر ایک راسخ العقیدہ خاتون کی زبانی نقل کی جاتی ہے۔ موقع وہ ہے جب مس روز (کلثوم) کو اس کے مفروضہ عیسائی والدین ترک مذہب نہ کرنے پر طرح طرح کی عقوبتیں دیکر ایک بوسیدہ اور پُرانے برج میں بند کرتے ہیں۔ روز اس وقت کہتی ہے:۔

"میں جس طرح پہلے فرمانبردار تھی اُسی طرح آج ہوں، اور جس طرح آج ہوں اسی طرح مدت العمر رہوں گی۔ صداقت ایک جوہر ہے جس کے سامنے دنیا کا ہر دکھ سکھ اور ہر مصیبت راحت ہے۔ اگر یہ قید واقعی مجھے تکلیف دہ ہے تو یہاں بھی میرا ایمان مجھے تسکین دیگا جس پر راحت کیا سلطنت بھی قربان ہے۔ یہ موت میرے لئے باعث فخر ہوگی اور یہ اذیت موجب عشرت، برج کا اندھیرا فضول، اژدھوں کی پھنکار لغو، سانپوں کا اندیشہ لچر اور تنہائی کا خوف پوچ، میرے ساتھ ایمان کی روشنی اطمینان کی سپر اور خلوص کے ہتھیار ہوں گے۔ اور میرا ایمان ہے کہ میں یہاں کے ہر دشمن پر غالب آؤں گی۔ راستی کے قدم کو دنیا کی کوئی طاقت ڈگمگا نہیں سکتی۔ خلوص کے سانس کو زندگی کا کوئی طوفان بند نہیں کرسکتا۔ میں نے جو کہہ دیا وہ اٹل اور جو کہتی ہوں وہ پہاڑ۔ آپ قید کیجئے شوق سے، مار ڈالئے خوشی سے لیکن یہ توقع نہ رکھئے کہ آبائی مذہب چھوڑکر آپ کا طریقہ اختیار کروں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کبھی میری زبان، میرے ہاتھ، میرے پاؤں، میرے قول، میرے فعل سے آپ کے کان آپ کی آنکھیں توحید کی حمایت اور تثلیث کی توہین دیکھیں تو کاٹ ڈالئے یہ زبان، گھونٹ دیجئے یہ گلا اور توڑ ڈالئے یہ ہاتھ۔ لیکن میرے عقیدے میں، میرے یقین میں دخل نہ دیجئے۔ آپ کا کرم آپ کا احسان آپ کا نمک میری گردن پر، میرے سر پر میری رگ رگ میں، میری مجال نہیں، ہمت نہیں، منہ نہیں کہ آپ کا مقابلہ کرسکوں۔"

سیرت نگاری انشا پردازی کے جوہر بہت کچھ خداداد ہوتے ہیں۔ انسانوں میں جس طرح کچھ لوگ فطری شاعر ہوتے ہیں اُسی طرح فطری انشا پرداز بھی ہوتے ہیں۔ ان کی عبارت کے گوناگوں محاسن ان کی فطری صلاحیتوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اور ایک فطری انشا پرداز عام اس سے کہ اس کی علمی حیثیت کچھ بھی ہو اُسے مطالعہ کتب و مشاہدہ

فطرت کے مواقع کتنے ہی کم ملے ہوں جب کچھ لکھے گا تو اس کی تحریر میں ایک امتیازی شان ضرور نمایاں ہوگی، لیکن سیرت نگاری کے لئے انشا پردازی کی نظروں میں وسعت اور اس کے مشاہدات کا کثیر ہونا ضروری ہے۔ جب تک کسی ادیب میں عمق نظر ذوق تجسس اور صلاحیت فکر و غور نہ ہوگی وہ اچھا سیرت نگار نہیں ہو سکتا۔ مولانا راشد الخیری کی تصانیف یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک صاحب نظر ادیب تھے اور انہوں نے سیرت نگاری کے سے دشوار کام میں بھی کامیابی حاصل کی۔ وہ عورتوں کی سیرت خاص طور سے کامیاب رہے ہیں "عروس کربلا" میں رذو کی سیرت "صبح زندگی" میں نسیمہ کی سیرت اور "حیات صالحہ" میں صالحہ کا کردار سیرت نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اور "بنت الوقت" میں نفسیاتی حیثیت سے فرخندہ کی سیرت پر وحید کی سیرت کا اثر بہت خوب دکھایا ہے۔

اوریجنلٹی ہمارے شعرا کی طرح ہمارے نثر نگار مصنفین کے یہاں بھی اوریجنلٹی یا ندرت خیال عام طور پر کم ہے ان کے ابتدائی دور کی لکھی ہوئی حکایتیں اور داستانیں ندرت خیال اور پرواز تخئیل کا ثبوت ضرور دیتی ہیں لیکن بعد کے مصنفین اور خاصکر عہد رواں کے اہل قلم اوریجنلٹی کے اعلیٰ وصف سے بہت حد تک محروم ہیں۔ علامہ مرحوم کی بعض تصانیف میں بھی ایک قسم کی یکرنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی موصوف کے یہاں کافی اوریجنلٹی موجود ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "تمغۂ شیطانی" تو تمامتر اوریجنلٹی اور اُردو ادب میں بالکل اچھوتی چیز ہے۔ اس کتاب میں تخئیل کی وسعت، بیان کی دلآویزی اور محاکات پر قدرت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس فسانہ میں نہایت اچھوتے عنوان سے آسمانی فرشتوں میں شیطانی کارپردازیوں کی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ اور آخر میں شیطان کی زبانی ہر قصہ کا تجزیہ بھی خوب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ اور غالباً مولانا کی سب سے بہتر تصنیف ہے۔

حمایت نسواں مولانا راشد الخیری مرحوم نے طبقۂ نسواں کی حمایت کے سلسلے میں جو درخشاں خدمات انجام دی ہیں اُن سے دنیائے ادب ناواقف نہیں ہے۔ میرے نزدیک ملک کے کسی اہل قلم نے صنف نازک کی اصلاح کی اتنی سعی نہیں جتنی مولانا مرحوم نے تاعمر جاری رکھی۔ آپ نے اپنی متعدد تصانیف میں اس پر اپنا غیر معمولی زور قلم صرف فرمایا اور نسوانی زندگی کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی ڈالی۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح و بہبودی سے متعلق تصانیف قلمبند کرنے میں مولانا راشد الخیری نے اپنے حقیقی پھوپا اور استاد مولانا نذیر احمد دہلوی کی تاسی کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بہت کامیاب تاسی کی ہے مولانا راشد الخیری نے اپنے فسانوں میں عورتوں کے کیرکٹر بہت نمایاں رکھے ہیں۔ اچھے اور بُرے دونوں طرح کے کیرکٹر پیش کرکے یہ واضح کیا ہے کہ مسلمان عورتیں پہلے کس درجہ ترقی یافتہ اور محاسن ذاتی سے متصف تھیں اور اب ان کی حالت کتنی خراب ہوگئی ہے اور جہالت و تنگ نظری نے انہیں کس پستی میں پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے شریف عورتوں کے بہترین زیورات مذہب پرستی عفت شعاری پاکبازی شرم و حیا نماز روزہ ایثار و خلوص محبت و مروت سلیقہ مندی اور کفایت شعاری بتائے ہیں۔ مولانا نے اپنی تصنیف "ستونتی" میں ایک مسلمان

بیوی کا معیاری کردار پیش کیا ہے اور اسے ایک تعلیم یافتہ باوفا صاحب ایثار اور شوہر پرست عورت دکھایا ہے اس سلسلے میں انہوں نے اپنی تصانیف "صبح زندگی" "شام زندگی" اور "شب زندگی" میں متعدد نسوانی کردار کی مکمل مرقع کشی کی ہے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کے تعلقات اچھے ہیں تو گھر جنت ہے اور اگر تعلقات برے ہیں تو گھر جہنم ہے۔ عورت کو نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر و تخریب کا اختیار ہے بلکہ اس کے قابو میں اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی بھی ہے یعنی اگر عورت چاہے تو مرد کی زندگی قابل رشک بن سکتی ہے اور اس کی اولاد مستقبل کے لئے نیک نہاد و باکار بن سکتی ہے۔ لیکن اگر عورت ہی میں برائیاں ہیں تو پھر گھر کی تباہی کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ مولانا راشد الخیری نے تہذیب جدید کی بدسلیقہ اور غیر ذمہ دار لڑکیوں کے عیوب بھی واضح کئے ہیں اور مسلمان گھرانوں کے علاوہ دیگر اقوام و مذاہب کی عورتوں کی سیرت اور انگریز زن و شو کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ "صبح زندگی" میں انہوں نے ڈاکٹر نذیر احمد کی پوری طور پر تاسی کی ہے۔ ایک نیک صفات لڑکی نسیمہ کی دلپذیر سیرت پیش کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی نسیمہ کو کسی کا حق نہ مارنے، جانوروں پر ظلم نہ کرنے اور دکھیاروں کی مدد کرنے کی بار بار تعلیم دی ہے اور اس تعلیم کا یہ اثر دکھایا ہے کہ نسیمہ ہمیشہ دوسروں کے حقوق کا تحفظ کرتی جانوروں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہتی اور حاجتمندوں کی مدد کرتی۔

"حیات صالحہ" میں مولانا نے سوکنوں کا جلاپا اور شوہر پر بیویوں کا حاوی ہونا دکھایا ہے اور یہ واضح کیا ہے بیویوں کے اشاروں پر چلنے والے مرد اپنی پیاری اولاد کے کیونکر دشمن بن جاتے ہیں اور بیویوں کی باہمی رقابت گھر کیلئے کیسی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

مولانا کی بعض تصانیف میں قدامت پرستی و تجدد پسندی میں تصادم بھی دکھایا گیا ہے مثلاً جوہر قدامت میں دو بہنوں کا قصہ لکھا گیا ہے ایک بہن مشرقی معاشرت اور مشرقی وضع و اطوار کی حامی ہے اور دوسری مغربی تہذیب کی دلدادہ ہے۔ دونوں کے خیالات میں جو کشمکش ہوتی ہے اس کا بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے۔

"وداع خاتون" خود مصنف کی بہو رازق دلہن کے سبق آموز سوانح اور دلگداز نوحۂ مرگ پر مشتمل ہے۔ مصنف کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے اس میں درد بہت ہے۔ "پرستار محبت" میں دو شریک زندگی کی باہمی محبت دکھائی گئی ہے جہاں آرا ماں کی مرضی کے خلاف شادی کرتی ہے۔ ماں اس سے ناراض ہو کر مقدمہ چلاتی ہے۔ جہاں آرا عدالت میں بچے کو مار ڈالتی ہے، جب میاں بیوی چھوٹتے ہیں تو شوہر اپاہج ہو جاتا ہے، وہ اسے ٹھیلے پر لئے ہوئے پھرتی ہے، آخر میں جوگن بن کر اس کی قبر کی والہانہ پرستش کرتی ہے اور بعد میں ایسے حالات رونما ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی ماں کے ہاتھوں ماری جاتی ہے۔

"نوحۂ زندگی" میں آپ نے عقد بیوگان کی پرزور تائید کی ہے جاہل شریف مسلمانوں کی اس معاملۂ خاص میں جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور آخر میں عقد بیوگان کا نتیجہ اتنا خوشگوار دکھایا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "خدا کرے حشمت کی طرح ساری نوجوان بیواؤں کے دن پھریں۔"

"تفسیر عصمت" میں بھی طبقہ نسواں کی حمایت کی گئی ہے اور متعدد اصلاحی تقریریں درج کی گئی ہیں۔

تعلیم اخلاق مولانا راشد الخیری کی تصانیف میں کثرت سے اخلاقی تعلیمات موجود ہیں۔ متعدد تصانیف تو اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور ہر مقام پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی ہمدردی ظاہرداری میں نہیں ہے بلکہ خلوص میں ہے۔ دنیا کی ناپائیداری اور حیات انسانی کی بے ثباتی دولت و ثروت کی بے وفائی کا نوحہ مولانا مرحوم کا پسندیدہ موضوع ہے اور آپ نے جہاں بھی موقع پایا ہے اس پر مسلسل تقریریں قلمبند فرمائی ہیں۔

محبت وطن مولانا مرحوم کی تصانیف کی ایک نمایاں خصوصیت حب الوطنی بھی ہے۔ دہلی سے آپ کو معمولی محبت نہ تھی بلکہ عشق تھا۔ قدم قدم پر آپ نے اس کی عظمت رفتہ کی داستان رو رو کر بیان کی ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "بیلہ میں میلہ" ہے اور اس تصنیف میں اجڑی ہوئی دلی کی کہانی اس کی شہزادیوں کی زبانی لکھی گئی ہے۔ اس فسانے سے خاص طور سے مولانا مرحوم کی وہ محبت وطن ظاہر ہوتی ہے جو آپ کے مصور غم کہلائے جانیکا باعث ہے۔

زندہ دلی مصور غم جہاں الم انگیز واقعات کے پراثر بیان میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہاں آپ کی بعض تصانیف میں ہلکی سی ظرافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً "عروس کربلا" میں روزکی ابن زیاد یا عمر سعد سے جو گفتگو درج کی گئی ہے اس میں تریا چلتر کی مثال زندہ دلی کے ساتھ پیش کی گئی ہے یا "بنت الوقت" میں قدیم وجدید تہذیب کا تصادم خوش مذاقی کے ساتھ دکھایا گیا ہے اور ایک مقام پر میراثنوں کی نقل بہترین عنوان سے کی گئی ہے۔ نانی عشو ایک مستقل ظریفانہ فسانہ ہے۔ اور آجکل کے ظرافت نگار اس کے پاکیزہ معیار سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا راشد الخیری کی انشا پردازی اور ان کے خیالات سے تفصیلی بحث کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ان کے لامحدود خزینۂ ادب کے چند موتیوں کی تڑپ دکھائی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ مولانا کے کمالات کا احصار نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ مولانا راشد الخیری مرحوم کی تصانیف پر جب ناقدانہ نظر ڈالی جاتی ہے تو آپ کے یہاں بعض اسقام بھی دکھائی دیتے ہیں مثلاً تاریخی تصانیف میں بعض واقعات غیر صحیح ہیں "عروس کربلا" میں حضرت زین العابدین کو امام حسینؑ کا منجھلا لڑکا لکھا گیا ہے، حضرت علی اصغر کو پہلا شہید بتایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ناولوں کا پلاٹ اکثر غیر فطری ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیرکٹروں کا خاکہ پہلے پیش نظر رکھ کر انہیں کے بیان کے لئے پلاٹ تیار کر لئے گئے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مکالمے اپنے جوش اور زور کی وجہ سے بعض اوقات غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ بلوچن کے تین رنگ میں صنوبر کی شدت طاعون میں گفتگو فطرت سے دور ہو گئی ہے یا ماہ عجم میں مسعود کی فریاد اور روز اور عبید کی اکثر تقریریں یا "بنت الوقت" میں آکا مرزا کی تقریر (ان اعتراضات کے معقول جوابات اسی پرچہ کے کئی مضمونوں میں موجود ہیں۔ - ایڈیٹر) اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مکالمہ

میں بہت زیادہ طول دیدیتے ہیں - ایک ایک شخص ڈیڑھ ڈیڑھ صفحے کی تقریر کرجاتا ہے - جیسے "نوحۂ زندگی" میں کوتوال کی گفتگو - اس کے علاوہ مکالمہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے بلا لحاظ سیرت سب کی گفتگو لچھے دار ہوتی ہے - مولانا اپنی تصانیف میں شروع سے آخر تک پند ونصیحت سے کام لیتے ہیں اور ہر موقع پر ناصح کی حیثیت میں نظر آتے ہیں - ان وجوہ سے مولانا کی تصانیف میں بعض مواقع پر تصنع اور بناوٹ نمایاں ہوجاتی ہے اور اثر میں بجائے زیادتی ہونے کے کمی نظر آنے لگتی ہے - دبی زبان سے یہ کہنے کی بھی اجازت چاہتا ہوں کہ مولانا کو زبان پر بڑی قدرت ہے لیکن اسے خالص ٹکسالی اردو کیلئے محدود نہیں کیا جاسکتا - وہ زبان کے استعمال میں آزادی پسند تھے اور اپنی تصانیف میں ایسی ایسی لفظیں اور محاورے استعمال کرگئے ہیں جنہیں ثقہ حضرات نظر تامل سے دیکھیں گے - لیکن یہ تمام باتیں نتیجہ ہیں مولانا کی اُس غیر معمولی قدرت انشا پردازی کا جو یک جنبش قلم طوفان برپا کردیتی اور اپنی وسعت وہیبت سے دلوں کو لرزاں کردیتی تھی - پھر یہ اسقام اس امر کا بھی ثبوت ہیں کہ مولانا مرحوم انسان ہی تھے ان کا شمار بھی دنیا کے انہیں بڑے سے بڑے مصنفین وشعراء میں کیا جاسکتا ہے جو باوجود تمام کمال فن کے غلطیوں سے مبرّا نہ رہ سکے - دراصل انسانی دماغ کے لئے یہی امر موجب فخر ہے کہ وہ خطا ونسیان کا شکار ہونے کے بعد بھی اتنی ترقی کرسکتا ہے - اگر مولانا راشد الخیری ہماری طرح کے ایک انسان نہ ہوتے اور غلطیوں سے پاک وصاف کوئی فرشتہ ہوتے تو آج ہم ان کی اتنی قدر ومنزلت عزت ومحبت نہ کرسکتے - ان کے یہی انسانی صفات تھے جنہوں نے ان کی جدائی کو ہمارے لئے ناقابل برداشت بنادیا ہے اور ہم اُن کے کمالات کا اعتراف کرکے انکی جدائی کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے بیچین نظر آتے ہیں - وہ ایک فانی نوع سے تعلق رکھنے کیوجہ سے اس دنیا سے روپوش ہوگئے - لیکن ان کے روحانی فیوض رہتی دنیا تک ہم میں موجود رہیں گے اور ہماری نسلیں فخر ومباہات کے ساتھ یہ تذکرہ کرتی رہیں گی کہ ہم میں راشد الخیری سا ایک بہترین ادیب وانشاپرداز ایک جانسوز حامیٔ نسواں اور ایک مجموعۂ صفات انسان گزرا ہے - خدا اُن کی روح کو جنت نعیم میں ابدی سکون عطا فرمائے -

آہ! مصورغم

(از خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب سابق ڈپٹی کمشنر سی-پی)

مصورغم حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم کی وفات حسرت آیات سے زبان اُردو کے ادبی حلقہ میں ایک سخت اور ناقابل تلافی نقصان واقع ہوا ہے - مرحوم کی تصانیف کا سلسلہ وسیع تھا جو ہمیشہ کے لئے اُنکی یادگار رہے گا - حلقہ اناث کی تعلیمی ترقی اور تربیت کے لئے مرحوم نے مسلسل کوشش کی جس کے سبب سے تعلیم نسواں کے متعلق خیالات میں ایک عظیم تبدیلی واقع ہوئی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ پورے طور پر ادا نہیں ہوسکتا - اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے -

علامہ مرحوم کی یادیں

(از لالہ جگ جیون لال صاحب بھٹناگر بی۔اے دہلوی)

جناب مولانا راشد الخیری صاحب ہندوستانی تہذیب کی عمارت کی وہ مضبوط اینٹ تھے جس کے نکل جانے سے تمام منزل کے گر جانے کا احتمال ہو رہا ہے۔ پرانی وضعداری اور مشرقی رنگ کے دلدادہ ہندوستانی تمدن کے پرستار اور خوددار بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی تمدن کا سیلاب امڈا چلا آرہا ہے۔ اور شاید کچھ عرصے بعد وہ رہی سہی ہندوستانی تہذیب کو بھی تہ وبالا کر دے گا۔ لیکن وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک ایک مضبوط چٹان کی طرح مضبوط اپنی جگہ پر قائم رہے اور دنیا کو دکھا گئے کہ اندھا دھند مغربی تہذیب کی تقلید کرنا ہندوستانیوں کو نہ گھوڑا رکھے گا نہ گدھا۔ بلکہ خچر بنا دے گا۔

انگریزی پر آپ کو کافی عبور تھا۔ لیکن آپ نے کبھی اپنی کسی تصنیف میں یا گفتگو میں سوائے سلیس اُردو کے انگریزی یا کسی دوسری زبان کو مخلوط نہ کیا۔ یہ ہے وضعداری۔ ہم ماں کے پیٹ سے بعد میں پیدا ہوتے ہیں پہلے اپنے جذبات خیالات اور روش کو دوسری تہذیبوں کے ساتھ مخلوط کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ ہم انکو اپنا بنا سکتے ہیں نہ خود اُن کے بن سکتے ہیں۔ ہم اپنی کمائی سے خود مالا مال ہونا بھول گئے۔ اور دوسروں کا مال و متاع چُرا کر قرض لے کر مانگ کر مالدار ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

اس بات کو مولانا مرحوم نے اپنی تصانیف میں اچھی طرح غلط ثابت کر کے دکھا دیا کہ ہم اپنی زبان اور اپنے جذبات میں وہ اثر پیدا کر سکتے ہیں کہ پتھر کا دل پگھل کر موم ہو جائے اور مردہ دلوں میں جان پڑ جائے۔ مغربی تہذیب کے پرستار بڑی شد و مد سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہر جگہ انگریزی تعلیم کا چرچا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہ دلیل کسی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن یہ بات اپنی خالص زبان کو ترقی دینے میں تو مانع نہیں ہو سکتی۔ جہاں انگریزی فرانسیسی یا جرمن زبان کی ضرورت ہو وہاں اگر اُردو ہندی۔ عربی یا سنسکرت استعمال کی جائے تو دوراندیشی سے بعید ہے لیکن جہاں ان کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی اگر ان کو کام میں لایا جائے تو سوائے ہماری ادبی مفلسی کے اور کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ اگر انگریزی بولنے کی ضرورت ہے تو انگریزی ہی بولئے۔ جہاں اُردو کی ضرورت ہے وہاں کھچڑی نہ بنائیے۔

چند سال پیشتر جس وقت الہ آباد سے ہندی رسالہ چاند نے اپنا اردو ایڈیشن نکالنا شروع کیا تھا اور اُس کی ادارت کی باگ ڈور جناب منشی کنہیا لال صاحب کے ہاتھ میں تھی تو مجھے ارشاد ہوا تھا کہ جناب مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی قلم کے چند جواہر ریزے حاصل کرنے کے لئے اُن سے درخواست کروں۔ اُس وقت جناب علامہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے میں مضمون حاصل نہ کر سکا۔ مگر آپ کی شفقت آمیز گفتگو کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔

مولانا مرحوم نے اپنے دونوں لائق فرزندوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری کا پوری طرح احساس کر کے

علم و ادب کے اُس خوشنما باغیچے کو جس کی کیاریوں کو اُنہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ اور اپنے دماغ سے معطر کیا تھا۔ دیکھ بھال کرتے رہیں۔ بلکہ زیادہ ترقی دیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُس معیار قابلیت تک پہنچنے میں ان دونوں نوجوان ادیبوں کو کافی عرصہ لگے گا۔ لیکن قطرہ قطرہ میشود دریا مرحوم والد کی دعا اور خدا کی عنایت سے وہ جلد اُسے جوئے کو جس میں صرف اب تک وہ سہارا لگائے ہوئے تھے پوری طرح اپنے کاندھوں پر رکھ کر حق وراثت ادا فرمائیں گے۔

جناب مولانا مرحوم میٹھی سلیس اور بامحاورہ اُردو کے قائل تھے۔ اور اپنی تصانیف میں انہوں نے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ بغیر عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کئے وہ اپنے مطلب کو ایسے سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ عوام کے دلوں کو مسخر کر لیں اور پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب رواں کر دیں جس طرح ایک اچھی تصویر دیکھکر آدمی اُس کی طرف کھچ جاتا ہے۔ یا گانا سُنکر اُس سے مسحور ہو جاتا ہے اُسی طرح مضمون کی روانی اور جذبات کے اظہار سے انسان پر رقت طاری ہو جاتی ہے یا دل میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے جب تک یہ نہ ہو مضمون روکھا پھیکا بے معنی اور پھسپھسا رہ جاتا ہے۔ جناب مولانا راشد الخیری صاحب اصلی معنوں میں مصور غم تھے۔ اور جہاں کہیں انہوں نے ایسی حالتوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ جذبات پر یہ قدرت احساسات پر یہ عبور واقعی یہ خداداد بات تھی جو درد آشنا دل ہی پیدا کر سکتا ہے۔

جناب مولانا صاحب مرحوم کی کئی قابل قدر تصانیف میری نظر سے گذری ہیں۔ واقعی وہ مفید لٹریچر ہے۔ بعض کتابیں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے لئے تصنیف فرمائیں۔ کچھ مستورات کی اصطلاح کے لئے تحریر فرمائیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو دارفتگان کی زندگی کا اصلی مرقع کہی جا سکتی ہیں۔ اور بے بسی کی مکمل تصویر ہیں۔ جناب کی تصنیف "نوبت پنج روزہ" پڑھ کر کون ایسا سنگدل انسان ہوگا جس پر رقت نہ طاری نہ ہوئی ہو۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ظفر کی زندگی کے پانچ مختلف ایام دنیا کی بے ثباتی اور ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ جناب بیتاب دہلوی کے ڈرامہ مہابھارت کے شروع میں ایک گانا ہے ؎

بھارت ویروں کی یاد میں یہ گانا بھی رونا ہے پانی نہیں ہے پاتر میں آنسوؤں سے منہ دھونا ہے

(یعنی ہندوستان کی بہادر ہستیوں کی یاد میں کچھ گانا بھی رونے کی طرح ہے۔ برتن میں پانی تو ہے نہیں یہ محض آنسوؤں سے منہ دھونا ہے) واقعی ہو بہو یہی نقشہ دل پر کھچ جاتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب مشرقی تمدن۔ سلطنت مغلیہ کی آخر ٹمٹماتی ہوئی شمع کا ذکر ہے۔ آپ نے ان کی یاد دلوں میں تازہ کر کے ثواب کمایا ہے اور اصلی حالات دنیا کے سامنے رکھے ہیں آپکی یاد آئندہ نسلوں کے دلوں سے محو نہ ہوگی۔ آپ کی علمی اور ادبی قابلیت کا بیان کرنے کی میں خود میں قابلیت نہیں پاتا اور بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ خدا کرے کہ بوڑھے جوان بچے اور بچیاں آپ کی تصانیف کو سر آنکھوں سے لگائیں اور اُن کی نصیحتوں پر عمل پیرا ہو کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچائیں۔

جناب مولانا صاحب مرحوم ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف ادیب اور شاعر ہی نہ تھے بلکہ آپ کی خانگی زندگی بھی نہایت کامیاب تھی آپ دل کے سخی اور طبیعت کے فیاض تھے جس کا اُن سے ایکمرتبہ واسطہ پڑگیا وہی گرویدہ ہوگیا۔ دوست احباب شناسا سب سے اُنکو بیحد خلوص تھا آپ کے متعدد ہندو احباب دوست تھے۔ جو آپکی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ آپ نے عصمت و بنات رسالے نکالکر نسوانی طبقے کی جو خدمات انجام دیں وہ قابل تحسین ہیں اور جب تک ایک بھی کاپی ان رسالوں کی باقی رہے گی اس مد میں جناب مولانا کا نام روز روشن کی طرح چمکے گا۔ افسوس صرف یہ ہے کہ خط اُردو ہونے کی وجہ سے اکثر ہندو دیویاں اِن رسالوں سے اور آپ کے خیالات سے مستفید نہ ہوسکیں۔ لیکن یہ خیال مولانا کو آخر دم تک رہا کہ چند کتابوں کا ہندی میں بھی ترجمہ کرایا جائے۔ تاکہ ہندی جاننے والی بیبیاں بھی جناب کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہوسکیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جناب مولانا صاحب کے ہونہار اور سعادت مند فرزند اکبر جناب رازق الخیری صاحب اپنے والد مرحوم کی اس آرزو کا خیال رکھتے ہوئے علم و ادب کے اُس نور کو اور جذبات کے اُس عطر کو پھیلا کر دنیا کو منوّر اور معطّر فرمائیں گے۔ اس کام میں انہیں دقتیں ضرور حائل ہونگی لیکن ہمت مرداں مدد خدا۔ اس کام کے لئے انہیں ایسے ادیبوں کی خدمات حاصل کرنا ہونگی جو اُردو اور ہندی دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہوں۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا انہیں اس عزم میں کامیابی عطا فرمائے۔

"آمنہ کا لال"

از شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب صدر شعبۂ السنۂ مشرقیہ
دہلی یونیورسٹی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لاکلام موجب خیر و برکت اور باعث اجر و ثواب ہے۔ ہاں ذکر کی صورتیں مختلف ہیں کوئی اچھی ہے اور کوئی بہت ہی اچھی۔ حقیقت اور صداقت اگر نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہے تو عقیدت بھی بشرطیکہ بربنائے محبت ہو اور ظل حقیقت ہو جلائے قلب و بصیرت کا ذریعہ ہے۔ بلکہ اُس ذکر حقیقت سے کہیں افضل ہے جو زبان سے نکلے اور گلے سے نیچے نہ اُترے۔ اس لئے کہ عقیدت صحیح مستلزم اتباع و عمل ہے اور گفتار حق کے ساتھ کردار حسن لازمی نہیں۔ لیکن وادی عقیدت کا صحیح راستہ فوز عظیم تک پہنچاتا ہے تو اس کے نامستقیم راستے درجات اسفل میں جا گراتے ہیں۔ جنہیں خیر و شر کی انتہائی منزل کہنا چاہیئے۔ انہیں دونوں کے درمیان اور بھی بہت سی منزلیں ہیں جو نہ خیر محض ہیں نہ شر محض۔

حضرت خیرالانام کا ذکر جو حقیقت میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ذکر ہے جہاں بھی ہو یا سنن کرامت آیات کی تعلیم کے طریقے پر بہرحال موجب ہدایت ہے اور ہدایت ہی ہر قسم کی خیر و برکت اور اجر و ثواب کا سرچشمہ ہے۔ اسی لئے اس ذکر کے مختلف طریقے وجود میں آئے مگر بعض حضرات افراط و تفریط میں

جا پڑے۔ اور اصلاح کی ضرورت ہوئی۔ یہ اصلاح بھی مدتوں سے ہوتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ کوئی سات سو برس ہوئے کہ علامہ ابن خوری نے یہ دیکھکر کہ میلاد خیر الانام کی محفلوں میں بے سروپا روایتیں بکثرت پڑھی جانے لگی ہیں۔ ایک رسالہ میلاد حضرت خیر الانام پر خود لکھا جو ابتک ملتا ہے۔

"آمنہ کا لال" بھی جناب مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک میلاد نامہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"مولود شریف کی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکیں اور ہو رہی ہیں مگر مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو رطب و یابس سے بالکل پاک ہو۔"

پھر اسی کو دہراتے اور کہتے ہیں:۔

"اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو عید میلاد اور مجالس میلاد کے صحیح حالات معلوم ہوں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مرحوم نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں میلاد کی عام مروجہ کتابوں کی ناقابل اعتماد روایات کو نہ آنے دیں اور جو کچھ لکھیں صحیح و معتبر لکھیں۔

اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیئے کہ اس قسم کی ایک صحیح اصلاحی کتاب کی ضرورت تھی۔ مرحوم نے اس کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھانا اور واقعی فائدہ اٹھانا قوم کی عورتوں اور لڑکیوں کا کام ہے۔ جن کے لئے مولانا نے یہ کتاب لکھی۔ اور جن کے اصلاحی مشاغل میں مولانا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ورنہ مولانا خود اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "مگر یہاں ذکر ولادت کے معنی دوستوں کی چہل پہل ہیں، ثواب ہو یا عذاب۔"

مولانا کا اصل میدان اصلاحی افسانہ ہے اور افسانہ بھی وہ جو تصویر غم ہو اور اس میدان میں وہ اپنے وقت کے یگانہ ہیں۔ لیکن اگر بضرورت اس میدان سے قدم باہر رکھا ہے تو اس کو توقع سے زیادہ نبھایا ہے۔ تخیل انکے دماغ کا خاص جوہر ہے۔ سادہ کاری اور واقعہ نگاری میں بھی ساتھ رہتا ہے۔ اس کتاب میں بھی کہیں لمبی لمبی تمہیدوں کی صورت میں اور کہیں تشبیہ و استعارہ و مبالغہ کے رنگ میں موجود ہے مولانا نے اس کو محسوس بھی کیا معذرت بھی کی۔ مگر وہی اپنے رنگ میں کہتے ہیں:۔

"تشبیہ و استعارہ مصنف کا جائز حق ہے اس کو مبالغہ سمجھنا غلطی ہوگی۔"

زبان کا کہنا کیا۔ دلی کی اور پھر راشد الخیری کی۔ بیان بھی اسکا بیان ہے جو کئی درجن کتابوں کا مصنف ہے۔ جسے جب بھی دماغ آسودہ ہوا لکھنے ہی سے سروکار رہا۔ اس نے جو کچھ لکھا خوب لکھا، یہاں تک کہ صاحب طرز ہوا اب وہ نہ دلی میں ہے نہ دنیا میں۔ مگر اُس کا طرز یادگار رہے گا۔ اور اس کی قدر وہ جانے گا جو اس کی سی تحریر لکھنا چاہے گا اور نہ لکھ سکے گا۔

حقوقِ نسواں پر علّامہ مغفور کی میسور میں تقریر

از محترمہ مریم یوسف علی صاحبہ بی۔اے

"مصور غم" حضرت علامہ راشد الخیری (اللہ اُن کی مغفرت فرمائے) ستمبر ۱۹۳۲ء میں میسور تشریف لائے تھے۔ یہ مسلمانان میسور کی نہایت خوش قسمتی تھی کہ ایسے دین دار روشن خیال بزرگ سے جو شرعی حقوق نسواں کے علمبردار اور بیواؤں کے ہمدرد اور قوم کے سچے خیرخواہ اور دہلی کی ادبیت کے آخری چراغ تھے۔اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یوں تو کئی سال سے ہماری خط و کتابت تھی اور خیال تھا کہ میری چھوٹی بہن (حمیدہ خانم ام-اے) کی تعلیم ختم ہوتے ہی ہم خود دہلی جاکر شرف نیاز حاصل کریں گے۔ مگر یہ ہماری بڑی خوش نصیبی تھی کہ میسور ہی میں علامہ مغفور سے شرف حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔جس صبح آپ نے سرزمین میسور پر قدم رکھا ہمیں علم ہوگیا اور اسی وقت ہم دونوں بہنیں قیام گاہ پر پہنچیں پہلے جناب بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی سادگی انکساری، ہمدردانہ الفاظ کا دل پر گہرا اثر ہوا۔کچھ دیر بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھے رہے۔پھر حضرت قبلہ کی اجازت سے آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔آپ نے شفقت پدری سے ہم دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔حمیدہ کو مرحومہ کی تعلیم کا حال سُنکر بیحد خوشی ظاہر کی اور جو حضرات موجود تھے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: "ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان اس بچی کی قدر کریں۔ مجھے اس بچی کو دیکھکر بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

علامہ مغفور کی میسور میں تشریف آوری کی خبر سُنکر لوگوں نے جو آنا شروع کیا تو جب تک ہم دونوں بہنیں حاضر رہیں برابر آتے ہی رہے۔خواتین بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو رہی تھیں۔لوگوں کے اصرار پر مردانہ لکچر کا بڑے پیمانہ پر انتظام ہوا۔ہال تعلیم یافتہ افراد سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔بعد حمد و ثنا کے لکچر شروع ہوا۔موضوع تقریر عورتوں کے شرعی حقوق پردہ اور تعلیم تھا۔علامہ مرحوم کے الفاظ درد سے بھرے ہوئے تھے۔سُننے والوں کے آنسو نکل آئے عورتوں کے حقوق کے لئے وہ بہت بلند آواز سے مردوں سے لڑ رہے تھے۔خلع، نکاح بیوگان ترکہ پدری اور تعلیم اناث پردہ مردوں کو متوجہ فرمارہے تھے ان کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولے جاسکتے کہ "یہ بیگمیں جنہیں تم نے لونڈیاں بنا رکھا ہے تمہارے گھر کی زینت ہیں۔لڑکیوں کو تعلیم دو۔آپس میں اتفاق و اتحاد سے کام لو عورت کو ہادی برحق نے اس کی خدمات کے معاوضہ میں جو حقوق عطا فرمائے ہندوستانی رسم و رواج اور مردوں کی ہٹ دھرمی نے غصب کرلئے اور طبقہ اناث کے جذبات فنا کر دئے۔ اور اُن کو بُت بناکر بے جان کر دیا۔"

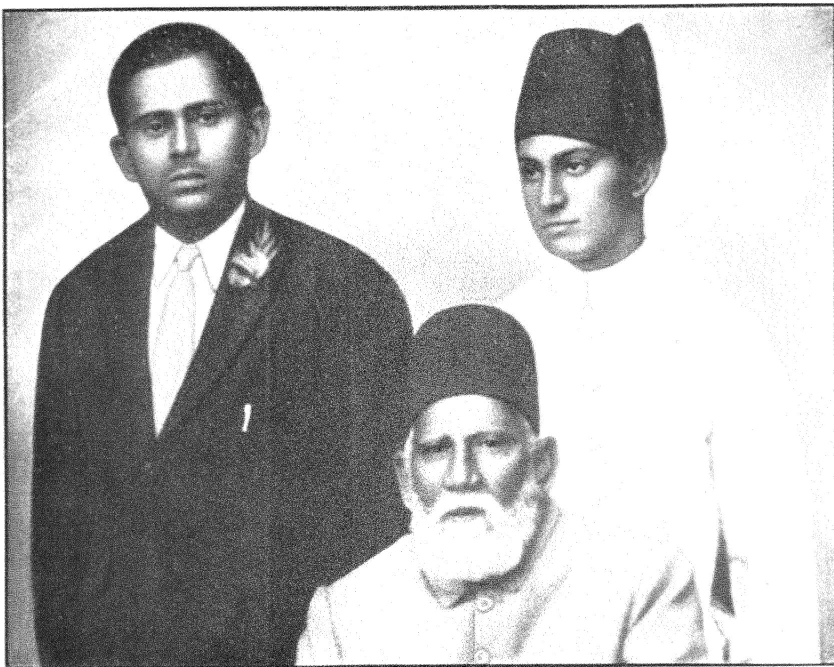
ایک اور لکچر خواتین کے لئے ہوا اسمیں عورتوں کے حقوق کے متعلق نہیں فرمایا بلکہ عورتوں کے فرائض پر تقریر کی۔

عورتوں کو مردوں کے فرائض کی طرف توجہ دلائی - غریب اور جاہل عورتیں بھی موجود تھیں جو اپنے شرعی حقوق سے بے خبر تھیں - ان کو بتایا کہ کامیابی کے ساتھ کس طرح زندگی گذار سکتی ہیں - تعلیم کی طرف رغبت دلائی - اور خاص کر اسلامی تعلیم کی طرف! اور فرمایا تمہاری ہی گود میں قوم تربیت پائے گی قوم کی ترقی کا راز عورت ہی کی ترقی میں ہے - ترقی کرنا ہر ایک کا حق ہے اور بڑی حد تک ترقی کی ذمہ داری عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہے - پھر فرمایا ہمارے ہادی برحق نے عورتوں کو پستی سے نکال کے بلندی تک پہنچایا پھر جائز پردہ پر تقریر دیر تک ہوتی رہی - جائز پردہ کی طرف متوجہ کیا - ایسا پردہ جس سے دین و دنیا کو فائدہ ہو - ناجائز پردہ پر کچھ دیر تک بحث کی اور کہا افراط و تفریط بری چیز ہے - پردہ شرعی حد میں رکھئے - یورپ کو شمع ہدایت نہ بناؤ - بلکہ درس عبرت حاصل کرو - مغربی خرابیوں سے خواتین کو چوکنا کیا - علامہ مرحوم و مغفور حقیقتاً دل سے عورتوں کے ہمدرد تھے اور انکو اچھی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے - لکچر نہایت ہی موثر تھا اور بہت روز تک عورتوں میں اس کا چرچا رہا -

کون نہیں جانتا کہ علامہ مغفور نے اپنی تمام عمر عورتوں کی بھلائی اور بہتری میں گذار دی تقریر اور تحریر کے ذریعہ وہ عورت کے حقوق کی حفاظت اور تبلیغ کرتے رہے - آپ کی تمام کتابیں مسلم خواتین کی اصلاح معاشرت کے متعلق ہیں - ہر تحریر درد سے بھری ہے - آپ ہی کی کوششوں سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور فضول رسم و رواج دور ہونے لگے - عورتیں بھی اپنے ہادی برحق کے دیئے ہوئے حقوق سمجھنے لگیں - اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کر دی -

لکچر ختم ہونے پر مدرسہ بنات کا ذکر کیا گیا اور خواتین نے اس وقت کچھ چندہ بھی دیا - بعض خواتین نے والدہ صاحبہ یعنی محترمہ بیگم صاحبہ کے پیروں کو چھوا کیونکہ آپ کی انکساری اور سادگی سے خواتین بہت متاثر تھیں بعض عورتوں نے اپنے آٹوگراف بھی حضرت علامہ مغفور سے لکھوائے - آپ نے ہم بہنوں کے آٹوگراف بھی خلوص دل سے لکھے - لیکن افسوس ہمارے آٹوگراف بمبئی میں میری مرحومہ بہن کی علالت کے دنوں میں گم ہو گئے - اس لئے میں حضرت قبلہ کی تحریر کردہ عبارت اپنے مضمون میں نقل کرنے سے عاجز ہوں -

ہم دونوں کو آپ کے ساتھ سرنگا پٹن وغیرہ بھی جانے کا شرف حاصل ہوا - ہم دونوں بہنیں تعجب کرتی تھیں کہ ہمارے رہنمائے اعظم اس قدر خوش طبع اور لطیفہ گو ہیں اس طرح ہم سے باتیں کرتے تھے جیسے ہم عمر آپس میں ہنستے بولتے ہیں اللہ اللہ کیا اخلاق اور وضعداری تھی! میں وہ منظر بھی کبھی نہ بھولوں گی جب ہم سب کھانے پینے میں مشغول تھے تو ہمارے علامہ محترم مع بیگم صاحبہ محترمہ کے کچھ فاصلے پر ٹہل رہے تھے! اس وقت بھی وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے - حضرت کو اپنی بیگم سے بہت ہی محبت تھی اور ان کی بیحد عزت کرتے تھے - میں نے بہت کم اس طرح سے ایک مسلمان مرد کو اپنی شریک حیات کے ساتھ اس محبت اور عزت سے رہتے ہوئے دیکھا ہے - مرحومہ حبیبہ اور میں دونوں بہت متاثر ہوئے تھے - کاش سب مسلمان اپنی شریک حیات سے اسی طرح محبت اور اس کی اتنی ہی عزت کریں تو زندگی کیسی خوشگوار اور کامیاب ہو سکتی ہے - افسوس صد افسوس یہ عالم باعمل ہمارے محسن اعظم اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے - لیکن آپ کے کارنامے قیامت تک زندہ رہیں گے! اور مسلمان مرد بالعموم اور مسلم خواتین بالخصوص آپ کو ہمیشہ آنسوؤں سے یاد کریں گی اور دعائے مغفرت ہمیشہ ان کی زبان اور دل سے نکلے گی -



حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ دونوں لڑکوں کے ساتھ (مارچ ۱۹۳۱ء)

مصورِ غم کے سفر نامے

علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور دو حیثیتوں سے ممتاز شخصیت رکھتے تھے، وہ اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے، اُنہوں نے اردو کے ذخیرۂ ادب کو اپنی بیش بہا تصانیف سے مالا مال کر دیا، ان کا ذخیرۂ ادب نہ صرف مختصر افسانوں اور ناولوں کی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ تمدن و معاشرت، تاریخ و اخلاق اور مذہبی نقطۂ نظر سے بھی قابل ذکر ہے، مرحوم کے ناول جو درد اور اثر رکھتے ہیں وہ مخصوص ان کا حصہ تھا، حزنیہ نگاری میں وہ خاص ملکہ رکھتے تھے، وہ ایک طرزِ خاص کے موجد تھے، اس طرح ان کی کتابیں ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گی "مصورِ غم" کا جو لقب ان کو دیا گیا ہے وہ بالکل حق بجانب ہے۔

مرحوم کی دوسری حیثیت "حامیٔ حقوق نسواں" کی ہے۔ نسوانی زندگی کی سدھار میں جو حصہ مرحوم نے لیا تھا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ زمانہ دراز تک وہ رسالہ عصمت کو اپنی اڈیٹری میں شائع کرتے رہے۔ اُس وقت اور پھر جب اس کی ادارت سے اُنہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی اس وقت بھی وہ برابر حقوق نسواں کے لئے مضامین لکھنے اور اپنی تقاریر اور اثر سے کام لیکر نسوانی زندگی کو بہتر بنانے میں بڑی زبردست کوششیں کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ تربیت گاہ بنات قائم کر کے جو کام اُنہوں نے کیا ہے، وہ بھی قابل قدر ہے۔ اس طرح حق یہ ہے کہ طبقہ نسواں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

یہاں ہم مختصر طور پر مرحوم کے سفر ناموں کی صراحت کرتے ہیں۔ اور بحیثیت سیاحی انہوں نے جو علم کی خدمت کی ہے اس کا اظہار کرنا نامناسب نہیں ہے۔

ہر زبان کے ادبیات میں سفر نامے بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے تاریخ، جغرافیہ، مذہب، تمدن و معاشرت اخلاق و عادات وغیرہ کا جو وافر ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتا۔

بطور مثال صرف ہندوستان کے متعلق دیکھو جو معلومات قدیم چینی اور عرب[1] سیاحوں کے سفر نامے پیش کرتے ہیں وہ کسی اور ذریعہ سے دستیاب نہیں ہوئے۔ اگر یہ سفر نامے نہیں ہوتے تو قدیم حالات کا بڑا حصہ تاریکی میں ہوتا۔

اُردو زبان میں بھی اب سفر ناموں کا خاصہ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ حجاز، ایران، عراق، مصر، شام اور یورپ وغیرہ کے متعلق بیسیوں سفر نامے شائع ہو چکے ہیں، علامہ شبلی نعمانی کا سفر نامہ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبد الماجد دریابادی وغیرہ کے سفر نامے اردو زبان کے انمول جواہرات ہیں۔

لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں اردو زبان میں ہندوستان کے متعلق بہت کم سفر نامے ہیں۔ اس لئے جو سفر نامے

[1] البرونی اور ابن بطوطہ قابل ذکر ہیں ۱۲

دستیاب ہوں وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ اس لحاظ سے مصورِ غم کی سیاحی بھی قابلِ قدر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مرحوم نے اپنا کوئی علیحدہ سفرنامہ شائع نہیں کیا ہے اور نہ کوئی مستقل کتاب اپنے سیاحت کی مرتب فرمائی۔ لیکن کئی سال تک انہوں نے تربیت گاہ بنات کی امداد اور چندے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کیا تھا۔ اور اپنے سیاحت وسفر کے حالات لکھا کرتے تھے اور یہ **عصمت و بنات** کے ذریعہ شائع ہوتے تھے۔

مصور غم کے ان سفرناموں سے جو امور اخذ کئے جا سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان سفرناموں سے ان کا درد دل اور نسوانی طبقہ کی سدھار کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے وہ کس طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت ان کے درد دل کے شریک اور ان کے حقوق کے حامی تھے۔

(۲) ان سفرناموں سے ہندوستان کی علمی دنیا کی آگاہی ہوتی ہے تعلیم یافتہ طبقہ کی اطلاع اور ہر شہر کے علم دوست اور ارباب ذوق کا تذکرہ ملتا ہے۔

(۳) ہر شہر کی تعلیم یافتہ خواتین کے مختصر حالات اور ان کی علمی دلچسپی قومی خدمات کی اطلاع ہوتی ہے۔

(۴) قومی درد رکھنے والے اور ایثار کرنے والے طبقہ کا علم ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف حصوں کی تمدن و معاشرت، اخلاق و عادات کی توضیح ہوتی ہے۔

(۶) ان سفرناموں سے خود مولانا کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے ان کے خاندان کی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

(۷) زبان کی شیرینی، سادگی اور صفائی جو لطف دے جاتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

ذیل میں بعض انتخاب پیش کئے جاتے ہیں جو امید ہے کہ دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

(۱) "صبح جاورہ روانہ ہوا، میں نے اپنے قصد کی اطلاع خان بہادر نواب سرفراز علی خاں صاحب چیف سکرٹری کو اس لئے دیدی تھی کہ وہ سواری اور رہنما کا انتظام فرما دیں اس کے ساتھ ہی ان سے یہ خواہش بھی کی تھی کہ میری حاضری کی تشہیر نہ ہو، لیکن حیدر آباد آکر جو ڈاک دیکھی تو معلوم ہوا کہ بعض احباب کو میری اس خاموش حاضری و روانگی پر شکایت ہے، یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر مگر کاش یہ جماعت میری عادت اور خصلت سے واقف ہوتی۔ اور اتنا سمجھتی کہ ان چند لمحوں میں تخیل جو کیفیت میرے سامنے لا رہا تھا اس سے میں کسی قیمت پر جدا ہونا پسند نہ کرتا تھا"

(۲) "شام کی گاڑی سے واپس ہوا اور کھنڈوہ پہنچا۔ یہاں ٹھیرنے کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلم جج ایک مسلمان لڑکی کو تربیت گاہ میں داخل کرانا چاہتے ہیں"

(۳) "ہم دلی کی گرمی سے اُکتائے ہوئے تھے، بھوپال پہنچکر جان میں جان آگئی۔ دھوپ بہت کم تھی اور اگر تھی بھی تو تمازت بالکل نہ تھی۔ اکثر ترشح ہوتا رہتا۔ شیخ عبدالغفور صاحب کی چھوٹی بچی اختر النساء بیگم جس کی عمر چھ سال کی ہوگی اور جو بیگم راشد

الخیری صاحبہ سے بہت ہی مانوس ہے۔ عجیب تماشا کرتی تھی۔ وہ کبھی تو ہیزلین کی شیشی لاکر ان کے منہ پر ملتی کبھی سر میں تیل ڈال کر کنگھی کرتی اور کبھی پھول لاکر سر پر لگاتی"

(۴) بیگم صاحبہ الطاف الحق صاحب انجنیر بھی جن کے لڑکے کی شادی کو چند روز ہوئے ہیں کوٹھے پر بیگم راشد الخیری صاحبہ سے ملنے تشریف لائیں۔ ان کی بہو یعنی نئی دلہن بھی گھونگٹ میں تھی۔ یہ عزیز بچی ذوالفقار بانو بھی تربیت گاہ کی تعلیم یافتہ ہے۔ وہ بیگم راشد الخیری صاحبہ کی صورت دیکھتے ہی پھڑک گئی اس پر دو متضاد کیفیتیں گذر رہی تھیں شرم اُس کے پاؤں پکڑ رہی تھی اور دل اُس کو اِدہر کھینچ رہا تھا۔ اس کشاکش میں جذبہ عقیدت غالب آیا اور سسرال کی نئی دلہن ساس نندوں کے سامنے زور سے "اماں جان" کہہ کر بیگم راشد الخیری صاحبہ کو لپٹ گئی"

(۵) میرا ارادہ ناگپور ٹھیرنے کا نہ تھا۔ اسی واسطے کسی کو اطلاع نہ دی تھی۔ مگر بیگم راشد الخیری صاحبہ نے دن بھر کی تکان محسوس کی اور یہی مناسب معلوم ہوا کہ ہم ناگپور اتر پڑیں لیکن خرابی یہ تھی کہ وہاں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے مجبوراً ویٹنگ روم میں اترے لیکن وہاں بھی اس قدر شور وغل تھا کہ سونا تو درکنار لیٹنا بھی مشکل ہوگیا۔ اب یہی ایک صورت صورت تھی کہ تیسرے درجے کے مسافر خانہ میں رات بسر کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ میں مسافر خانہ میں خاموش ٹہل رہا تھا کہ ایک نوعمر مسلمان نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ نام نہ بتاؤں تاکہ میری وجہ سے یہاں کسی کو تکلیف نہ ہو۔ مگر اس کے اصرار نے مجبور کردیا۔ اور نام سنتے ہی تین چار آدمیوں نے اسباب اُٹھانا شروع کیا کہ ہمارے ساتھ چلئے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ نہ جاؤں مگر میاں عبد القادر ٹرین اگزیمر کی خواہش نے مجبور کردیا"

(۶) قاضی پیٹ اسٹیشن پہنچ کر خیال آیا کہ کام کرنے کے واسطے صرف ستمبر کا مہینہ باقی ہے۔ یہ تھوڑا سا وقت اتنے بڑے صوبہ (مدراس) کے لئے کافی نہ ہوگا یہ وقت حیدرآباد میں گذاروں تاکہ جن حضرات سے سال گذشتہ میں ملاقات نہیں ہوئی ہے اور جنہیں شکایت کا جائز حق ہے ان سے بھی مل لوں۔ چنانچہ ورنگل میں میرے محترم دوست مرزا احمد بیگ کے فرزند مرزا حسین احمد بیگ صاحب ناظم تشریف فرما ہیں۔ ان کو تار دیا عزیز موصوف نے فوراً موٹر بھیج کر مجھکو بلوایا۔ انہوں نے اور ان کی بیگم صاحبہ نے توقع سے زیادہ خاطر مدارات کی شام کو خان بہادر مرزا اکبر بیگ صاحب انجنیر نے چاء پر بلایا اور ایسی محبت سے ملے کہ جی خوش ہوگیا"

(۷) تیسرے روز متواتر کئی جگہ سے چاء اور کھانے پر طلبی ہوئی۔ اور اس سے زیادہ کالج کے طلباء اور مساجد کے خطیبوں اور انجمنوں کے ناظموں نے وعظ کی خواہش کی اور یہ اصرار اتنا بڑھا کہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے کھلے ہوئے الفاظ میں یہ عذر کیا کہ میں حیدرآباد میں دعوتوں کے واسطے نہیں آیا اور یہ خیال کہ میں واعظ ہوں قطعاً غلط ہے۔ میں نے ۴۹ سال صرف ایک موضوع یعنی مسلمان عورت پر بسر کئے ہیں۔ میرے سامنے سوا اسکے کوئی چیز نہیں ہے۔ دنیا متغیر ہوچکی۔ قوم بدلی۔ اسکی معاشرت بدلی تمدن بدلا۔ خیالات بدلے مگر میں اُسی جگہ کھڑا ہوں جہاں ۴۹ سال قبل سب سے پہلی کتاب "صالحات" لئے کھڑا تھا۔

(۷) دوسرے ہفتہ میں سب سے پہلے مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم کی جا پر گیا۔ سید صاحب سے پہلی ملاقات نہ تھی البتہ آج بیس سال پہلے جب میں مخزن و تمدن کو مرتب کر رہا تھا اور عصمت کی ابتدائی حالت تھی میری انکی خط و کتابت متواتر تین چار سال رہی۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بڈھے نہیں تو ادھیڑ ضرور ہوں گے۔ میر مہدی علی صاحب شہید اور مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل سے بھی وہی مراسم تھے جو اب عرصہ سے بند تھے۔ مگر یہاں آکر دیکھا تو تینوں کے تینوں خدا ان کی عمریں دراز کرے ماشاء اللہ جوان ہیں۔ اور مضمون نگاری کا شوق طالب علمی کا زمانہ تھا۔ مگر میں بڈھا ہوکر آج بھی اُن سے زیادہ جوان ہوں کہ قلم سے کچھ کام تو لے رہا ہوں۔ یہ تینوں کشاکش حیات پر قربان کر چکے۔ اور جس طرح مخزن کے اہل قلم کی تمام جماعت اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہوگئی اسی طرح یہ دماغ بھی خاموش ہوگئے۔ پھر بھی بسا غنیمت ہے کہ اس چیٹک نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ سید خورشید علی صاحب کے خالی وقت کا بیشتر حصہ قومی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔"

(۸) رات کو نواب ہاشم یار جنگ بہادر سے ملاقات ہوئی ان کا خلق و محبت دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ دوسرے روز مولوی نصیر الدین ہاشمی کے ہاں جا پر گیا۔ ان کی والدہ صاحبہ محترمہ مسز عبدالقادر صاحب رجسٹرار عصمت کی قدیمی قدردانوں میں سے ہیں۔ ان کی فارسی عربی قابلیت بہت اچھی ہے۔ اس خاندان کے سب بچے بتا رہے ہیں کہ اچھی ماں کی گود کیا معنی رکھتی ہے"۔

(۹) "نواب سالار جنگ نے دوسرے ہی روز کھانے پر مدعو کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ نواب سالار جنگ ہر موضوع پر نہایت قابلیت کے ساتھ گفتگو کرسکتے ہیں۔ ان کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ میری کئی کتابیں ان کی نظر سے گذر چکی ہیں کئی گھنٹے تک تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ معاملہ فہم روشن خیال اور صائب الرائے نوجوان ہیں اور اسلام کا سچا درد سینہ میں رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے نوجوان رؤسا میں نواب سالار جنگ غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں جس قدردانی اور خلوص کے ساتھ وہ مجھ سے ملے اب تک مجھ پر اس کا اثر ہے۔"

(۱۰) "اب ۲۰ تاریخ ہوچکی تھی اور اگلے ہفتہ میں تربیت گاہ کا نیا سیشن شروع ہونا اور مجھے فوراً واپس ہونا تھا۔ لیکن چونکہ خسرو دکن نے خاصہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لئے مجھے اس کرم و اعزاز کا شکریہ ادا کرنا لازمی تھا، ۲۷ کی صبح کو سوا آٹھ بجے میں کنگ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ صدر امین صاحب میرے غائبانہ کرم فرما تھے۔ فوراً ہی میرا کارڈ اعلیٰ حضرت واما قبالہ کی خدمت میں بھیج دیا اور باوجودیکہ بندگان عالی بے انتہا مصروف تھے۔ اسی وقت مجھے باریاب ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ میں نے خسرو دکن کی سادہ زندگی کی بہت سی روایتیں سُنی تھیں مگر یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ معمولی شیروانی اور کف پائی پہنے ہوئے جو مبارک صورت میرے سامنے ہے یہی کڑوڑہا انسانوں کا ماویٰ و ملجا ہے۔ آدھے گھنٹہ تک مجھے شرف باریابی عطا فرمایا۔ اور جب میں چلنے لگا تو انتہائی کرم ولطف سے میری حاضری پر خوشنودی کا اظہار فرمایا"۔

(۱۱) "مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری اس خاموش روانگی پر بعض حضرات کو شکایت ہے۔ میں اپنی محترم بہنوں اور پیاری

بچیوں کا شکر گزار ہوں وہ میری ناچیز خدمات کو وقعت سے ملاحظہ فرماتی ہیں۔ مگر میں اپنی طبیعت عادت اور خصلت سے مجبور ہوں اور جو کچھ عمر بھر نہ کیا اب مرتے وقت اس کا کرنا آسان نہیں۔

میں حیدر آباد اپنی عصمتی لڑکیوں سے ملنے گیا تھا۔ محترم خواتین کے اس گروہ نے دل کھول کر میرا استقبال کیا، خوش رہا خوش آیا اور اگر زندگی ہے تو شاید پھر کبھی خوشی سے جانے کا قصد کروں"۔

(۱۲) "صبح کو ڈاکٹر اقبال سے ملا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ کو تو اس قسم کے جلسوں سے نفرت ہے۔ کہیں آنا جانا پسند نہیں۔ آپ کیسے باہر نکلے۔ سالک صاحب نے اس کا جواب میری طرف سے خوب دیا کہ مولانا کو عورتوں کی خدمت مردوں میں کھینچ لائی۔ خلع کے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ دوپہر کو مولوی سید ممتاز علی صاحب اور میاں امتیاز سے ملا۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی سید حبیب صاحب اڈیٹر سیاست کے ہاں گیا۔ یہاں بھی خلع کے متعلق دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور لاہور کے تمام مسلم اخبارات زمیندار، سیاست، تہذیب نے خلع کے مسئلہ میں اعانت کا وعدہ فرمایا"۔

(۱۳) "ایک روز جب میں دو بجے کے قریب واپس آیا۔ تو معلوم ہوا کہ سید صاحب کے سوا اب تک کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی اس غیر معمولی مدارات سے بہت تکلیف ہوئی۔ بچے ضرور اپنے دل میں کہیں گے کہ اماں جان کے مولوی صاحب آئے تو شام تک بھوکا رہنا پڑا۔ ابا جان کے مولوی صاحب کبھی آجائیں گے تو شاید رات کو بھی کھانا نصیب نہ ہو گا"۔

(۱۴) آج سے قریباً بیس سال قبل جب حجاز ریلوے تیار ہو چکی تھی اور ایک مشہور ادیب نے جو اس وقت تاج برطانیہ کا معزز عہدہ دار ہے۔ اپنے سفرنامہ میں یہ فقرہ لکھا تھا "میل ٹرین کو ایک ترکی ٹوپی لے جا رہی تھی" آج ٹکٹ لیتے وقت میں نے یہ الفاظ سُنے کہ "یہ نہیں چاہئے حالی روپیہ دو"

مندرجہ بالا انتخابات سے نہ صرف مصور غم کا انداز تحریر جو اُنہوں نے اپنے سفرناموں میں اختیار کیا تھا معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے خیالات اور جذبات کا بھی بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وہ نسوانی سدھار کے لئے کیسا بے چین دل رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی کا کس قدر خیال تھا۔ وہ ایک درد بھرا پر اثر دل رکھتے تھے ان کو ہر وقت عورتوں کی حالت بہتر بنانے اور ان کے حقوق ان کو واپس دلانے کی دھن رہا کرتی تھی۔ اُنہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا تو کسی اپنی ذاتی منفعت کے لئے نہیں کیا بلکہ اس سے ایک مسلم تربیت گاہ کی ترقی اور اس کے ذریعہ مسلمان لڑکیوں کی خدمت مقصود تھی۔ اپنی حد تک اُنہوں نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اس کو کامیاب انجام پر پہونچا دیا تھا جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے مصور غم کے سفرنامے چند خاص خصوصیات رکھتے ہیں اس حیثیت سے وہ اہم ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو گا اگر عصمت کی جانب سے ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

نصیر الدین ہاشمی

آہ علامہ راشد الخیری!

از جناب پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی

آہ وہ حامیِ ادب نہ رہا — عرصۂ علم جس سے تھا گلشن
تھی حیات اُنکی وقفِ خدمتِ خلق — نام دہلی کا کر گیا روشن
تیسری فروری تھی پیر کا دن — اور انیس سو تھا چھتیس سن
راشد الخیری نے جو منہ موڑا — جاکے دار البقا کیا مسکن
یہ دعا ہے کہ رحمت خالق — رہے جنت میں سر پہ سایہ فگن

علامہ راشد الخیری سے مجھے عرصہ دراز سے شرف نیاز حاصل تھا۔ وہ میرے دیرینہ عنایت فرما تھے۔ اور میں ان کے کمال کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ اُنہوں نے اہل ہند کی خدمت میں اپنی تمام عمر صرف کردی تھی۔ وہ اردو زبان کے مشہور اور باکمال ادیب تھے۔ اور مستورات کی ترقی تعلیم اور حفاظت حقوق کے بارے میں ان کی مساعی جمیلہ بہت کامیاب ثابت ہوئی ہیں مستورات کے لئے ۱۹۰۸ء میں جو رسالہ عصمت جاری ہوا تھا وہ بدستور جاری رہ کر اپنی روشنی چاردانگ ہند میں پھیلا رہا ہے۔ ضرورت وقت کو مدنظر رکھ کر دوسرا رسالہ بنات جاری کیا گیا تھا وہ بھی ہر دل عزیز ہو رہا ہے۔ کوئی دو سال ہوئے ایک اور رسالے جوہر نسواں کا اجرا کیا گیا تھا وہ بھی بہت مقبول ہوا غرض علامہ مرحوم کو عورتوں ہی کی اصلاح اور بہتری کی ہر زمانہ میں دُھن تھی مستورات ہند اور اُردو ادب کو ابھی انکی بہت ضرورت تھی مگر حکم ربی ہوا کہ اے مولانا تمہارا فرض دنیوی ادا ہوچکا۔ اپنی ذمہ داری کا بار اپنے ہونہار بچوں کے سپرد کردو۔ اب ہمارے سایہ رحمت میں آکر دوامی راحت حاصل کرو۔ پھر کیا تھا۔ پیک قضا کو لبیک کہا اور داعی اجل کو جان سپرد کردی۔ امید ہے ان کے دونوں لڑکے مولانا رازق الخیری اور مسٹر صادق الخیری مولانا مرحوم و مغفور کے کاموں کو جاری رکھیں گے اور دنیا کو دکھا دیں گے کہ لایق باپ کی لایق اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اردو ادب کی خدمت انجام دینا اس خاندان کا حصہ ہے اور یقین ہے کہ آیندہ بھی رہیگا کچھ شک نہیں کہ مغفور کے انتقال سے اردو ادب کو نقصان عظیم پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی ہستی اُٹھ گئی جس کے اوصاف حمیدہ کی مثالیں اب اس زمانہ میں بہت کم نظر آئیں گی +

حضرت علامہ راشد الخیری — بجہاں رفت و یادگار بماند
طرح نو فگند ریختہ را — در ادب نقشِ پایدار بماند
عصمت و بنات از کلکش — یادگارے بروزگار بماند
کار کرد است کاید از مرداں — بفلک ایں اساس کار بماند
دلنوازی بکار عصمتیاں — گو کہ کرد است و استوار بماند
اے بچشم حسو علم و ادب — گل زگلشن برفت و خار بماند
رخصت آہ وہ کہ ساحر را
ازدم اندر گلو فشار بماند

علامہ راشد الخیری مرحوم

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

(از جناب مولانا شوکت علی صاحب ام۔ال۔اے)

اس خاندان کے اور افراد سے میری علی گڈھ کی جان پہچان تھی مگر علامہ راشد الخیری صاحب سے بہت بعد میں ملاقات ہوئی اور خاص کر اُن کے پُر درد دہلی کے قصوں اور افسانوں کی وجہ سے۔ ایک خاص پُرلطف صحبت کا حال سناتا ہوں۔ کچھ دہلی کی نہاری کا تذکرہ تھا۔ ہمارے رام پور میں اس کو پائے کہتے ہیں اور خود ہمارے گھر کا یہ دعویٰ ہے کہ جیسے پائے ہمارے ہاں پکتے ہیں ایسے کہیں اور نہیں پکتے۔ دہلی کی نہاری ایک مرتبہ اور دوستوں نے کھلانی چاہی مگر میں نے اُس کو سونگھ کر چھوڑ دیا تھا۔ کھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں اپنی گستاخانہ خواہش کا میں نے راشد الخیری صاحب کے سامنے اعادہ کیا اور انہوں نے اپنے خاص اور متین انداز میں دعوت دی کہ میں اور بھائی (محمد علی مرحوم) اور دوسرے احباب کوچہ چیلاں کے نکڑ پر جو لڑکیوں کا مدرسہ (تربیت گاہِ بنات) تھا وہاں آئیں اور ایک صبح ان کے ساتھ ناشتہ اور نہاری کھائیں۔ ہم روز مقررہ پر گئے اور نہاری کے علاوہ خدا معلوم اور کیا کیا سامان کھانے کا تھا انگیٹھیاں پاس رکھی تھیں جنجیری روٹی بھی گرم گرم ملتی تھی اور نہاری بھی گرم تھی اور اس پر گرم گرم اچھا گھی ڈالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حلیم بھی تھی اور ہر چیز نہایت مزیدار تھی۔ خود ہمارے ساتھ کھانے میں وہ شریک نہ تھے مگر اپنے ہاتھوں سے ہر چیز نکال کر ہم کو کھلاتے تھے۔ اگر واقعی دہلی کی نہاری ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ مرحوم نے کھلائی تو کیا کہنا تفصیل تو مجھے یاد نہیں مگر اتنا زبان کا مزہ یاد ہے کہ ہر چیز بہت مزیدار تھی اور نہایت نفاست کے ساتھ کھلائی گئی تھی۔ مرحوم کی محبت اور اخلاص کا آہیں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت پُرلطف صحبت رہی تھی۔ مرحوم باتیں کم کرتے تھے اور خدا نے ان کو اس کے بدلے تحریر میں درد و گداز کا عجیب و غریب مادہ دیا تھا۔ مجھے بے حد اشتیاق ہے کہ ان کے سب افسانے مجھے مل جائیں تو میں آرام سے لیٹے لیٹے ان کو پڑھوں اور پھر اس کے بعد ان کے افسانوں پر اپنے صحیح جذبات کا اظہار کروں۔ مرحوم کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہ تھی مگر کام کرنے والوں کو جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیں۔ آج علم و ادب کے قدر دان کہاں ہیں جو خداداد طبیعت والوں کو روزمرہ کی خانگی مشکلات سے آزاد کر کے ان کو موقعہ دیں کہ وہ اپنے اپنے میدانوں میں بے فکر ہو کر نمایاں کام کر سکیں۔ مصنفوں اور قومی کام کرنے والوں کو اور ہر روز مرہ معاش کی فکر۔ دوسرے جو ملت کے کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہو اُس کی زحمتیں۔ دماغ سے نئے نکات پیدا کرنے پر کہاں سے قدرت ہو جبکہ تصنیف سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہو کہ

طباعت کے بعد قدردان کہاں سے آئیں گے۔ اسی قسم کی دوسری پریشانیاں دماغ کو کمزور کر دیتی ہیں اور مصنف غریب کے خیالات کو پریشان اور پراگندہ کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ راشد الخیری غریب کو بھی اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ خاموش مزاج تھے اور غیور تھے اس لئے جو کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی محمد علی مرحوم کے حالات سے خوب واقف ہوں وہ بھی انہی پریشانیوں کا شکار رہا۔ ان ہی لوگوں کے لئے حالی مرحوم، حکیم محمود خاں مرحوم کے مرثیے میں دو بند لکھ گئے ہیں جس میں صحیح طور پر ان کے تفکرات کا نقشہ کھینچتے ہیں:-

سنتے تھے حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھی سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزل لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہہ قصیدے لکھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ہمیں ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
تراگنی نے دقت کی ہم کو دیا لینے نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جاکر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

یہی حال غریب راشد الخیری کا ہوا۔ خدا اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی اولاد کو توفیق دے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کے کاموں کو آگے بڑھا کر ثوابِ دارین حاصل کریں اور مرحوم کی روح کو خوش کریں۔

کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کو اپنی زندگی میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یا محمد علی مرحوم کو کامیابی نہیں ملی۔ نہیں۔ ملی ضرور ملی مگر یہ ہستیاں ایسی تھیں کہ قدر دانوں کی فیاضی اور ہمت افزائی سے آرام سے بیٹھے ہوئے ہزار دو ہزار روپیہ ماہوار پاتے اور بے فکری کے ساتھ تصنیف و تالیف کرتے اور قومی خدمات انجام دیتے اور وہ وقت جو معمولی انتظامات اور بعض اوقات مالی مشکلات کے مقابلے میں ضائع ہوتا قومی کاموں اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا۔ دہلی کے لئے فخر ہے کہ حالی مرحوم نے دہلی کے زمانے کے حالات بیان کرکے ایک شعر میں ساری موجودہ تاریخ کو ختم کر دیا تھا اور دہلی کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔

آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

جو احسانات مرحوم کے خواتین پر تھے۔ ان کو بیگم محمد علی تحریر فرما رہی ہیں۔ یہ میرے سرسری خیالات ہیں کہ مرحوم کی یاد اور غم میں شریک ہو جاؤں۔

شوکت علی (خادم کعبہ)

حضرتِ راشد

(از سید محمد آصف علی صاحب دہلوی بیرسٹرایٹ لا۔ ام ال اے)

بھئی رازق میاں ضرور مجھ سے خفا ہو گئے کہ آصف صاحب بھلا ایسا بھی کیا ہے آپ کے اور والد مرحوم کے کیا تو مراسم اور بے تکلفی تھی اور کیا آپ کے اور اُن کے تعلقات اور محبت۔ کیا آپ اتنا وقت بھی نہیں نکال سکتے کہ جو کچھ یاد آجائے وہ قلمبند کریں۔ ہاں بھئی سچ کہتے ہو تمہاری شکایت درست ہے۔ مگر اس بے لگام زندگی کا کیا علاج ہے کہ نہ جینے کی مہلت دیتی ہے نہ مرنے کی ہمت۔ اس چار مہینے کے اندر کون کون اُٹھ گیا۔ عارف نے دغا دی، تمہارے والد کا ساتھ چھوٹا، انصاری نے دنیا اندھیر کر دی۔ اور اگر نو برس کا حساب بتاؤں تو نہ معلوم کس کس کو گنوا دونگا۔ رؤف کے مرنے پر تو گویا ہماری دنیا ہی ختم ہو گئی تھی۔ نہ روتے بن آتی تھی نہ چپ رہتے گذرتی تھی۔ پھر کیا تھا حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اور کس کس کا ذکر کروں۔ کن کن کو قبروں میں اُتارا۔ کن کن کو کندھا دیا۔ اور آج کون کون کمر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہیں کہ عبدالقادر صاحب مع "مخزن" کے دلّی آئے۔ "مخزن" کا دفتر ہمارے گھر کے برابر ہی تھا جہاں بعد میں محمد علی مرحوم نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا دفتر اور اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ ہم ان دنوں میں شاید یہ ۱۹۰۲ء کی بات ہے کالج میں پڑھتے تھے۔ ہر مہینہ "مخزن" کو اس طرح پڑھا کرتے تھے جیسے گویا آسمانی صحیفہ اُترا ہو۔ مہینہ بھر انتظار کرنے اور مہینہ کے آخیر میں اُدھر "مخزن" تیار ہوا اور اِدھر ہم نے اسے کالج میں گھر پر باغ میں جہاں موقعہ ملا بیٹھکر پڑھا۔ اب یہاں سے تمہارے والد کا تعارف ہوتا ہے۔ ایک مضمون "گدڑی کا لعل" "مخزن" میں نکلا۔ دلّی کی وہ زبان جو لے دے کے گھروں کی بڑی بوڑھیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی پہلی دفعہ نظروں سے گذری۔ ہماری اور ہمارے دوستوں کی خوشی اور ناز کی انتہا نہ رہی۔ کہ پہلی دفعہ وہ زبان جو ہم بولتے تھے لکھی ہوئی ملی ورنہ لکھنے والے یا تو اکتسابی اُردو لکھتے تھے یا کتابی اُردو۔ مگر یہ زبان کہاں۔ اس دن سے ہر رسالہ میں راشد الخیری کی تلاش رہتی تھی۔ دوسرا مضمون نکلا "حسن و عشق" اس کے پڑھنے کے بعد تو بیچین ہو گئے اور راشد الخیری کون ہیں کہاں ہیں روزمرہ کے سوال ہو گئے۔ آخر میں نے ایک دن اکرام صاحب سے جو اس وقت "مخزن" کے نائب مدیر تھے اور گھر کے برابر رہتے تھے پوچھا کہ جناب یہ راشد صاحب کون ہیں؟ وہ بولے۔ "لیجئے آپ دہلی والے ہیں اور مولانا راشد کو نہیں جانتے" اور پھر کہا کہ "وہ تو یہیں پاس ہی کلاں محل میں رہتے ہیں اور "آڈٹ" کے دفتر میں ملازم ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر اُن سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو ان کی تصویر تو چھاپ دیجئے۔ وہ بولے "بلاک بننے گیا ہے۔ ایک آپ ہی ان کی صورت دیکھنے کے شائق نہیں۔ سب طرف سے یہی مانگ آرہی ہے۔

یہ تو راشد صاحب سے غائبانہ تعارف کا قصہ ہے۔ تھوڑے دنوں پیچھے ہم انگلستان چلے گئے۔ اور ملاقات کا موقعہ نہ نکلا۔ مگر لندن میں بھی "مخزن" کا انتظار رہا اور "مخزن" میں راشد صاحب کے قصوں کی تلاش رہتی تھی۔ اسی عرصہ میں عبدالقادر صاحب تو دہلی سے چلے گئے، اور "مخزن" بھی چلا گیا۔ مگر اکرام صاحب اور راشد صاحب نے "عصمت" نکالنا شروع کر دیا۔ پھر اکرام صاحب بھی لندن پہونچ گئے اور راشد صاحب تنہا "عصمت" کے پردہ دار رہ گئے۔ "عصمت" نے

ترقی کی، مقبولیت حاصل کی، شہرت میسر آئی سب کچھ ہوا۔ مگر اب راشد صاحب سرکاری ملازمت کو تو خیرباد کہہ چکے تھے اور فقط قلم کے دھنی ہونے پر انحصار تھا۔ اس وقت تک مصنف اور مؤلف جیسی زندگی بسر کرنے تھے اور بلکہ اب بھی ایک حد تک کرتے ہیں اس کا نقشہ صرف وہی خیال میں لا سکتے ہیں جنہوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا ہو عصمت کی مانگ بھی تھی مگر عصمت اور "ہوس زر" کو خلاف قانون قدرت بھی سمجھا جاتا تھا۔ راشد صاحب کے جو گھر کے مکان تھے وہ اس بھنور کے نذر ہو گئے۔ اور اب وہ کرایہ کے گھر میں رہنے لگے۔ ہندوستان میں علم و فضل کا فقر و فاقہ سے ایک مدت سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اور خدا جانے ابھی کب تک رہے گا۔ ملاجی مکتبوں میں اور پنڈت جی آشرموں اور پاٹھ شالاؤں میں محلہ کی روٹی اور دہریوں کے دان پر بسر کرتے رہے ہیں۔ مصنفین عمر بھر کی جانکاہی اور دماغ سوزی سے کچھ اگر پیدا کریں تو اس کی قیمت نولکشور کے مطبع میں چار آنے سے بارہ آنے تک کی تھی۔ یہ نیا طریقہ "مخزن" نے نکالا تھا کہ تین چار روپیہ سال میں مہینہ کے مہینے کئی کئی مصنفوں کی تصنیف نگاہ سے گذر جاتی تھی۔ عصمت غریب کے پیدا ہونیکے وقت دو ڈھائی تین روپیہ کا سالانہ رسالہ خاصہ مہنگا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھلا اس قیمت میں کیا ننگی نہائے اور کیا نچوڑے اگر راشد الخیری کا سر چھپانے کا ٹھکانا نہ بکتا تو کیا ہوتا۔ لوگ زبان کے چٹخارے لیتے تھے۔ راشد الخیری کو مصور غم کا بھی خطاب عطا کر دیا۔ مگر محنت کی اجرت تک نہ ٹھیرائی۔ اب مولانا نے قصے کہانیاں مضامین عصمت کے پردے کے باہر آکر بھی لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ زمانہ تھا کہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاید ۱۲ء میں یا ایک دو سال بعد۔ ملے اور محبت سے ملے۔ خلوص سے ملے۔ پرانی وضعداری کا نمونہ بن کر ملے۔ غرض اس دن سے مرتے دم تک مرحوم نے ملنے کا جو انداز اور بے تکلفی کی جو وضع تھی قائم رکھی۔ میں ان کا مداح بھی تھا اور ان کا ادب اور احترام بھی ان کی ادیبانہ شان کے مطابق کرتا تھا۔ اول اول جب ہم نووارد تھے وقت کافی تھا علمی اور ادبی مشغلوں کی فرصت تھی۔ راشد صاحب سے گھنٹوں اور پہروں باتیں رہتی تھیں۔ ادھر انہوں نے کچھ لکھا اور آئے اور کچھ حصہ سنا گئے۔ یوں تو جو واحدی صاحب کے اور ان کے مراسم تھے اور جو عارف مرحوم اور ایک دو اور دوستوں سے ان کے تعلقات تھے ان کا تو پوچھنا کیا مگر ان حضرات کو چھوڑ کر جو عنایت وہ مجھ پر کرتے تھے وہ اپنی جگہ بالکل مخصوص تھی۔ کبھی کبھی مشورہ بھی کرتے تھے مگر اکثر اردو کے نثاروں اور شاعروں اور کبھی کبھی انگریزی کے ادیبوں کے تذکرے رہا کرتے تھے۔ ایک دن "شاہین و دراج" کا تذکرہ آیا تو میری انکی بالکل بے تکلفی ہو چکی تھی۔ میں نے بے ساختہ ان سے کہا کہ حضرت یہ کوچہ آپ کے قابل نہیں۔ اسے چھوڑیئے کہنے لگے کیوں۔ میں نے کہا جس زبان اور جس سوز و درد کے آپ استاد ہیں اس کے لئے "شاہین و دراج" موزوں نہیں۔ "رویائے مقصود" جس طرح آپ کے قلم کی زبان میں ایک پھونسڑے کی طرح اٹک گیا تھا۔ اسی طرح "شاہین و دراج" کی پتھریلی زمین میں بھلا آپ کا بہتا ہوا دریا کیا آبیاری کر سکے گا۔ چھوڑیئے۔

اگر میں بھولتا نہیں تو یہ گفتگو "شاہین و دراج" کے بہت عرصہ بعد ہوئی تھی۔ کہنے لگے "میاں تم نے صبح زندگی" بھی دیکھی "میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے خیر اب تو میں" شام زندگی "شروع کر رہا ہوں"۔ گویا یہ میرا جواب تھا کہ میں خود شاہین دراج "کی ننگنائے کو چھوڑ چکا ہوں"۔ "شام زندگی" کا کیا پوچھنا تھا۔ اُدھر واحدی صاحب جیسا "شام زندگی" کا ڈنکا کرنے والا اِدھر علامہ راشد الخیری جیسے لکھنے والے۔ غالباً اکثر نقادوں کی نگاہ میں "شام زندگی" ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اُس کے بعد تو مرحوم کے قلم اور دماغ کی تگ و تاز کا ٹھکانا نہ رہا۔ قدرتی بات تھی "شام زندگی" کی جو دھوم دھام ہوئی

اور جو مقبولیت اُسے حاصل ہوئی اُس کا یہی تقاضا تھا۔ مصنف کی جولانی اس کی تصنیف کی مقبولیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مقبولیت کا اثر سرورِ صہبا سے کم نہیں ہوتا۔ سنہ ۱۹ء تک تو مرحوم نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ اور اب وہ چھوٹے قصے کہانیوں کا دور ختم ہو گیا تھا اس زمانہ میں دوسرے تیسرے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔

قدامت کے جوہر کے دلدادہ شیفتہ تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۸ء ہی میں "جوہرِ قدامت" قلم کے سپرد کیا۔ پرانی باتوں وضعداریوں کے پرستار تھے۔

جس دن "نوبت پنج روزہ" ختم کر چکے تو آئے اور کہنے لگے "میاں اب کے تم خوش ہو جاؤ گے" بجھتے ہوئے چراغ کی لَو ذرا اُبھار دی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ اتنا بتانے والے بھی نہیں رہیں گے۔ جس دن تمہاری نانی اماں اور والدہ کی خدانخواستہ آنکھیں بند ہو گئیں تو وہ زبان بولنے والے بھی نہیں رہیں گے جو میں لکھ رہا ہوں۔ اور میں نے کہا جس دن ہم مر گئے اس دن اس زبان کو سمجھنے اور اس کا مزہ لینے والے بھی کم ہو جائیں گے۔ ہنسنے لگے "آصف میاں یہی باتیں کرنے تو تمہارے پاس آیا کرتا ہوں۔"

سنہ ۱۸ء سے میں بالکل سیاسیات کا ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہ صحبتیں کم ہوتی گئیں۔ "عروسِ کربلا" "شبِ زندگی" "سیدہ کا لال" وغیرہ وغیرہ تصانیف شائع ہوئیں۔ اور مجھے ایک نگاہ دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئیں۔

لکھنے کو دفتر کے دفتر سیاہ کر سکتا ہوں۔ مگر سیہ بختی نے اتنی مہلت نہیں چھوڑی۔ یہ تو رازق میاں تمہاری خاطر سے آج اتنا نہ جانے کس طرح لکھ دیا ورنہ ع

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

علامہ راشد الخیریؒ کی وفات پر

ستم ڈھایا یہ کیا جانِ ادب پر آسماں تو نے
غریب و بیکس اُردو کو کیا بے خانماں تو نے
اُجاڑا آہ اک شاداب و رنگیں گلستاں تو نے

کیا ہم سے جُدا اُس بلبلِ باغِ فصاحت کو
کہ جس پر ناز تھا اُردو کے اربابِ صحافت کو
بڑھایا جس نے اس پیاری زباں کی شان و رفعت کو

سدھارا جانبِ ملکِ عدم وہ راشد الخیری
مصوّرِ غم کا تھا جس کا قلم وہ راشد الخیری
نہ دیکھیں گے جسے دنیا میں ہم وہ راشد الخیری

وہی راشد زباں دہلی کی جس پر فخر کرتی ہے
وہی لکھتا ہے روز و شب جو ہر گھر میں گذرتی ہے
چبھوتا ہے وہ نشتر اور دل کی رگ ابھرتی ہے

وہ راشد طبقۂ نسواں کی جس نے ایسی خدمت کی
ہلا دیں جس نے بنیادیں غرور و جہل و نخوت کی
بڑھا دی دیدۂ انسانیت میں قدر عورت کی

وہ راشد جس کا ہر افسانہ تصویرِ حقیقت ہے
وہ راشد جس کی ہر تحریر میں تاثیرِ عبرت ہے
وہ راشد جس کے ہر مضمون میں ندرت ہے جدت ہے

وہ جسکی نثر پڑھتے ہیں سر اہل قلم اکثر
ہوئی جس سے زمیں علم و ادب کی آسماں یکسر
فدا حُسنِ فصاحت جس کے اندازِ نگارش پر

وہ راشد جس کی نوکِ کلک برچھی سی چبھوتی تھی
وہ راشد جسکی کلکِ دوزباں یوں خون رُلاتی تھی
کہ دنیا پڑھ کے ہر اک سطر کو بیتاب ہوتی تھی

رہا بیتاب روز و شب غمِ اصلاحِ نسواں میں
بھلا اتنی تو غمخواری و دل سوزی ہو انساں میں
ضرور آج اس کی روح پاک ہوگی باغِ رضواں میں

دل راشد میں تھی اس صنفِ نازک سے وہ ہمدردی
کہ آخر وقت تک اُس نے دکھائی اپنی پامردی
حقیقت تو یہ ہے بہبودیٔ نسواں کی حد کردی

وہ دریا اس نے ہر تصنیف میں غم کے بہائے ہیں
کہ پڑھ پڑھ کر کلیجے اہلِ دل کے مُنہ کو آئے ہیں
عجب دل دوز منظر جو درِ انساں کے دکھائے ہیں

وہ اس کی غم نگاری جس نے برمایا ہے ہر دلکو
وہ اس کی شعلہ باری جس نے گرمایا ہے ہر دلکو
وہ اس کی حق طرازی جس نے شرمایا ہے ہر دلکو

غرض جادو طرازی اس کی دنیا میں مسلّم ہے
جبھی ہندوستاں میں اُسکا گھر گھر آج ماتم ہے
دل اس کی یاد میں لبریزِ غم ہے آنکھ پُر نم ہے

کہاں تک روئیں آنکھیں آہ یہ وقتی نہیں ماتم
نہ ہوگا حق ادا راشد کا روئیں عمر بھر گو ہم
پڑے ہیں زخم وہ دل میں نہیں جنکا کہیں مرہم

نہیں یہ سب غلط دنیا میں اب باقی نہیں راشد
برابر ہے زمیں پر ہو کہ ہو زیرِ زمیں راشد
مگر زندہ ہے اور زندہ رہیگا ہمنشیں راشد

نہیں مرنے کا وہ جبتک ہے یہ اُردو زباں زندہ
رہے گا نام نامی اُس کا مثلِ مہر تابندہ
ہیں اُس کے کارنامے غیر فانی اور پایندہ

جو تصنیفات چھوڑے ہیں یہاں مرحوم راشد نے
عجب دلچسپ وہ شہکار ہیں اصلاحِ ملت کے
اُسے دنیائے اُردو میں کبھی مرنے نہیں دینگے

ہزار اس دل کو سمجھاتا ہوں قابو میں نہیں آتا
وہ صدمہ ہے، کسی پہلو بھی یہ راحت نہیں پاتا
خیال اس کا کسی ساعت بھی اس دل سے نہیں جاتا

غرض آتی ہے اک اک بات اُسکی یاد اے محوی
کروں میں اُسکے غم کی کس سے اب فریاد اے محوی
پڑی ہے خاطرِ نازک پہ سخت افتاد اے محوی

الٰہی کیا کروں صبر آئے کیوں کر جانِ غمگیں کو
نظر آتی نہیں کوئی بھی صورت دل کی تسکیں کو
نجات ان آنسوؤں سے آستیں کو ہے نہ بالیں کو

تسلّی رازق و صادق کو کوئی دے تو کیونکر دے
کہ معمولی نہیں ہیں باپ کی فرقت کے یہ صدمے
الٰہی تو ہی ڈھارس دے انہیں اپنی عنایت سے

غمزدہ

محوی صدیقی لکھنوی

علامہ راشد الخیری مرحوم

(از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری۔ بار ایٹ لار)

مولانا راشد الخیری مرحوم کی وفات اُردو ادب کے لئے ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی آسانی سے ممکن نہیں مرحوم نے آغاز ہوش سے مرتے دم تک جس جوش وخروش و مستعدی اور خلوص و تندہی کے ساتھ اُردو ادب کی ترقی کی عموماً اور طبقۂ نسواں کی اصلاح کی خصوصاً کوشش کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ آج اُن کی موت پر نہ صرف اُردو ادب سوگوار ہے بلکہ موجودہ نسل کی خواتین کی کثیر تعداد ان کی ماتم گسار ہے۔ اس رنج والم کا اندازہ جو مولانا راشد الخیری کی وفات پر مسلمان خواتین کو ہے ان مضامین وخطوط سے ہوتا ہے جو عصمت کے پچھلے نمبر میں کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔

مولانا راشد الخیری کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناول "حیات صالحہ" سے ہوتا ہے جو غالباً ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے اردو شعر وادب کی تجدید و ترقی میں مسٹر عبدالقادر (اب سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا ممبر انڈیا کونسل۔ لندن) کے مشہور رسالہ "مخزن" نے نمایاں حصہ لیا۔ "مخزن" پہلے لاہور سے شائع ہوتا تھا مگر بعد میں دہلی سے شائع ہونے لگا۔ مولانا راشد الخیری نے "محمد عبدالراشد" کے نام سے اس رسالہ میں ایسے دلچسپ اور مخصوص ادبی رنگ کے مضامین اور قصے لکھنے شروع کئے اور اپنی ادبی شہرت اور عظمت اس حد تک مسلّم کر لی کہ "مخزن" کے جوائنٹ ایڈیٹر منتخب ہوگئے اور آپ کی محنت وجانفشانی اور قابلیت وتجربہ پر ایڈیٹر "مخزن" کو اتنا اعتماد ہوگیا کہ جب وہ ولایت تشریف لے گئے تو "مخزن" کا سارا کام تنہا مولانا راشد الخیری کی ذات پر چھوڑ دیا۔ مولانا نے بھی اس انہماک سے کام کیا کہ "مخزن" کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ میں اس وقت "مخزن" کا خریدار تھا اور اُسے بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت سے زیادہ ممتاز کوئی اور اُردو رسالہ نہ تھا اور مولانا راشد الخیری اُردو کے نوجوان لکھنے والوں میں پیش پیش تھے۔

مولانا راشد الخیری کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا یعنی مسلمان خواتین کی اصلاح۔ ان کی تصانیف اور مضامین میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے اور یہی ان کی سیرت کا روشن پہلو تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنا ذاتی رسالہ "عصمت" جاری کر دیا جو آجتک قائم ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ طبقۂ نسواں کی اصلاح وترقی میں اس رسالہ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

مولانا راشد الخیری سے پہلے اصلاح نسواں کا کام اُردو کے زبردست محسن اور افسانہ نگار ڈاکٹر نذیر احمد نے

کیا تھا۔ اون کی "مراۃ العروس" "بنات النعش" "رویائے صادقہ" وغیرہ اس سلسلے کی بہترین اور مشہور کتابیں ہیں جنہوں نے بڑی حد تک مسلمان لڑکیوں کی تربیت و اصلاح کا مقصد پورا کیا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولانا راشد الخیری کے پھوپھا تھے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مولانا راشد الخیری نے اپنی ابتدائی تصانیف میں ڈاکٹر نذیر احمد کے مقاصد و طرز تحریر سے فائدہ اٹھایا ہو مگر ڈاکٹر نذیر احمد کی شخصیت جامع حیثیات تھی ایک ہی وقت میں وہ بہت بڑے عربی داں مصلح مترجم خطیب اور افسانہ نگار تھے ۔ مولانا راشد الخیری نے اُن کے مصلح ہونے کی خصوصیت کو بالخصوص عورتوں کے مصلح ہونے کی حیثیت کو جو ان کی دوسری حیثیتوں میں گم ہو گئی تھی اپنی مفید مطلب پاکر چن لیا اور اسے کمال پر پہنچا دیا ۔ ان کی "صبح زندگی" "شام زندگی" اور "شب زندگی" عورتوں میں ویسی ہی مقبول ہیں جیسے "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" وغیرہ ۔

مولانا راشد الخیری کی طرز تحریر پر بھی شروع میں ڈاکٹر نذیر احمد کی طرز کا اثر پڑا مگر رفتہ رفتہ اُن کی طرز تحریر الگ ہو گئی اور اس میں خاص قسم کی شیرینی پیدا ہو گئی ۔ عورتوں کے جذبات اور خیالات کی صحیح ترجمانی اور اُن کے مصائب و آلام کی سچی مصوری مولانا راشد الخیری کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ مولانا کو رنج و غم کے جذبات ادا کرنے میں جو کمال حاصل تھا اور ان کے قلم میں اپنے ناظرین کو متاثر کرنے کی جو قدرت تھی اُس کی بنا پر انہیں بجا طور پر "مصور غم" کا خطاب دیا گیا ہے ۔ یہ ضروری ہے کہ اس چیز کی افراط بعض دفعہ پڑھنے والے کو تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے ۔

مولانا راشد الخیری نے اصلاح نسواں کا کام نہ صرف تحریری حیثیت سے کیا بلکہ انہوں نے عورتوں کی اصلاح میں عملاً بھی حصہ لیا ۔ انہوں نے "تربیت گاہ بنات" قائم کی جہاں یتیم بچیوں کی پرورش ہوتی تھی ۔ اس نیک اور مفید کام میں بیگم راشد الخیری نے بھی مرحوم کا ہاتھ بٹایا ۔

میں تعلیم تربیت اور تہذیب نسواں کا ایسا دلدادہ ہوں کہ جو شخص اس کام میں کسی قسم کی کوشش کرتا ہے مجھے قدرتاً اسکی طرف میلان ہوجاتا ہے ۔ فی الحقیقت میری تو یہ رائے ہے کہ اگر کسی کے دو بچے ہوں ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور اسے صرف ایک کی تعلیم کی مقدرت ہو تو پہلے اسے لڑکی کو تعلیم دینی چاہیئے ۔ میرے نزدیک ہندوستان میں قدرتاً بڑی ذہانت ہے لیکن وہ پس پشت پڑی ہوئی ہے ۔ اس لئے کہ ہماری مائیں غیر تعلیم یافتہ ہیں اور ارتقاء انسانی میں کسی طرح معین نہیں ہو رہی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ خیال ہو اس کو مولانا راشد الخیری کے ساتھ کیسی وابستگی ہو گی ۔ چنانچہ پچھلے سال جب مجھے معلوم ہوا کہ مولانا شملہ میں مقیم ہیں تو مجھے ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور تھوڑی دیر ان سے صحبت رہی مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا کے دلمیں ہر وقت اُسی ایک مقصد کا خیال تھا جسکے حصول میں انہوں نے اپنی زندگی صرف کردی ۔

مجھے اُمید ہے کہ جس کام کا آغاز مولانا نے کیا اور جو انہیں مرتے دم تک عزیز رہا مولانا کے لائق فرزند اور جانشین نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ ترقی دیں گے ۔

شہنشاہِ اقلیمِ الم

(از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی بی۔اے حیدرآباد دکن)

آہ آنسوؤں کے بادشاہ کے اُٹھ جانے سے طبقہ نسواں یتیم اور عروس اُردو بیوہ ہوگئی۔ یہ وہ بیش بہا ہستی تھی جو اوروں کے غم کھانے اور دوسروں پر جی جلانے میں صرف ہوئی جن کا مطمح نظر ہی یہ تھا ؂

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں　　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

مصورِ غم کی مثال حقیقتاً شمع سوزاں سے دیجا سکتی ہے کہ وہ جلتی ہے۔ سلگتی ہے اور پگھل کر رہ جاتی ہے لیکن محفل کی روشنی اور فضا میں پھیلا ہوا نور اسی کے جلنے پر منحصر ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ کی ہستی کی ہر کروٹ میں سامان اضطراب مضمر تھا ان کا قلم اسی کمزور و ناتواں مصیبت زدہ طبقہ کے لئے اُٹھتا تھا جس پر آئے دن ستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں جب اُن کا ہر مضمون اور افسانہ عورت ہی کی بیکسی۔ کس مپرسی اور حسرت و ناکامی پر لکھا ہوا ہے گویا اس کی دردناک و تباہ شدہ زندگی کا مرقع کھینچ کر رکھدیا۔ مصورِ غم کی زندگی کا یہی دستور العمل ہوگیا تھا۔ پھر الفاظ ایسے شستہ۔ جملے ایسے نپے تلے طرزِ بیان ایسا دلکش و دلسوز۔ پلاٹ اتنا اچھوتا اور پسندیدہ کہ کتاب ایک بار ہاتھ لگتی تو پھر ختم کئے تک ہاتھ سے نہیں چھٹتی تھی۔

مرحوم نے متعدد کتابیں لکھیں اور زندہ جاوید ہوگئے۔ لیکن ان کی بعض کتابیں تو مدت العمر رلانے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً "صبح زندگی" "شام زندگی" "شب زندگی" کے خونیں اوراق کا مطالعہ کسی دکھے ہوئے دل سے پوچھے چوٹ کھائے ہوئے دل کسی کی ذراسی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ کسی مریض کی کراہ۔ کسی مصیبت زدہ کی آہ۔ کسی یتیم کی چیخ۔ کسی بیوہ کا نوحہ یہ ایسے رموز ہیں جن میں قدرت کا راز مضمر ہے۔ لیکن انہیں غم و الم کی سچی داستانوں کو سچی تصویر کی شکل میں ڈھال دینا بہت ہی بڑے کمال فن کی دلیل ہے۔ اور مرحوم اس "اقلیم الم" کے شہنشاہ تھے۔ رو رو کے رلایا ہے۔ دکھ کا صدمہ اپنے دل پر لیکر کتابیں لکھی ہیں۔

مصیبت و الم کی کہانیوں کو کچھ اس خوبی سے بیان کرنا کہ پڑھنے والا بے اختیار تڑپ اُٹھے ہر مصنف کا کام نہیں مصورِ غم کا قلم کون لائے گا؟ دوسروں کا غم اپنا غم کون سمجھے گا۔ لاریب مصورِ غم اس میدان کے شہسوار تھے۔ جینے کو سب جیتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے زندہ رہنا کمال ہے۔ مرنا سب کو ہے مگر ان کی رحلت ادب اُردو کا سانحہ عظیم ہے۔

آہ! مصورِ غم!! ان کی زندگی قوم پر قربان ہوگئی!

استری جاتی کا رکشک

(از شریمتی چندر دیوی۔ سابق پرنسپل ایم۔ بی۔ ودیالیہ کلکتہ)

ہندوستان کی عورتوں کیلئے جناب مولانا راشد الخیری صاحب کی موت ایک بہت دُکھ دینے والی بات ہوئی ہے۔ علامہ جوانی کے شروع سے لیکر مرتے دم تک ہندوستانی عورت کی حالت اچھی کرنے کیلئے کوشش کرتے رہے اُنہوں نے اس کام کو پورا کرنے کیلئے درجنوں کتابیں لکھیں۔ کئی رسالے چلائے اور یتیم بچیوں کے لئے سکول کھولا۔ پُرانی بُری رسموں کو دُور کرنے میں انہوں نے جن مشکلوں اور سختیوں کا سامنا کیا یہ اُن کا ہی کام تھا۔ لیکھ لکھ کر لیکچر دیکر۔ مِل جُل کر غرضیکہ جس طرح بن سکا مولانا نے ہندوستانی عورت کو اُس کی اصلی جگہ دلوائی۔ مردوں کو بتا دیا کہ اُنکا سلوک عورتوں کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے اور انہیں عورت کی عزت کرنا سکھایا۔

مولانا صاحب کے لیکھوں اور لکچروں میں جادو بھرا ہوتا تھا۔ پتھر کے دل بھی پگھل جاتے تھے۔ یہ مولانا ہی کا دم تھا کہ اتنے عرصے میں ہندوستانی عورت کو اپنی غلامی کا خیال پیدا ہوگیا اور اُسے دُور کرنے کیلئے طاقت بھی دیدی۔

مولانا صاحب یورپین کلچر کی بعض بھلائیوں کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی اندھی نقل کے بہت خلاف تھے۔ وہ ہندوستانی عورت کو گھر کی لکشمی دیکھنا چاہتے تھے یعنی اُسیں گھر والی کے گُن ہوں اُن کے رسالہ عصمت نے بھی عورتوں میں تعلیم کا شوق دلانے میں بہت مدد کی ہے۔ مولانا صاحب نے گھر ملو بان کو خاص ستھان دیا اور اُسکی خوبصورتی کا سکہ اُردو کے بڑے بڑے لکھنے والوں پر جما دیا۔ ہندوستان کی عورتیں مولانا صاحب کی یاد میں جتنا روئیں تھوڑا ہے۔ مگر ایسے بزرگ کی سچی عزت تو اُن کے بتائے ہوئے سدّھانتوں پر چلنے سے ہوتی ہے۔ پرماتما کرے کہ ہندوستانی عورت اپنا کام خود سنبھال

(صفحہ ۲۶۵ کا بقیہ)

اسلامی تاریخ کے ہر انقلاب کن واقعہ پر ناول لکھے ہیں ایام جاہلیت ("ایام عرب" از شرر) اور آغاز اسلام ("جویائے حق" از شرر "الزہرا" از مصور غم) سے لیکر معرکہ کربلا ("عروس کربلا" از مصور غم) زوال بغداد ("زوال بغداد" از شرر۔ "امین کا دم واپسیں" از مصور غم۔ "شہنشاہ کا فیصلہ" از مصور غم "فلپانا" از شرر "محبوبہ خداوند" از مصور غم۔ اندلس ("فلورا فلورنڈا" از شرر۔ "اندلس کی شہزادی" از مصور غم) جزیرہ صقلیہ ("الفانسو" از شرر) ہندوستان ("منصور موہنا" از شرر "نوبت پنج روزہ" از مصور غم) اور ترکی ("تیغ کمال" از مصور غم) تک مسلمانوں کے پھیلنے اور عروج وزوال کے نہایت عمدہ نقشے دکھائے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر اور علامہ راشد الخیری نے جو احسان عظیم اُردو کے افسانوی ادب پر کیا ہے اسے رہتی دنیا تک ہرگز نہیں بھلایا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تاریخی صداقت کردار نگاری کی خوبیوں اور واقعات کی ترتیب کی وجہ سے علامہ راشد الخیری کو اپنے معزز معاصر پر ایک طرح کی فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے اگر مصور غم کو اُردو کا اسکاٹ کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ ان کے ناولوں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تجربہ ومشاہدہ کی کسوٹی پر پوری نہ اُتر سکے یا جسکی تاریخی شہادت نہ مل سکے برخلاف اس کے ان کے معاصرین کے بعض ناولوں میں ایسے واقعات تحریر ہیں جنکی نہ صرف تاریخی شہادت ملنی دشوار ہے بلکہ وہ غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا راشد الخیری کے ناولوں کے مطالعہ کے وقت ہمارے دل میں ایک ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو اصلاح کرنیکا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے اسی احساس کو ہمدردی کہتے ہیں۔ ہم نہ صرف دوسروں کی تکالیف پر ترس کھانے لگتے ہیں بلکہ اُنکی قلبی کیفیات کو سمجھتے ہیں انکے ناول نہ صرف انکے خیالات کے حامل ہوتے ہیں بلکہ قاری کے خیالات کے بھی۔ زبان کے لحاظ سے بھی انکے ناول دہلی کے محاورات اور روزمرہ کے انمول خزانے ہیں جنکا مطالعہ ہمیں دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان سے روشناس کرا دیتا ہے۔ الغرض مولانا راشد الخیری نے بحیثیت مصلح قوم ناول نگار ادیب اور ایک ہمدرد قوم کے ہندوستانی مسلمانوں اور ادب اردو پر وہ احسان کیا کہ اس صدی ...

مصورِ غم علامہ راشد الخیریؒ کے تاریخی ناول

مصورِ غم علامہ راشد الخیری مرحوم کے مختصر حالات اور انکی ادبی خدمات پر ایک مضمون اس سے قبل رسالہ ساقی میں بابت ماہ مارچ ۱۹۳۶ء لکھ چکا ہوں۔ مصورِ غم ایک کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے ساٹھ کے قریب ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ انکی تحریر کی امتیازی خصوصیت حزن و ملال ہے جو ان کے تقریباً تمام افسانوں اور ناولوں میں نمایاں ہے۔ اگر آپ نے ان کے ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُن کے ہر افسانے اور ناول پر عورت اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ اسے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ان کی تحریر کا مقصد اولین مظلوم خواتین کی حمایت و طرفداری ہے اور اس شد و مد کے ساتھ کہ ہندوستان تو کیا دنیا میں بہت کم ایسے حامی نسواں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی بے وقت موت سے صنفِ نازک کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ ان کی نظروں میں مرد انکی حیات مجسم جور و ستم اور حیات نسوانی "شام زندگی" اور "نوحہ غم" ہے۔ اس لئے خواتین عالم اور اہل ادب اپنے اس نقصان کا جس قدر بھی ماتم کریں کم ہے۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ مولانا کے ادبی سرمایہ کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی معاشرتی اور اصلاحی ناول اور افسانے۔ (۲) تاریخی ناول اور افسانے۔ (۳) مذاحیہ افسانے (۴) شاعری۔ "صبح زندگی" "شام زندگی" "شب زندگی" "نوحہ زندگی" وغیرہ معاشرتی اور اصلاحی ناول ہیں۔ "یاسمین شام" "عروس کربلا" "اندلس کی شہزادی" "شہنشاہ کا فیصلہ" "ماہین کا دم واپسیں" "نوبت پنج روزہ" وغیرہ تاریخی ناول اور افسانے ہیں۔ "ولایتی نخی" "نانی عشو" وغیرہ مذاحیہ افسانے ہیں اور "درد دا قفس" "گرفتار قفس" ان کی درد انگیز نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان سب پر لکھنے کے لئے تو کتابیں درکار ہیں۔ اس لئے میں سطور ذیل میں صرف مولانا کے تاریخی ناولوں اور افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس میدان میں مصورِ غم نے کس قدر کامیابی حاصل کی اور مسلمانوں اور خاصکر طبقہ نسواں پر کیا کیا احسانات کئے

فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ اسے محبت اور قتل و خون کی داستانوں کے علاوہ اپنے بزرگوں کے زریں کارناموں اور جنگ و جدل کے افسانوں سے خاص دلچسپی ہے۔ اس لئے فطرت انسانی کو ہنگامہ پسند کہا گیا ہے اور یہی راز ہے سلف پرستی کا۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کی تواریخ میں ہزاروں اس قدر دلچسپ واقعات قلمبند ہیں کہ انھیں ایک ماہر فن نہایت آسانی سے بے حد دلچسپ ناول یا افسانہ کی صورت میں پیش کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام شجاعت جانبازی اور سرفروشی کے واقعات سے پر ہے۔ اس کا ہر واقعہ دنیا کے بہترین ناول کا جامہ پہن سکتا ہے علامہ راشد الخیری نے ماہر نفسیات کی طرح فطرت انسانی کی اس رگ کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انھوں نے معاشرتی اور اصلاحی ناولوں اور افسانوں کے پہلو بہ پہلو تاریخی ناول و افسانے بھی تصنیف و تالیف کئے۔

مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے یا ہندوؤں کی یا دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دور موجودہ میں ہندو مسلم فسادات اور ہندی اردو کی کشیدگی کے باعث اردو داں طبقہ میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اور ہندو خواتین کے مقابلہ میں مسلم خواتین کی حالت بہت زیادہ ابتر اور قابل اصلاح ہے۔ چونکہ مولانا خواتین کی حالت کی اصلاح کرنے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ اس لئے انھیں مجبوراً مسلم خواتین کی حالت زار کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہونا پڑا۔ اب چونکہ دنیا کی ہر قوم کو اغیار کے مقابلہ میں اپنے بزرگوں کے حالات سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے مسلم خواتین کے لئے تاریخ اسلام سے زیادہ

اور کیا چیز دلچسپ ہو سکتی ہے۔ اس لئے مولانا نے اسی طرف توجہ فرمائی۔ اس کے علاوہ چونکہ مولانا کو تاریخ اسلام پر خوب عبور حاصل تھا اس لئے انھوں نے اس خزانہ سے چند جواہر پارے چن کر بحیثیت ایک ماہر فن ناول نگار کے انھیں زندہ جاوید ناولوں اور افسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے قدیم و جدید ہر دو زمانوں سے واقعات منتخب کئے ہیں اور ایک یا دو نہیں بلکہ اپنے معزز معاصر مولٰنا عبدالحلیم شرر کی طرح اس قدر ناول اور افسانے لکھے ہیں کہ ان سب کا نام بھی بیک وقت یاد رکھنا مشکل ہے۔ "آمنہ" "یاسمین شام"۔ "عروس کربلا" "نوبت پنجروزہ"۔ "محبوبۂ خداوند"۔ "اندلس کی شہزادی"۔ "ابن کا دم واپسیں"۔ "منتظر طرابلس"۔ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

مولانا راشد الخیری کے تاریخی ناولوں کے پلاٹ بظاہر پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن در اصل ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں یہ غلط فہمی تاریخ اسلام سے نابلدی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ ان ناولوں کے پلاٹ کہیں (مثلاً عروس کربلا) ذاتی او خاندانی عناد کی وجہ سے دو جماعتوں کی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ بظاہر یہ عناد خاندان علیؑ اور خاندان معاویہؓ کے اختلاف سے امام حسینؓ اور یزید کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ خاندانی عناد قومی عناد کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسے تاریخی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے۔ الغرض دو مخالف اور مرکزی قوتیں آپس میں برسر پیکار نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ناولوں کے پلاٹ مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کشمکش پر مبنی ہیں۔ عیسائیوں کو اپنی قوت پر ناز تھا۔ ان کی سلطنتیں مہذب دنیا کے ایک نہایت وسیع علاقہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ مٹھی بھر مسلمانوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور جو مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا اس پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ "یاسمین شام" میں مولانا نے انہی روح فرسا مناظر کو پیش کیا ہے۔ اب میں مولانا کے بعض تاریخی ناولوں پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہوں۔

یاسمین شام

اگر اس ناول کو خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانہ کی تاریخ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا دکھایا ہے۔ اور یہ بھی بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی متواتر فتوحات کا سبب اصلی کیا تھا۔ اور اور مجاہدین اسلام کس طرح سرفروشیاں اور قربانیاں کرتے تھے۔ اور مسلمان عورتیں کس طرح جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ یہ ناول جداگانہ حصوں میں منقسم ہے یعنی اول تاریخ اسلام اور دوسرے حصہ میں ایک افسانہ بیان کیا گیا ہے۔ اور افسانہ نگار کو کامل اختیار ہے کہ افسانہ کو پورا کرنے کے لئے حسب ضرورت کردار تخلیق کرے۔

یاسمین شام کا سب سے نمایاں کردار ایک عورت بلقیسا کا ہے جس میں استقلال حد درجہ کا ہے۔ اس کا باپ عیسائی تھا لیکن اس کی ماں مسلمان ہو چکی تھی، بلقیسا کے باپ کو لڑکیوں سے نفرت تھی وہ کسی حالت میں بھی ایک لڑکی کا باپ بننا گوارہ نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی ماں مسلمان ہونے کے سبب سے اس کے خیال یا اعتقاد سے متفق نہ تھی۔ داستان کا آغاز اسی بحث سے ہوتا ہے۔ بلقیسا ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھی کہ اس کا شوہر یرموز اس ڈر سے کہ کہیں لڑکی نہ پیدا ہو جائے۔ اپنی بیوی کو تاکید کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسے زندہ نہ رہنے دے۔ اس کے بعد یرموز جنگ میں شرکت کے لئے چلا جاتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں رومانہ کے لڑکی پیدا ہوتی ہے وہ مسلمان ہونے کے سبب سے لڑکی کو مارنا گوارہ نہیں کرتی۔ مگر ظالم شوہر کے ڈر سے اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے وہ لڑکی کو ایک سہیلی کے حوالہ کر دیتی ہے۔

جب بلقیسا بڑی ہوتی ہے تو یرموز جسے یہ معلوم نہیں ہے کہ بلقیسا اس کی اپنی بیٹی ہے اس کی منگنی اپنے بیٹے پیٹر سے کرنا چاہتا ہے۔ رومانہ اصل راز سے آگاہ ہوتے ہوئے اس منگنی کی مخالفت کرتی ہے۔ اس پر اس کا ظالم شوہر اسے قتل کر دیتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ شادی ہو بلقیسا کی جوانی اس کے عزیزوں کو مصیبت میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اس شہر کا حاکم ہیرس بلقیسا سے شادی کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور جب یرموز اس کی مخالفت کرتا ہے تو وہ قتل کرا دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی ہیرس اپنے اس ناپاک مقصد میں

کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ بلقیسا کا دوسرا خواہشمند سرٹونی پیئیرس کے ارادوں کی تکمیل کی راہ میں سد سکندری بنکر حائل ہوتا ہے۔ مگر سرٹونی کی قسمت میں بھی کامیابی نہیں لکھی تھی۔ ایک مسلمان سردار اسعد بر وقت بلقیسا کی مدد کرتا ہے اور اسے ظالم کے پنجہ سے رہا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

گو پیٹر اور بلقیسا کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن مسلمان ماں کی بچی منگنی کو ہی بمنزلہ نکاح تصور کرتی تھی اور پیٹر کا بدرجہ شوہر ادب و احترام کرتی تھی۔ بلقیسا کے فرضی باپ نے اپنے آخری سانس کے ساتھ اس منگنی کی مخالفت کی اور اس کی پیدائش کے راز کو کھولنا چاہا۔ مگر موت نے مہلت نہ دی۔ اس لئے اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ گو بلقیسا اسعد سے ملاقات ہونے کے بعد اس کے حسن اخلاق۔ اسکی صداقت۔ اس کی شجاعت اور ایثار اور اس کے حسن سلوک کی مداح ہو جاتی ہے اور اس کی اسوقت سے سب سے افضل خواہش اسعد کی خدمت کرنی ہی ہوتی ہے لیکن وہ ایک نیک اور شریف بیوی کی طرح اپنے آپ کو صرف پیٹر کی بیوی تسلیم کرتی ہے۔ اور گو پیٹر ایک ظالم۔ لالچی محسن کش اور بدنیت انسان ثابت ہوتا ہے اور اسلام سے دشمنی کی خاطر بے گناہ بلقیسا کو بے حد اذیتیں پہنچاتا ہے لیکن بلقیسا کوئی ایسی حرکت نہیں کرتی کہ اس کی شرافت پر دھبہ آئے۔ آخر جب ظلم حد سے گذر جاتا ہے تو پیٹر تائب ہو کر دامن اسلام میں پناہ لیتا ہے اور اسوقت اس راز کا پردہ چاک ہوتا ہے اور اسعد اور بلقیسا کی شادی ہو جاتی ہے

یاسمین شام بہت دلچسپ ناول ہے۔ اس میں عورت کا کیرکٹر بہت مضبوط اور قابل تقلید ہے۔ دنیا کی کوئی مصیبت اور کوئی ظلم ہیروین کو راہ راست سے منحرف نہیں کرتا ۔۔۔۔ اس ناول میں مولانا نے مردوں کو بے وفا۔ ظالم اور جابر دکھایا ہے اور عورتوں کو مظلوم۔ وفادار اور شوہر پرست۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ کس قدر خدا ترس اور مہمان نواز تھے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بلا کسی غرض کے اخلاق اور سلوک کے ساتھ پیش آنا اپنا مذہبی فرض جانتے تھے۔

محبوبۂ خداوند یہ عہد عثمانی کا تاریخی ناول ہے جس میں قرون اولیٰ کے پاکباز اور نیک نفس مسلمانوں کی جانبازیوں کی تصویر دکھائی ہے۔ طرابلس کا مصنوعی مقدس خداوند کا ٹھیٹ شمالی افریقہ کی حسینہ سفیریہ کو قابو میں کرنے کے لئے انتہائی جد و جہد سے کام لیتا ہے۔ طرابلس کا گری گوری حاکم بھی سفیریہ کا دیوانہ ہو کر اسے اپنا بنانا چاہتا ہے۔ مگر یہ سچائی کی پرستار اور اخلاق و مروت کی پتلی دولت و حشمت اور جاہ و جلال پر لات مار کر اسلام کی لونڈی اور ایک غریب مسلمان قیدی کی سیرت کی پرستار بن جاتی ہے مسلمانوں کی ایک ٹڈی دل جماعت قلیل التعداد عیسائیوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ طرابلس کا فرعون ثانی اور اس کی فوج مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ہزار جتن کرتے ہیں۔ مگر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آخر مسلمان طرابلس کی سلطنت کا تختہ الٹ دیتے ہیں اور سفیریہ کا نکاح اسی مسلمان قیدی سے ہو جاتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں ناولوں کا انجام رنج و غم میں نہیں بلکہ مسرت و شادمانی میں ہوتا ہے۔ اور یہ جواب ہے ان گمراہ مبصرین کے اعتراض کا جو کہتے ہیں کہ مولانا راشد الخیری صرف حزنیہ فسانے لکھتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی لڑائیوں کے علاوہ حسن و محبت کے دلچسپ مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر مولانا راشد الخیری منظر نگاری کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ مگر جہاں کہیں انھوں نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ کمال کر دیا ہے۔ نہایت مختصر الفاظ میں مناظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اسے نہ صرف اپنے تصور میں دیکھنے لگتے ہیں بلکہ محسوس بھی کرنے لگتے ہیں۔ اسی محبوبۂ خداوند میں صحرائے افریقہ کی قیامت خیز گرمی کا نقشہ کس قدر صحیح اور عمدہ کھینچا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"صبح کا نکلا ہوا آفتاب نصف منزل طے کرنے کے بعد منزل مقصود کیطرف ڈھلنا شروع ہو چکا تھا

قیامت خیز گرمی نے ہر جاندار کی جان پر بنا دی تھی۔ شجر، حجر، گھاس، پھوس، کائنات کی ہر شئے آگ میں جھلس رہی تھی....... زمین آگ اگل رہی تھی۔ آسمان انگارے برسا رہا تھا...... (صفحہ ۲۴)

عروس کربلا

تاریخ اسلام کے متعلق یہ مولانا کا بہت مشہور ناول ہے۔ اگرچہ "یاسمین شام" اور "محبوبۂ خداوند" کی طرح اس کا انجام بھی شادمانی اور مسرت پر ہوتا ہے۔ لیکن درد و اثر کے لحاظ سے یہ مولانا کے تمام تاریخی ناولوں میں ممتاز ہے، کربلا کا واقعہ یوں ہی درد انگیز ہے۔ اس پر مصور غم کے قلم نے واقعی قیامت برپا کر دی ہے۔ اکثر مقامات پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ مولانا کے اس ناول کی مقبولیت کو دیکھ کر کئی صاحبوں نے اس طرز پر ناول لکھے ہیں۔ مگر "عروس کربلا" کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ مولانا نے مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کے ان حملوں کا بھی جو اس نے دبی زبان سے اسلام پر کئے ہیں بڑی قابلیت سے عروس کربلا میں جواب دیا ہے۔ جرجی زیدان کے ناول پلاٹ کی دلچسپی اور بیان کے تسلسل کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ مگر علامہ راشد الخیری کا یہ ناول "عروس کربلا" بیان کی دلآویزی اور پلاٹ کی دلچسپی کے اعتبار سے بھی جرجی زیدان کے ان ناولوں پر فوقیت رکھتا ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ اس ناول میں حضرت علی شیر خدا کی شہادت سے شروع ہوتی ہے اور حادثۂ کربلا کے بعد ملک کے حالات غم و الم اور ظلم و ستم سے لبریز ہیں اور اس قدر درد انگیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ ہر واقعہ دل کے پار ہو کر ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ جو قصہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ عروس کربلا میں تصنیف کیا گیا ہے وہ حد درجہ دلآویز ہے۔ اس کی ہیروین رد ز (کلثوم) کا کیرکٹر بعض اعتبار سے سفیرہ اور ربقیسا سے بھی بڑھ گیا ہے۔

امین کا دم واپسیں

یہ ناول خاندان عباسیہ کے مشہور عالم تاجدار خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹوں امین و مامون کی باہمی جنگ اور امین کے حسرت ناک انجام کی پر درد داستان ہے۔ امین و مامون کا باہمی نزاع ہارون الرشید کی حیات میں شروع ہو گیا تھا۔ تربیت اور علم کے لحاظ سے بھی دونوں میں کسی ایک کو فضیلت دینا مشکل تھا۔ مگر امین عیش و آرام کی طرف زیادہ مائل تھا۔ ہارون الرشید مامون کو ولیعہدی کا مستحق نہ صرف اس لئے سمجھتا تھا کہ عمر میں امین سے بڑا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی طبیعت میں نیکی تھی۔ مگر ملکہ زبیدہ کی موجودگی میں ہارون الرشید کی مجال نہ تھی کہ امین کی مخالفت میں زبان تک ہلاتا۔ جب خلیفہ ہارون الرشید کا بمقام طوس انتقال ہو گیا تو زبیدہ اور امین نے جمعیت، خزانہ، دربار، ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ ایک مامون کا کانٹا باقی تھا وہ بھی یہ یقین تھا کہ جلد نکل جائے گا۔ اس کے ساتھ امین کے وزیر فضل بن الربیع کے اشارہ سے تجویز ہوئی کہ مامون کی بجائے موسیٰ کی جو امین کا لڑکا اور ابھی بچہ ہی تھا بیعت لے لی جائے۔" مگر مامون بھی بچہ نہ تھا کہ بن لڑے جھگڑے اپنے حقوق غصب ہوتے دیکھ کر خاموش رہتا۔ چنانچہ جنگ کا فیصلہ ہوا۔ گو ابتدا میں امین کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی مگر امین عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ رعیت اور فوج کا ایک بڑا حصہ اس کے خلاف ہو چکا تھا اس لئے اسے ہر موقعہ پر منہ کی کھانی پڑی۔ آخر قید ہو کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور وہیں قاتلوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ مولانا وقت کے اس اتار چڑھاؤ پر حکیمانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

زمانہ کا نشیب و فراز چشم بینا کے واسطے صداقت کا راز اور قدرت کی آواز ہے۔ آنکھیں وہ منظر فراموش نہیں کر سکتیں جب ہارون کا تاج شاہی اقبال زبیدہ کو بوسے دے رہا تھا۔ اور خلافت عباسیہ کا ہر ذرہ اسکے جاہ و حشم کا مرکز اور دولت و حکومت کا گھر تھا۔ انقلاب کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اور سلطنت پر حکومت کرنے والی بیگم کی آنکھ سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہ رہی ہیں۔ امیدیں قریب قریب ختم ہو رہی ہیں توقعات بظاہر مٹ چکی ہیں...... تاریخ سے بہت زیادہ کتاب زمانہ کے اوراق انقلاب سے لبریز ہیں بڑے بڑے

تاجدار خاک میں رل مل کر آغوش زمین میں سوتے ہیں۔ لیکن دنیائے حیات کو جگمگا دینے والے جواہرات اس کی گود میں دیکھتے ہی دیکھتے ایسے پھیکے پڑے کہ روشنی اندھیرے سے اور سپیدی سیاہی سے ہمیشہ کو بدل گئی۔ انقلاب زمانہ کی اس سے زیادہ اور کیا عبرت انگیز تصویر ہو سکتی ہے؟

"قتل امین۔ نہیں قتل امین کے سلسلہ میں ہر واقعہ عبرت کی پوری تصویر ہے۔ جس ماں کے یہ الفاظ آج تک آغوش تاریخ میں موجود ہیں۔ کہ ڈھائی سو فرسنگ کی نہر میں کدال کی ہر ضرب کی اجرت ایک اشرفی دونگی آج اس کا بچہ قصر الخلد کے باہر اس طرح نکلتا ہے کہ اس کو روشنی تک میسر نہیں جس شہزادہ کی سواری میں غلاموں کے لباس اور ہتھیاروں کی چمک میدان جگمگا دیتی تھی اس وقت اس کے جلو میں صرف ایک شخص ہے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"رحم رحم الراحمین رحم۔ ۲۵ محرم ۱۹۸ھ ہجری کے چمکنے والے تارے کیا دیکھتے ہیں کہ ہارون الرشید کا بچہ، زبیدہ خاتون کا لال، سلطنت عباسیہ کا تاجدار خلیفہ ہاشمی امین الرشید کڑکڑاتے جاڑے میں دشمنوں کے ہاتھوں اسطرح گرفتار ہے کہ جسم پر سوائے ایک پاجامہ کے جس سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں اور کوئی کپڑا نہیں!! آدھی رات کے سنسان وقت میں قصر الخلد کے رہنے والے امین اور قصر زبیدہ میں پلنے والے شہزادہ کو جیلخانہ کی دیواروں نے آغوش میں لیا!"

شہنشاہ کا فیصلہ

یہ دردناک داستان خود مصور غم کے پرتاثیر الفاظ میں اس وقت کی ہے جب خلفائے عباسیہ کا چراغ جاہ وجلال زمانہ کے ہاتھوں ٹمٹما کر بجھ چکا ہے۔ بغداد جو مدتوں بوسہ گاہ ملوک رہا اس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے معتصم باللہ کے عہد کے ساتھ ہی سلطنت عباسیہ کا بھی خاتمہ ہوچکا ہے۔ ہلاکو خاں کا لشکر جرار سرزمین بغداد پر خون کے پرنالے بہا چکا ہے۔ اس اقتدار رعب کا خاتمہ ہوچکا ہے جس کو آج تک مسلمان رو رہے ہیں۔ ہارون اور مامون کے محل جو نمونہ جنت تھے تاراج ہوچکے ہیں مسجدیں برباد اور خانقاہیں منہدم ہوچکی ہیں۔ اور جس سرزمین پر رونق اور مسرت کے ڈنکے بجتے تھے وہاں آج ہُو کا عالم ہے۔ ہلاکو خاں بھی انقلاب زمانہ کا شکار ہوکر فنا کے گھاٹ اتر چکا ہے اور اب بغداد پر اباقا خاں کا سکہ چل رہا ہے۔ اس زمانہ میں ایک یہودی تاجر نے اپنے آخری سانس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کا نکاح اپنے لالچی اور بدنیت بھتیجے ابونوس کے ساتھ کردیا۔ کچھ مدت تک تو یہ تعلق خوشگوار رہا اور ان کے ہاں ایک لڑکا بھی پیدا ہوگیا۔ لیکن اس عرصہ میں ابونوس اس علاقہ کی حسین ملکہ عزرانہ کی طرف مائل ہوگیا۔ پہلے تو مغرور عزرانہ ابونوس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ لیکن آخر جب وہ رضامند ہوئی تو مشکل یہ پیش آئی کہ شریعت موسٰی کے مطابق ایک مرد کا ایک وقت دو عورتوں سے نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے بدطینت اور بدنیت ابونوس نے اپنی بیوی کا نکاح ایک اور شخص کے ساتھ کردیا۔ اور اس پر یہ ظاہر کردینے کے لئے کہ وہ ابونوس کی بیوی نہیں بلکہ بہن ہے اپنے بچہ کو ہلاک کرنے کی نیت سے باہر پھینک آیا۔ اور اس کے مار ڈالے جانے کا فیصلہ ہوا۔

بچہ کی ماں یعنی ابونوس کی بیوی اپنے بچہ کو بچانے کے لئے بیتاب ہے۔ مگر وہ ابونوس سے وعدہ کرچکی ہے کہ وہ خود کو اسکی بیوی ظاہر نہ کریگی اس لئے بچے کے باپ کا نام ظاہر کرنے سے مجبور ہے۔ آخر جب جلاد بچہ کو قتل کرنے لگتا ہے تو اس وقت اباقا خاں وہاں پہونچکر بچہ کو بچاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک بہت ہی پُردرد داستان ہے۔ اس میں ابونوس کی بیوی اسمٰعیلہ تمام قصہ پر چھائی ہوئی ہے۔ مولانا نے اسے اپنے اصول کے مطابق مظلوم۔ وفادار اور بہت ہی نیک سیرت پیش کیا ہے۔ یہ ناول گو بہت ہی مختصر ہے مگر بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ اول تو پلاٹ ہی جس کو میں نے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے بے حد دلچسپ ہے اور حضرت

علامہ کا قلم پڑھنے والے کے قلب پر جادو کا اثر کرتا ہے۔ بعض مواقع پر جب اس میں ڈرامائی عنصر غالب آجاتا ہے، اس وقت تو دل میں ایک کربیدگی سی پیدا ہو جاتی ہے کہ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو۔ اس میں طرز تحریر اسقدر دلآویز اور موثر ہے کہ قاری عبارت کے تخیل میں گم ہو جاتا ہے۔

اندلس کی شہزادی

یہ مختصر ناول اس خاک اندلس سے متعلق ہے جہاں سے مسلمانوں میں ہزاروں اور لاکھوں صورتیں پیدا ہوئیں۔ ملکوں پر حکومت کرنے والے اٹھے۔ دنیا میں زندگی کا جائز حق رکھنے والے پیدا ہوئے۔ دیکھنے اور دکھانے کے لائق سپوت اس ماں کی گود میں کھیلے۔ اور تاریخ کو جگمگا دینے والے چاند اسی آسمان سے نمودار ہوئے۔ یہ اس زمانہ کی داستان ہے کہ اسلامی سلطنت کا چراغ سرزمین اندلس میں ٹمٹما رہا تھا۔ ابوالحسن نے سلطنت کی خاطر اپنے عاشق باپ ابوعبداللہ کو قتل کیا مگر وہ بھی اس کا پھل نہ کھا سکا۔ فرڈینڈ نے مکار و دغاباز ابوالحسن کو شکست دے کر سلطنت اسلامی کا خاتمہ کر دیا۔ فرڈینڈ کے بعد ملکہ الیفنٹا تخت نشین ہوئی۔ وہ بہت حسین اور دانشمند تھی۔ لیکن اسے تخت پر بیٹھے کچھ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ سانپ نے کاٹ کھایا۔ وہ بظاہر مردہ معلوم ہونے لگی۔ اور اسے اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔

ملکہ الیفنٹا کے بعد تخت پر حق اس کے چھوٹے بھائی فریڈرک کا تھا۔ مگر چونکہ وہ ابھی کم عمر تھا اس لئے شہزادہ جمیس کو موقع مل گیا اور وہ رعیت اور ارکان سلطنت کو دھوکہ دے کر تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔ اور تخت نشین ہوتے ہی ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر ملکہ الیفنٹا کی لاش کو مسلمان چرواہ نکال کر لے گیا۔ اور علاج کر کے اچھا کر لیا۔ شہزادی الیفنٹا چرواہے کی صداقت آمیز باتوں سے اسقدر متاثر ہوئی کہ مسلمان ہو گئی۔ اس ناول میں مولانا نے دکھایا ہے کہ مسلمان خواہش کے بندے اور نفس کے غلام ہرگز نہیں۔ بات کے دھنی اور دل کے غنی ہیں۔ محبت کی زنجیر ان کے قدموں میں تاج شاہی کو ٹھکرانے والی اور خلوص کا دریا ان کے سینہ میں نفسانی سمندر کو تہ و بالا کرنے والا ہے۔ ملکہ الیفنٹا نے مسلمانوں کے ان اطوار پسندیدہ و اخلاق حمیدہ کی قدر کرتے ہوئے اس چرواہے کے ساتھ نکاح کر لیا جس کے پاس نہ پیٹ کو ٹکڑا، نہ تن کو کپڑا۔ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں لیترا میسر تھا۔ اور اس نے دریائے محبت میں ہر قدم ایسا اٹھایا کہ تاج شاہی قربان اور تخت سلطنت کو تصدق کر دیا۔

مولانا راشد الخیری کے تاریخی ناول دو وجہوں سے غیر فانی ہو گئے ہیں۔ ایک تو ان کا اسلوب بیان اور دوسرے افسانہ کے پلاٹ کی تعمیر۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ اس فن کے بلاشبہ بادشاہ ہیں۔ اور جس بے مثل طریقہ پر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور کوئی مصنف اس طرح نہیں کرتا۔ پلاٹ کا تو اسی ایک ناول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے ان کرداروں سے جنہیں فروگذاشت کیا جا چکا ہے وہ ایسے بے نظیر پلاٹ تعمیر کر لیتے ہیں۔ کہ تاریخ کے یہ اوراق پارینہ ہماری آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویروں کی طرح حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ "اندلس کی شہزادی" پڑھتے وقت دل اسقدر محو ہو جاتا ہے کہ یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ ہم صرف ایک ناول پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ قلمکار راشد الخیری اپنے تمام ناول میں ہمکو ایک لمحہ بھی ایسا نہیں دیتے کہ ہم کچھ اور سوچ سکیں۔ اس تاریخی ناول میں مصنف مرحوم نے دو تین مزاحیہ سین بھی دکھائے ہیں جو موقع کے لحاظ سے نہایت کامیاب ہیں خاص طور پر اس لئے کہ موصوف نے اپنے پر لطف مکالموں کے ذریعے سے نہایت نیچرل اور لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔

نوبت پنج روزہ

مولانا راشد الخیری کا تاریخ ہند سے متعلق یہ ناول اپنا جواب نہیں رکھتا۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی پانچ نوبتیں حددرجہ درد انگیز پیرایہ میں لکھی ہیں۔ یہ داستان ہی بذات خود کیا کچھ کم درد انگیز ہے۔ اسپر مصنف مرحوم کا قلم۔ دنیا کے خزینہ ناولوں میں ایک بہترین چیز بن گیا ہے۔ ناممکن ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت دل

رکھنے والا انسان اسے پڑھ کر آنسو نہ بہائے۔ اس میں غدر دہلی کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ شاہی خاندان کے علاوہ اہل شہر پر کیسی مصیبت نازل ہوئی۔ اور انگریزوں کی سکھ فوج نے فتح کے بعد کس طرح سکھا شاہی قائم کی اور کس بیدردی وجفاکاری کے ساتھ مسلمانوں اور خصوصًا نوجوان مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا اور پردہ میں بیٹھنے والی خواتین کی بے حرمتی کی۔ نوبت پنج روزہ کا ہر باب بیحد دردناک ہے۔ اس حزن وملال رنج وغم اور حسرت وحرماں سے لبریز ناول کا نمونہ بہادر شاہ کی زبان سے سنئے۔

"میں وہ شخص ہوں جس کی بدنصیبی پر تقدیر بھی رونے کا حق رکھتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گذرا جوانی اور بڑھاپا دونوں دکھ پیٹتے پیٹتے اور رنج سہتے سہتے بسر ہوئے چند روز باقی ہیں وہ بھی نہ معلوم کیا کیا دکھائیں گے جن آنکھوں کی ایک گردش دنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خشک ہو گئے۔ جو ہاتھ امور سلطنت کو ایک اشارہ میں زیر وزبر کر دیتے انھوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے ڈھوئے اور اتنے ڈھوئے کہ اب سکت باقی نہ رہا۔ اور خاندان شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ وبرباد ہوئی مجھ پر اور میرے بچوں پر کربلا کے کے فاقے گذرے! کلیجے کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہائے! اگر اس کے بعد میں کسی سزا کا مستحق ہوں تو خدا کی مرضی مقدم ہے اور میں اس کے واسطے تیار ہوں۔"

اس ناول میں متعدد مقامات پر اس قدر دردناک پیرایہ بیان ہے کہ بے اختیار خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس قدر المناک ناول لکھنے کے لئے مصور غم کے علاوہ ہر قلم عاجز ہے۔

منظر طرابلس اس مختصر افسانہ کے علاوہ بعض مختصر تاریخی افسانوں کو "شہید مغرب" کے نام سے بھی شائع کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر افسانہ اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

ناولوں کے مقاصد گو جن ناولوں پر میں اس مضمون میں نظر ڈال رہا ہوں وہ تاریخی ناول ہیں لیکن وہ خاص مقصد کے تحت میں لکھے گئے ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوں میں عورت کا کیرکٹر سب سے زیادہ نمایاں ہے مولانا نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایسی خواتین پیش کی جائیں جو اخلاق۔ عادات اور اطوار میں ان کی خواتین کے لئے قابل تقلید ہوں۔" یاسمین شام" میں بلقیس کا کیرکٹر نہایت زبردست ہے۔ وہ ہر مصیبت کا سامنا کرتی ہے۔ لیکن وفاداری، شرافت اور اخلاق کی راہ سے اس کا قدم ہرگز نہیں ڈگمگاتا یہی حال طرابلس کی حسینہ سفیریہ کا ہے۔

ان ناولوں کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو تاریخ اسلام سے آشنا کرایا جائے۔ اور پھر اسقدر دلچسپ طریقہ سے کہ تفریح طبع بھی ہو جائے اور تاریخ اسلام کے متعلق مفید باتیں بھی معلوم ہو جائیں۔ "یاسمین شام" "محبوبہ خداوند" "عروس کربلا" "ابن کا دم واپسیں" اور "شہنشاہ کا فیصلہ"۔ ان ناولوں میں ابتدائے اسلام سے لے کر زوال بغداد تک کے حالات بیان کئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو اپنے معاصرین کی طرح صرف داستان حسن وعشق وجنگ وجدال نہیں بنایا ہے بلکہ کام کی باتیں تحریر کر کے اردو کے بہترین تاریخی ناول بنائے ہیں جن کے مطالعہ سے تفریح طبع کے علاوہ تاریخ اسلام سے بھی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ان ناولوں کا تیسرا مقصد تاریخ اسلام کے متعلق ان غلط فہمیوں کا دور کرنا ہے جو متعصب پادریوں اور عیسائی مورخوں کی گمراہ کن تبلیغ کی بدولت غیر مسلموں میں پھیل گئی ہیں۔ عرب کے جاہل اور بت پرست قبیلوں نے اسلام کے سایہ میں پناہ لینے کے بعد اسقدر تیز رفتاری کے ساتھ اپنی سماجی اور معاشرتی حالت میں انقلاب پیدا کیا اور اس قدر جلد مہذب دنیا کے ایک بڑے حصہ کو روند ڈالا کہ دنیا آج تک محو حیرت ہے۔ اس عروج کی وجوہ بیان کرنے کے لئے ہزاروں تاویلوں سے کام لیا ہے۔ مگر چونکہ یورپین مورخین کی آنکھوں پر مذہبی

اختلاف وتعصب کا پردہ پڑا ہوا ہے اس لئے وہ اس کی وجہ معلوم کرنے سے عاجز ہیں۔ مولانا نے مسلمانوں کے اس عروج کا سبب اصلی بیان کرنے کی نہایت کامیاب سعی کی ہے۔

کردار نگاری تاریخی ناولوں میں کردار نگاری کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ کسی مصنف یا مولف کو تاریخی کرداروں کی سیرت میں کمی یا بیشی نہ کرنی چاہئے۔ اگر وہ اللہ کے نیک بندے تھے تو انھیں اسی حالت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ تاریخی ناولوں میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر کردار تاریخی ہی ہو۔ ضرورت قصہ کے مطابق افسانہ نویس کردار تخلیق کرسکتا ہے مثلاً یاسمین شام میں بلقیسا کا اور عروس کربلا میں روز کا کردار مولانا کا تخلیق کردہ ہے اور ان دونوں سے مولانا کی کردار نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا نے اپنی کردار نگاری کی ان دو ناولوں میں جو مضبوطی دکھائی ہے اس سے اردو کے بہت سے ناول خالی ہیں۔

فلسفۂ حیات مولانا راشد الخیری نہ صرف ایک کامیاب ناول نگار ہمدرد نسواں اور مصلح قوم تھے بلکہ ایک بلند پایہ مورخ اسلام اور فلسفی بھی تھے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کا بغور مطالعہ کیجئے معلوم ہوگا کہ انھوں نے حیات انسانی کے متعلق اسقدر حکیمانہ نکتے لکھے ہیں کہ دنیا ان پر عمل کرنے سے یقیناً نجات حاصل کرسکتی ہے۔ انکو یقین ہے کہ دنیا میں عروج وزوال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی موجودہ اور خوشحالی میں پھول کر غریبوں کی حالت سے ناآشنا نہ ہوجائے۔ کیونکہ دولت اور مسرت فانی چیزیں ہیں۔ عشرت اور راحت طلب زندگی کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ ہارون الرشید کا بیٹا اور ملکہ زبیدہ کی آنکھوں کا تارا امین عیش و عشرت کے ہاتھوں میں پھنسکر نہ صرف دولت وحشمت اور عزت وحرمت کھو بیٹھا۔ بلکہ اسے جیل خانہ کی چہار دیواری میں محبوس ہوکر قتل ہونا پڑا۔ طرابلس کے خداوند کا تھیٹ اور سپہ سالار گرگیوری کا انجام ہمارے لئے تازیانہ عبرت ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے۔ اسجگہ انسان بطور مسافر کے آتا ہے اور چند سال گذار کر چلا جاتا ہے اس لئے اس چار روزہ زندگی پر پھول نہیں کھاسکتا۔ دولت۔ عزت اور حشمت دوسروں پر ظلم کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے میں وقتی طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو کیا اس کا انجام ہمیشہ نہایت دردناک ہوا کرتا ہے۔ غرناطہ کے غاصب حکمران جیسیں بیٹرس اور سرٹونی جو بلقیسا سے شادی کرنی چاہتے تھے انکا حسرتناک انجام ہمارے لئے تازیانہ عبرت ہونا چاہئے۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ کا اندوہگیں انجام انسان کو دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا سبق دینے کے لئے کافی ہے۔

مصور غم نے تعلیم دی ہے کہ دنیا فانی ہے یہاں سلوک سے رہنا چاہئے۔ ایک کو دوسرے کے رنج وتکلیف کا احساس ہو۔ ہمدردی کا مادہ موجود ہو۔ وفاداری اس کا فرض ہو، معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی زندگی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ والدین۔ شوہر۔ بیوی۔ بچہ۔ بھائی بہن خسر اور استاد کی عزت کرنا ضروری ہے مصیبت زدوں کی تکلیف میں مدد کرنا لڑائی جھگڑے سے بچتے رہنا تقاضۂ انسانیت ہے۔

مصور غم نے اپنے اکثر ناولوں میں دو متضاد کیرکٹر پیش کئے ہیں جن کی زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بغور مطالعہ سے ایک بہترین اور مستقل اخلاقی درس حاصل ہوتا ہے۔ وہ مشرقی اور خاصکر اسلامی تہذیب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ وہ مسلمان خاتون کو خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا درس دیتے ہیں۔ ان کے اصلاحی۔ سماجی اور تاریخی ناولوں میں انکی یہی تعلیم ہر جگہ نمایاں ہیں وہ قدامت پسند تھے مگر صرف اسی حد تک کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو یورپ کی دہریت اور سرمایہ پرستی کی تہذیب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مصلح قوم تھے اور قومی درد سے سرشار دل کے مالک تھے۔ انکی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گذرا کہ مسلمانوں کو زوال اور پستی کے غارعمیق سے نکال کر ترقی اور سربلندی کی راہ پر گامزن کردیں۔ وہ اپنے اس نیک مقصد کے لئے کسی فوری انقلاب کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ اس مقصد کو مسلمانوں کی ذہنی تبدیلی سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اسی صورت سے مستقل و پائیدار نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

مکالمے مکالمہ نویسی اب تو ناولوں کا جزو لازمی بن گئی ہے۔ کیونکہ مکالموں کے صحیح استعمال سے نہ صرف ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان سے کردار کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مولانا نذیر احمد نہ صرف اُردو میں مکالموں کے موجد تھے بلکہ اس فن کے ماہر بھی تھے صاحب افسانہ آزاد" اور اس کے بعد دیگر ناول نویسوں نے مکالمہ نویسی کی۔ مگر بہت کم لوگ مولانا کے پایہ کو پہونچ سکے، مولانا راشد الخیری نے بھی مکالمے لکھے ہیں اور گو ان کے بعض مکالمے طویل ہوتے ہیں لیکن اپنی دلچسپی کے لحاظ سے یقیناً قابل قدر ہیں ان سے نہ صرف کردار افسانہ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بہت سی الجھی ہوئی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں (ملاحظہ ہو "یاسمین شام" صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱ پر)

بلقیسا اور اسعد کے مکالمہ سے مصور غم کی تعلیم اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ "محبت" اور "انسانیت" اس امتیاز کا جو "یاسمین شام" میں کیا گیا ہے اُردو کے بہت کم ناول نویسوں نے لحاظ رکھا ہے مولانا کی ایسی ہی تعلیم نے انہیں نہ صرف مصلح قوم۔ ہمدرد نسواں بلکہ مشرقی تہذیب کا علمبردار اور اُردو کا محسن اعظم بنا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُردو فنا بھی ہو جائے تو بھی مولانا کی یہ حکیمانہ اور اخلاقی تعلیم ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کے نام کو جگمگایا کرے گی۔

پلاٹ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ تاریخی ناول یا افسانوں کے پلاٹ بنانے میں کچھ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ واقعات ترتیب وار پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ جنکو بدلنے کی کسی ادیب کو اجازت نہیں مانا کہ یہ بالکل صحیح ہے مگر بایں ہمہ تاریخی ناولوں یا افسانوں کا پلاٹ بنانا بہت دشوار ہے۔ پہلے مناسب و موزوں واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے کردار افسانہ کے کیرکٹر کے مطابق واقعات کی ترتیب پھر افسانہ کی ضرورت کے مطابق واقعات میں حذف و اضافہ کرنا اور پھر اس طرح کہ تسلیم شدہ تاریخی واقعات کی صداقت پر ضرب نہ آئے بہت دشوار ہے۔ اسی لئے تو مولانا راشد الخیری کے اکثر معاصرین کے ناول صرف داستانِ حسن و عشق بنکر رہ گئے ہیں۔ تاریخی صداقت ان میں بہت کم ہے۔ اُردو کے ناول نویسوں میں یہ امتیاز صرف مولانا راشد الخیری ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے پاک محبت اور بدکرداری کی داستان لکھنے کے ساتھ ہی تاریخ اسلام کے وہ واقعات بیان کئے جن کی صداقت سے دنیا کا کوئی مورخ انکار نہیں کرسکتا ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ مجاہدین اسلام کس طرح سرفروشانہ قربانیاں کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مسلمان عورتیں کس دل اور گردے کی مالک تھیں اور کس طرح جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنے قلم کے زور سے اپنے تاریخی ناولوں میں ایک تڑپ اور ایک روح پیدا کر دی ہے ایسا معلوم ہے کہ تاریخ اسلام کے ان واقعات کو بیان کرتے وقت ان پر اسلامی جذبہ طاری ہو جاتا تھا جس کے اثر سے وہ مسلمانوں کے جوش ایمانی انکی جرأت اور جانبازی کی مکمل تصویر پیش کر دیتے ہیں۔

مولانا راشد الخیری نے واقعات اور افراد ناول کے تعلقات کو ہر وقت پیش نظر رکھا ہے لیکن تاریخ اسلام کے وہ واقعات جو تبلیغ اسلام کے متعلق ہیں جنگ و جدل سے بھی پُر ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان تاریخی واقعات کو بھی بیان کر دیا ہے مگر اختصار کے ساتھ اور ایک چابکدست ناول نویس کی طرح غیر ضروری واقعات کو نہایت ہوشیاری سے نظر انداز کر دیا ہے۔

مصور غم کے تاریخی ناولوں کی خصوصیات اُردو میں تاریخی ناولوں کا ذخیرہ کافی وسیع ہے مولانا عبدالحلیم شرر حکیم محمد علی خاں اور کئی ناول نویسوں نے قابل قدر تاریخی ناول و افسانے لکھے ہیں۔ مگر ان کے بہت سے ناولوں میں صداقتِ واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے ان کا اہم مقصد تفریحی لٹریچر بہم پہنچانا ہے۔ مگر شرر اور مصور غم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے اور ان کے گذشتہ واقعات کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قدیم اسلامی واقعات کو پردۂ گمنامی سے روشنی میں لا کر مسلمانوں کی وقعت لوگوں کے دلوں میں جاری ہے (باقی صفحہ ۲۵۶ پر)

عقیدت کے آنسو

محسنِ نسواں مصوّرِ غم رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ پاک پر

از حکیم عبد المنتقم خاں صاحب تبسم مولوی فاضل۔ بنگلور

اے جنابِ راشد الخیری ادیبِ غم نگار
محسنِ نسواںِ ہند۔ علّامۂ عالی وقار

اے ادیبِ نامور اے راشدِ سحر البیاں
افتخارِ خاکِ دلّی۔ نازشِ ہندوستاں

اے مصنفِ "سیدہ کا لال" و "آمنہ کے لال" کے
اے میں قرباں! اندرتِ تحریر و استدلال کے

دہلی مرحوم کی عظمت کے اے ماتم گُسار
خاکِ دلّی آج تیرے غم میں ہے خود سوگوار

تو نے لکھے ہیں مراثی دہلیِ مرحوم پر
کم نہیں احسان تیرے طبقۂ مظلوم پر

مرثیے ہوتے تھے تیرے محشرستانِ الم
قالبِ الفاظ میں تو پھونکتا تھا روحِ غم

تیری تحریریں ہوا کرتی تھیں بے حد دلگداز
ناز ہے اردو زباں کو تجھ پہ اے اردو نواز

تیرے اسلوبِ بیاں پر خود زباں کو ناز تھا
تجھ پہ دِلّی کو نہیں ہندوستاں کو ناز تھا

اپنی تحریروں سے تو نے خدمتِ اسلام کی
چار دانگِ دہر میں شہرت ہے تیرے نام کی

سنگدل انسان ہو یا ہو کوئی آتش مزاج
اُن سے لیتی تھی تری تحریر آنسو کا خراج

تیری ہی تحریر گویا سحر کی تصویر تھی
دل تڑپ جائے کچھ ایسی دل رُبا تاثیر تھی

طبقۂ ایتام پر ہیں تیرے احسانِ جلیل
ہے خدا آگاہ تیری ذات تھی اُن کی کفیل

تو نے رکھ لی بیکسی میں طبقۂ نسواں کی لاج
اک زمانہ ہے تری خدمات کا مداح آج

صنفِ نازک کی مصیبت میں حمایت تو نے کی
اُن کے استحقاقِ فطری کی حفاظت تو نے کی

تو نے اصلاحِ مراسم کی بہت کیں خدمتیں
صفحۂ ہستی پہ ہیں منقوش تیری عظمتیں

تو نے کی ہیں حالِ زارِ قوم پر غمخواریاں
اللہ اللہ دیدۂ خونبار کی بیداریاں

تو نے کی ایجاد اپنے رنگ میں تحریرِ غم
رشکِ مانی۔ غیرتِ بہزاد تھی تصویرِ غم

نام تیرا دہر میں مثلِ مہ و خورشید ہے
اپنی تصنیفات سے تو زندۂ جاوید ہے

تو نے کی تفسیرِ رازِ "صبح و شامِ زندگی"
آہ کتنے جلد ٹوٹا ہے نظامِ زندگی

لُٹ گیا ہے موت کے ہاتھوں گلستانِ حیات
بحرِ ہستی میں فنا دیدہ ہے "طوفانِ حیات"

موت نے چھینا ہے ہم سے اک "درِ شہوار" کو
آج طوفان ہے اٹھانا دیدۂ خونبار کو

تیرے مرجانے سے اب جادو نگاری ختم ہے
سچ تو یہ ہے تیری دلکش غم نگاری ختم ہو

اب کہاں تجھ سا ادیب و نافر نازک خیال
ختم ہے رعنائی و حُسنِ تخیّل کا کمال

طبقۂ مظلوم کی نوحہ خوانی کس سے ہو
تیرے اُٹھ جانے سے اُن کی ترجمانی کس سے ہو

تیرا مرنا فی الحقیقت قوم کا نقصان ہے
"بزمِ عصمت" میں اندھیرا چھا گیا ویران ہو

تیرے احسانات کو دنیا بھلا سکتی نہیں
قوم تیرے کارناموں کو مٹا سکتی نہیں

تو بھی رواے خاکِ دلّی! چھپ گیا وہ آفتاب
لا نہیں سکتا زمانہ جس کی انشا کا جواب

اُٹھ گیا دنیا سے وہ سچا فدائی غم گسار
چھپ گیا زیرِ زمیں دِلّی کا وہ آتش نگار

ہو نہیں سکتی تلافی ہے یہ نقصانِ عظیم
اُٹھ گیا اُردو کا حامی ہو گئی اُردو یتیم

کیسی کیسی بستیاں تاراج و ویران ہو گئیں
"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں"

ہے دعا اللہ کی رحمت کا ہو تجھ پر نزول
اُس کی رحمت سے تری خدمات ہو جائیں قبول

ہوں خدا کی رحمتیں تیرے مزارِ پاک پر
پھول برسیں خلد سے تیری مقدس خاک پر

تصانیف مصوّرِ غم رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ

ہر کتاب کا سال تصنیف بریکٹ میں لکھ دیا گیا ہے

(۱) حیات صالحہ یا صالحات (۱۸۹۵ء) حضرت والد مغفور نے سب سے پہلے ایک عشقیہ افسانہ احسن و میمونہ ۱۸۹۲ء میں شروع کیا تھا مگر جب ختم کر لیا تو اسے ضائع کر دیا (دیباچہ حیات صالحہ پانچواں ایڈیشن صفحہ ۶) اور ۱۸۹۵ء میں جب مصنف کی عمر ۲۰ سال تھی حیات صالحہ شروع کی اور ڈیڑھ سال بعد ۱۸۹۶ء میں اسے پورا کر لیا، پہلا ایڈیشن غالباً ۱۹۰۱ء میں جب "منازل السائرہ" بھی لکھی جا چکی تھی شائع ہوا۔ اس تصنیف کے متعلق ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے جن کی شاگردی پر حضرت مصنف فخر کرتے تھے فرمایا تھا "اپنی کتابوں کے علاوہ قصص میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے شروع سے آخر تک پڑھی اور اگر مجھکو یقین کامل نہ ہوتا تو میں کہدیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری گیا"

حضرت علامہ مغفور کے دوسرے استاد مولانا حالی مرحوم نے بھی حیات صالحہ پر حوصلہ افزا الفاظ فرمائے تھے، جن صاحب نے کتاب کا حق تصنیف حاصل کیا تھا انہوں نے معاوضہ شاید پچیس روپے بھی نہ دئے تھے مگر ۱۹۱۲ء میں جب تیسری دفعہ اسکی چھپائی ختم ہو گئی تو ۸ صفحوں کا ایک فرمہ ضائع ہو گیا تھا، پبلشر صاحب نے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کا (جو غالباً پانچ سال بعد شائع ہوا تھا) بہت تلاش کیا

مگر کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا، آخرہ صفحے انہوں نے حضرت مصنف سے دوبارہ لکھوانے چاہے اور ۸ صفحوں کا معاوضہ سو روپے تک لگا دیا مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے، میں اپنے محترم دوست جناب مولوی محمد ظفر صاحب ام اے، ایل ایل بی کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ انہوں نے صالحات کی موت کو مسلمان لڑکیوں کے ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر فرما کر مجھے کتاب کے کاپی رائٹ حاصل کرنے کی ہر ملاقات میں اور اکثر خطوط میں کئی سال تک ترغیب دی ۱۹۲۹ء میں میں نے کتاب کا حق تصنیف واپس لے لیا تو مولوی محمد ظفر صاحب نے ہی اس کا پرانا نسخہ فراہم کیا ۱۹۳۰ء میں حضرت مصنف نے اس پر نظر ثانی فرمائی تو کہیں کہیں لفظی تبدیلی کی، البتہ مقدمہ نکال کر جدید دیباچہ کا اضافہ فرمایا ۱۹۳۵ء تک اس کے تین ایڈیشن اور شائع ہوئے، مولوی محمد ظفر صاحب ملک کے مشہور نقاد ہیں ان کا اس کتاب پر ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا " سیرت نگاری میں مولانا نے کمال کر دیا ہے۔ اس پہلی ہی کتاب میں مولانا نے قلم توڑ دیا ہے، کتاب کیا ہے ایک قیامت ہے جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے "۔

(۲) **منازل السائرہ** (غالباً ۱۸۹۸ء) میں شروع کر کے ۱۹۰۰ء میں ختم کی تھی اور صالحات کی اشاعت کے بعد غالباً ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی، اخبارات نے اس پر نہایت اچھے اچھے ریویو کئے تھے۔ شاید ۳ سال میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا، دوسری مرتبہ ۱۹۰۵ء میں اسے شیخ عبدالقادر صاحب نے (اب آنریبل سر عبدالقادر صاحب ممبر انڈین کونسل لندن) جنہوں نے علامہ مغفور کو چارلس ڈکنز کا خطاب دیا تھا اپنے مخزن پریس دہلی سے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ شیخ صاحب موصوف کی رائے کا خلاصہ یہ ہے۔

"منازل السائرہ مولوی صاحب کے مشہور طرز تحریر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی کتب کے بعد منازل السائرہ ہی ان کے ڈھنگ پر ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کا مطالعہ خاص مستورات کے لئے مفید ثابت ہوگا" اس ایڈیشن کی ضخامت تین سو صفحوں کے قریب تھی۔ منازل السائرہ کا یہ اڈیشن شائع کرنے کے ڈیڑھ دو برس بعد شیخ صاحب لاہور تشریف لے گئے اور دوسری مصروفیات کے سبب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع نہ کرا سکے تو ۱۹۱۹ء میں حضرت مصنف نے اس کی اشاعت کا اہتمام جناب واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کے سپرد کیا اور کتاب پر نظر ثانی فرمائی تو یہ ترمیم کی کہ ہر باب کے جو عنوانات پچھلے اڈیشنوں میں تھے وہ نکال دیئے، ۱۹۱۹ء والے ایڈیشن سے کتاب دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی، حصہ اول میں سارہ کی کنوارپنے کے حالات اور حصہ دوم میں شادی سے موت تک کے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک منازل السائرہ ۵ مرتبہ اور شائع ہوئی گویا کل ۸ ایڈیشن اس کے شائع ہوئے ہیں، یہ کتاب مختلف یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے اردو نصاب میں داخل کی گئی، منازل السائرہ میں حیات انسانی کی چار حالتوں کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو چار نہیں درجنوں درسی کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے۔

(۳) **صبح زندگی** (۱۹۰۸ء) سر عبدالقادر ممبر انڈین کونسل کی تحریک پر لکھی گئی تھی، اور ۱۹۰۸ء میں پہلی مرتبہ مخزن پریس سے شائع ہوئی تھی ۱۹۱۶ء میں حضرت مصنف نے نظر ثانی فرمائی تو اس میں سے بھی ہر باب کے عنوانات نکال دئے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن دفتر نظام المشائخ سے شائع ہوا اور ہر ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا گذشتہ سترہ سال میں اٹھارہ مرتبہ یہ کتاب حضرت علامہ مغفور کے سامنے چھپی، اب تک بیس اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، یہ بھی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئی۔

(۴) **لڑکیوں کی انشا** (۱۹۱۰ء) سب سے پہلی کتاب تھی جسے حضرت مصنف نے خود شائع کیا تھا مگر ۱۹۱۱ء میں ایک تاجر نے تمام جلدیں اکٹھی خرید لیں تھیں، پانچ دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

(۵) **شام زندگی** (فروری ۱۹۱۱ء) صرف بیس دن میں لکھی گئی تھی، نو ماہ یعنی نومبر تک ہاتھوں ہاتھ تین ایڈیشن نکل گئے تھے۔ اگرچہ پہلے بھی بہت سے درد انگیز افسانے اور مضامین شائع ہو چکے تھے مگر مصنف کو قوم سے "مصور غم" کا خطاب اسی کتاب نے دلوایا۔ حضرت علامہ مغفور کی زندگی میں اس کتاب کے اوپر تلے سترہ ایڈیشن شائع ہوئے

(۶) **الزہرا** (۱۹۱۸ء) ۱۹۰۹ء سے رسالہ عصمت میں "سیدۃ النساء" کے عنوان سے حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضؓ کے حالات سال ڈیڑھ سال تک شائع ہوتے رہے لیکن عصمت و تمدن کی مصروفیت کے سبب نامکمل رہے، اپریل ۱۹۱۸ء میں کتاب شروع کر کے ڈیڑھ ماہ میں ختم کر دی، دوسرا ایڈیشن بھی

اسی سال شائع ہوا۔ یہ کتاب باوضو لکھی گئی تھی شیعہ اور سنی دونوں طبقوں میں مقبول ہوئی، ہزارہا کی تعداد میں آٹھ دفعہ شائع ہو چکی ہے

(۷) **ساتوں روحوں کے اعمالنامے** (۱۹۱۷ء) یہ افسانے رسالہ خطیب کے لئے لکھے گئے۔ اس قدر مقبول ہوئے کہ رسالہ میں ختم ہونیکے بعد بصورت کتاب جولائی ۱۹۱۷ء میں شائع کئے گئے، اب تک سات اڈیشن ہو چکے ہیں،

(۸) **طوفان حیات** (۱۹۱۷ء) یہ اصلاحی ناول مولانا عبدالمجید سالک اڈیٹر انقلاب کی تحریک پر اگست ستمبر میں لکھا گیا اور دسمبر میں شائع ہوا تھا، طوفان حیات ہندوستان کا بہترین اصلاحی ناول کہا جاتا ہے، مگر سابقہ پبلشر صاحب اخبار کی مصروفیات سے کتاب کی اشاعت کے لئے بالکل وقت نہ نکال سکے اس لئے اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو شام زندگی الزہرا وغیرہ کو ہوئی تھی ۱۹۳۱ء میں میں نے اس کا کاپی رائٹ واپس لیکر حضرت مصنف سے نظرثانی کرا کر خاص اہتمام سے شائع کی۔ اب تک یہ کتاب پانچ دفعہ شائع ہوئی ہے۔ منازل السائرہ صبح زندگی شام زندگی وغیرہ کی طرح یہ بھی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

(۹) **سوکن کا جلاپا** (۱۹۱۸ء) نومبر ۱۹۱۸ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک کے عصمت میں مسلسل شائع ہو کر کتابی صورت میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۸ء میں چھپا ۱۹۳۰ء تک پانچ ایڈیشن شائع ہو گئے تھے

(۱۰) **گوہر مقصود** یہ مجموعہ ہر دو افسانوں لال کی تلاش اور خیالستان کی پری کا۔ جو ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کے عصمت میں شائع ہوئے تھے، یہ بھی کتابی صورت میں ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا ۱۹۳۲ء تک پانچویں دفعہ شائع ہوا تھا۔

(۱۱) **سنجوگ** (۱۹۱۷ء) مولوی سید ممتاز علی مرحوم نے اخبار تہذیب نسواں کے لیے یہ افسانہ لکھوایا تھا، کتابی صورت میں ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ اب تک چھ دفعہ شائع ہوا ہے،

(۱۲) **ماہ عجم** (۱۹۱۸ء) مصنف کا سب سے پہلا تاریخی ناول ہے "شام زندگی" کے بعد حضرت مصورِ غم علیہ الرحمۃ نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں ان میں سوائے آمنہ کے لال کے کسی تصنیف پر ختم کرنے کے بعد نظرثانی نہیں فرمائی، ماہ عجم کے تین باب ہیں، پہلا باب جس دن ختم ہوا اسی روز پبلشر صاحب کو بھیج دیا گیا تھا اسی طرح دوسرا باب بھی۔ جب تیسرا باب یعنی کتاب ختم ہوئی تو پہلے دونوں باب لاہور میں پبلشر صاحب کے پاس تھے۔ یہ ثبوت ہے اس حقیقت کا کہ حضرت مصورِ غم پبلشر کو مسودہ دینے سے قبل نظرثانی نہیں فرماتے تھے، بلکہ ماہ عجم کی طرح اور کئی کتابیں کئی کئی قسطوں میں لکھ کر دی تھیں یہ تاریخی ناول چار پانچ مرتبہ چھپ چکا ہے

(۱۳) **سراب مغرب** (۱۹۱۸ء) فروری ۱۹۱۸ء میں پہلی دفعہ چھپی تھی، اب تک سات مرتبہ چھپ چکی ہے۔

(۱۴) **بنت الوقت** (اپریل ۱۹۱۸ء) صرف چھ روز میں لکھی گئی تھی ۱۹۳۳ء تک چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔

(۱۵) **آفتاب دمشق** (۱۹۱۸ء) گجراتی زبان میں کئی صاحبوں نے اس کا ترجمہ شائع کیا تھا نوساری کے ایک صاحب نے اس کا ترجمہ ۱۹۲۱ء میں حضرت مصنف کی خدمت میں پیش کیا تھا جن صاحب نے کتاب کے حقوق حاصل کئے تھے ان کے انتقال کی وجہ سے کئی سال تک دوبارہ نہ چھپ سکی اب تک چار پانچ اڈیشن نکل چکے ہیں

(۱۶) **محبوبۂ خداوند** (۱۹۱۱ء) چار ماہ میں ختم کی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں چوتھی مرتبہ شائع ہوئی تھی،

(۱۷) **جوہر قدامت** (۱۹۱۸ء) دو مہینہ میں لکھی گئی تھی اور تین قسطوں میں پبلشر صاحب کو پنجاب بھیجی گئی تھی۔ جب میں نے اس کے حقوق واپس لئے تو جنوری ۱۹۳۲ء میں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے نظرثانی فرمائی اور تین ابواب میں کمی بیشی کی۔ اسی سال اس کا پانچواں اڈیشن شائع ہوا۔ جوہر قدامت مصورِ غم کے ضخیم اصلاحی ناولوں میں سے ہے اور مدراس وغیرہ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

(۱۸) **عروسِ کربلا** (۱۹۱۸ء) ۱۹۳۳ء میں اس پر نظرثانی فرمائی تھی اور کہیں کہیں مناسب ترمیم بھی کی تھی، یہ بھی مدراس وغیرہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل تھی، اب تک چھ دفعہ شائع ہوئی ہے۔

(۱۹) **شب زندگی حصہ اول** (جون ۱۹۱۸ء) میں شروع کیا گیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں جب اس کی کتابت ختم کے قریب تھی اس وقت کتاب ختم کی تھی اگست ۱۹۱۹ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا جو ستمبر میں ختم ہو گیا تھا ۱۹۱۹ء کی آتش زدگی کے بعد سلسلہ عصمت کی یہ پہلی کتاب تھی اب تک بارہ مرتبہ شائع ہو چکی ہے

(۲۰) **نوحۂ زندگی** (۱۹۱۸ء) حضرت علامہ مغفور نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کے زمانہ میں کئی کتابیں اس طرح لکھی تھیں کہ ایک پوری نہیں کی کہ دوسری شروع

کردی۔ دوسری ختم نہ کرنے پائے تھے کہ تیسری شروع کر دی گئی۔ تاجران کتب کی فرمائشوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا کس کس سے معذرت کرتے نوحہ زندگی جب شروع کی تھی تو شب زندگی اور عروس کربلا دونوں کتابیں نامکمل تھیں، نوحہ زندگی شروع کی تو دو ہفتے میں ختم کر دی، اگست ۱۹ء میں پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ جب میں نے اسے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تو حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے نظر ثانی فرمائی اور دیباچہ کا جدید اضافہ فرمایا۔ اب تک یہ آٹھ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(۲۱) **موؤدہ** (۱۹ء) یہ افسانہ ایک ہفتے میں لکھا گیا تھا۔ پانچ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲۲) **رُوداد قفس** (۱۹۱۸ء) یہ مجموعہ تھا ان چند نظموں کا جو ۱۹۱۸ء تک علیحدہ یا بعض مضمونوں اور افسانوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ستمبر ۱۸ء میں جب پہلی دفعہ یہ مجموعہ چھپا تھا تو ضخامت صرف ۳۲ صفحے تھی لیکن ۱۹۲۸ء میں جب چوتھی مرتبہ شائع ہوا تو اس میں کچھ اور نظموں کا اضافہ کیا گیا اور ضخامت ۴۰ صفحہ ہو گئی۔ عصمت میں حضرت علامہ مغفور نے کئی نظمیں اپنے نام سے شائع نہیں کی تھیں۔ کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور ان نظموں میں شاعری کی غلطیاں ہونگی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے شعراء نے بھی اپنے خیالات اس طرح نظم کے سانچے میں بہت کم ڈھالے ہوں گے جس طرح مصور غم نے سرخاب کا دم واپسیں ۸ صفحوں میں پوری منظوم کہانی اس طرح لکھوادی کہ گنگا پورسٹی میں شیشم کے درخت کی چھاؤں میں ایک چارپائی پر لیٹ کر وہ اشعار فرماتے جاتے تھے۔ اور میں لکھتا جاتا تھا۔ تین دن میں یہ نظم اس طرح قلمبند کی گئی تھی کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کا ایک شعر بھی نہ لکھا تھا۔ طبیعت کی روانی ایک دریا تھا کہ بہا چلا جا رہا تھا لکھتے لکھتے میرے ہاتھ دکھ جاتے تھے۔ مگر جذبات نگاری کے شہنشاہ کی زبان نہ رکتی تھی، میں اس نظم کو الہام کہا کرتا تھا اور وہ سنکر مسکرایا کرتے تھے! آہ وہ زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی اور وہ مسکراہٹ ابدالاباد تک کے لئے ختم "رُوداد قفس" کے مصنف نے شاعر نہ ہونے پر بھی اپنے کلام کی وہ مقبولیت دیکھ لی جو اچھے اچھے شاعروں کو میسر نہ ہوئی تھی ان کی زندگی میں یہ کتاب چھ مرتبہ شائع ہوئی۔

(۲۳) **انگوٹھی کا راز** (۱۹۱۹ء) حضرت علامہ مغفور نے اپنی شہرت کی کبھی مطلق پرواہ نہ کی۔ مسودے صاف ہونے میں اور کتابت میں بے شمار غلطیاں رہ جاتیں مسودوں پر نظر ثانی کرنے کی بھی ضرورت ہوتی مگر وہ ان میں سے کسی بات کی پرواہ کرتے تھے۔ انہیں احساس ہی نہ تھا کہ وہ کتنے زبردست مصنف تھے اور کسی کتاب میں کوئی کمزوری رہجانے سے انکی شہرت پر کیا اثر پڑیگا، یہ افسانہ جس کا ایک تہائی حصہ مارچ ۱۸ء کے عصمت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا باقی دو تہائی حصہ پورا کرنے کے لئے انہوں نے مجھے حکم دیا تھا۔ اسوقت میں انٹرنس میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی لیکن انہوں نے میرے لکھے ہوئے صفحوں کی بھی تصحیح نہ فرمائی اور پبلشر صاحب کو مسودہ دیدیا گیا۔ ۲۸ء میں جب میں نے کتاب کا حق تصنیف واپس لے لیا اور نظر ثانی کی التجا کی تو لفظی تبدیلیوں کے علاوہ پلاٹ بھی کسی حد تک بدل دیا۔ مگر جو کچھ ترمیم وغیرہ کی سب ایک دن میں، یہ افسانہ چھ دفعہ شائع ہو چکا ہے

(۲۴) **جوہر عصمت** (۱۹۲۰ء) تین مختصر افسانوں کا مجموعہ جنوری ۲۰ء میں شائع ہوا تھا ضخامت ۸۸ صفحے تھی ۲۸ء میں اور دس مختصر افسانے اس میں شامل کر دئیے تو ضخامت کچھ کم دو سو صفحے ہو گئی اس مجموعے میں زیادہ تر وہ افسانے ہیں جو عصمت و تمدن میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے تھے۔ یہ کتاب چھ دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

(۲۵) **نائلہ عبسی** یا اندلس کی شہزادی (جنوری ۱۹۳۰ء) میں صرف ۵ روز میں لکھی تھی ۳۱ء میں چوتھی مرتبہ چھپی۔

(۲۶) **فسانہ سعید** یا آہ مظلوم (۱۹۲۰ء) چوتھا ایڈیشن ۳۱ء میں چھپا تھا۔

(۲۷) **دُرِ شہوار** (۱۹۲۱ء) یہ تاریخی افسانہ صرف تین روز میں لکھا گیا تھا اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۸) **یاسمین شام** (۱۹۲۱ء) یہ تاریخی ناول تقریباً پونے دو سو صفحوں کا ہے بمقام گنگا پورسٹی جہاں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ اپنی بڑی صاحبزادی کے پاس مقیم تھے صرف ایک ہفتہ میں لکھا گیا تھا۔ ۵ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲۹) **شاہین دُرّاج** (ء) حسن و عشق پر سب سے پہلا افسانہ ہے جو ء کے مخزن میں مسلسل شائع ہوا تھا اور جس کی تیسری قسط شائع ہونے پر مخزن کے خریداروں میں ۶۰۰ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کتابی صورت میں پہلی دفعہ ۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۷ء میں تیسری مرتبہ چھپا تھا۔

(۳۰) **قطرات اشک**، یہ حضرت علامہ مغفور کے ان مختلف افسانوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے اکثر رسالہ مخزن میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۲۱ء میں شائع ہوا تھا اور چوتھی مرتبہ ۳۰ء میں۔

(۳۱) **شب زندگی حصہ دوم** (جنوری ۱۹۲۳ء) حضرت علامہ مغفور نے اپنی بہو محترم خاتون اکرم مرحومہ کی رونمائی کے لئے پانچ ہفتوں میں لکھی تھی کتاب نصف کے قریب ہو گئی تھی کہ کتابت شروع کرادی گئی تھی ۲۳ء میں دو ایڈیشن نکل گئے تھے، گیارہ مرتبہ شائع ہوئی ہے

(۳۲) **سمرنا کا چاند** (۱۹۲۳ء) اس کتاب کا نام تربیت نسواں ہے مگر چونکہ اُس زمانہ میں سمرنا کی لڑائی ہو رہی اور ہندوستانی بیبیوں کو ترکی خواتین کی مصیبت پر ایک دردانگیز باب میں متوجہ کیا گیا تھا اس لئے پبلشر صاحب نے اس کا نام سمرنا کا چاند رکھ دیا۔

(۳۳) **تیغ کمال** (۱۹۳۳ء) حضرت علامہ مغفور کی سب سے آخری کتاب ہے جس کا حق تصنیف فروخت کیا گیا تھا، یہ ناول بھی گنگا پورسٹی میں لکھا گیا تھا۔ اس کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحے ہے مگر ۶ روز میں لکھا گیا تھا۔ جس روز شروع کیا تھا اس کے تیسرے روز نصف حصہ پبلشر صاحب کو بھیجدیا گیا تھا اور باقی نصف تین روز بعد یہ ناول چار دفعہ چھپ چکا ہے۔

(۳۴) **امت کی مائیں** (۱۹۱۷ء) پہلی مرتبہ ۲۵ء میں شائع ہوئی تھی ۳۱ء میں تیسری مرتبہ چھپی تھی

(۳۵) **ستونتی** (ستمبر ۱۹۳۶ء) بمقام گنگا پورسٹی، اس طرح تصنیف فرمایا تھا کہ حضرت علامہ مغفور بولتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا مصور غم کی

تصانیف میں یہ خصوصیت اسی کتاب کی ہے کہ شروع سے آخر تک سارا افسانہ اسی طرح روزنامچہ میں لکھا گیا پانچواں ایڈیشن فروری ۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳۶) **منازل ترقی** (۱۹۱۸ء) اکتوبر ۱۸ء کے عصمت اور نظام المشائخ میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں پہلی دفعہ ۲۲ء میں چھپا تیسری دفعہ اگست ۳۲ء میں

(۳۷) **بچہ کا کرتہ** (جولائی ۱۹۲۱ء) عصمت میں شائع ہوا تھا اور کتابی صورت میں پہلی دفعہ فروری ۲۲ء میں اور چوتھی مرتبہ مئی ۳۵ء میں۔

(۳۸) **امین کا دم واپسیں** (فروری ۱۹۱۹ء) خطیب میں شائع ہوا تھا اور علیحدہ بصورت کتاب مارچ ۲۰ء میں جولائی ۳۱ء میں تیسری مرتبہ چھپا

(۳۹) **وہیڈیا کی سرگذشت** (۱۹۱۹ء) مگر آہ وہ موتی تو وہاں ہی نہ تھا۔ کے عنوان سے ۱۹ء کے خطیب میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں
اکتوبر ۲۷ء میں پہلی دفعہ اور جنوری ۳۳ء میں تیسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔

(۴۰) **گلدستہ عید** - یہ عید اور رمضان کے متعلق ان مضامین کا مجموعہ ہے جو عصمت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے پہلی دفعہ بصورت کتاب
یہ مضامین ۲۱ء میں شائع ہوئے، نومبر ۳۰ء میں جب تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کا ایک افسانہ چہار عالم اس سے علیحدہ کر دیا گیا۔

(۴۱) **نانی عشو** (۱۹۲۰ء) عصمت کے سالگرہ نمبر ۲۰ء سے شروع ہو کر تین چار قسطیں ہی ابھی چھپی تھیں کہ عصمتی بہنوں نے اصرار کیا کہ یہ قصہ
جلد کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے چنانچہ یہ قصہ اور اس کے ساتھ تین اور قصے پہلی مرتبہ بصورت کتاب جنوری ۲۱ء میں شائع ہوئے، مئی ۳۶ء
میں یہ کتاب پانچویں مرتبہ طبع ہوئی۔

(۴۲) **سیلاب اشک** - ان سات دردانگیز افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ۲۶ء اور ۲۷ء کے عصمت میں شائع ہوئے تھے ہر افسانہ کے
ساتھ ہاف ٹون بلاک کی تصاویر ہیں، یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۲۸ء میں شائع ہوا تھا اور تیسری دفعہ ۳۲ء میں،

(۴۳) **قلب حزیں** - یہ ان چھوٹے چھوٹے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۲ء سے ۲۷ء تک شائع ہوئے تھے، ان میں حضرت مصور غم
علیہ الرحمۃ نے مناظر کشی، جذبات نگاری اور نثر میں شاعری کی ہے، اس مجموعہ کے اکثر مضامین بھی حضرت علامہ مغفور نے رسالوں میں اپنے نام سے شائع
نہیں کئے تھے "س" "ش" "ر" وغیرہ لکھدیا کرتے تھے۔ جب یہ مجموعہ میں نے مرتب کر لیا اور کاپیاں بھی پریس میں بھیجدیں اور کتاب کا نام رکھنے
کی درخواست کی تو "قلب حزیں" تجویز فرمایا مگر خفا ہوئے کہ یہ مضامین اس قابل نہیں کہ اس عمر میں میرے نام سے شائع ہوں۔ یہ مجموعہ پہلی دفعہ ۲۸ء میں چھپا
اور تیسری مرتبہ ۳۲ء میں

(۴۴) **نوبت پنج روزہ** یا داغ ظفر (۱۹۲۸ء) تیغ کمال کے بعد یہ مستقل اور ضخیم تصنیف تھی جو اگست ۱۹۲۴ء میں بمقام گنگا پور سٹی شروع کی تھی اور
پہلی نوبت وہیں لکھ لی تھی دوسری نوبت دہلی میں لکھ رہے تھے کہ نومبر ۲۴ء میں علامہ مغفور کی بہو محترمہ خاتون اکرم کا انتقال ہو گیا۔ پھر
مدرسہ کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال تک دوسری نوبت ختم کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ۲۸ء میں جب میں نے بہت اصرار کیا تو دو ماہ میں کتاب
پوری کر دی۔ نوبت پنج روزہ کی آخری نوبت حضرت مصنف مرحوم نے اپنے بعض ان دوستوں کو سنائی تھی جو ان کی ایک ایک سطر پر سر دھنتے تھے۔
کہ اس صحبت میں مرحوم مولانا عارف ہسوی جناب ملا واحدی اور جناب مولوی فضل احمد شیدا تو ضرور ہی تھے غالباً جناب خواجہ حسن نظامی صاحب بھی تھے
ان حضرات کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں حضرت علامہ کئی گھنٹے تک ان دردمند دوستوں کو تڑپاتے رہے، دوسرے دن مصنف کو مشورہ
دیا گیا کہ یہ نوبت بے انتہا جوش میں لکھی گئی ہے کہیں حکومت کتاب ضبط نہ کرلے، مجھے اتنا خیال ہے کہ حضرت علامہ مغفور نے آخری نوبت میں سے فقرے
کے فقرے نکال دئیے اور کتاب میں سے سطریں کی سطریں بدل دی تھیں اگر آخری نوبت بغیر ترمیم کے اسی طرح شائع ہو جاتی تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے
مٹنے اور مشرقی تہذیب کے اجڑنے پر قیامت کا مرثیہ ہوتا نوبت پنج روزہ پہلی مرتبہ نومبر ۲۸ء میں شائع ہوئی تھی، ۳۵ء تک چار مرتبہ ہزارہا کی تعداد
میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ مصنف کو اپنی کتابوں میں یہ کتاب بہت محبوب تھی۔ جب میں ان کی تصانیف کی مقبولیت اور نئے نئے ایڈیشن شائع
ہونے کا ذکر کرتا تو خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کے متعلق دریافت فرماتے کہ کیسی نکل رہی ہے۔

(۴۵) **طوفان اشک** - یہ مجموعہ ہے ان مضامین اور افسانوں کا جو ۔۔۔ء سے ۲۸ء تک عصمت میں شائع ہوئے تھے پہلا ایڈیشن ۲۹ء
میں چھپا تھا اور تیسرا اڈیشن ۳۲ء میں۔

(۴۶) **تمغہ شیطانی** (یہ افسانہ جنوری ۲۸ء کے عصمت سے شروع ہو کر ستمبر ۲۹ء کے پرچہ میں ختم ہوا تھا۔ یہ افسانہ اسی سال بصورت کتاب شائع
ہوا اور اب تک تین دفعہ چھپ چکا ہے،

(۴۷) **شہید مغرب** اس مجموعہ میں کچھ تو وہ مضامین اور افسانے ہیں جو جنگ طرابلس جنگ بلقان وغیرہ سے متاثر ہو کر ۱۹۱۱ء ۱۹۱۲ء کے عصمت و تمدن میں لکھے تھے، کچھ مضامین مولانا محمد علی مرحوم حکیم اجمل خاں مرحوم مولانا عارف مرحوم اور ملا واحدی صاحب کے اصرار پر ہندو مسلم فسادات پر اخبارات ہمدرد، تنظیم اور انقلاب میں لکھے تھے، بعض مضامین مسلمانوں کے تنزل پر خون کے آنسو ہیں یہ مضامین بصورت کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے تھے، ۱۹۳۳ء میں تیسرا ایڈیشن چھپا تھا،

(۴۸) **تفسیر عصمت** (۱۹۲۸ء) عصمت کے جوبلی نمبر میں شائع ہوا تھا بصورت کتاب ۱۹۲۹ء میں چھپا اور تیسری مرتبہ ۱۹۳۳ء میں۔

(۴۹) **ولایتی نغمی** (۱۹۲۹ء) نانی عشو کی طرح یہ بھی قسط وار عصمت میں چھپنا شروع ہوا تھا مگر عصمت میں ختم ہونے کی نوبت نہ آئی اور نومبر ۱۹۲۹ء میں بصورت کتاب شائع ہوا جنوری ۱۹۳۶ء میں چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔

(۵۰) **شہنشاہ کا فیصلہ** (۱۹۱۸ء) رسالہ خطیب میں شائع ہوا تھا پہلی مرتبہ بصورت کتاب ۱۹۲۹ء میں چھپا اور ۱۹۳۴ء میں تیسری دفعہ

(۵۱) **وداع خاتون** (۱۹۲۴ء) مصنف نے اپنی بہو محترمہ خاتون اکرم مرحومہ کی جواں مرگی پر ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء پر تین مضامین لکھے تھے ان کا مجموعہ ہے جو بصورت کتاب پہلی دفعہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا اور تیسری دفعہ ۱۹۳۳ء میں۔

(۵۲) **منظر طرابلس** (۱۹۱۲ء) رسالہ خطیب میں شائع ہوا تھا علیحدہ بصورت کتاب پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور تیسری دفعہ ۱۹۳۵ء میں۔

(۵۳) **آمنہ کا لال** (۱۹۳۰ء) مولود شریف کی اصلاح کی طرف حضرت علامہ علیہ الرحمۃ مسلمانوں کو عرصہ دراز تک متوجہ فرمانے کی کوشش کرتے رہے مگر جب مسلمانوں نے اسکی کچھ زیادہ ضرورت نہ سمجھی تو حضرت علامہ مغفور نے خود ہی یہ مولود شریف لکھا تصنیف نمبر ۴۹ یعنی وداع ظفر کے بعد تصنیف نمبر ۵۲ یعنی منظر طرابلس تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ قریب قریب سب مطبوعہ مضامین تھے ۱۹۲۸ء میں وداع ظفر ختم کرنے کے بعد نومبر ۱۹۲۹ء میں مولود شریف "آمنہ کا لال" شروع کیا اسکی ضخامت سوا سو صفحوں سے بھی کم ہے اور ڈیڑھ ڈیڑھ پونے دو دو سو صفحے کی کتابیں حضرت علامہ مغفور نے پانچ پانچ سات سات روز میں لکھی تھیں مگر آمنہ کا لال پورے سال بھر میں لکھا گیا ایک صفحہ نہیں ایک ایک سطر نشہ عشق رسول سے سرشار مصنف نے غسل کر کے نماز فجر کے بعد جا نماز بچھا کر عطر لگا کر لوبان سلگا کر لکھی تھی اس مولود شریف میں چھ سات موقعوں پر اشعار بھی ہیں اور سب مصنف ہی کے بعض اشعار دو دو پہر کو بھی لکھے مگر آمنہ کے لال میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو باوضو نہ لکھا گیا ہو جس مصنف نے بعض کتابوں کے ایک ایک دن میں تیس تیس چالیس چالیس صفحے لکھے تھے اس عاشق رسول نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر کسی دن ایک صفحہ بھی پورا نہ لکھا ذکر ولادت ختم ہونے سے قبل جو مخمس ہے اس کے دو مصرعے موزوں ہو گئے تھے، تیسرے اور چوتھے مصرعہ کا تین روز تک فکر کرتے رہے تیسرے روز شام کو جب یہ شعر لکھا ہے سے تیرے احکام نے ختم رسل ساکت زباں کر دی :: نہ ہوتا قفل گر منہ پر تو بتلاتے کہ کیا تو تھا۔ تو انکی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا حضرت علامہ راشد الخیری (نور اللہ مرقدہ) اکثر سینما دیکھتے تھے اور اگر کوئی عمدہ انگریزی فلم آتا تھا تو ضرور جاتے تھے (اس موقعہ پر مجھے یہ بھی لکھ دینا چاہیئے کہ انگریزی فلم میں بھی اکثر والدہ ضرور باوجودیکہ انگریزی نہیں جانتیں انکے ساتھ ہوتیں اور وہ انہیں سمجھاتے جاتے تھے انگریزی کے بعض فلم میری اور صادق کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آتے تو وہ ہمیں بھی سمجھاتے اور پھر پلاٹ پر بحث فرماتے تھے) مگر آمنہ کا لال شروع کرنے کے بعد جب تک کتاب ختم نہ کر لی سینما قطعی ترک کر دیا تھا، یہ کتاب ہزار ہا کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے، پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اور چھٹی مرتبہ جولائی ۱۹۳۵ء میں۔

(۵۴) **گرفتار قفس** — یہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء میں تیسری مرتبہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

(۵۵) **نسوانی زندگی** — چار مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ ہے پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا ۱۹۳۵ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

(۵۶) **سودائے تقدر** (۱۹۱۸ء) رسالہ خطیب میں شائع ہوا تھا۔ کتابی صورت میں ۱۹۳۱ء میں شائع کیا گیا تھا۔

(۵۷) **سیدہ کا لال** (۱۹۳۱ء) دسمبر ۱۹۳۰ء میں جب آمنہ کا لال" شائع ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ اب شہادت نامہ بھی لکھ دیجیئے مولود شریف کی کتاب کی طرح شہادت کی ایسی کتاب کی ضرورت پر بہت عرصے سے سنیوں اور شیعوں کو متوجہ فرما رہے تھے جس میں واقعات اس طرح لکھے جائیں کہ کتاب غیر مسلموں کے سامنے فخریہ پیش کی جا سکے اور جس میں محض عقیدت اور محبت ہی نہ ہو بلکہ صحیح واقعات بھی ہوں مارچ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے شہادت نامہ لکھنے پر آمادگی ظاہر فرمائی تو میں نے شہادت کی بہت سی کتابیں جمع کر لیں مگر انہوں نے ان کے مطالعہ سے قطعی انکار فرما دیا تھا البتہ تاریخی واقعات اور انکی ترتیب نوٹ کر لی گئی تھی اپریل میں قطب صاحب (مہرولی) میں کتاب شروع کی تھی اور ڈیڑھ ماہ بعد آخر جون میں یہ مکمل تاریخ شہادت ڈھائی سو صفحوں کی ضخیم کتاب ختم کر لی تھی، بالعموم ایک گھنٹہ صبح لکھتے اور ایک گھنٹہ تیسرے پہر یا عصر کی نماز کے بعد کبھی کبھی دوپہر کو بھی باوضو لکھنے بیٹھتے تھے اور پسینہ میں شرابور اٹھتے تھے جضرت بی بی زینب کے بچوں کی شہادت لکھنے بیٹھے تھے کہ سامنے گھر کے نیچے جو ایک درخت کے سایہ میں تلوار کی لڑائی دیکھ کر آئے تھے کہ ننھے اور ملپن کی تیلیوں سے کھیل رہے تھے یہ منظر مصور غم کے تخیل کو میدان کربلا کے میدان میں لے گیا اور اسی حالت میں عون و محمد کی شہادت اور مرثیہ لکھا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت جس وقت لکھ رہے تھے تو پسینہ میں نہا رہے تھے، پیاس کے مارے بری حالت تھی دو دفعہ برف کا پانی رکھے رکھے گرم ہو چکا تھا مگر پانی نہ پیا۔ کتاب اس طرح لکھی تھی کہ جب ایک بیان ختم کر لیتے تو فرمانے لگتے کیا لکھوانا چاہتے ہو اور میں نوٹ سنا دیتا تھا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ جولائی ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی اور پانچویں مرتبہ ۱۹۳۵ء میں۔

(۵۸) **بیلہ میں میلہ** یا غدر کی ماری شہزادیاں۔ مئی ۱۹۲۹ء کے عصمت سے شروع ہو کر جنوری ۱۹۳۲ء میں یہ افسانے ختم ہوئے تھے اسی سال کتابی صورت میں بھی چھپے اب تک ۳ بار شائع ہو چکے ہیں۔

(۵۹) **جہاں رعالم** (۱۹۱۸ء) کے عصمت میں یہ افسانہ شائع ہوا تھا پھر گلدستہ عید میں شامل کر دیا گیا تھا۔ مگر ۱۹۳۵ء میں علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔

یہ ۵۹ کتابیں تھیں جو حضرت علامہ مغفور کے سامنے شائع ہو گئی تھیں مگر انہیں اپنی تصانیف کی صحیح تعداد بھی معلوم نہ تھی ۱۹۳۲ء میں جب حیدرآباد دکن میں چند روز کے لئے قیام فرمایا تھا تو ایک روز حکیم مقصود علیخاں صاحب، جناب ہوش بلگرامی اپنے ساتھ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے ہاں لے گئے، مہاراجہ صاحب نے تصانیف کی تعداد دریافت کی تو جواب پایا کہ ہو گی بیس پچیس بزم آخر (۱۹۳۵ء) اور دعائیں (۱۹۳۵ء) یہ دو کتابیں غیر مطبوعہ ہیں، لڑکیوں کا کورس دھورا رہ گیا۔ بر کے انتخاب کے متعلق اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ایک کتاب شروع کی تھی وہ بھی نامکمل ہے۔ گذشتہ تین سال میں جو مضامین شائع ہوئے تھے ان میں سے بہت سے مضامین ان کے سامنے کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکے یہ کم و بیش دو درجن مجموعے ہوں گے جن میں سے آٹھ دس مجموعے ستمبر تک شائع ہو جائیں گے اور باقی مجموعے بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ۱۹۳۶ء تک شائع ہو جائیں۔ اس طرح یہ سب ملا کر تقریباً ۹۰ کتابیں ہو جائیں گی۔ رازق الخیری۔

عِصمت بک ڈپو کی مشہور و مقبول کتابیں

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ جنت مکانی محترمہ خاتون اکرم اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی تصانیف کھانے پکانے اور زنانہ دستکاری کی مفید کتابوں کے علاوہ جن کے اشتہار ٹائیٹل کے صفحوں پر ہیں دفتر عصمت سے مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

قیمت	مختصر کیفیت	نام کتاب
۱۲؍	عِصمتی دسترخوان کا دوسرا حصہ مغربی اور ایشیائی کھانوں کی ترکیبیں جو تجربہ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ سو صفحوں کے کارآمد مضامین بھی ہیں	مشرقی مغربی کھانے
۱۲؍	خوبصورتی اور تندرستی کی کتاب جسم کے ہر حصہ کو خوشنما بنانے جوانی قائم رہنے کی ہدایتیں سنگھاری اشیا کے استعمال کے صحیح طریقے اور ورزشیں	سنگھار خانہ
۱۲؍	ذاتی تجربوں کی بنا پر خانہ داری کے متعلق بے بہا مضامین جو نامور مضمون نگار محترمہ و۔ ا۔ بلقیس بیگم نے لکھے ہیں۔ ہر لڑکیاں مطالعہ کریں تو سگھڑ بنجائیں	خانہ داری کے تجربات
۸؍	خانہ داری کے تجربوں کا دوسرا حصہ تندرستی، تیمار داری کے متعلق ذاتی تجربوں کی بنا پر نہایت مفید اور کارآمد مضامین	مفید نسواں
۴؍	عصمت کی مشہور نامہ نگار محترمہ زہرہ فیضی کے یورپ امریکہ کے تجربات صحت قایم رکھنے کے متعلق قیمتی مشورے تندرستی کے اصول	تندرستی ہزار نعمت
۱۰؍	سائنس اور حفظان صحت کے اصولوں پر بچوں کی پرورش اور اخلاق و مذہب کے اصولوں پر ان کی تربیت کس طرح کی جائے اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے	بچوں کی تربیت
۶؍	مسلمانوں کے زمانہ کے اسپین میں بڑی بڑی شاعرہ، ادیب مصور، بذلہ سنج لطیفہ گو مدبر خواتین پیدا ہوئی تھیں ان کا تذکرہ ہے تاریخ میں افسانہ کا لطف	خواتین اندلس
۴؍	اُردو کی نامور افسانہ نگار مسز خدیو جنگ مرحومہ کا مقبول و مشہور افسانہ جس میں تمدنی خرابیوں اور رسوم کی پابندیوں کے نقصانات دکھائے ہیں۔	النوری بیگم
۸؍	دولت کے لالچ میں سوکن پر بیٹی بیاہنے اور ناموزوں لڑکے لڑکی کی شادی کے دردناک نتائج۔ ۵ عبرتناک سبق آموز افسانے۔	دولت پر قربانیاں
۶؍	تین مختلف الخیال عورتوں کے حالات اولوالعزمی اور ہمت سے کس طرح بگڑا ہوا گھر بن سکتا ہے اس موضوع پر محترمہ فاطمہ بیگم منشی فاضل کی تصنیف	غیرت کی پتلی
۴؍	چار عورتوں کی آپ بیتی مغربی تمدن کی اندھا دھند تقلید، عیسائی مشنریوں کی صحبت رواج کی پابندیوں کے دردانگیز نتیجے دکھائے ہیں	چار رخ
۱۲؍	امۃ الوحی صاحبہ مشہور افسانہ نگار ہیں یہ کتاب انھیں کے ۹ نتیجہ خیز دلاویز دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے سب افسانے کامیاب اور اچھے ہیں	شہید وفا
۸؍	دنیا کی نامور شہزادیوں، بادشاہوں، شاعروں، ادیبوں کے لطیفے جن میں تہذیب سے گرا ہوا لغویات خرافات سے لتھڑا ہوا کوئی لطیفہ نہیں	تاریخی لطیفے
۸؍	عامیانہ بازاری لطیفے نہیں عصمتی بہنوں کے لکھے ہوئے نئے نئے طبع زاد سنجیدہ لطیفے مہذب ظرافت کی دل پسند کتاب	ہنسی کی باتیں
۸؍	بڑے بڑے پیغمبروں بادشاہوں مصنفوں فلاسفروں کے وہ مقولے جو برسوں کے تجربوں پر مبنی ہیں جن میں زندگی کی مشکلات کا حل ہے	عقل کی باتیں
۱۲؍	مسلمان عورت کا تمام مذہب کی عورتوں سے مقابلہ مسلمان عورت کے حقوق تعلیم کی طرف سے غفلت کے نتائج پردہ پر معقول بحث	پردہ و تعلیم
۱۲؍	بلقیس جمال صاحبہ کی ۸۰ نظموں کا مجموعہ اسلام کے دور اولیں کی سبق آموز تاریخی کہانیاں مناظر قدرت کی بھی خوب مصوری کی گئی ہے	آئینہ جمال
۷؍	خواتین کی محبوب شاعرہ سنجو بیگم لکھنوی کی دردانگیز نظمیں جو ہندوستانی مسلمان عورت کی مظلومیت کا صحیح فوٹو ہے۔	شمع خاموش
۶؍	محترمہ حجاب اسمٰعیل کے دردانگیز مضامین جو انھوں نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھے ہیں اور جو اُردو رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔	نغمات موت
۸؍	محترمہ حجاب اسمٰعیل کے دردانگیز مضامین کا دلاویز مجموعہ مصنفہ کے بلند تخیل عبارت کی رنگینی جذبات کی ترجمانی اور شاعری کا بہترین نمونہ	ادب زرّیں
۶؍	اخلاقی و صلاحی ڈراما جو پلاٹ مکالمہ کیرکٹر ہر اعتبار سے کامیاب ہے سبق آموز عبرتناک اور دلچسپ مزاحیہ بھی ہے از منشی پریم چند بی اے	روحانی شادی
۱۲؍	انجن کے ہر پرزہ کے متعلق مفید معلومات، کتاب کے مطالعہ کے بعد مالک موٹر خود گاڑی کا نقص دور کر سکتا ہے۔	آئینہ موٹر
۵؍	چھوٹے بچوں کے لئے انھیں کی زبان میں نہایت دلچسپ کہانیاں جن کی تصویریں بھی بچے دیکھکر خوش ہونگے از سید ابوالمتیم صاحب	مزیدار کہانیاں
۵؍	ایک انگریز سیاح بالشتیوں کی دنیا میں چلا گیا بالشتئے اُسے دیو سمجھتے تھے سیاح درجنوں بالشتیوں کو جیب میں ڈال لیتا تھا قابل دید ہے۔	مختصر دنیا
۷؍	ملک روس کے سب سے بڑے مصنف ٹالسٹائی نے بچوں کے لئے جو کہانیاں لکھی تھیں ان میں سے سب سے عمدہ کا آسان زبان میں بہترین ترجمہ	بچوں کی دنیا
۱۲؍	جاپانی بچوں کی بہترین کہانیاں نہایت آسان عام فہم زبان میں محترمہ مسز فضلی نے لکھی ہیں ہر کہانی کے ساتھ تصاویر ہیں۔	جاپانی کہانیاں

نام کتاب	مختصر کیفیت	قیمت
زچہ خانہ	کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب میڈیکل افسر کی بے مثل کتاب جس سے ہندوستانی خواتین پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں موضوع جس قدر خشک ہے پیرایہ بیان، اسی قدر دلچسپ اور عام فہم ہندوستان میں اور بیرون ہند میں ہزارہا عورتیں زچگی سے قبل اور بعد میں ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج رہی ہیں، ہندوستان کی کسی زبان میں اتنی محنت اور قابلیت سے ایسی مفید کتاب اس موضوع پر شائع نہیں ہوئی۔ سینکڑوں روپیہ صرف کر کے تصاویر وغیرہ خاص طور پر فراہم کی گئی ہیں۔ حصہ اول حاملہ۔ حصہ دوم زچہ دونوں کی قیمت علاوہ محصول ساڑھے تین روپیہ۔	۳؍۸
صنعت و حرفت	محترمہ امۃ الحفیظ کا زریں کارنامہ۔ صابن۔ سیاہیاں۔ منجن۔ تیل۔ خضاب۔ بوٹ پالش۔ اچار۔ مربے وغیرہ بنانے کے بالکل صحیح اور آزمودہ نسخے اور ایک ایک چیز کے کئی کئی نسخے۔ یہ کتاب نادار عورتوں کو خوشحال اور خوشحال بیبیوں کو کفایت شعار بنا دیگی۔ جس نے کتاب منگائی پسند کی نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔ قیمت دو روپیہ	۲؍
سوئی کا کام	فن خیاطی کی بہترین استانی۔ کپڑوں کی کٹائی سلائی کے مفید مشورے۔ نئی نئی وضع کے ۸۱ نمونے دے گئے ہیں۔	عہ ۸؍
سلمہ ستارہ کا کام	مشہور دستکار محترمہ خدیجہ بائی کی یہ کتاب ہندوستان کی دستکاریوں کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے ۲۲۶ نمونے قیمت	عہ؍
اونی کام سلائیوں سے	فن ننگ یعنی بنائی کے متعلق بہت مفید کتاب ہے ۵۲ نمونے ہیں بلاک اور لیتھو کے ۳۶ نقشے قیمت	عہ ۸؍
کراس اسٹیچ ورک	دو سوتی کا کام یا ترچھے ٹانکوں کے کام پر اردو میں پہلی کتاب ہے جو ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہے۔ قیمت	عہ ۸؍
تارکشی کا کام	جس کی مدد سے لڑکیاں کپڑے سے دھاگہ نکالنے کا کام بہت آسانی سے سیکھ جائینگی وضع وضع کے خوشنما ۶۹ نمونے جن میں یکہ رجن سادہ نمونے بلاک کے نمو۔	عہ؍
گلدستہ تارکشی	محترمات سنجیدہ اشرف و سیدہ اشرف نے بہت محنت سے تیار کی ہے ۵۷ نمونے ہیں کامیاب کتاب ہے۔	عہ ۸؍
جانباز	محترمہ نذر سجاد حیدر ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار کا نہایت دلچسپ اور سبق آموز اخلاقی جاسوسی افسانہ۔	۱۲؍
فیروزہ	ایک دولتمند یتیم لڑکی کا افسانہ غم شرافت و انسانیت کی دل ہلا دینے والی قربانیاں ہمت اور دور اندیشی کی فتح	۸؍
	زنانہ لبستہ۔ چھوٹی بچیوں کے لئے دس ننھی ننھی کتابیں جواب تیسری بار شائع ہوئی۔ قیمت عہ؍ افسانہ حرم۔ لڑکیوں کیلئے دس نتیجہ خیز اخلاق آموز دلچسپ کہانیاں عام فہم زبان میں قیمت	۷؍

بحکم رائے زادہ بابو رام سرنداس صاحب بہادر سب جج مظفر نگر

سمن بنام قائم مقام قانونی مدعا علیہ متوفی (آرڈر ۲۲ - قاعدہ ۴) اجرائے ڈگری نمبر ۷۲ سنہ ۳۵

بعدالت سب ججی مظفر نگر ضلع میرٹھ - مسماۃ جمیلہ خاتون وغیرہ مدعی بنام حکیم ظہیر احمد وغیرہ مدعا علیہ -
بنام مسماۃ امت الحبیب عرف ام حبیبہ دختر نصیر احمد قوم شیخ ساکن موضع پھلت پرگنہ کھاتولی حال ریاست ٹونک محلہ قافلہ بر مکان حکیم محمد احمد مرحوم - ہرگاہ جمیلہ خاتون وغیرہ مدعی نے ایک نالش اس عدالت میں بتاریخ ۲۶ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء بنام نصیر احمد مدعا علیہ کے رجوع کی تھی جو بعد کو فوت ہوگیا اور ہرگاہ مدعی مذکور نے ایک درخواست اس عدالت میں گذرانی ہے جسمیں وہ لکھتا ہو کہ آپ متوفی مذکور کے قائم مقام قانونی ہیں اور چاہتا ہے کہ آپ بجائے اُس کے مدعا علیہ بنائے جاویں - لہذا آپکو حکم ہوتا ہے کہ بتاریخ پچیسویں ۲۵ ماہ جولائی سنہ ۳۶ء بوقت ۱۰ بجے دن اس عدالت میں حاضر ہو کر مقدمہ مذکور کی جوابدہی کریں اور اگر آپ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ بغیر حاضری آپ کے مسموع اور منفصل ہوگا - بہ ثبت میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۳ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۶ء جاری کیا گیا - دستخط حاکم بخط انگریزی - نام عدالت سب ججی مظفر نگر - نمبر مسل ۷۲ سنہ ۱۹۲۷ء نام فریقین جمیلہ خاتون بنام حکیم ظہیر احمد وغیرہ

بحکم رائے زادہ بابو رام سرنداس صاحب بہادر سب جج مظفر نگر

حسب دفعہ ۱۴۵ ضابطہ دیوانی - بدست عوام فروخت کے لئے -

نوٹس نسبت دکھانے وجہ کے (عام طور پر)

بعدالت سب ججی مظفر نگر مقام مظفر نگر ضلع میرٹھ مقدمہ دیوانی نمبر ۴۲ بابت سنہ ۱۹۲۷ء متفرقہ اجرا ۲ بابت سنہ ۱۹۳۵ء مسماۃ جمیلہ خاتون وغیرہ بنام حکیم ظہیر احمد وغیرہ
بنام مسماۃ امت الحبیب عرف ام حبیبہ دختر نصیر احمد ساکن موضع پھلت پرگنہ کھاتولی حال ریاست ٹونک محلہ قافلہ بر مکان حکیم محمد احمد مرحوم - چونکہ جمیلہ خاتون وغیرہ نے درخواست اس عدالت میں گذرانی ہے کہ تم نصیر احمد متوفی کی دختر و وارث ہو زر ڈگری کیوں نہ تم سے وصول کیا جاوے لہذا آپکو اطلاع دیجاتی ہو کہ آپ اصالتاً یا معرفت کسی وکیل کے جو حالات مقدمہ سے بخوبی واقف ہو بتاریخ پچیسویں ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء بوقت ۱۰ بجے قبل دوپہر اس عدالت میں حاضر ہو کر درخواست کے خلاف وجہ دکھاویں - اگر ایسا نہ کرینگے تو درخواست مذکور آپ کی غیر حاضری میں یکطرفہ سماعت ہوگی - آج بتاریخ ۲۳ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۶ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا - دستخط حاکم بخط انگریزی
نام عدالت سب ججی مظفر نگر - نمبر مسل ۴۲ سنہ ۱۹۲۷ء -
نام فریقین جمیلہ خاتون وغیرہ بنام حکیم ظہیر احمد وغیرہ -

زنانہ دستکاری کی مفید کتابیں

جو اپنے موضوع پر بہترین تسلیم کی جا چکی ہیں

(۱) عصمتی کروشیا

کروشیا کی شوقین بہنوں کے لئے بہترین تحفہ

یہ کتاب فن کروشیا کی مشہور ماہرہ فاطمہ انور علی بیگم صاحبہ نے ترکیبیں اور ہدایات لکھ کر مرتب کی ہے۔ مجلہ عصمت کی مشہور مضمون نگار محترمہ و۔ا۔ صابرہ کی رائے ہے "یہ خوبصورت اور کامیاب کتاب بہت محنت سے مرتب کی گئی ہے"۔ محترمہ لطیف بیگم صاحبہ جن کے سلائی کے کام کے مضامین مجلہ عصمت میں خوب مقبول ہو چکے ہیں لکھتی ہیں "عصمتی کروشیا کے نقشے اس قدر صاف واضح اور آسان ہیں کہ بنانے میں بالکل دقت نہیں ہوتی"۔ محترمہ انیس بیگم صاحبہ مولفہ کروشیا کی رائے ہے جو ہدایات دی گئی ہیں ان سے نمونے بنانے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔ دوسرا ایڈیشن نہایت آب و تاب کیساتھ بڑے سائز پر شائع ہوا ہے کاغذ دبیز۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

مختصر فہرست عصمتی کروشیا

بگلہ نما گاڑی	فارم ہاؤس	گوٹا نٹ
ڈاک بنگلہ	مسجد کا دروازہ	امام حسین
آدمی مع مشک	مرغ	شیر ببر
کلمہ طیبہ	تاج محل آگرہ	جامع مسجد
۵ نفیس نسترن	۱۱ دلاویز جھالریں	۶ خوبصورت کونے
خوش آمدید	عید مبارک	درخت نما ڈالی
چڑیا ڈالی پر	طرہ دان	پردار گھونٹے
گاڈ بلیس	راج ہنس	بچہ مع تیر و کمان
ایک خاتون مع پنکھا	ئی گوری، توتلے	گلدستے و گلدان

(۲) عصمتی کشیدہ

اس کتاب میں کشیدہ کاری کے نہایت اچھے اچھے نمونے دیئے گئے ہیں ضروری اور کارآمد ہدایتیں اس قدر آسان پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی سمجھ سکیں ہر نمونہ کی ضروری تشریح کی گئی ہے یعنی نمونہ کس کس چیز کے لئے موزوں ہو سکتا ہے اور کس کس رنگ میں ہونا چاہیئے۔ اور کیا کیا احتیاط ضروری ہے۔ پھر نمونے شروع ہوتے ہیں، میز پوش پلنگ پوش، رومال، کرسیوں کے گدوں تکیوں کے غلاف پلنگ کی چادروں ۔ پردوں وغیرہ وغیرہ کے وسط اور کونوں کے لئے مختلف قسم کے پھولوں، بوٹوں، گلدستوں وغیرہ کے کئی درجن خوبصورت نمونے ہیں۔ ان کے بعد کئی وضع کی دلاویز بیلیں پھر مختلف قسم کی کڑھت کے عمدہ عمدہ نمونے ایک درجن سے زیادہ اس کے بعد پرندوں اور چند مشہور عمارات کے خاکے۔ غرض بچیوں کیلئے یہ کتاب بہت کارآمد ہے اور انہیں ہنرمند بنا دیگی پہلا ایڈیشن افسوس ہے ختم ہو گیا اب دوبارہ چھپی ہے قیمت ۱۲

(۳) گلدستہ کشیدہ

عصمتی کشیدہ کا دوسرا حصہ

کشیدہ کاری کی اس قدر خوبصورت اور اتنی کارآمد کتاب آج تک نہیں چھپی

اس کتاب کی تیاری میں ۴۰ دستکار بہنوں نے حصہ لیا ہے۔ اور کشیدہ کاری کی مشہور ماہر محترمہ علی کر فاطمہ بیگم صاحبہ گرو نے نہایت محنت و قابلیت سے کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کے ۱۱ باب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

باب ۱	خوبصورت فریم شلاً امرتہ تاج محل حیدر آباد وغیرہ	۹ نمونے
باب ۲	مختلف قسم کے پھولوں کونوں والیوں کے	۶۲
باب ۳	مختلف وضع کے بڑے پھول	۴۴
باب ۴	میز پوش چادروں وغیرہ کے	۱۹
باب ۵	غلاف تکیہ وغیرہ کے خوشنما مرکز	۱۸
باب ۶	مختلف وضع کے گول پھول	۱۱
باب ۷	ٹیبل کلاتھ، پلنگ کی چادریں ساری وغیرہ کی بیلیں	۱۶
باب ۸	ڈسٹرشن کی بوٹیاں وغیرہ	۸
باب ۹	قمیص کے کف	۳
باب ۱۰	قمیص کرتہ جاڈر کے گریبان	۳
باب ۱۱	متفرق، مثلاً ٹوکری بچوں کے بب جوتہ پاندان کا غلاف بائیسکل کی گدی بٹوہ وغیرہ	۱۵

موتیوں کے کام کی طرح گلدستہ کشیدہ میں بھی پہلے نہایت کارآمد ہدایتیں ہیں پھر نمونوں کے مطابق کاڑھنے کی مفصل ترکیبیں ہیں جس میں ہر چیز کا رنگ اور ٹانکہ بتایا گیا ہے نمونے دیئے گئے ہیں اور تمام نمونے نہایت صاف ہیں۔ اکثر نمونے ایسے خوبصورت ہیں کہ آجتک کشیدہ کاری کی کسی کتاب میں دیکھنے میں نہ آئے ہونگے اور ترکیبیں تو اس قدر آسان ہیں کہ چھوٹی بچیاں بھی سمجھ سکتی ہیں۔ گلدستہ کشیدہ میں سب نئے نئے نمونے ہیں یعنی جو عصمتی کشیدہ میں آچکے ہیں وہ اس کتاب میں نہیں ہیں کاغذ خوب موٹا اور دبیز اعلیٰ درجہ کی چھپائی ٹائٹل رنگین ضخامت ۱۴۰ صفحے قیمت ۱۲

(۴) خواتین کی دستکاریاں

جو عورتیں مالی دقتوں سے پریشان ہیں جنہیں آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی نے پریشان کر رکھا ہو وہ اگر ایک جلد منگالیں تو گھر پر خودداری و عزت کیساتھ زندگی گزار سکتی ہیں کیونکہ اس کتاب میں نادار اور غریب عورتوں کو نہایت کارآمد بیش بہا مشورے دئے گئے ہیں اور بہت سے کاموں کی اس قدر تفصیل بیان کر دی ہے کہ پردہ نشین عورتیں بغیر کسی کا احسان اٹھائے صرف اس کتاب کی بدولت مالی پریشانیوں کو بآسانی دور کر سکتی ہیں۔ خواتین کی دستکاریاں جہاں غریب عورتوں کو بہترین مشورہ دیگی وہاں امیر عورتوں کو بھی ہنرمند اور سلیقہ شعار بنا دے گی۔ قیمت آٹھ آنہ۔

ملنے کا پتہ۔ منیجر عصمت دہلی

(۵) موتیوں کا کام

موتیوں کے کام کا شوق لڑکیوں میں روز بروز ترقی کر رہا ہے مگر یہ کام ایسا ہے کہ جب تک بتانیوالا نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا اور جب اشارہ مل جائے تو بآسانی کیا جا سکتا ہے یہ کام ہے بھی نہایت دلچسپ اور مفید غریبوں کے لئے روزی کا ذریعہ ہو سکتا ہے تو امیروں کے لئے دل بہلانے کا۔ ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ مفید کتاب دستکاری کی ماہر ۲۷ عصمتی بہنوں نے تیار کی ہے اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موتیوں کے کام کی ایسی مفید کتاب ہندوستان بھر میں نہیں چھپی۔ اس میں مندرجہ ذیل ۲۰۶ نمونے ہیں۔

۴۸ وضع کے پھول گلدستے	۲۷ قسم کی لیس	۲۹ جھالریں
۱۳ عمدہ عمدہ فریم	۱۱ فسٹرشن توری وغیرہ	۲ جالیسار
۲۹ وضع وضع کی بیلیں	۸ [illegible] ہار	۸ خوان پوش
۹ حاشیہ کنارہ	۲ پنکھے	۲ [illegible] بیگ
۷ ہینڈ بیگ کے نمونے	۶ [illegible]	گلاس پوش [illegible]
متفرق چیزیں جیسی گوٹا	بورڈ، بیلیں	لیمپ کے جھاڑ

مثال کے طور پر صرف دو چیزوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے

بیلیں		لیس	
بلاؤز کی بیلیں ۲	گلاب کی بیل	جگنو نما لیس	برگ نما لیس
آسان بیل	عینک نما بیل	کے لئی رس کی لیس	دامنی لیس
سادی بیل	لٹ دار ”	کنگورے دار لیس	جال نما لیس
دوپٹہ کی بیل ۲	دوہری ”	انگوٹھی دار لیس	بلاؤز کی لیس
فراک کی ”	کرتے کی آستین کی	سموسہ دار لیس	دوپٹہ کی لیس
ساڑھی کی ”	دامن کی بیل	اور پرلڑیاں	لونگ نما لیس
اوڑھنی ”	حاشیہ کی	بوردار	[illegible] لیس
قمیص کا گھیر	نفیس بیل	لاکٹ لڑیاں	شلوار کا پائنچہ
		فیروزہ کی چٹلی	دلکش [illegible]
		سہ جڑی ”	چوڑی دار پائجامہ

پہلے موتیوں کے کام کی ماہر بہنوں کے نہایت کارآمد مضامین و ہدایات درج ہیں پھر مفصل ترکیب اور ضروری ہدایات ہر نمونہ کی اس قدر آسان لکھی گئی ہیں کہ نوشق بھی پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں چنانچہ بعض ترکیبیں ۱۲-۳ اور ۱۴-۱۳ برس کی بچیوں کی ہیں جو کہ بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں تمام نمونے نہایت صاف اور خوبصورت ہیں کسی نمونے کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی موتیوں کے کام کا شوق رکھنے اور یہ کام سیکھنے والی لڑکیوں اور عورتوں کے لئے اس سے بہتر ساتھی نہیں ملے گی، کاغذ خوب دبیز، لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ ٹائٹل دو رنگ کا با تصویر خوبصورت قیمت دو روپے ۱۲

(۶) عصمتی دستکاری
(۷) سلمہ ستارہ کا کام
(۸) نٹنگ یا بننے کی کتاب

ان کتابوں کا اشتہار کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے۔

Cover Printed at the Calcutta Art Press, Katra Baryan, Delhi.